(۱۵)

سفر نامہ حرمین شریفین جدید تحدیات کے تناظر میں

رابطہ ادب اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادب اسلامی

بانی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

کاروانِ ادب اسلامی

بانی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سابق صدر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

مجلس مشاورت

مولانا محمد ناظم ندوی
پروفیسر عبدالحلیم ندوی۔ دہلی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی۔ لکھنؤ
پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی دہلی
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی
پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر ذفار احمد رضوی

مدیر مسؤل

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، دہلی یونیورسٹی دہلی
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی لکھنؤ

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

معاون طباعت

محمد غفران ندوی

کتابت:۔ حامد

طباعت:۔ پاریکھ آفسٹ، لکھنؤ

زرِ تعاون

فی شمارہ ——— چالیس روپے
سالانہ برائے ہندوستان ——— ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش ——— تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک ——— چار سو روپے یا ۱۲ امریکی ڈالر

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں ——— RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

پتہ:۔ صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۶ | اپریل ۱۹۹۹ء مارچ ۲۰۰۰ء | شمارہ نمبر ۱-۴

حصۂ عمومی

۱۔ منزل بہ منزل (۱)	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۸
۲۔ ” ” (۲)	پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی	۱۰

مقالات

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک عظیم اور متنوع خصوصیت کی حامل شخصیت	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۱۴
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کی کتاب رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۲۷
۳۔ سیرت عائشہؓ تاریخ و ادب کا حسین امتزاج	مولانا نذر الحفیظ ندوی	۸۳
۴۔ اسلامی بیداری میں بہار کے چند اردو نثر نگار علماء کا حصہ	مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی	۹۰
۵۔ ناول میں کردار نگاری	ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی	۱۰۳

۶۔ ادب کا تعلق فلسفہ اور سائنس سے | پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی | ۱۲۴

شعر وادب

۱۔ نعتیہ دوہے | جمیل عظیم آبادی | ۱۴۲
۲۔ نعت شریف | عزیز احسن | ۱۴۳
۳۔ بادۂ عرفاں | ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی | ۱۴۴
۴۔ غزل | نشاد عظیم آبادی | ۱۴۶

حصۂ خاص

مذاکرۂ علمی

حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں

منعقدہ لاہور پاکستان بتاریخ ۲۴-۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء

جلسہ افتتاحی:-

۱۔ حرف آغاز... | | ۱۴۸
تعارف رابطہ ادب اسلامی پاکستان | ڈاکٹر محمود الحسن عارف |
۲۔ روداد سیمینار حرمین شریفین کے سفرنامے | ڈاکٹر محمود الحسن عارف | ۱۵۵
۳۔ خطبۂ استقبالیہ | ڈاکٹر ظہور احمد اظہر | ۱۶۹
۴۔ تعارفی کلمات | مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی | ۱۷۴
۵۔ حرمین شریفین کے سفرنامے | جسٹس میاں محبوب احمد | ۱۸۰

۶۔ نمائش کتب بین الاقوامی سیمینار　اورنگ زیب ملک　۱۸۷

۷۔ قراردادیں　ادارہ　۱۹۰

۸۔ اسلامنا أدب اخلاق (نظم)　ڈاکٹر خالد حسن ہنداوی　۱۹۲

۹۔ تأثرات　مولانا عبدالحفیظ مکی　۱۹۶

۱۰۔ 〃 〃　مولانا سعید احمد عنایت اللہ　۱۹۸

جلسہائے مقالات

الدور الأول لأدب الرحلات إلى الحرمين الشريفين

۱۔ أدب الرحلات　ڈاکٹر ابوبکر صدیقی　۲۰۰

۲۔ الرحلة الحجازية ومناهج المؤلفين فيها في العصر الحديث　مولانا سید واضح رشید ندوی　۲۱۷

۳۔ رحلة ابن جبير إلى الحرمين الشريفين　ڈاکٹر خالق داد　۲۳۶

حرمین شریفین کے سفرناموں کا ابتدائی دور اور عربی سفرنامے

۱۔ دنیائے اسلام کا پہلا سفرنامۂ حرم: جدید تحدیات کے تناظر میں　ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی　۲۵۴

۲۔ عربی زبان وادب میں حرمین شریفین کے سفرناموں کی روایت اور اس کا ارتقاء　ڈاکٹر محمود الحسن عارف　۲۶۱

۳۔ جذب القلوب (شیخ عبدالحق) اور سفرنامہ حجاز ایک تقابل — ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی — ۲۸۳

۴۔ شاہ ولی اللہ کے سفرنامۂ حج فیوض الحرمین پر ایک نظر — محمد امین — ۲۹۲

۵۔ رحلۃ الصدیق إلی البیت العتیق ہندوستان کا ایک عربی سفرنامہ — پروفیسر عبدالباری علی گڑھ — ۳۰۶

۶۔ نواب صدیق حسن خاں اور ان کا سفرنامۂ حج، رحلۃ الصدیق إلی البیت العتیق — پروفیسر محمد اجتباء ندوی — ۳۱۲

فارسی سفرنامہ ہائے حرمین شریفین

۱۔ شیفتہ کا سفر حرمین — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۳۲۳

۲۔ علامہ اقبال اور سفر حرمین شریفین — ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام — ۳۳۶

۳۔ ارمغان حجاز : ایک سفرنامہ — ڈاکٹر محمود احمد غازی — ۳۴۴

اردو سفرنامہ ہائے حرمین شریفین

۱۔ حرمین شریفین کے اردو سفرناموں کے علمی و ادبی اسالیب — ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی — ۳۷۹

۲۔ حرمین شریفین کے سفرنامے: ادب کی مخصوص صنف	محمد عبدالجبّار شیخ	۴۰۷
۳۔ حرمین شریفین کے سفرناموں میں ادبی اسلوب	محمد یوسف خاں	۴۱۰
۴۔ اپنے گھر سے بیت اللہ تک... ایک منفرد سفرنامہ	ڈاکٹر ظفر احمد صدّیقی	۴۱۵
۵۔ ماہر القادری بحیثیت سفرنامہ نگار (کاروانِ حجاز کی روشنی میں)	ڈاکٹر سید عبدالباری، سلطانپور	۴۲۳
۶۔ آنحضورؐ کے نقشِ قدم پر ایک مختصر مطالعہ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۴۴۵
۷۔ سفرِ حجاز (مولانا عبدالماجد دریابادیؒ) ایک بے مثل سفرنامہ	ڈاکٹر تحسین فراقی	۴۵۱
۸۔ مولانا غلام رسول مہر کا سفرنامہ حجاز	زاہد منیر عامر	۴۶۰
۹۔ نیویارک سے مکّہ مکرمہ تک (ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کا سفرنامۂ حج)	ڈاکٹر محمود الحسن عارف	۴۷۱
۱۰۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کے چند سفرنامے	ڈاکٹر امین اللہ وثیر	۴۹۱
۱۱۔ سفرنامہ سعادت	محمد عبدالوہاب صفدر گنج	۵۱۹
۱۲۔ حرمین شریفین کے سفرنامے اور ... بلوچستان	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۵۲۶

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

(۱)

انجمن ادب اسلامی کو سال رواں اپنے ایک بہت بڑے رہنما مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جدا ہو جانے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، اس سانحہ نے اس کے کارواں کی رفتار سفر پر بھی اثر ڈالا اور اس کے سال رواں کا مذاکرۂ علمی مؤخر ہوا، اور اس کا اردو مجلّہ "کاروان ادب" بھی تاخیر سے دوچار ہوا، جس کے لیے اس کے ارکان ادارہ معذرت خواہ ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر گذشتہ سال مرض فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے علاج سے اگرچہ مرض کا بیشتر اثر زائل ہو گیا تھا، لیکن ضعف برابر قائم رہا، اس میں کچھ تو عمر کے تقاضہ سے تھا اور کچھ بیماری کے دباؤ سے تھا، علاج ہوتا رہا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی ہمت کا ثبوت دیتے رہے، اور اپنے علمی و دعوتی کام کو بقدر استطاعت انجام دیتے رہے اور اس طرح مرض سے مقابلہ میں دس ماہ گزارے بالآخر اچانک سکتۂ قلبیہ سے سابقہ پڑا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، مولانا نے اپنی کارگزار زندگی سے اُمّت اسلامیہ کی موجودہ تاریخ کا ایک زرّیں باب بنایا، یہ باب متعدد حصّوں پر مشتمل تھا، جس میں ایک حصّہ دعوت اسلامی کا اور ایک حصّہ تعلیم و تربیت

کا اور ایک حصّہ تزکیہ نفس کا، اور ایک حصّہ انسانیت نوازی کا، اور ایک حصّہ ادب اور ادب اسلامی کا تھا۔ ادب اسلامی کے حصہ کے مشتملات میں ہمارا یہ رابطہ ادب اسلامی خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کو تخیل سے منصوبہ اور منصوبہ سے ایک کارگزار ادارہ کی حیثیت تک پہنچانے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ بنیادی ذریعہ بنا۔

ہمارے رابطہ ادب اسلامی نے ان کی رہنمائی میں پورے پندرہ سال گزارے۔ جو پندرہ بہاروں پر مشتمل رہے، جن کو ہندوستان کے بڑے متعدد شہروں نے قیمتی و پُر مغز ادبی سیمیناروں کی شکل میں دیکھا، ان بہاروں کی داستان رابطہ کے اس ترجمان نے اپنے مختلف شماروں میں پیش کی ہے۔

ہمارا گزشتہ سیمینار بنگلور میں ماہ فروری کے آخر میں منعقد ہوا تھا، اس کے متصلاً بعد ہی مولانا کو مرض کے حملہ سے سابقہ پڑا تھا اور مہینوں اس کا سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ کاروان ادب کا نیا شمارہ اور سالانہ مذاکرہ ادب اسلامی کو بھی تاخیر پر مجبور ہونا پڑا۔

شمارہ کے تاخیر کا حل اس طرح نکالا جا رہا ہے کہ دو سال قبل لاہور پاکستان میں رابطہ ادب اسلامی کے منعقد سیمینار کے مضامین کو جو رابطہ ادب اسلامی کی پاکستانی شاخ کے ترجمان میں شائع ہوئے ہم اپنے ہندوستانی قارئین کو بھی پیش کر دیں۔ چنانچہ یہ زیر نظر شمارہ اصولاً انھیں مضامین پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ اس سے ہمارے قارئین کو مسرّت و دانش کی سوغات ملے گی۔

ادارہ کاروان ادب کا ارادہ ہے کہ وہ اگلا شمارہ خود حضرت مولانا کی شخصیت خصوصیات اور کارناموں پر پیش کرے گا اس طریقہ سے وہ حضرت مولانا کے تئیں اپنی احسان شناسی کا ثبوت دے گا۔

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی

منزل بہ منزل

(۲)

کاروانِ ادب سوئے منزل رواں دواں تو ہے لیکن جس طرح ہر کارواں کی رفتار راہ و منزل کے حالات و اثرات کے پیش نظر کم و بیش ہوتی رہتی ہے اسی طرح ہمارے اس کارواں کی رفتار کا حال ہے۔ زیر نظر شمارہ کم و بیش ایک سال کے طویل وقفہ کے بعد اپنے قدر دانوں تک پہنچ سکا ہے، کچھ دشواریاں در پیش تھیں جن کی وجہ سے یہ غیر معمولی تاخیر ہوئی، اس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں، یہ شمارہ کئی شماروں پر مشتمل ہونے کی بنا پر اس کے لائق طبع ہونے کے قریب اس کارواں پر میر کارواں صدر عالی مقام سے محرومی کی قیامت گزر گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو نہ صرف میر کارواں تھے بلکہ ہمارے اس عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی، سرپرست اور روح رواں تھے، گزشتہ سال کے آخری دن یعنی ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے، آج کئی ماہ گزر جانے کے باوجود اس صدمہ سے سنبھلنا دشوار ہو رہا ہے۔ لیکن

صبر کرتے ہی بنے گی غالب

ع واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

تاہم جان کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو جان کے ڈر سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں جا سکتا ہر چند کہ حضرت والا کے حادثۂ وفات نے ایسا لگتا ہے کہ عرصہ تک کے لیے سوچنے سمجھنے اور کارگاہ زیست میں سرگرم عمل رہنے کا حوصلہ چھین لیا ہے لیکن زندگی یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم سے عبارت ہے جس کے بغیر جہاد زندگانی میں قدم رکھنے کا حق نہیں، اور بے عملی و بے خبری کا یوں بھی کوئی جواز نہیں کہ یہ اس پیکر علم و دانش، مجسم حرکت و عمل رہنما کی روح سے بے وفائی کے مترادف ہے، مولانائے محترم اپنی آخری سانس تک امت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور باوقار زندگی کے حق کے لیے وقف عمل رہے ان کی زندگی اوّل سے آخر تک ان کے خوردوں، شاگردوں اور رفقائے کار کے لیے جہد مسلسل کا پیغام تھی۔ وہ ایک ایسی بے چین روح لے کر دنیا میں آئے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی اس خیر امت کی فکر و فلاح سے غافل نہ ہو سکی، حرکت و عمل کی اسی روح سے توانائی حاصل کرتے ہوئے "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" ہمارا اگلا شمارہ انہی کی شخصیت پر خاص شمارہ ہوگا۔

جنوری۔ مارچ ۱۹۹۹ء کا شمارہ پونا میں ہونے والے سیمینار کے مقالات اور کچھ دوسرے مضامین پر مشتمل تھا۔ پونا کا سیمینار ادب کے تناظر میں تاریخ نویسی کا جائزہ لینے کی ایک کوشش تھی۔ جس کے منتخب مقالات گزشتہ شمارہ میں شائع کیے گئے۔ ایک سال کے وقفہ کے بعد کاروان ادب کا یہ شمارہ عمومی نوعیت کے بعض مقالات و مضامین اور شعری انتخاب کے علاوہ ۲۴، ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں لاہور کے بین الاقوامی سیمینار کی روداد اور مجموعہ مقالات پر مشتمل ہے۔ لاہور کا یہ سیمینار حرمین شریفین کے سفرناموں اور جدید چیلنجوں کے موضوع پر تھا۔ سفرنامے کہیں کے بھی ہوں معلومات افزا ہوتے ہیں اور قارئین کے لیے ان میں بڑی کشش بھی ہے۔ پھر جب کوئی روداد سفر

اس مقام تک پہنچنے کی سعی مشکور پر مشتمل ہو جو اسلامیان عالم کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا درجہ رکھتی ہے یعنی اس جگہ کا سفر جو دنیا کے بتکدہ میں خدا کا پہلا گھر کہلاتا ہے اور اس سمت کی تگ و دو جہاں انسانیت کا محسن اعظم محوخواب ہے تو یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ جو خوش نصیب زیارت کعبہ وطیبہ سے مشرف ہو چکے ہیں ان کے لیے ایسے تمام سفرنامے قند مکرر یا ایسی حکایت لذیذ کا مزہ دیتے ہیں جس میں دراز گفتنی بلکہ دراز نفسی کی بے پایاں گنجائش ہے۔ قاری وسامع اس حکایت سے کبھی اکتا نہیں سکتا کہ گویا وہ اس مطالعہ کے وقت اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہوتا ہے، اور یہ پرواز طائر روح کے لیے سرتاپا کشش ہے۔ لاہور کا سیمینار شروع سے آخر تک اسی کشش کا پرتو تھا۔ دودن تک سننے والے اور سنانے والے حرمین شریفین کی روح پرور فضا میں سانس لیتے رہے، ان میں جو لوگ اس وقت تک زیارت حرمین سے محروم تھے ان کے دلوں پر ان مقالات کا ایک ایک لفظ مہمیز بن رہا تھا اور ان کے پرواز کو تازگی و توانائی فراہم کر رہا تھا۔ تمنائے دید دامن دل سے اس طرح کھیل رہی تھی جیسے برسوں کا کوئی شہر بدر خاک وطن کا سرمہ بنانے کے لیے بےچین ہو، سامعین میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جس نے اسی لمحہ سفر حرمین کے وسائل واسباب نہ شروع کر دیئے ہوں۔

مناسب سمجھا گیا کہ سیمینار لاہور کی پوری روئداد بے کم وکاست اپنے قدردانوں کے سامنے پیش کر دی جائے۔ کہ اس طویل فراق کی کچھ تلافی ہو سکے، لاہور سیمینار پر جو ذات والاصفات مانند خیر و برکت سایہ فگن تھی اور جس کے دیدار کی تمنا دور دراز کے لوگوں کو اس شہر نگاراں تک کھینچ کر لائی تھی وہ میر کاروان ادب صدر عالمی رابطہ

ادب اسلامی، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی تھی، مولانا کا قیام لاہور کے جامعہ اشرفیہ میں تھا۔ صبح سے شام تک حضرت والا سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک صبح کو قبل فجر یہ منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ جامعہ کی اس عمارت تک پہنچنے والے راستوں پر جہاں مولانا کا قیام تھا بڑی تعداد میں لوگ دو رویہ بیٹھے ہیں ان کو لانے والی بسیں آس پاس کھڑی ہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ حضرت مولانا کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ تمام مشتاقان دید کو فرداً فرداً باریاب کریں تو لوگوں نے حسرت و شوق کے عجیب و غریب جذبات کے ساتھ جواب دیا کہ "حضرت جب واپس جانے لگیں گے تو ہم یہیں سے ایک نظر انھیں دیکھ لیں گے اور ہمیں تسلی ہو جائے گی۔"

نہ جانے وہ کون سی ساعت ہمایونی تھی جب قدرت نے اپنے اس بندے کے لیے محبوبیت خلق کا فیصلہ رقم کیا اور اس کے دل کو تمام عالم انسانیت کی محبت کا مرکز بنا دیا۔ مذکورہ بالا مکالمہ ان ہزاروں شواہد میں سے ایک ہے جس سے مولانائے محترم کی محبوبیت و مقبولیت عام کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت کرے اور بہشت کے اعلیٰ درجات سے نوازے۔

یہ شمارہ چار شماروں کے مجموعہ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ اس سے اس کوتاہی کی کسی حد تک تلافی ہو سکے گی جو گزشتہ مارچ سے تادم تحریر جاری ہے کوشش کی جائے گی کہ اس کے بعد کے شمارے نظم و ترتیب بپابندی وقت شائع ہوتے رہیں۔

این دعا از ما واز جملہ جہاں آمین آباد

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ایک عظیم اور متنوع خصوصیت کی حامل شخصیت

الحمد للہ رب العلمین حمدا ینبغی لجلال وجہہ وعظیم سلطانہ
سبحنک لا نحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک فلک الحمد حتی ترضیٰ
یارب صل وسلم علی عبدک ورسولک سیدنا ونبینا محمد وعلیٰ اٰلہ وصحبہ اجمعین۔

اما بعد: صدر محفل: لائق صد احترام محسن بھٹکل ومشفق اہل نوائط حضرت مولانا دامت برکاتہم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ العالی اور مفسر قرآن حضرت مولانا یار بجھو صاحب مدظلہ العالی اور معزز سامعین۔

آج سے ۹، ۸ سال قبل کوئی ۱۹۹۰ء کے آس پاس کا زمانہ ہے ملک میں مسلمانوں کے سب سے بڑے اور مؤقر ادارہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی دعوت پر دہلی میں ملت کے چنیدہ قائدین جمع ہیں، سپریم کورٹ میں جس کے فیصلہ کے بعد اپیل بھی نہیں کی جا سکتی ملت کا ایک اہم مسئلہ زیر سماعت ہے مضبوط نمائندگی کے لیے قائدین ملت فیصلہ کرتے ہیں کہ ملک کے چوٹی کے غیر مسلم وکلاء کی خدمات حاصل کی جائیں لیکن اس کے لیے ایک بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے تو اکثر کی رائے ہے کہ اس کے لیے ملک کے بڑے شہروں کلکتہ،

بمبئی اور مدراس وغیرہ کا دورہ کیا جائے۔ صدر محفل فیصلہ سناتے ہیں کہ زیر غور شہروں میں جنرل سکریٹری کی قیادت میں ایک وفد مدراس اور بنگلور جائے البتہ صدر محفل اپنی طرف سے ایک اور چھوٹے سے شہر کا اس میں اضافہ کرتے ہیں جس سے بعض حاضرین ششدر رہ جاتے ہیں۔ جی ہاں اس وقت کے صدر محفل اس وقت اسٹیج پر جلوہ افروز حضرت مولانا کی ذات گرامی ہے اور وہ بستی بھٹکل ہے اللہ اکبر! مدراس اور بنگلور جیسے عالمی شہرت یافتہ شہروں سے بھٹکل کا کیا جوڑ، نہ مسلم آبادی میں، نہ معاشی استحکام میں، نہ اعلیٰ تعلیم میں، نہ ملکی سطح پر مسلم قیادت کی فراہمی میں، لیکن اس کے باوجود صدر محفل کو یقین تھا کہ ملت اسلامیہ کے تشخص کے بقاء کے لیے اہل بھٹکل کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے، بقول شخصے مولانا اس اعتماد کے ساتھ اس دورہ میں بھٹکل کا نام شامل کر رہے تھے جیسے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی کوئی بڑی جمع پونجی بھٹکل میں رکھی ہوئی ہے اور وہ اس کو لانے کے لیے اس وفد کو بھیج رہے ہیں تاریخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب نباض زمانہ حضرت مولانا منت اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی قیادت میں یہ وفد بھٹکل پہنچا تو نصف سے زائد مالی نشانہ بھٹکل ہی میں مکمل ہوا اور یہاں کے باشندوں نے اپنے سرپرست کے اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ مسلم خواتین نے اپنی سونے کی چوڑیاں تک اس کے لیے وقف کر دیں۔ کیا اہلیانِ بھٹکل پر حضرت مولانا کا یہ عظیم احسان نہیں ہے کہ ایک غیر معروف چھوٹی سی بستی کا ملک کے چنیدہ قائدین کے سامنے اس طرح تعارف کرا رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا یہاں کلکتہ اور بمبئی جیسے شہروں سے بھی بڑھ کر کار خیر میں حصہ لیا جاتا ہے۔ اور یہاں دین کے نام سے کوئی واپس نہیں جاتا۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار مولانا کی ہم پر شفقتیں تھیں جو ہمیں رہ رہ کر یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ کسی دن حضرت مولانا کے سامنے تحدیث نعمت کے طور پر اس کو دہرایا جائے

یہی سوچ کر ارباب جامعہ نے اہلیان بھٹکل اور آس پاس کی طرف سے آپ کی چودھویں بار آمد کے موقع پر یہ عظیم الشان تاریخی جلسہ منعقد کیا۔ جلسے بھٹکل میں اب تک سیکڑوں ہو چکے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ بار بار ایسی عوامی محفلیں منعقد ہو چکی ہیں جس میں ہم نے مولانا کو بار بار سنا اور کبھی مولانا کے سامنے اپنی گزارشات بھی رکھی لیکن آج کا یہ جلسہ اپنی نوعیت کا بھٹکل کی تاریخ میں اولین جلسہ ہے اس لیے کہ یہ نہ تو مولانا کے لیے استقبالیہ ہے کہ آپ یہاں پہلی دفعہ تشریف لارہے ہیں اور نہ انشاء اللہ آخری جلسہ اور الوداعیہ ہے کہ اس کے بعد آپ کو نہیں آنا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ بار بار آئیں گے اور ہم اپنی آنکھوں کو آپ کے دیدار سے اگلی صدی عیسوی میں بھی برابر ٹھنڈک پہنچاتے ہوئے ھل من مزید کی صدا لگاتے رہیں گے

اس جلسہ کا ایک مقصد اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان پر شکر بجالانا ہے کہ اس نے ہمارے روحانی سرپرست کو چند ماہ قبل دشمنوں کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھا اور تکیہ رائے بریلی میں مسلح چھاپہ میں بھی آپ کی حفاظت کی گویا اپنے پیارے نبی کے لیے واللہ یعصمك من الناس کے وعدہ کے مطابق انہیں کے صدقہ طفیل اسی خانوادۂ نبوت کے ایک فرزند پر بھی کوئی آنچ آنے نہیں دی۔ اس حادثہ کی اطلاع پر رنج والم کی جو کیفیت اہلیان بھٹکل کی تھی اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجلس اصلاح وتنظیم کے زیر اہتمام ہزاروں لوگوں کی طرف سے وہ پر امن احتجاج ہوا کہ جس کی مثال ضبط وتحمل میں اس علاقہ کے پوری تاریخ میں خود بڑے بوڑھوں کے کہنے کے مطابق نہیں ملتی۔

ایک دفعہ ایک استاد نے اپنے چند شاگردوں سے سوال کیا کہ بتائیے حضرت مولانا کا یہ جملہ کس شہر کے بارے میں ہے کہ مجھے وہاں جاکر اپنے وطن رائے بریلی کا سا سکون ملتا ہے۔

کسی نے کہا کہ لاہور اس لیے کہ ان کے سب سے مشفق استاد حضرت احمد لاہوری کا یہ وطن عزیز ہے، کسی نے کہا کاندھلہ کہ یہ ان کے مشفق اور باپ کی طرح محبت کرنے والے حضرت مولانا الیاس صاحب اور حضرت شیخ الحدیث کا مسکن ہے، کسی نے کہا بالاکوٹ کی یہ بستی اس کے جد امجد سید احمد شہید کی مجاہدانہ و سر فروشانہ قربانیوں کی یاد دلاتی ہے لیکن کسی کا جواب صحیح نہیں تھا اس جگہ موجود ایک بھٹکلی طالب علم کے لیے یہ جواب بہت آسان تھا اس نے کہا کہ اس سے مراد بھٹکل ہے، اس جملہ کو جامعہ کے معائنہ بک میں حضرت مولانا نے خود تحریر فرمایا ہے کہ جب میں یہاں آتا ہوں تو اپنے وطن رائے بریلی کا سا سکون محسوس کرتا ہوں یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کرم ہے کہ اس نے مولانا کے دل میں اس بستی کے مسلمانوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ مجموعی طور پر عالمی و ملکی سطح پر روز بروز گرتی صحت کے پیش نظر آپ کے اسفار دن بدن کم ہو رہے ہیں لیکن بھٹکل نہ صرف اس سے مستثنیٰ بلکہ مستثنیٰ در مستثنیٰ ہے اور اس میں کمی کے بجائے زیادتی ہی ہو رہی ہے آپ کو یہ سن کر مسرت آمیز حیرت ہوگی کہ اس مرتبہ آپ کی آمد نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے اور آپ صرف دس ماہ کے قلیل وقفہ کے بعد تشریف لائے، جبکہ آپ کی صحت کا یہ عالم کہ یقین کرنا مشکل یعنی اسی رمضان میں کئی روز تک اپنے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر واقع مسجد تک پہنچنا بھی ممکن نہیں تھا ۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۴ء آپ دس دفعہ تشریف لائے اس طرح تین سال میں ایک دفعہ آمد کا اوسط تھا لیکن ادھر مرحوم منیری صاحب کی وفات کے بعد جن سے آپ کو سب سے زیادہ تعلق تھا اور ان کی وفات کے بعد ہم کو یقین نہیں تھا کہ یہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری رہے گا۔ آخری تین سال میں چار دفعہ تشریف لاکر دوسری بستیوں کے چاہنے والوں کے لیے ہمیں

قابل رشک بنا دیا۔ کہ آپ کو یقین آئے گا جب بھٹکل کو نظر بد لگتی ہے اور اس پر کوئی آنچ آتی ہے تو اس کے لیے آپ کی بے چینی کا کیا عالم ہوتا ہے جی ہاں آج سے ۴ سال قبل کی بات ہے بھٹکل کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ اکثر تو اپنے گناہوں کی پاداش کا نتیجہ ہے اور کچھ خدا کی طرف سے شاید آزمائش بھی گھر گھر تلاشی ہے قبرستان میں آرام کر رہے مرحومین تک کی تلاشی لی جا رہی ہے مساجد تک کو بخشا نہیں جا رہا ہے حضرت مولانا کسی تقریب میں شرکت کے لیے ہاسن تشریف لاتے ہیں جامعہ سے اساتذہ کا ایک وفد دعا کی درخواست لے کر مولانا کے پاس پہنچتا ہے مولانا یہاں کے حالات سن کر بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ظہر کے بعد معمول کا قیلولہ بھی مولانا کا یہاں کے حالات سننے کی نظر ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں تم لوگ یہ سب شکایات مجھے ابھی تحریری لکھ کر دو اور ان سرکاری افسران کے نام بھی جن کا ذہن اس کے پیچھے کارفرما ہے۔ میں خود اگر موقع ہوا وزیر اعظم سے مل کر اس کی شکایت کروں گا بصورت دیگر مولانا پاریکھ کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجوں گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی دنوں میں وزیر اعظم کو اللہ تعالیٰ نے خود مولانا کے دروازہ تک ندوہ پہنچا دیا اس موقع پر ملک کے حالات پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے جو باتیں دیوے گوڑا جی سے مولانا نے کہیں اس میں یہ بھی تھی کہ گوڑا جی مجھے شرم آتی ہے کہ اب میں کس منہ کے ساتھ بھٹکل جاؤں گا، آپ ذرا بھٹکل کی فوراً خبر لیجئے اور اس کی فکر کیجئے اور اس کے بعد اس کے یہاں کیا اثرات مرتب ہوئے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ میں اس پوری ساحلی پٹی سے صرف ایک نشست ہے آپ کا ہم سے شفقت کا یہ عالم کہ مرحوم منیری صاحب اور اب محتشم عبدالغنی صاحب کو اس اعزاز سے سرفراز کیا۔ اپنے وطن رائے بریلی میں رمضان المبارک

میں آنے والے سیکڑوں مہمانوں کی خبر گیری کرنے اور اپنی طرف سے ان کا خیال رکھنے اور طعام وقیام کا نظم کرنے کے لیے اپنے خاندان سے کسی کو مقرر کر سکتے تھے لیکن یہ شرف بھی نسلاً نہ سہی عملاً اپنے گھرانہ سے تعلق رکھنے والے اپنے عزیز خاص ہی نہیں بلکہ خاص الخاص عبدالعزیز بھٹکلی ہی کو دیا، مرکز نظام الدین میں حضرت مولانا انعام الحسن علیہ الرحمہ کی ملاقات کے لیے جب بھی جانا ہوا تو وہاں بھی بھٹکلی ہی کو نگاہ کرم ڈھونڈتی رہی اور یہ سوال سب سے پہلے ہوا کہ عزالی کہاں ہے، شام سے جب علامۃ العصر شیخ حسن حبنکہ علیہ الرحمہ نے خط لکھا کہ اپنے کسی ایسے عزیز کو شام بھیجیں جن پر آپ کو ہر طرح سے اعتماد ہو تاکہ میں اپنے پاس رکھ کر اس کی تربیت کر سکوں تو وہاں بھی نظر انتخاب فاروق بھٹکلی ہی پر گئی۔ کسی نے سوال کیا ندوہ کے بعد کس ادارہ سے آپ کا سب سے زیادہ تعلق ہے تو کہنے میں دیر نہیں لگی جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے میرا وہ تعلّق ہے جو ندوۃ العلماء کے بعد کسی بھی ادارہ سے ہو سکتا ہے۔ گزشتہ ترکی کے سفر کے دوران جب ایک دن کے لیے دبئی میں قیام کرنا پڑا تو ایک طرف شارجہ کے حاکم کا محل آپ کا منتظر تھا تو دوسری طرف جمعۃ الماجد وسیف الغریر جیسے ارب پتی تاجروں کے مکانات مشتاق تھے لیکن وہاں بھی قرعہ فال ایک بھٹکلی ہی کے نام نکلا۔ جب کسی نے ندوہ کے مہمان خانہ میں بعد نماز عشاء کی مجلس میں یہ سوال کیا کہ اس وقت ملک میں مسلم بچیوں کی دینی تعلیم کا کون سا معیاری ادارہ ہے تو سائل کو حیرت ہوئی کہ رامپور اور مالیگاؤں کے بجائے جامعۃ الصالحات بھٹکل کا نام سننے کو ملا اسی طرح جب آپ نے اپنی زندگی کی روداد مرتب کرنا شروع کیا اور اس کے لیے جن پرسکون مقامات پر آپ نے قیام کیا تو اس میں ایک بھٹکل بھی تھا جس کا تذکرہ خود آپ نے اس کے مقدمہ میں کیا ہے۔

لیکن قبلہ محترم! آپ کی ہم سے یہ محبت یک طرفہ نہیں ہے اہلیان بھٹکل بھی آپ سے اسی طرح بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں کیا بات ہے کہ آپ جب بھی یہاں تشریف لاتے ہیں پورے شہر میں عید کا سا سماں ہوتا ہے گھر گھر آپ کی آمد کا چرچا ہوتا ہے خلیج سے لوگ محض آپ کی ملاقات کے لیے چھٹیاں لے کر آتے ہیں آپکے دیدار سے ہر بار اک نئی لذّت محسوس ہوتی ہے۔ آپ الحمد للہ اب تک چودہ بار یہاں تشریف لا چکے ہیں جس کی مجموعی مسافت لکھنؤ تا بھٹکل ایک لاکھ کلو میٹر سے زائد ہو جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے تو اس کے بدلے خلائی جہاز سے زمین کے کئی چکر لگا سکتے تھے۔ چاند تک کا ایک تہائی فاصلہ طے کر سکتے تھے یا پھر لکھنؤ سے دہلی تک سو بار سفر کر سکتے تھے۔ آپکے مزاج اور فکر سے اہلیان بھٹکل کی ہم آہنگی کا یہ عالم ہے کہ بانیانِ جامعہ نے آج سے ۳۵ سال قبل جامعہ کے لیے ندوہ کا نصاب منتخب کیا جبکہ آج کی طرح ہر چہار سمت ندوہ کی یہ شہرت نہیں تھی۔ بھٹکلی ندوی فضلاء کی تعداد آج بھی پورے صوبہ کے ندوی فضلاء پر بھاری ہے اور اس وقت ندوہ میں زیر تعلیم ۵۰/۶۰ طلباء اس کی واضح دلیل ہیں اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد رابع صاحب دامت برکاتہم کی شفقتوں سے وہاں اساتذہ کی بھی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ انجمن طلباء بھٹکل کی طرح انجمن اساتذہ بھٹکل بھی قائم ہو سکتی ہے اور یہ تعداد اب ایک دو تک محدود نہیں رہی۔ ۸-۷ سال قبل تک بھٹکل کی ۴/۳ ایسی عمارتیں تھیں جس کا یا تو آپ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا یا افتتاح کیا۔ آپسے تعلق کی بناء پر حاکم شارجہ نے ایک سڑک آپ کے نام موسوم کیا اور شارع ابی الحسن علی وجود میں آئی تو مسلمانان بھٹکل نے اس چھوٹی سی بستی میں دو سڑکوں کو آپ کے نام سے موسوم کیا۔ ایک شرالی میں تو دوسری آزاد نگر میں اہلِ کشمیر اور اہل دکن نے آپ کی نصیحتوں یعنی تحفۂ کشمیر اور تحفۂ دکن

عالم اسلام میں صرف اب تک آپ کی ذات گرامی پر ۳ ر۲ سال قبل میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری کے شہر ترکی میں بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا یہ صرف اب تک آپ ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ زندگی ہی میں دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ۱۲ اشخاص اس وقت آپ پر ریسرچ اور پی۔ ایچ ڈی کر رہے ہیں ہیں آپ کی جن خصوصیات نے آپ کا گرویدہ کیا اس میں سرفہرست آپ کی مادیت سے بے رغبتی ہے آپ کی دنیا سے بے نیازی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے کہ وزیراعظم نے خود فون کر کے حکومت ہند کی طرف سے دوبار آپ کو ملک کے بڑے اعزاز پدم بھوشن کی پیش کش کی لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا یا دنیا آپ کے قدم پر پوری آسائش کے ساتھ آتی رہی لیکن آپ نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ ابھی ۳-۲ ماہ قبل آپ کو سوا کروڑ روپیہ کا عالمی اسلامی ایوارڈ دینے کا حکومت دبئی نے اعلان کیا آپ نے اس کو بھی شروع میں لینے سے انکار کر دیا حکومت نے بہت اصرار کیا وزیر دفاع شیخ محمد نے اپنا ذاتی طیارہ مولانا کو لانے کے لیے بھیجا اور یہ کہلوایا کہ آپ کی عدم شرکت سے ہماری سبکی ہوگی اور محفل بے رونق تو اکرام مسلم کی خاطر آپ گئے لیکن اسی مجلس میں اس کو دینی تعلیم کے لیے وقف کرنے کا اعلان کر کے عربوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

آپ کی کتاب ماذا خسر اور تاریخ دعوت وعزیمت کے جب ایک ایک لاکھ نسخوں پر مشتمل ایڈیشن نکلے تو اس کے ناشر لکھ پتی سے کروڑ پتی بن گئے لیکن خود صاحب کتاب کا یہ حال کہ مکان کچا کپڑا پیوند لگا ہوا مستقل آمدنی کچھ بھی نہیں۔ تکیہ رائے بریلی میں جب سیلاب آیا تو اسی مصنّف کے مکان کو خستہ حال ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے نشانہ بنایا۔ جب کبھی سائل آیا تو اپنے پاس کچھ موجود نہیں تو سنت نبوی کے مطابق قرض لیکر

کو زیور طبع سے آراستہ کیا تو ہم نے تحفہ بھٹکل کی سوغات ملت کو دی ہم پر ہمیشہ یہ الزام لگا کہ ہم اپنے ان محسنین سے تعلق باقی نہیں رکھتے جو ہمیں سخت سست کہتے ہیں یا ڈانٹتے ہیں۔ لیکن آپکے ساتھ وابستگی میں یہ سب الزامات غلط ثابت ہوئے آپنے ایک دفعہ ہمیں ایسا ڈانٹا کہ شاید آپ کو خود محسوس ہوا کہ اہل بھٹکل ہمیں شاید اب دوبارہ نہ بلائیں آپ نے ۱۹۶۷ء میں یہاں کے ہزاروں مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا کہ اے اہل بھٹکل، اے اہل نوائط کے چشم و چراغ تمہارے بزرگ بتیس دانتوں میں ایک زبان کی حیثیت رکھتے تھے ان کی باتوں کا وزن تھا اور تم اتنی بڑی تعداد میں ہو تمہارا کوئی وزن نہیں میں صاف کہتا ہوں بھٹکل کے مسلمانوں کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے وہ ملت کی فکر کریں یہ ٹکڑیاں یہ لے یہ نوائط ملت نہیں اتنی بڑی کاروباری قوم اور ملت کے مسائل حل نہ کر سکے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جی ہاں ہم نے اس کے بعد آپ کو پہلے سے زیادہ زحمت دی آپ کے ساتھ ہمارے اس والہانہ تعلق کو دیکھ کر کوئی ہم پر یہ الزام نہ لگائے کہ مولانا کی موجودہ بین الاقوامی شہرت و عزت کو دیکھ کر ہم نے اس کو سینے سے لگایا ہے نہیں ہرگز نہیں اس موقع پر میں اسی جامعہ کے ایک حقیر فرزند کی حضرت مولانا ہی کی سرپرستی میں مکمل ہوئی ایک تالیف سیرت سلطان ٹیپو شہید میں مولانا کے نام انتساب کے لیئے جن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے اس کو مستعار لے کر آج پوری قوم کی طرف سے اللہ ہی کو گواہ بنا کر یہ سنانا چاہتا ہوں کہ مخدوم محترم واللہ ہمیں آپسے محبت آپ کی عالمی شہرت یا بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے نہیں بلکہ خاندان نبوی سے آپکے خالص نسبی تعلق آپ کے فکری اعتدال، علمی توازن حلم، بردباری اور ملت اسلامیہ کے لیے آپ کی کڑھن و تڑپ کی وجہ سے ہے اس لیے نہیں کہ پورے

اس کو دیا اس کے علاوہ بہیں آپ کے جن امتیازات نے اور متأثر کیا اس میں آپ کی وہ حق گوئی و بے باکی ہے جس سے فاروق اعظم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ذرا اس وقت کو یاد کیجئے جب سارا عالم عرب بشمول اس کے سربراہان کے مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے قومیت عربیہ کے نعرہ سے نہ صرف متأثر بلکہ اس کا داعی بن گیا ہے لیکن عالم عرب سے خصوصی تعلق اور بار بار کے وہاں کے اپنے تاریخی دوروں کے باوجود پورے عالم اسلام میں حضرت مولانا ہی کی وہ پہلی آواز جس میں قومیت عربیہ کو جاہلیت قرار دے کر قومیت اسلامیہ کی دعوت دی گئی تھی حالانکہ اس وقت حکومت ہند بھی مصر سے اپنے دیرینہ تعلق کی خرابی کا حوالہ دے کر اس شدت میں نرمی کے لیے مولانا سے اصرار کرتی رہی لیکن حق کی یہ آواز دھیمی کیا ہوتی اور تیز ہو گئی ابھی دبئی کے حکمراں کی دعوت پر خود اس کے ذاتی طیارہ میں اسلامی ایوارڈ کی محفل کو اپنی شرکت سے اعزاز بخشنے کے لیے جب دبئی پہنچے تو وہاں بھی رستم کے دربار میں ربعی بن عامر کی بے باکانہ وجرأت مندانہ تقریر کی یاد تازہ کر دی۔ حضرت مولانا نے عرب شیوخ و حکمراں کو خود ان کا ذاتی مہمان بن کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ تم اس جزیرۃ العرب سے اسرائیل کو نکال دو اپنے رشتہ کو محمد عربی سے دوبارہ جوڑ دو اس لیے کہ ان ہی سے تمہارا وجود ہے یہ رشتہ دن بدن کمزور ہو رہا ہے اس کو مستحکم کرو۔

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

مصر و شام لبنان و فلسطین اردن و مراقش یمن و عراق ہر جگہ آپ نے اسی جرأت کا مظاہرہ کیا گزشتہ سال کے اواخر میں وندے ماترم کے معاملہ میں آپ کو خود اندازہ

تھا کہ اس موقع پر اپنی زبان کو جنبش دینے سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آجائے گا لیکن آپ نے لایخاف فی اللہ لومۃ لائم کے اپنے اصولوں کے مطابق صاف کہہ دیا اے مسلمانان ہند صاف سن لو ایسے اسکولوں میں اپنے گلشن کے معصوم کلیوں کو بھیجنا جہاں شرک و کفر کے شرکیہ کلمات دہرانے پر مجبور کیا جاتا ہے حرام ہے، ناجائز ہے اور شریعت میں قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ہمیں آپ سے وابستگی اس لیے بھی نہیں کہ عامۃ الناس اس وقت پوری دنیا میں آپ کی گرویدہ ہے عالم اسلام کے چوٹی کے مشائخ و اکابر کی نظروں میں بھی آپ محترم و مکرم ہیں ایک جلسہ میں امام حرم عبداللہ بن السبیل نے آپ کی موجودگی میں آپ کے جلالتِ علم کے سامنے صدارت کرنے سے معذرت کر دی۔ برصغیر کے مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے آپ کو موفق من اللہ قرار دیا۔ حکیم الامت حضرت تھانوی جیسے تول تول کر بولنے اور لکھنے والے نے بھی آپ کو صرف ۱۹ سال کی عمر میں مجمع الکمالات کا خطاب دیا۔ حضرت رائے پوری جیسے شیخ وقت نے اپنے سے بہت کم اسی شاگرد عزیز کو سیدی و مولائی لکھا۔ مجدد عصر حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط میں ان ہی کو وہ تاریخی خط لکھا جس میں اس بات کا اعتراف کیا کہ آپ کی توجہات سے اس دعوت کی تحریک کو جس قدر نفع پہنچا کسی اور سے نہیں پہنچا، بقول جسٹس تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی ندوہ کو زبان ہوشمند تھا ہی آپ نے اس کو دل دردمند بھی بنا دیا۔ حضرت شیخ الحدیث جیسے ولی کامل نے بھی آپ کو مجموعہ حسنات لکھا اور یہ بھی کہا کہ میں آپ سے تعلق کو وسیلہ نجات سمجھتا ہوں۔

غرض یہ کہ ہمیں آپ حضرت مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت میں

ملّت کے لیے تڑپتے نظر آتے ہیں تو مغرب سے صاف صاف باتوں میں مادیت کے خلاف شمشیر برہنہ مجاہد و سرفروش، تذکرہ گنج مرادآبادی میں ایک خالص صوفی اور زاہد اور راتوں میں اٹھ کر رو رو کر خدا سے اپنی ملّت کے لیے مانگنے والا تو سیرت سید احمد شہید میں کفر و شرک کے خلاف میدان کارزار میں ایک مسلح سپاہی اور جانباز کمانڈر، ماذا خسر میں علمیت و سنجیدگی میں مغربی مؤرخین کے ہم پلہ تو تاریخ دعوت و عزیمت میں اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے والا، امام غزالی و رومی کا ہم نشین و صحبت یافتہ، نقوش اقبال میں ایک خالص اسلامی ادیب تو ارکان اربعہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا تربیت یافتہ، پرسنل لا بورڈ اور ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے ایک بہترین منتظم اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والا ایک بہترین قائد تو تحریک پیام انسانیت کے اسٹیج سے گاندھی و نہرو سے زیادہ محب وطن اور اس کا وفادار۔ رابطہ عالم اسلامی کی میٹنگ میں شیخ بن باز کے ساتھ ملّت کا ایک صاحب بصیرت مشیر تو رابطہ ادب اسلامی کی تاسیس سے امّت کی صلاحیتوں کو ایک نیا رخ دینے والا اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک سچا پیرو اور اس کا عاشق۔

اپنے شیخ، شیوخ حرم کا شیخ اور اکابرین ملّت و صلحائے اُمّت کا منظور نظر تیری ان سب اسلامی خدمات کو دل کی گہرائیوں سے سلام اور ملّت کے ایک جز مسلمانان بھٹکل و آس پاس کی طرف سے نذرانہ تشکر اور ہدیہ تبرک و تحسین۔

اے اللہ کے اس نیک بندہ کو چاہنے والے بھٹکل کے مسلمانوں ذرا اس وقت کو یاد کرو جب آپ کے اس روحانی سرپرست کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے دنیا کے سب سے اعزاز سے نوازا اور گذشتہ سیکڑوں سالوں کے بعد ہوئی تجدید

تعمیر کعبۃ اللہ کے بعد شیخ بن باز اور عالم اسلام کے چوٹی کے علماء کی موجودگی میں کلید کعبہ اس کو سونپ کر ہم سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا اور اس کو کعبۃ اللہ کی نئی تعمیر کے بعد پوری دنیا کی ۶ ارب انسانی آبادی میں سب سے پہلے داخل ہونے والے شخص کا شرف بخشا۔

اینی سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء۔

ذرا اس وقت کا بھی تصوّر کیجئے جب امام کعبہ شیخ عبدالرحمٰن السدیس منبر حرم سے جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہہ رہے تھے کما قال سماحۃ شیخنا العلامہ ابوالحسن علی الحسینی الندوی حفظہ اللہ اور مولانا خود حرم کے ایک کونہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کے بازو میں موجود بدو عرب کو پتہ بھی نہیں تھا کہ آج اس کو دنیا کی کتنی عظیم المرتبت شخصیت کی صحبت نصیب ہے جس کا نام کعبۃ اللہ کے منبر سے گونج رہا ہے اور دنیا کے کروڑوں مسلمان اس کو ٹی وی اور ریڈیو پر سن رہے ہیں۔

آج پھر ایک بار اس شہر اور اس جامعہ میں آپ کی چودھویں بار آمد پر آپ کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہوئے اسی خدائے بزرگ و برتر کا شکر بجالاتے ہیں جس نے آپ کے دل میں ہماری محبّت ڈالی۔ یا بار الہا! تیرے اس نیک چہیتے بندہ کی سرپرستی ہم پر اور ملّت اسلامیہ پر تا دیر سلامت رکھ کہ اس کا محض وجود ہی ملّت پر آنے والے بے شمار مسائل و مصائب کو روکے ہوئے ہے۔ اس کو تا دیر سلامت رکھ اور عمر نوح عطا فرما۔

——— ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد ———

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مدیر البعث الاسلامی
و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کی کتاب

رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام

۱۹۵۵ء مطابق ۱۳۷۵ھ میں دمشق کے مشہور عالم وداعی اور مصنف ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی رحمہ اللہ کی کوششوں کے نتیجہ میں دمشق یونیورسٹی میں شریعت کالج (فیکلٹی آف دی شریعہ) کا افتتاح عمل میں آیا اس میں داخلے کے لیے ندوۃ العلماء کے ہونہار طلبہ کو بھی دعوت دی گئی، اور اس کے لیے تین طالب علموں کا انتخاب ہوا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء کے روح رواں اور ڈاکٹر سباعی کے مخلص دوستوں میں تھے، اس لیے داخلہ اور وہاں جاکر ہر طرح کی تعلیمی سہولتوں کے حاصل کرنے میں ان لوگوں کو کوئی دشواری نہیں پیش آئی، اور اس طرح ندوہ اور شام یونیورسٹی کے درمیان ایک ثقافتی، علمی اور دینی رشتہ پہلی مرتبہ قائم ہوا۔

اسی اثناء میں سباعی صاحب کا مفصل خط حضرت مولانا کے پاس آیا، اس میں انھوں نے شام یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعہ کھلنے کی خوشخبری کے ساتھ یہ بھی اطلاع

دی تھی کہ کالج کی کمیٹی نے ان کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی ہے کہ میں وہاں کچھ دنوں کے لیے مدرس کی ذمہ داری قبول کرنے پر آپ کو آمادہ کروں، حضرت مولانا نے ہندوستان میں دعوت اسلامی کے کاموں کی ضرورت کے پیش نظر اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر فرمائی لیکن ایک محدود وقت کے لیے کسی منظم طریقے سے مقالات پڑھنے کی تجویز پیش کی جس کو کالج کی کمیٹی نے منظور کرلیا، اور استاذ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) کی حیثیت سے صدر جمہوریہ شکری القوتلی نے منظوری دیدی، حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "ڈاکٹر مصطفی السباعی نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۵۵ء میں اس منظوری کی اطلاع دی، اور میری اس تجویز کو منظور بھی کرلیا، کہ میں تاریخ اسلام کی عہد آفریں وانقلابی، اصلاحی وتجدیدی کوششوں، اور ان کی اہم شخصیتوں پر لکچر دوں گا، میں نے اس موضوع کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس عنوان پر میں کالج اور یونیورسٹی کے نوجوان طلباء اور فضلاء واساتذہ کے سامنے اپنے تاریخ کے مطالعہ کا وہ نتیجہ اور ماحصل پیش کرسکوں گا جو اس تاریخ ساز سرزمین میں ان کو نئے سرے سے دینی فکر وعمل اور اصلاح وانقلاب حال پر آمادہ کرسکے اور ایک مہمیز کا کام دے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"میں اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے ایک ترقی یافتہ عرب ملک (شام) کی ایک مؤقر دانش گاہ کی طرف سے ایسی دعوت آنے پر بڑی مسرت ہوئی، اور میں نے اس کو ایک علمی اعتماد اور اعزاز کے مترادف سمجھا۔"

(کاروان زندگی ج اول ص ۴۱۹ — ۴۲۰)

مقالات عربی زبان میں پیش کرنے تھے، اس لیے ان کی تیاری کے لیے وقت

درکار تھا، یہ کام خاصا توجہ طلب اور پورے انہماک کے ساتھ مشغولیت کا متقاضی تھا، اس لیے بغیر کسی تاخیر کے اس کام کی ابتدا ہو گئی اور "رجال الفکر والدعوۃ" کے نام سے محاضرات کی تیاری کا سلسلہ شروع ہوا اور تاریخ دعوت وعزیمت کے طرز پر عربی زبان میں یہ تحقیقی دستاویز لکھنے کے لیے حضرت مولانا نے اپنی تمام مصروفیات کو مؤخر کر کے پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی، اور مرکز دعوت وتبلیغ کچہری روڈ میں جہاں آپ کا قیام تھا اپنا تالیفی عمل شروع کر دیا۔ اور اس کے لیے مطلوبہ مراجع بھی کتب خانہ ندوۃ العلماء سے حاصل فرما لیے۔

چونکہ اس جلیل الشان موضوع پر مواد فراہم کرنے اور املا وتبییض کے لیے کسی مخلص اور خوش خط لکھنے والے ایسے شخص کی ضرورت تھی جو نہ صرف امتثال حکم کے طور پر بلکہ پورے جذبے اور شوق سے اس کام میں حصّہ لے، اس کے لیے نظر انتخاب مجھ خاکسار پر پڑی، اس وقت میں دار العلوم میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا اور "البعث الاسلامی" جو ابھی چند مہینے پہلے نکلا تھا، اس میں تحریر وادارت کے فرائض بھی اپنے مخلص دوست مولانا سید محمد الحسنی صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ مل کر انجام دیتا تھا، اس لیے اس کام کے انجام دینے میں الحمد للہ کوئی دشواری نہیں پیش آئی، اور روزانہ دار العلوم کی مسجد میں نماز فجر ادا کر کے دسمبر اور جنوری کی سردیوں میں تیز قدموں کے ساتھ مرکز کی طرف روانہ ہو جایا کرتا تھا، اور حسب الحکم لکھنے یا مسودہ کی تبییض کرنے یا کسی کتاب سے موضوع کے متعلق عبارت پڑھنے میں مشغول ہو جایا کرتا تھا، یہ سلسلہ کم وبیش ایک ماہ تک چلتا رہا، اور "رجال الفکر والدعوہ" کے عنوان سے تقریباً آٹھ محاضرات عربی زبان میں تیار ہو گئے، اور یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی کہ تاریخ اسلام کے اس موضوع پر، جس میں اصلاح

و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتوں اور ان کے تجدیدی کارناموں کا احاطہ ہو اور اسلامی تاریخ کے سلسلے کی ایک بہت ہی اہم کڑی ہے، تاریخ کے اس تسلسل کو قائم رکھنے کی طرف بہت کم لوگوں کی نظریں گئیں، اور تاریخ اسلام کے تجدیدی عہد میں جابجا خلاء قائم رہا، اس کے نتیجے میں خود مسلمانوں کی صفوں میں اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرف بدگمانی اور مایوسی کے آثار نظر آنے لگے اور امت اسلامیہ بڑی حد تک انحطاط اور اسلام کی ابدی حقیقت، اور اس کے زندہ جاوید اصولوں سے مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی، حضرت مولانا نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے، جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلاء ہے جس کو جلد پُر ہونا چاہیئے، اس خلاء کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل خلاء ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں یا کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنھوں نے حالات سے کشمکش لی، اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی تھی، صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷۔۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت وصلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت وعزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے، اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے، جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ؛؛

چنانچہ اس کتاب کے لکھنے کا خاص مقصد اسلام کی تیرہ سو برس پر پھیلی ہوئی اصلاحی تاریخ میں اصلاح ودعوت کے عمل اور اس کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا، نمایاں اسلامی شخصیتوں اور تحریکوں کی نشاندھی کرنا، اور یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام اسی طرح تروتازہ اور مکمّل شکل میں موجود ہے، جس طرح وہ نازل ہوا تھا، اور مسلمان آج بھی ایک ممتاز اُمّت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کتاب کی ترتیب وتصنیف میں جن خاص اور اہم پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ خود حضرت مولانا کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) "کسی دعوت یا شخصیت کے حالات کو معلوم کرنے کے لیے عموماً اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے۔ اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور خلاء رہ گیا تو اس کے رفقاء وتلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات وبیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گردوپیش، اس زمانہ کی علمی وفکری

سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور اس کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لاکر اپنے زمانہ کے پیغاموں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا، ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے، جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لیے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جا سکتا ہے، ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مؤرخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جا سکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جا سکتی۔

(۳) کسی صاحب دعوت یا مصنّف اور مفکّر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطف صحبت اور شرف ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحب دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحاب فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان

کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لیے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصّہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ، اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا ہے، اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت، خاص اسی ماحول میں گزارے، اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہم نشینوں پر طاری ہوئی تھیں، اس کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے، اور اس کو زبان میں بھی تغیر اور صاحب ترجمہ کی زبان و ادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقّاد کی نگاہ میں قابل اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس کے نزدیک مؤرخ کو اپنے قلم کی طرح "چوب خشک" اور ناقل بے ضمیر ہونا چاہیئے تو مصنّف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلّق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہل دعوت و اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاص مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوق عمل کا

حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متأخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لیے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد اول)

کتاب میں اسلامی تاریخ کی جن عظیم الشان اور مثالی شخصیتوں کا تذکرہ مذکورہ بالا اہم ترین پہلوؤں کی رعایت کرتے ہوئے کیا گیا ہے وہ پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے شروع ہو کر تیرہویں صدی ہجری کے مصلح امام ہجرت و جہاد سید احمد شہید رحمۃ اللہ کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ سرگرمیوں تک پہنچتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ کتاب کی پہلی جلد میں پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ قرن اوّل کی سب سے اہم ترین شخصیت کے طور پر نہایت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، ان کے منصب خلافت پر فائز ہونے سے قبل عہد اموی میں جو جاہلی رجحانات اور اخلاقی بیماریاں معاشرے میں پیدا ہو گئی تھیں، ان کا تفصیل کے ساتھ تاریخی دلائل کی روشنی میں بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان عظیم ہستیوں کے متعلق تاریخی شواہد کی روشنی میں، تاریخ نویسی کی اس بے مثال کوشش کا ادب کے تناظر میں کوئی جائزہ لیں، مصنّف مدظلہٗ نے اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل کے عنوان سے کتاب کے مقدّمہ کے طور پر جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ

بھی پیش کریں۔

سب سے پہلے "زندگی متحرک و تغیر پذیر ہے" کے ذیلی عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو لفظ بلفظ پڑھنے اور ہر لفظ پر غور کرنے اور اس سے زندگی کا صحیح تصوّر اخذ کرنے کی ضرورت ہے، اس مختصر سی عبارت میں ایک طرف اسلام کے دین کامل ہونے اور دوسری طرف زندگی کے رواں دواں متحرک اور تغیر پذیر ہونے کی حقیقت کا بیان زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ نہایت مؤثر ادبی اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے، اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے، اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[1] آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر لیا"

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے، اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے،

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے اس کی بنیاد

---

[1] سورۃ المائدہ ۔ ۳

اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہو، اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے، ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ، "یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا، (۱) صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (۲) کاری گری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔" (تاریخ دعوت و عزیمت ج اول)

اُمّت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُراز تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ اُمّت آخری اور عالمگیر اُمّت ہے اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس اُمّت کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری اُمّت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پُراز تغیرات اور پُراز انقلاب ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

کتاب کے اس مقدمہ کے دوسرے عناوین پر نظر ڈالنے سے اور ان کا مطالعہ

---

(۱) سورۃ الانعام ۱۲ (۲) سورۃ النمل ۸۸

کرنے سے تاریخ اسلام میں اصلاح وتجدید کی ضرورت اور اس کے تسلسل کا نقشہ کھل کر سامنے آجاتا ہے، مثلاً، اسلام کے بقا کے لیے غیبی انتظامات، اور اسلام کے قلب و جگر پر ایسے حملے کہ کوئی دوسرا مذہب اس کی تاب لانے سے قاصر ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کا فقدان، اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف میں جن تحریفات کا شکار ہوئی اس کی نظیر اس دور کے مذاہب کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، اس حقیقت کو مولانا نے دلائل وشواہد کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے!

"وہ یعنی مسیحیت ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہوگئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار وخیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مترادف تھی جس میں پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول وعمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں ومسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے، اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا

کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کی پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب ایسانی (ESSENIO) کا داعی تھا ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیح کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں، حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے[۵]۔"

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفاء اور متبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علاحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے

۵؎ ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY - P. 128

بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط رُخ اور اس کے انحراف کے خلاف بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بارآور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:۔

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلاکسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی۔"[1]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چرچ کی اصلاح کی کوئی جامع تجویز بروئے کار لانے کی ان مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے۔"[2]

• سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متعدد اور بعض

---

[1] ENC. BRITTANICA-ED. IX VOL. XX P. 320 ARTICLE BY J.B. MULLINGER. [2] ایضاً ص ۳۲۱

بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثنا ان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا[1]۔

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، جو کلیسا کے خرافات واوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لیے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادّیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل، اس کی روشنی میں ممکن ہوا، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا۔

---

[1] ایضاً ص ۳۲۱

دنیا کا کوئی زندہ مذہب اشخاص کی نمائندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس میں نئے فتنے اور نئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی شخصیت اور طاقت کی ضرورت ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب بھی اسلام کے قلعہ پر حملہ ہوا اور اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو پردۂ غیب سے کسی ایسی طاقت کا ظہور ہوا جس نے ان تمام حملوں اور فتنوں کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔

کتاب کا مقدمہ دراصل ایک اہم علمی اور تاریخی دستاویز ہے جو اپنے اختصار کے باوجود پوری ایک ضخیم کتاب کی افادیت اور اس کی روح کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے، اس کے پڑھنے سے اسلام کی ابدیت، اس کے خلود اور ناقابل تنسیخ دین کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اور کتاب کے اندر جن شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا بلند مقام ان کی اثراندازی ان کے تجدیدی کارنامے دین کی اساسی ضرورتوں اور اس کے بنیادی مقاصد میں ہر حال میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

قرن اوّل کے سب سے پہلی شخصیت حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں سے اس سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے، خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ میں قدیم جاہلی رجحانات ابھر آئے تھے اور حکومت اپنے اصل محور اور مرکز یعنی کتاب و سنّت سے منحرف ہو کر عربی سیاست اور ملکی مفادات کے اردگرد گردش کرنے لگی تھی، رنگ و نسل اور زبان و ادب اور رنگ و خون کی عصبیت پھر ایک دفعہ سر اٹھانے لگی تھی، اسی کے ساتھ اقربا پروری ایک فن کی شکل اختیار کر گئی تھی، اور اخلاص و احتساب کا تصوّر بڑی حد تک زائل

ہوچکا تھا مادی نفع اندوزی رشوت خوری اور دیگر اخلاقی کمزوریاں منظر عام پر آگئی تھیں، اور وہ اسلامی ماحول یکسر بدل گیا تھا، لوگ جاہلیت اولی کی طرف لوٹنے لگے تھے، اس وقت کی دینی عظیم شخصیتوں میں حضرت علی بن حسن زین العابدین اور دیگر فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ المحض اور دوسرے تابعین کرام حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر حضرت سعید بن مسیّب حضرت عبداللہ بن زبیر اپنے دینی نمونے اور مثالی شخصیت کے اثرات کو قائم رکھنے میں کامیاب تھے، لیکن حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے وہ حکام اور حکومت کے اہل کاروں کی اصلاح سے بڑی حد تک مایوس تھے، خصوصاً جبکہ موروثی حکومت نے اصلاح وتجدید کے سارے دروازے بند کردیئے تھے اور ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظام حیات کی حیثیت سے دوبارہ مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور معاشرے میں نئی جان ڈالنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا، ظاہر ہے یہ صورتحال ایک غیر فطری اور ناقابل بقا تھی اور اس کو بدلنے اور نئے سرے سے اسلامی روح کو بیدار کرنے کی ضرورت ایک ناگزیر تاریخی ضرورت بن گئی تھی۔

اس اہم ضرورت کو پوری کرنے کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ذات گرامی کو اللہ تعالیٰ نے بطور ایک معجزے کے ظاہر فرمایا، وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچازاد بھائی تھے اور ان سے پہلے ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر مقرر تھے، وہ ایک صاحب ذوق نفیس طبع نوجوان تھے اور ان کے اندر اس طرح کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے تھے کہ وہ سلیمان بن

عبدالملک کے جانشین خلافت بن سکتے ہیں، مگر حالات کی مجبوری کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رجاء بن حیوہ کے مشورہ سے خلیفہ وقت بن گئے اور زمام حکومت کو پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اللہ کا نام لے کر سنبھال لیا اور بغیر کسی تاخیر کے اصلاح و تجدید کا کام شروع کر دیا، خود ان کی زندگی کے اندر زبردست تبدیلی آئی، سنّت کا اتباع اور دنیاوی منافع سے بے رخی اور صحیح دین کو غالب کرنے کی کوشش اور اپنے تمام مال و متاع کو مسلمانوں کے بیت المال میں وقف کر دینے کے ساتھ لباس و طعام میں کفایت شعاری اور اپنے اہل خاندان کو قناعت اور زہد کی تلقین اور سب سے بڑھ کر پاکبازی، تقویٰ اور خوف خدا ان کا سب سے بڑا امتیاز تھا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے بہت سے انقلابی اقدامات کئے اور حکومت کے بنیادی ڈھانچے میں زبردست تبدیلی کی اور حکام اور اہل کارانِ حکومت کے مزاج کو پوری طرح بدل دیا، ان کے انقلابی اقدامات کی مختصر تفصیل مصنّف مدظلہ العالی کی زبان سے سنیے جو حسن ادب اور سحر بیان کا ایک شاہکار نمونہ ہے:-

اصلاحاته الواسعة في نظام الحكم :

ان عظمة عمر بن عبد العزيز وعبقريته ليست محصورة في ورعه وزهادته ـ وهو عظيم في ذلك حقا ، ويستحق ان يسمى عبقريا اذا عرفنا ما كان يحف الملوك من الاغراءات وفرص المتعة ، وما كان يملكه من الحرية المطلقة ـ وليست عظمته محصورة في ما كان يؤاخذ به عماله وأمراؤه من التورع ٠ ان أعظم ما يمتاز به هو انه نظر الى الحكومة نظرة لم ينظرها الا الرسول وخلفاؤه الراشدون ، فقد كانت الحكومة في عهده مقصورة على جباية الاموال وانفاقها في مصالح الدولة ، لا صلة لها بأخلاق الجمهور وعقائده وأخلاق الناس ، ولا شأن لها بالضلالة والهداية وكان الذين يخلفون الرسول الذي ارسل للناس كافة بشيرا ونذيرا

وهاديا باذنه وسراجا منيرا ، كان الذين يخلفون هذا الرسول ، عصابة من جباة الاموال يقيسون كل قضية في هذه الدولة ــ التي كانوا يسمونها الخلافة ــ بالمقياس المالي ، ولا ينظرون الى شيء الا بالناحية المالية ٠

ظهر عمر بن عبد العزيز في هذه الاسرة الحاكمة ، فثار على هذه النظرة وعلى هذه النفسية ، وقال عن الحكومة كلمته المأثورة التي سجلها التاريخ ، ولا أعرف كلمة في التاريخ تبين روح الخلافة الراشدة وما تمتاز به عن الحكومات الزمنية ابلغ من هذه الكلمة . لقد شكا اليه بعض العمال أن اهل الذمة بدأوا يقبلون على الاسلام في عدد كبير وقد فشا فيهم الاسلام ، واصبحت هذه قضية تشغل عقول « الاداريين » ذلك لان الجزية التي يفرضها الاسلام على أهل الذمة ــ ولو كان بمقدار طفيف ، يتضاءل بجانب ما يتمتعون به من حقوق ، وما يعفون عنه من خدمات ــ من أعظم موارد بيت المال ، فاذا أسلم هؤلاء سقطت عنهم الجزية وخسرت مالية الدولة الاسلامية خسارة باهظة ، بلغت هذه الشكوى عاهل الدولة الاسلامية ، فأجاب عنها في هدوء وثقة وكتب اليه « ان الله جل ثناؤه بعث محمدا صلى الله عليه وسلم داعيا الى الاسلام ولم يبعثه جابيا [1] » ٠

وعلى هذا الاساس وعلى هذه النظرة ، قامت دولته ، وهو أساس «الهداية» التي بعث لها النبي صلى الله عليه وسلم ، وبهذه النظرة كان ينظر الى قضايا الحكومة ومصالحها وهي نظرة « المرشد » ونظرة « الداعي » ونظرة خليفة الرسول الهادي ، وذلك مفتاح شخصية عمر بن عبد العزيز الذي نستطيع ان ندخل به الى رحاب هذه الشخصية الفذة في الاسلام ، النذة في الامم ٠

وقد طبق هذا المبدأ على حكومته الواسعة تطبيقا دقيقا ، فاذا تعارضت المصلحة المالية مع مصلحة من مصالح الشريعة ، رجح المصلحة الشرعية والحكم الشرعي على المصلحة المالية ولم يتردد ، يدل دلالة واضحة على ذلك ، وعلى ايمانه بهذا المبدأ ، كتابه الذي كتبه الى عامله على اليمن عروة بن محمد يقول فيه : « أما بعد فانك كتبت الي تذكر انك قدمت اليمن ، فوجدت على أهلها ضريبة من الخراج مضروبة ، ثابتة في أعناقهم كالجزية ، يؤدونها على كل حال ، ان اخصبوا أو أجدبوا ، وحيوا او ماتوا ، فسبحان الله رب العالمين ، ثم سبحان الله رب العالمين ثم سبحان الله رب

---

(١) كتاب الخراج لأبي يوسف ص ٧٥ ٠

العالمين ، اذا أتاك كتابي هذا ، فدع ما تنكر من الباطل الى ما تعرفه من الحق ، ثم ائتنف الحق فاعمل به بالغا بي وبك ، وان أحاط بمهج أنفسنا وان لم ترفع الي من جميع اليمن الا حفنة من كتم ، فقد علم الله أني بها مسرور اذا كانت موافقة للحق والسلام [1] .

وكذلك رفع المكس — وهو مورد عظيم من موارد الحكومة — قال رحمه الله « وأما المكس فانه البخس الذي نهى الله عنه فقال « ولا تبخسوا الناس أشياءهم ولا تعثوا في الارض مفسدين » غير انهم كنوه باسم آخر [2] .

وحط العشور والضرائب التي فرضتها الحكومة ، وقال : « فأما المسلمون فانما عليهم صدقات أموالهم ، اذا أدوها في بيت المال كتبت لهم بها البراءة ، فليس عليهم في عامهم ذلك في أموالهم تباعة [3] » .

وفتح طريق البر والبحر للتجارة الحرة ، ومنع الضرائب والمكوس « أما البحر فانا نرى سبيله سبيل البر قال : « الله الذي سخر لكم البحر لتجري الفلك فيه بأمره ولتبتغوا من فضله » فاذن فيه أن يتجر فيه من شاء ، وأرى أن لا نحول بين أحد من الناس وبينه ، فان البر والبحر لله جميعا سخرهما لعباده ، يبتغون فيهما من فضله ، فكيف نحول بين عباد الله وبين معائشهم [4] .

وقد أحدث في مملكته الواسعة اصلاحات واسعة الاثر . فأمر بأن يكون تمام مكيال الارض وميزانها واحدا في جميع الارض كلها ؛ وحرم على العمال وموظفي الدولة ان يتجروا ، فكتبه « ونرى أن لا يتجر امام ، ولا يحل لعامل تجارة في سلطانه الذي هو عليه ، فان الامير متى يتجر ليستأثر ويصيب امورا فيها عنت وان حرص على الا يفعل [5] » وبعد ثمانية قرون جاء ابن خلدون وكتب في مقدمته العظيمة بعد تجارب طويلة ودراسة واسعة ، ما يصدق فراسة عمر بن عبد العزيز الصادقة ، وحكمته البالغة ، قال : « ان التجارة من السلطان مضرة بالرعايا مفسدة للجباية [6] والبلاد التي يحكمها الاوربيون — وهم تجار قبل كل شيء — شاهدة بصدق هذه النظرة » .

---

(١) سيرة عمر بن عبد العزيز ص ١٢٦

(٢) سيرة عمر بن عبد العزيز ص ٩٩

(٣) أيضا ص ٩٨ .

(٤) ص ٩٩ .

(٥) أيضاً ص ٩٩

(٦) مقدمة ابن خلدون ص ١٩٧

وحرم السخرة بأنواعها ــ وهي التي درجت عليها الحكومات . وكان من آثارها الاهرام في مصر ومباني رومة العظيمة ــ فقال « ونرى أن توضع السخر عن أهل الارض ، فان غايتها أمور يدخل فيها الظلم ۱ » .

وكان الامراء ورجال الاسرة الحاكمة قد استحوذوا على قطع واسعة من الارض واتخذوها حمى ، وحرم منها الشعب ، فقال : « ونرى أن الحمى يباح للمسلمين عامة ... وانما الامام فيها كرجل من المسلمين ، انما هو الغيث ينزله الله لعباده فهم فيه سواء ۲ » .

وفطن لامور دقيقة لا تسترعي اهتمام الخليفة ، وعرف منافذ السوء والخيانة فسدها ، منها الهدايا التي كانت تهدى الى العمال ، وكانوا يقبلونها لان قبول الهدايا سنة ، وقد عرف عمر بن عبد العزيز تغير الاوضاع وتغير البيئات ، فحرمها وقال في هدية أهديت اليه ، وقال القائل قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الهدية « هو لرسول الله صلى الله عليه وسلم هدية وهو لنا رشوة ولا حاجة لي به ۳ » .

وقد أصبح الخليفة محجوبا عن الناس لا سبيل لهم اليه ولا سبيل له الى معرفة أحوالهم وما يجري في مملكته ، وقد بنى الحاشية حوله سياجا من حديد لا ينفذ منه اليه الا ما يشتهون وما تسمح به مصالحهم ، أما عمر بن عبد العزيز ، فقد أعلن بالجوائز والمكافأة المالية لمن يخبره بحقيقة الحال ، أو يشير عليه بشيء فيه مصلحة للمسلمين ومصلحة لدولتهم ، وكتب الى أهل المواسم :

« أما بعد ، فأيما رجل قدم الينا في رد مظلمة أو أمر يصلح الله به خاصا أو عاما من أمر الدين ، فله ما بين مائة دينار الى ثلاثمائة دينار ، بقدر ما يرى الحسبة وبعد سفر . لعل الله يحيي به حقا أو يميت باطلا أو يفتح به من ورائه خيرا ۱ » .

ان کی انقلابی اصلاحات کا اردو پیرایۂ بیان

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ واحتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی

---

(۱) سيرة عمر بن عبد العزيز ص ۱۰۰
(۲) ص ۹۷ .
(۳) ص ٦۳ .

روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطۂ نظر بدلا اس وقت تک حکومت محاصل وخراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق وعقائد، سیرت وتربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ :-

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"[1]

حکومت کا مزاج اور نقطۂ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوّت بنا دیا، ان کی ساری مدّتِ خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح ومنافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین واصول واخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمّی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہل کاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلّے اللہ علیہ وسلّم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۵۷

کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں[۱]،
یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی خواہ فصل اچھی ہو یا بُری، حاکم نے اطلاع دی،
آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیئے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے
یمن سے ایک مٹھی غلّہ وصول ہو، میں اس پر راضی ہوں[۲]، چنگی ساری مملکت سے معاف
کردی، اور عمّال کو لکھا کہ وہ بخس ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ — اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو،

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ — اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو

(ہود - ۸۵)

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنالیا ہے[۳]، چند شرعی محاصل کے علاوہ
ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمّال حکومت نے ایجاد
کئے تھے، یکسر معاف کردیئے[۴]، خشکی اور سمندر کے راستوں کو کھولنے کی ہدایت کی، اور ہر
طرح کی پابندیاں اٹھادیں[۵]۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دوررس تھے، ساری مملکت
کے لیے یکساں پیمانے مقرر کئے جس میں فرق نہیں ہو سکتا تھا[۶]، حکام وعمال سلطنت کو تجارت
کی ممانعت کی[۷]، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا[۸]، سلطنت کی زمین کا خاصا رقبہ، امراء اور شاہی
خاندان کے افراد وحکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے لیے گھیر کر بے کار بنا رکھا تھا، حکم دیا

---

[۱] مناقب عمر بن عبدالعزیزؒ، ص ۹۶ (طبع یورپ) [۲] سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۲۶، [۳][۴] ایضاً ص ۹۹، [۵] ایضاً ص ۹۸، [۶][۷] ایضاً ص ۹۹، [۸] ایضاً ص ۱۰۱

کہ وہ عوام کی ملکیت ہے[1]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی، اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا، تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے[2]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہنچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی اچھا مشورہ دے گا، اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا[3]

اعمال واخلاق کی طرف توجہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی نہ فرصت تھی، نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق و رجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ و نصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء و محدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے، جو انتظامی سے زیادہ دینی و اخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ و نصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہد نبوت و خلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظام ایات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے[4]۔ ان خطوط میں وہ امراء اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر

---

[1] ایضاً ص۹۷ [2] ایضاً ص۱۶۲، [3] ایضاً ص۱۴۱ [4] سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن حکم) ص۶۹

نماز پڑھیں، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں[۱]، عمال کو تقویٰ و اتباعِ شریعت کی وصیت فرماتے ہیں[۱]۔

اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں[۲] ان کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس ذریعہ کے ترک ہو جانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے[۳]۔ عمال سلطنت کو سزا و عقوبت میں اعتدال و احتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانون تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں[۴]، پھر سلطنت کے عمومی شہری خرابیوں اور بد اخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں[۶]، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں[۸]۔

نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہو گئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے، جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید و تشریح کرتے ہیں[۹]۔

حکومتی اصلاحات کے ساتھ ساتھ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے علوم دینیہ کی تدوین اور سنّتوں کے احیاء کی طرف بھی توجہ دی اور علماء کے لیے وظائف مقرر کیے تاکہ سکون و اطمینان کے ساتھ اشاعت علم اور تدوین علوم میں مشغول ہو سکیں، اہل کارانِ

---

[۱] ایضاً ص ۷۹، [۲] ایضاً ص ۹۲، [۳] ایضاً ص ۱۳۷، [۴] ایضاً ص ۱۱۶، [۵] ایضاً ص ۸۰، [۶] ایضاً ص ۱۰۸، [۷] ایضاً ص ۱۰۲

سلطنت ومشاہیر علما کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے ایک گشتی فرمان جاری کیا اور لکھا:۔

"انظروا الی حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاجمعوہ"

یعنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کی احادیث تلاش کر کر کے جمع کرو۔

انھوں نے نظام سلطنت کو خالص اسلامی ذہن کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سلطنت کے کارپردازوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو خطوط لکھے، اور جاہلیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ کسی شائبے کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کو پوری طرح متوجہ کیا، حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار حضرت ضحّاک بن عبدالرحمٰن کو مندرجہ ذیل خط لکھا:۔

« أما بعد فان الله جعل الاسلام الذي رضي به لنفسه ومن كرم عليه من خلقه ، لا يقبل الله دينا غيره كرمه بما أنزل من كتابه الذي فرق بين الاسلام وبين ما سواه ، فقال : « قد جاءكم من الله نور وكتاب مبين ، يهدي به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ويخرجهم من الظلمات الى النور باذنه ويهديهم الى صراط مستقيم » ، وقال : « وبالحق أنزلناه وبالحق نزل ، وما ارسلناك الا مبشرا ونذيرا » . فبعث الله محمدا صلى الله عليه وسلم حين بعثه ، وأنزل عليه الكتاب حين أنزله ، وأنتم معشر العرب فيما قد علمتم من الضلالة والجهالة والجهد وضنك العيش وتفرق الدار ، والفتن بينكم عامة ، والناس لكم حاقدون مستأثرون عليكم بالدين ، وليس من ضلالتهم من شيء الا وأنتم على مثله ؛ من عاش منكم عاش فيما ذكرت من الجهل والضلالة ، ومن مات منكم الى النار ، حتى أخذ الله بنواصيكم عما كنتم فيه من عبادة الاوثان والتقاطع والتدابر وسوء ذات البين ، فأنكر منكركم ، وكذب مكذبكم ، ونبي الله عليه السلام يدعو الى كتاب الله والى الاسلام ، ثم أسلم معه قليل مستضعفون في الارض ، يخافون ان يتخطفهم الناس فأواهم وايدهم بنصره ، ورزقهم الله من أذن له بالاسلام والدنيا مقبوضة عنه ، والله منجز لرسوله موعوده الذي ليس له خلف ، فيراه من يراه بعيدا الا قليلا من المؤمنين فقال : « هو

الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون [١] » . وقال في بعض ما يمده المسلمين ان قال : « وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم أمنا يعبدونني لا يشركون بي شيئا [٢] » . فانجز الله نبيه عليه السلام وأهل الاسلام موعودهم الذي وعدهم ، فلم يعطكم يا أهل الاسلام ما أعطاكم من ذلك الا بهذا الذي تفلحون[٣] به على خصمكم ، وبه تقومون شهداء يوم القيامة ، ليس لكم نجاة غيره ، ولا حجة ولا حرز ولا منعة في الدنيا والآخرة ، فاذا أعطاكم الله منه أحسن يوم وعدتموه فارجوا ثواب الله فيما بعد الموت فان الله قال : « تلك الدار الآخرة ، نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين [٤] » . واني أحذركم هذا القرآن وتباعته ، فان تباعته وشروطه قد أصابكم منها أيتها الامة وقائع من هراقة دماء ، وخراب ديار وتفرق جماعات ، فانظروا ما زجركم الله عنه في كتابه فازدجروا عنه ، فان أحق ما خيف وعيد الله بقول او بعمل أو غير ذلك ، فان كان بقول في امر الله فنعما له ، وان كان بقول في غير ذلك فانما يفضي الى سبيل هلكة ، ثم ان ما هاجني على كتابي هذا أمر ذكر لي عن رجال من أهل البادية ، ورجال أمروا حديثا ظاهر جفاؤهم ، قليل علمهم بأمر الله ، اغتروا فيه بالله غرة عظيمة ونسوا فيه بلاءه نسيانا عظيما ، وغيروا فيه نعمه تغييرا لم يكن يصلح لهم أن يبلغوه ، وذكر لي أن رجالا من أولئك يتحاربون الى مضر والى اليمن ، يزعمون انهم ولاية على سواهم ، وسبحان الله وبحمده ما أبعدهم من شكر نعمة الله ، وأقربهم من كل مهلكة ومذلة وصغر ، قاتلهم الله أية منزلة نزلوا ، ومن أي أمان خرجوا ، أو بأي أمر لصقوا ، ولكن قد عرفت أن الشقي بنيته يشقى ، وان النار لم تخلق باطلا ، أو لم يسمعوا قول الله في كتابه ، : « انما المؤمنون أخوة فاصلحوا بين أخويكم ، واتقوا الله لعلكم ترحمون [٥] » . وقوله : « اليوم أكملت لكم دينكم

---

(١) سورة التوبة الآية ٣٤ والصف الآية ٩ .
(٢) سورة النور الآية ٥٥ .
(٣) في مخطوطة ب « تفلحون » ولعل ما هنا اصوب
(٤) سورة القصص الآية ٨٣
(٥) سورة الحجرات الآية ١٠

واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا [۱] » ۰ وقد ذكر لي مع ذلك أن رجالا يتداعون الى الحلف ، وقد نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحلف وقال : « لا حلف في الاسلام قال ـ وما كان من حلف في الجاهلية فلم يزده الاسلام الا شدة ، فكان يرجو أحد من الفريقين حفظ حلفه الفاجر الآثم الذي فيه معصية الله ومعصية رسوله ، وقد ترك الاسلام حين انخلع منه . وانا احذر كل من سمع كتابي هذا ومن بلغه ، أن يتخذ غير الاسلام حصنا ، أو دون الله ودون رسوله ودون المؤمنين وليجة ، تحذيرا بعد تحذير ، واذكرهم تذكيرا بعد تذكير ، واشهد عليهم الذي هو آخذ بناصية كل دابة ، والذي هو أقرب الى كل عبد من حبل الوريد واني لم آلكم بالذي كتبت به اليكم نصحا ، مع اني لو اعلم أحدا من الناس يحرك شيئا ليؤخذ له به أو ليدفع عنه أحرص ـ والله المستعان ـ على مذلته من كان ، : رجلا أو عشيرة ، أو قبيلة ، أو اكثر من ذلك ، فادع الى نصيحتي وما تقدمت اليكم به فانه هو الرشد ليس له خفاء ، ثم ليكون أهل البر وأهل الايمان عونا بالسنتهم ، وان كثيرا من الناس لا يعلمون ۰ نسأل الله أن يخلف فيما بيننا بخير خلافة في ديننا والفتنا وذات بيننا والسلام [۲] » ۰

حمد وصلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لیے اور اپنے بندگان خاص کے لیے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی، اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کردی ہے، ارشاد فرمایا:۔

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۝	تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک
يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ	کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى	رضائے حق کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو

---

۱ سورة المائدة الآية ٤ ۰

۲ سيرة عمر بن عبد العزيز لابن عبد الحكم ص ۱۰۳ وما بعدها ۰

النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ — توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

(المائدہ۔ ۱۵،۱۶)

نیز ارشاد ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا — اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہوگیا، اور ہم نے آپ کو صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

(اسراء ۱۰۵)

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم اے اہل عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی، اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فتنے تمہارے درمیان عام تھے، لوگ تم کو دبائے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا، اس سے بھی تم محروم تھے اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ وجدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچالیا، تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، کہ لوگ انہیں اچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ کو اپنے

رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ	وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ	دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب
الْمُشْرِكُوْنَ ○ (الصف - ۹)	کرے، گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، ارشاد فرماتا ہے کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا	اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ	عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی
لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے
مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ	لئے قوت دے گا، اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل
لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا (نور ۵۵)	بامن کردے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں، میرے
	ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کردیا، اے اہلِ اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو، اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ بنوگے، تمہارے لیے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے، اور نہ کوئی حجت، نہ کوئی بچاؤ ہے اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت، جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دین نصیب کرے گا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے تو موت کے بعد

اللہ کے ثواب کی امید ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ	یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا	جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (سورۃ القصص ۸۳)	متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اِس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لیے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں، اُمّت میں جو خونریزی، جو خانہ ویرانی، جو پراگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رُک جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وعید سے زیادہ کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ بیچارے اجڈ اور جاہل قسم کے لوگ ہیں، احکام الٰہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ رہا ہے اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے، جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور یمن والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حامی اور ولی ہیں، سبحان اللہ وبحمدہٖ! یہ کس قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں ان کو ہلاکت، ذلت وخواری کا کیسا شوق ہے؟ یہ دیکھتے نہیں کہ انھوں نے اپنے لیے کون سا مقام پسند کیا، کس امن وامان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا تعلق پیدا

کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنّم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے، کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ (الحجرات۔۱۰)	مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سُنی ؟:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاط (المائدہ ۳)	آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانۂ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے اور ارشاد ہے "لاحلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور جتھ بندی نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتۂ محالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو........ میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سُنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے شدومد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بناتا ہوں

جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں، اور جو ہر شخص کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اصلاح و تجدید کے میدان میں اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے سلسلہ میں جو کوششیں کیں وہ تاریخ کا ایک اہم ترین جزء ہیں اور اصلاح و تربیت کے میدان میں ایک بے مثال کوشش کے مرادف ہے، تاہم انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی دعوت پیش کی اور غیر مسلم سربراہوں کے نام خطوط تحریر فرما کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری کو پوری کیا، حضرت مولانا نے اپنی کتاب "رجال الفکر والدعوۃ" اور تاریخ دعوت وعزیمت" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے تذکرہ میں بلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" میں درج شدہ کچھ نمونے تحریر فرمائے ہیں، جس میں انھوں نے ہندوستان کے راجاؤں اور مغرب اقصیٰ میں آباد اہل بربر اور ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت دی ہے، لکھتے ہیں:-

"عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے ہندوستان کے راجاؤں کو سات خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا، اور ان کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں،

ان کے اخلاق و کردار کی خبریں وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اس لیے انھوں نے اسلام قبول کیا، اور اپنے نام عربوں ہی کے نام پر رکھے[1]

جب اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولی بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اپنے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا، اور اہل بربر کو اسلام کی دعوت دی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، یہ خط اسماعیل نے مجمعوں میں پڑھ کر سنایا، اور اسلام بالآخر وہاں غالب آیا۔[2]

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۴۷ [2] ص ۴۴۶ [2] ایضاً ص ۲۳۹

اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے، اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کردیا، لیکن جو لوگ اسلام لائے اور ساتھ ہی انھوں نے سرائیں تعمیر کیں، ان کے لیے انعام اور وظیفہ مقرر کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مدت خلافت دو سال پانچ مہینے ہے، اس مختصر سی مدت میں انھوں نے ایک عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا، اور دنیا کے سامنے ایمان وعزیمت اور عفت وپاکبازی، زہد وقناعت اور سب سے بڑھ کر آخرت پر ایمان اور جنت کے شوق اور ہر چھوٹے بڑے کام میں رضائے الٰہی کی پاسداری کا ایک بے مثال نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ ثابت کردیا کہ اصل طاقت قلب وروح میں سمائی ہوئی اللہ کے خوف اور حسن نیت اور احتساب کی وہ طاقت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مادی طاقت نہیں کر سکتی۔ رحمۃ اللہ علیہ وسلامہ علی نفسہ الطاھرۃ الزکیۃ۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ

کتاب میں دوسری صدی ہجری کی اصلاحی کوششوں میں سرفہرست حضرت حسن بصری کی تربیتی اور اصلاحی، دعوتی اور تجدیدی کاموں کا وہ زندہ جاوید عمل ہے جو اسلامی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جاتا ہے، اور ان کے مواعظ ومجالس کا تذکرہ زبان زد خاص وعام ہے۔

مصنف مدظلہ العالی نے حضرت حسن بصریؒ کی شخصیت اور ان کی داعیانہ صلاحیتوں پر اپنی کتاب "رجال الفکر والدعوۃ" میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور ان کی شخصیت کے امتیازی وصف کو تاریخی دلائل سے نہایت مؤثر اسلوب اور ادب وبلاغت کے خوبصورت طرز بیان میں پیش کیا ہے، بہتر تھا کہ کتاب کی عربی عبارت کو اس موقع پر پیش کر کے عربی زبان وادب کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے ادبی شاہکار کے طور پر پیش کیا جاتا، اور بعد میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا، لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے

اور طوالت سے بچنے کے لیے ہم تاریخ دعوت وعزیمت سے اردو میں اس کا خلاصہ مصنّف کے قلم سے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسّر اور مستند محدّث تھے، جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرامؓ کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ سے وہ پورے طور پر باخبر تھے، اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح وبلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے، یا صحابہ کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا ساز بان آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصریؒ اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت ونحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے[1] وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس

[1] دائرۃ المعارف لبستانی ج ۶، ص ۴۴

کہتے ہیں کہ میں دس[۱] برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی[۲]، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا:۔

کان من دراری النجوم علما وتقوی
وزھدا وورعا وعفة ورقة، وفقھا
ومعرفة یجمع مجلسه ضروبا من الناس
ھذا یاخذ عنه الحدیث، وھذا یلقن
منه التاویل وھذا یسمع منه الحلال
والحرام، وھذا یحکی له الفتیا وھذا
یتعلم الحکم والقضاء، وھذا یسمع الوعظ
وھو فی جمیع ذلك کالبحر العجاج تدفقا
وکالسراج الوھاج تالقا ولا تنس مواقفه
ومشاھدہ فی الامر بالمعروف والنھی
عن المنکر عند الامراء واشباہ الامرا
بالکلام الفصل واللفظ الجزل۔[۲]

وہ اپنے علم و تقوی، زہد و ورع و استغناء و عالی ہمتی لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں ستارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے تھے، اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث حاصل کر رہا ہے، ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے، ایک فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتوی پوچھ رہا ہے کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو موجیں لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو پر نور کر رہا ہے، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے روبرو پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہار حق کے واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض

---

[۱] ایضاً [۲] ابو حیان التوحیدی نے اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہے۔

صاحبِ قال اور صاحب کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحب حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے، ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لیے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگر بصرہ میں کوفہ میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو "کلام نبوّت" سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں لکھا ہے کہ "اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصریؒ کا کلام انبیاء علیہم السّلام کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابۂ کرام کے طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا[1]"

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے اور ان کو اُمّت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ اُمّت محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امّتوں کو رشک آنا چاہیئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں، مکّہ معظّمہ ہمیشہ سے عالم اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحب کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکّہ بھی حسن بصریؒ کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا[2]۔

حسن بصریؒ کے مواعظ: حسن بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں،

---

[1] احیاء العلوم الدین ج ۱ ص ۱۶۸ [2] دائرۃ المعارف للبستانی ج ، ص ۶۴۲

ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان وعمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم، طولِ امل اور فریب نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جارہے تھے، انھی مضامین کی ضرورت تھی، انھوں نے چونکہ صحابۂ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لیے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی و عملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہلِ زمانہ پر تبصرہ، صحابۂ کرامؓ کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

هيهات هيهات اهلك الناس الأماني	ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وايمانٍ	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا يقين، مالي ارى رجالاً ولا ارى	مگر (اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے) صبر نہیں، ایمان ہے
عقولاً واسمع حسيساً ولا ارى انيساً،	مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ نایاب
دخل القوم والله ثم خرجوا وعرفوا	آنے جانیوالوں کا شور ہے مگر ایک بندۂ خدا ایسا نظر
ثم انكروا وحرموا ثم استحلوا، انما دين	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر

احدکم لعقة علی لسانه
اذا سئل أمؤمن انت
بیوم الحساب ؟ قال
نعم اکذب ومالك
یوم الدین، ان من اخلاق
المؤمنین قوة فی دین وایمانا فی یقین
وعلما فی حلم وحلما بعلم وکیسا فی
رفق وتجملا فی فاقة وتقصدا فی غنی
وشفقة فی نفقة ورحمة للمجهود، وعطاء
فی الحقوق، وانصافا فی استقامة لایحیف
علی من یبغض ولا یاثم فی مساعدة من
یحب ولایهمز ولایغمز ولایلمز ولایلغو
ولا یلهو ولا یلعب، ولا یمشی بالنمیمة
ولا یتبع مالیس له ولا یجحد الحق الذی
علیه، ولا یتجاوز فی العذر ولا یشمت
بالفجیعة ان حلت بغیره ولا یسر
بالمعصیة اذا نزلت بسواه، المؤمن
فی الصلوة خاشع والی الرکوع مسارع
قوله شفاء وصبره تقی وسکوته فکرة

نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان
لیا پھر مکر گئے، انھوں نے پہلے حرام کیا پھر
اسی کو حلال کرلیا، تمہارا دین کیا ہے ؟
زبان کا ایک چٹخارہ ! اگر پوچھا
جاتا ہے کیا تم روز حساب
پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں! قسم
ہے روز جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو
یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان ویقین
ہو، اس کے علم کے لئے حلم اور اس کے حلم کے لئے علم باعث
زینت ہو، عقلمند ہو لیکن نرم خو، اس کی خوش پوشی
اور ضبط اس کے فقر وافلاس کی پردہ داری کرے،
دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے
پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں
رحیم وکریم، حقوق کی ادائی میں کشادہ دست وفراخ دل،
انصاف میں سرگرم وثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے
حق میں زیادتی نہ ہونے پائے کسی سے محبت ہو تو اس کی
مدد میں حد شریعت سے نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چینی کرتا ہو،
نہ طنز واشارہ، نہ طعن وتشنیع، نہ لایعنی سے اس کو کچھ کام
ہو، نہ لہو ولعب سے دلچسپی، چغلخوری نہیں کرتا، جو اس کا حق

ونظرته عبرة، يخالط	نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا جو اس پر واجب آتا ہے
العلماء ليعلم ويسكت	اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد سے نہیں بڑھتا
بينهم ليسلم ويتكلم	دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
ليغنم ان احسن استبشر	معصیت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو نماز
ان أساء استغفر وان	میں خشوع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے، اس کا کلام
عتب استعتب، وان سفه	شفا کا پیام، اس کا صبر تقوی، اس کا سکوت سراسر
عليه حلم، وان ظلم	غور و فکر اس کی نظر سراپا درس و عبرت ہے، علما کی صحبت
صبر وان جير عليه	اختیار کرتا ہے علم کی خا [illegible] ش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہ
عدل ولا يتعوذ بغير الله	اور گرفت سے محفوظ رہے بولتا ہے تو اس لئے کہ کچھ (ثواب) کمائے
ولا يستعين الا بالله	اور فائدہ حاصل کرے، نیکی کرکے اس کو خوشی ہوتی ہے، غلطی
وقور في الملاء	ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے، شکایت کرتا ہے اور اس کے
شكور في الخلا، قانع	دل میں کسی کی طرف سے رنج آتا ہے تو معافی تلافی کر لیتا ہے، اس سے
بالرزق، حامد على	کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے، ظلم
الرخاء، صابر على البلاء	کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے، کوئی اس کے حق میں ناانصافی
ان جلس مع الغافلين	کرے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی
كتب من الذاكرين	کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتا، مجمع
وان جلس مع الذاكرين	میں باوقار، تنہائی میں شکر گذار، رزق پر قانع، آرام و عیش
كتب من المستغفرين،	کے زمانہ میں شاکر، مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر،
هكذا كان	غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شاغل،

اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الاوّل فالاوّل حتی لحقوا باللہ عزّ وجلّ وھکذا کان المسلمون من سلفکم الصالح وانّما غیّر بکم لما غیّرتم۔[1]

یہ تھی شان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اپنے درجوں اور مرتبہ کے مطابق، جب تک دنیا میں رہے، اسی شان سے رہے، اور جب دنیا سے گئے تو اسی آن بان سے گئے، مسلمانو! تمہارے سلف صالحین کا یہ نمونہ تھا، جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا تو اللہ نے بھی تمہارے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْءً فَلَا مَرَدَّ لَہٗ وَمَا لَھُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک کہ لوگ خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کرتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں، اور کوئی خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا۔

ایک دوسرے موقع پر صحابۂ کرامؓ کو یاد کرتے ہوئے اور سورۃ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا:

انّ المؤمنین لما جاءتھم ھذہ الدعوۃ

مومنین (اوّلین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار

---

[1] الحسن البصری لابن الجوزی

من الله صدقوا بها وافضى يقينها الى
قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم
وابصارهم كنت والله اذا رأيتهم
رأيت قومًا كأنهم رأى عين والله
ماكانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم
جاءهم امر عن الله فصد
قوا به فنعتهم الله فى القرآن
احسن نعت فقال وَعِبَادُ
الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَالهون فى كلام العرب
اللين والسكينة والوقار"
وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ
قَالُوْا سَلَامًا" حلماء لا
يجهلون وان جهل عليهم
حلموا يصاحبون عباد الله
نهارهم بما يسمعون
ثم ذكر ليلهم خير ليل
فقال "وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ

پہونچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی، اور
اس پر لبیک کہا، اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں
اتر گیا، ان کے دل، ان کے بدن، اور ان کی نگاہیں خدا کی
عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں، بخدا میں جب ان کو
دیکھتا تو صاف معلوم ہوتا کہ دینی حقائق، اور غیب کی باتیں
گویا ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں، ان کو بحث و مباحثہ
اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز
پہونچی، اور انھوں نے مان لی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید
میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
"رحمٰن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ
چلتے ہیں" آیت میں "ھونًا" کا لفظ آیا ہے، ھَوْن
کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں، پھر
فرمایا "اور جب ان سے بے سمجھ لوگ باتیں کریں تو کہتے ہیں سلام
ہے" یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں، جہالت پر نہیں اترتے، اور
اگر کوئی دوسرا جہالت پر اتر آئے تو ان کے حلم و وقار میں
فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کی
بات سننے کے لئے دن گذارتے تھے، پھر ان کی بڑی اچھی
راتیں گزرتی تھیں، جن کی اللہ تعالیٰ خود تعریف کرتا ہے اور
وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدہ میں اور کھڑے ہو کر رات

لربهم سجدا وقياما،
ينتصبون لله على اقدامهم
ويفترشون وجوههم
سجدا لربهم تجري دموعهم على
خدودهم فرقا من ربهم لامرما
سهروا الليل ولامرما خشع انهارهم
قال الذين يقولون ربنا اصرف
عنا عذاب جهنم ان عذابها كان
غراما" وكل شيء يصيب ابن آدم ثم
يزول عنه فليس بغرام، انما الغرام
اللازم له مادامت السموت والارض
صدق القوم والله الذي لا اله الا هو
فعملوا وانتم تمنون، فاياكم وهذه
الاماني رحمكم الله فان الله لم يعط
عبدا بامنيته شيئا في الدنيا والآخرة۔[1]

گزارتے ہیں" واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے، چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدہ میں پڑ جاتے، ان کے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا خوف ان کی آنکھوں کو اشکبار رکھتا، آخر کوئی تو بات تھی جس کے لئے وہ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے، کوئی تو بات تھی جس کے باعث وہ دن میں سہمے سہمے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے بیشک اس کا عذاب بڑا تاوان اور بلائے جان ہے" آیت میں غرام کا لفظ آیا ہے جو مصیبت انسان کو لاحق ہو اور ٹل جائے اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت ہے جو قیامت تک انسان کے سر سے نہ ٹلے، قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں) سچے اور پکے ثابت ہوئے اور جو انھوں نے زبان سے کہا تھا اس پر عمل کیا، لیکن افسوس تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو لوگو! ان خالی تمناؤں سے باز آؤ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی بندے کو محض اس کی تمنا پر دنیا و آخرت کی کوئی چیز نہیں عطا فرمائی۔

---

[1] قیام اللیل ص۱۳ (محدث محمد بن نصر مروزی تلمیذ امام احمد بن حنبل)

اس تقریر کے آخر میں فرمایا (اور اکثر مواعظ کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

دوسری صدی میں حسن بصریؒ کے بعد سب سے زیادہ نمایاں اور پرکشش شخصیت امام احمد بن حنبلؒ کی ہے، جس وقت آپ اپنے زمانہ میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے اور اس وقت اسلامی معاشرے کے لیے آپ نے اپنے علمی اور عملی کارناموں سے قلب و روح کی تسکین کا سامان فراہم کیا اس وقت فلسفہ الٰہیات و ذات صفات باری کی بحثیں ہر طرف جاری تھیں، اور سادہ لوح عوام کو ان بحثوں میں الجھا کر ان کی اصل توجہ کو اپنے مرکز سے ہٹا کر فتنوں کی خاردار وادیوں میں مبذول کر دی گئی تھی، اسی زمانہ میں معتزلہ کا ظہور شدت سے ہوا اور فتنہ خلق قرآن ایک بڑی آزمائش کی شکل میں امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے آیا اور اس کی وجہ سے ان کو زبردست امتحان سے گزرنا پڑا، لیکن انھوں نے اپنی بے مثال عزیمت و استقامت سے بفضل ایزدی تمام آزمائشوں کو صبر و شکر کے جذبہ کے ساتھ جھیل لیا اور ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، حضرت مولانا مدظلہٗ العالی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلاء میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی

اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دوبالا ہوگئی، ان کی محبت اہل سنّت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قتیبہ کا مقولہ ہے کہ:

"اذا رأیت الرجل یحب احمد بن حنبل فاعلم انه صاحب سنة"[۱] (جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو امام احمد بن حنبل سے محبت ہے تو سمجھ لو کہ یہ سنّت کا متبع ہے۔")

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

"من سمعتموه یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتهموه علی الاسلام"[۲] جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

ولیس سر عبقریة احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبل کی عبقریت کا راز
فی دفاعه عن عقیدة من	صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے
عقائد الاسلام، وانتصاره لها	اسلام کے اس عقیدے کا زبردست
وفضله ذلك لاینكر - ولكن	دفاع کیا اور اس کو قائم رکھنے کے
مآثره الكبرى التي اكتسبته	لیے سب کچھ برداشت کیا، بلکہ ان
منصب التجديد، هو انه	کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی وجہ سے
وقف سداً منيعاً في اتجاه	ان کو منصب تجدید حاصل ہوا وہ یہ
هذه الأمة الى التفكير	ہے کہ انھوں نے امت کو عقلی فلسفہ

---

[۱] تاریخ اسلام الذهبی، ترجمہ الامام احمد ص ۱۶   [۲] تاریخ بغداد للخطیب جلد ۴ ص ۴۲۱

الفلسفی المتهور- الذی لوسیطر علی هذه الامة لانقطعت صلتها بالتدریج عن منابع الدین الاولی، وعن النبوة المحمدیة، وخضعت هذه الامة للفلسفات واصبحت عرضة للآراء والقیاسات وانتصرت الحکومة علی الشعب والسیاسة علی الدین انتصاراً مؤیداً، وسلبت حریة الرأی والعقیدة۔[1]

کے شتر بے مہار سے نجات دلادی، اس لیے کہ اگر یہ فلسفہ اُمّت کے عقل وفہم پر غالب آجاتا تو اس کا رشتہ بتدریج دین کے بنیادی سرچشموں سے کٹ جاتا، اور نبوت محمدیہ کی شاہراہ سے وہ دور جا پڑتی، اور پھر مادی فلسفوں کا سلسلہ اس امت پر چھا جاتا، اور وہ قیاس وتخمین کا شکار ہو جاتی اور حکومت عوام پر غالب آجاتی، اور سیاست دین پر اور عقیدے اور رائے کی آزادی سلب ہو جاتی۔

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے متبعین:

خلیفہ متوکل کے مسند اقتدار پر آنے کے بعد اگرچہ فتنہ اعتزال کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی اور معتزلہ کا دور دورہ بڑی حد تک مایوسی کا شکار ہو گیا تھا، لیکن معتزلہ کا علمی وقار اور ان کے اثرات ابھی بھی علمی حلقوں میں مقبول ہو رہے تھے اور تیسری صدی کے وسط میں عام طور پر یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر وسیع الفکر اور محقق ہوتے

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب جلد ۷ ص ۴۲۱

ہیں، اور ان کی علمی تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں شریعت کے علوم سے بے توجہی اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی، اور بہت سے علماء احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے، ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کتاب و سنّت کی عظمت کے لیے سخت خطرناک تھی، اور اسلامی عقائد کی ہیبت اور احکام شریعت کی اہمیت دلوں سے محو ہونے لگی تھی، اس اعتزالی سیلاب کو روکنے کے لیے اللہ تبارک وتعالی نے امام ابوالحسن اشعری کو تیار کیا، جو اپنے ابتدائی دور میں معتزلہ سے متاثر ہو کر ان کے خیالات کی ترجمانی کرنے لگے تھے، تقریباً چالیس برس تک مذہب اعتزال اور اس کے عقائد کی پشت پناہی کرنے کے بعد مزید تحقیق و مطالعہ کے نتیجے میں ان کا ذہن پھر گیا اور معتزلہ کے خلاف ان کے دل میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے، اور ایک مختصر مدّت تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ اور جس دن وہ گھر سے نکلے جمعہ کا دن تھا جامع مسجد نمازیوں سے (جن میں علماء، صلحاء، فقہاء، سبھی لوگ موجود تھے) بھری ہوئی تھی، منبر پر چڑھ کر بآواز بلند اعلان کیا اور فرمایا، جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا اور فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں، اور اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوری اور غلطیوں کو بیان کرنا ہے[۱]

امام اشعری کا مسلک اور ان کی خدمات کے عنوان سے مصنّف مدظلہ العالی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ہدیہ سامعین وناظرین ہے۔

---

[۱] ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۴۷

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جا سکے، نہ وہ بعض پرجوش محدثین و حنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم" اس میں جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے

ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی. "کتاب الابانة عن اصول الدیانة" میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

اَمّا بعد فانّ من الزائغین عن الحق	حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة واهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
اهواءهم الی تقلید رؤسائهم ومن مضی	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من اسلافهم فتاولوا القرآن علی آرائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تاویلا لم ینزل الله به سلطانا ولا اوضح	ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهانا ولا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ

رب العالمین ولا عن السلف المتقدمین۔[1] | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

قولنا الذی نقول بہ ودیانتنا التی ندین بہا التمسک بکتاب ربنا عز وجل وبسنۃ نبینا علیہ السلام وما روی عن الصحابۃ والتابعین وائمۃ الحدیث ونحن بذلک معتصمون وبہ کان یقول بہ ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل نضر اللہ وجہہ ورفع درجتہ واجزل مثوبتہ قائلون ولما خالف قولہ مخالفون لانہ الامام الفاضل والرئیس الکامل الذی بان اللہ بہ الحق ورفع بہ الضلال و وضح بہ المنہاج وقمع بہ بدع المبتدعین وزیغ الزائغین وشک الشاکین فرحمۃ اللہ علیہ من امام مقدم وخلیل معظم مفخم[2]

ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک جس پر ہم قائم ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ رسول کو مضبوط پکڑا جائے، اور صحابہ و تابعین اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (اللہ ان کے چہرہ کو تر و تازہ رکھے، اور ان کے درجات بلند فرمائے، اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل و معتقد ہیں، اور جو ان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم اس سے علیحدہ ہیں، اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل اور پیشوائے کامل تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور صراطِ مستقیم کو روشن کیا اور مبتدعین کی بدعات، اہل زیغ کی کجروی، اور اہلِ شک کے شکوک کا ازالہ کیا، اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

---

[1] کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۸، طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد۔ [2] ایضاً ص۸

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنّت اور عقیدۂ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کر ہی رہے تھے ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انھیں کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

امام غزالی کی شخصیت اور ان کا کارنامہ

فلسفہ یونان کی بڑھتی ہوئی یورش اور علم کلام سے بے رخی اور بے تعلقی بہت سے فتنوں کا سبب بنی جن میں سب سے بڑھ کر باطنیت کا فتنہ تھا، جس نے ظاہر و باطن کا مغالطہ دیا اور اسلام اور تعلیمات نبوّت کے حق میں بہت زیادہ خطرناک بلکہ صراحتاً کفر و الحاد کی دعوت دینے میں امامت کا درجہ حاصل کر لیا، باطنیت کے علمبردار عام طور پر ان قوموں کے افراد تھے جو اسلام کے مقابلے میں اپنی سلطنت اور اقتدار کھو چکے تھے، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے اور اسلام ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، لوگوں کی یہ تمام قسمیں باطنیت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئیں، اور مسلمانوں کو کھلم کھلا کفر و الحاد کی دعوت دینے لگے، اور انھوں نے ظاہر و باطن کا مغالطہ دیا، اور اپنی ساری طاقت اس بات پر صرف کی کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح کتاب و سنت کے کچھ ظاہر ہیں اور حقائق ہیں، ان حقائق اور ان کے باطن کو صرف

اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں اور ظاہر کی پرواہ کیے بغیر حقائق و رموز کی اونچی سطح تک پہنچ جاتے ہیں اور ظاہر کا بوجھ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں اور شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور یہی مفہوم ہے قرآن کریم کی اس آیت کا "ویضع عنہم إصرہم والأغلال التی کانت علیہم"

باطنیت اور فلسفے کے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو علوم عقلیہ و نقلیہ کی جامع ہو، اور تمام علوم میں مجتہدانہ نظر و بصیرت رکھتی ہو، حضرت مولانا نے اس شخصیت کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

"فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لیے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دست گاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، جو اپنے ذہن خداداد، جودت طبع، اور دقت نظر میں فلاسفۂ یونان اور بہت سے قدیم ائمۂ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقے سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو وفور علم اور وسعت نظر کے ساتھ دولت یقین سے بھی مالا مال ہو اور اس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق اور ریاضت و عبادت سے دین کے ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو اور وہ نئے اعتماد تازہ یقین کے ساتھ علی وجہ البصیرۃ دین کی پیروی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالم اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی

عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی جس کی عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالیؒ کی تھی۔"

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلب سلیم کے ساتھ عقل، ذہانت، احتیاط بصیرت اور پاکبازی کا ایک وافر حصہ عطا کیا تھا انھوں نے اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بنا پر عقلیات اور باطنیت کے فتنے کو مٹانے میں زبردست کردار ادا کیا، اور اسلامی معاشرے کو ایک نئی روح اور نیا عزم وحوصلہ عطا فرمایا، اور فضا اس طرح کے علمی اور عقلی فتنوں سے بہت حد تک پاکیزہ ہوگئی تھی،

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی شخصیت کو عام اصلاح اور اخلاق وفضائل کی تربیت اور قلب کے تزکیہ کے لیے منتخب فرمایا، انھوں نے تعلق باللہ اور اخلاص واحتساب کے میدان میں ایسی نمایاں خدمات انجام دیں جو اللہ کے خاص الخاص بندوں کا حصہ ہے، اور جن کے ذریعہ شرک و بدعت رذائل ومعاصی کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایمان ویقین کی باد بہاری چلتی ہے، انھوں نے دین کے ستون کو مضبوط کرنے اور عبودیت کے جذبہ کو بیدار کرنے اور تعلق مع اللہ سے سرشار کرنے میں اپنی عظیم الشان دوررس اور گہرے نتائج کی حامل خدمات انجام دیں کہ ان کی مثال بعد کی صدیوں میں ملنا مشکل ہوگیا۔

چھٹی صدی ہجری ۵۶۱ھ میں نوّے سال کی عمر میں اللہ کے جوار رحمت میں پہنچے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

عالم اسلام پر تاتاریوں کا حملہ

ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر تاتاریوں کا وحشیانہ حملہ ایک زبردست فتنے کی شکل میں ظاہر ہوا، اور مسلمان سخت آزمائش سے دوچار ہوئے اور عالم اسلام کے لیے ایک بلائے ناگہانی ثابت ہوا، ہر طرف خوف و ہراس کا عالم طاری ہوگیا، اور شہر کے شہر ان کی تاراجیوں اور بربادیوں سے خاک کا ڈھیر بن گئے، یہ ایک ایسا عظیم حادثہ اور ہمہ گیر فتنہ تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، حضرت مولانا نے اپنی کتاب میں اس کا مختصر خاکہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے دار الخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے، اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے، کچھ اندازہ ان مؤرخین کے بیانات سے ہوگا، جنھوں نے اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہوگیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں، اور سارے شہر میں بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہوگئی، اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہونچا، اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فنا، تینوں کا دور دورہ تھا۔"[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۰۲-۲۰۳ [2] ایک ایرانی فاضل کی تاریخ "اخبار و آثار خواجہ نصیر الدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اس کتاب کے ایرانی مصنف نے بھی نصیر الدین طوسی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں :۔

"ہلاکو خاں نے خلیفہ بغداد (مستعصم) کو ایک خیمہ میں اتارا اور وزیر ابن العلقمی نے علماء و اعیان شہر کو دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلحنامہ پر گواہ بنیں، وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑا دی گئی، اسی طرح ایک ایک گروہ کے بعد دیگرے بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑا دی جاتی، پھر خلیفہ کے معتمدین و مقربین کو بلایا گیا اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا۔ خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی آفت آئے گی، ہلاکو کو تردد تھا، نصیر الدین طوسی[۱] نے کہا کہ یہ کچھ مشکل بات نہیں، خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے بلکہ دوسری طرح اس کی جان لی جائے چنانچہ اس کو فرش میں لپیٹ دیا گیا، اور ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔

بغداد میں ایک مہینہ سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا جو چھپا رہا، کہا جاتا ہے کہ ہلاکو نے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۱۸ لاکھ مقتول شمار ہوئے[۲]۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

طوسی کی سب سے بڑی سیاسی چال جو بالآخر کامیاب ہوئی، یہ تھی کہ ہلاکو کو اس نے خلافتِ عباسیہ کی بیخ کنی پر ابھارا اور قصرِ خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، ہلاکو خود بھی اپنے بھائی منکوقاآن کی طرف سے اس پر مامور تھا کہ باطنیوں کے استیصال کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دے، خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ہلاکو نے اطاعت کا حکم بھیج دیا، مراسلت ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب ہلاکو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، مغل نجوم سعد و نحس کے بہت معتقد تھے، حسام الدین نامی ایک سنی نجومی اس کے دربار میں تھا، اس نے کہا کہ حملہ بغداد کی یہ گھڑی نحس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے، تو اسے منہ کی کھانی پڑی ہے، اور کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حملہ کرتے ہیں، تو بارش بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکوقاآن) ہلاک ہو جائے گا، یہ سن کر ہلاکو متردد ہو گیا، ہلاکو نے طوسی کی رائے معلوم کی کہ "اگر بغداد حملہ کنیم عاقبت چہ خواہد شد" طوسی نے جواب میں کہا "چیزے نخواہد شد جز اینکہ بجائے خلیفہ خان خواہد بود" ہلاکو نے طوسی اور حسام الدین دونوں کو مناظرہ کرایا، طوسی نے کہا کہ ہزاروں صحابہؓ شہید کر دیئے گئے، مگر کوئی فساد ظاہر نہیں ہوا، اگر عباسیوں کی خصوصیت کہتے ہو تو ظاہر کو دیکھو جس نے امون کے حکم سے خلیفہ امین سے جنگ کی اور اس نے قتل کر دیا متوکل کو اس کے لڑکوں اور غلاموں نے اتفاق کر کے مار ڈالا منتصر اور معتضد کو امراء اور غلاموں نے ختم کر دیا کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔

فتنۂ تاتار پورے عالم اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دینے کے لیے کافی تھا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی ابدیت اور تا قیامت باقی رہنے والے دین کی حیثیت سے اس کے بقا کا ذمہ نہ لیا ہوتا تو کوئی طاقت اس فتنے کو روکنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے خود تاتاریوں کو اس دین حق کے دوبارہ پھیلنے اور مسلمانوں کو عالم اسلام پر آباد کرنے کا ذریعہ بنایا، اور اللہ کے مخلص اور باکمال بندے شیخ جمال الدّین کی آہ سحرگاہی نے کایا پلٹ دی، اور پوری تاتاری قوم حلقہ بگوش اسلام بن گئی، اور نہ صرف یہ کہ تاتاریوں نے اسلام قبول کیا بلکہ ان میں بڑے بڑے علماء، مجاہد، فقیہ اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے اور اسلام کی پاسبانی کا فرض انجام دیا۔

مولانا جلال الدّین رومیؒ

اسی ساتویں صدی ہجری میں علم کلام کے مسائل اس قدر الجھ گئے تھے کہ اس کا اصل مفہوم ذہنوں سے غائب ہوگیا تھا، اور پورے عالم اسلام پر قیاس واستدلال کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا، اور اگرچہ متکلمین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات ونتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کردیا تھا، لیکن وہ دلوں کو سکون و اطمینان اور شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ایمان کی روشنی کی طرف واپس لانے میں ناکام رہ گئے تھے، ایسی صورت میں عالم اسلام کو ایک بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی، مولانا مدظلہ العالی لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت جو دل دردمند اور فکر ارجمند دونوں سے فیضیاب ہو، جس کے لیے عقلیت کا سمندر پایاب ہوچکا ہو، اور

الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمی عشق اور سوز دروں سے اس یخ بستہ عالم اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے، اور عقل کے اس زنگار خانہ، میں عشق کا صور پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد رکھے، جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کا تسکین دور کرے، اور دل کی گرہ کھولے، اور ان کو سکینت و ایمان و یقین و اطمینان سے بھر دے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کی تھی، جن کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی "ہوس پرستیوں"، کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلان جنگ ہے، اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی"

رجال الفکر والدعوۃ کی پہلی جلد میں جن شخصیات اور عظیم ہستیوں کا ذکر ہے ان کا مختصر تذکرہ ان کے کارنامے اور ان کی تجدیدی و اصلاحی فکر کا ایک مختصر مرقع کتاب کی روشنی میں پیش کرنے کے بعد اب ہم منتقل ہوتے ہیں دوسری جلد کی طرف جو حافظ ابن تیمیہ کی بلند و بالا شخصیت ان کے علمی اصلاحی و تجدیدی کارناموں پر مشتمل ہے تیسری جلد ہندوستان کے مجدد الف ثانی شیخ احمد بن عبد الاحد السرہندی کے حالات و تذکرے پر حاوی ہے، انھوں نے جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے ان کا مفصل ذکر تاریخ کی روشنی میں اس حصے کے اندر موجود ہے۔

چوتھی جلد ہندوستان کے خانوادۂ علم و دین کے امام محدث اور محقق شیخ الاسلام احمد بن عبد الرحیم شاہ ولی اللہ دہلوی کے حلات اور کمالات اور ان کے

اولاد واحفاد کے اصلاحی علمی تحقیقی اور تجدیدی کارناموں پر مشتمل ہے۔

پانچویں جلد تیرہویں صدی کے امام ہجرت وجہاد حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد زندگانی اور ہجرت وجہاد کے حالات، اللہ کے راہ میں ان کی سرفروشی کی داستان سے مزین ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اردو زبان میں دو ضخیم حصوں میں مقبول عام ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی اس کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام پورا نہیں ہوا۔

نذر الحفیظ ندوی

سیرت عائشہؓ

تاریخ وادب کا حسین امتزاج

سیرت عائشہ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کی طالب علمانہ زندگی کی تصنیف ہے جیساکہ دیباچہ طبع سوم میں مصنف نے لکھاہے، اس کے دو ایڈیشن چھپے، پھر ۱۹۲۰ء میں سید صاحب نے اس پر نظر ثانی کی، اپنے بعض فقہی آرار سے رجوع کیا اور کہیں جزوی ترمیم واضافہ سے کام لیا، بعد میں ہند وپاک میں اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔

عام طور پر بقول سید صاحب کے سوانح عمریوں کے لیے تاریخ کی کتابیں درکار ہوتی ہیں، لیکن امہات المومنین خصوصًا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالات زندگی لکھنے کے لیے صرف حدیث کی کتابیں ہیں، یہ تمام ذخیرہ درحقیقت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، امہات المومنین اور اصحاب کرام کی مقدس زندگیوں کی عملی تاریخ ہے، جنگ جمل کے متعلق بے شبہ مجبوری تھی کہ اس کا مفصل تذکرہ احادیث میں نہیں اس لیے اس باب میں زیادہ تر طبری پر اعتماد کیا گیا۔

سید صاحب نے صحاح ستہ کا باربار مطالعہ کیا، مسانید کے دوسرے مجموعوں کو

کھنگالا، اور عملاً انھوں نے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کرنے کی مثال ثابت کردی، اس طرح سید صاحب نے سیرت نگاری کا وہ معیار قائم کیا جس پر آخری زندگی تک ان کی علمی وتحقیقی عمارت قائم رہی بلکہ محققین، ومصنفین کے لیے اس نے منارۂ نور کا کام کیا۔

حضرت سید صاحب کی تحقیق کے معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارے استاد مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رحمۃ اللہ علیہ۔ جو سید صاحب کے ممتاز ومحبوب شاگرد تھے فرماتے تھے کہ سید صاحب فرماتے تھے کہ دس صفحہ لکھنے کے لیے کم از کم دس ہزار صفحات پڑھنے ضروری ہیں، لیکن یہ بھی اس کے ساتھ ضروری ہے کہ مصنّف کسی دوسرے درجہ کی کتاب پر قناعت نہ کرے اور نہ ہی ادب کی خاطر تحقیق کے تقاضوں کو قربان کرے۔

مندرجہ بالا معیار کے مطابق اگر ہم سیرت عائشہؓ کا تاریخی اور ادبی اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اسلام کے خیر القرون کی تاریخ کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کو اصل بنیاد بناتے ہیں۔ جہاں حدیثوں میں تعارض ہوتا ہے اس کو اجتہادی انداز سے اس طرح حل کرتے ہیں کہ صراط مستقیم اور جمہور کی راہ سے سرِمو انحراف نہیں کرتے، عقل ونقل دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، لیکن دلائل وبراہین کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں، ہر سطر کے پیچھے دلائل اور شواہد کا انبار ہوتا ہے، کوئی اقتباس بغیر سند کے پیش نہیں کرتے، اور نہ ہی دھونس اور رعب سے اپنی بات منواتے ہیں، نہ ہی مظلوم بن کر اپنے حق میں راہ ہموار کرتے ہیں، قدم قدم پر اعتدال وتوازن کا دامن ہاتھ سے تھامے رہتے ہیں، جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے نازک مسائل کو جو پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر تھے، امن وسلامتی سے عبور کر جاتے ہیں اور ام المومنین کے کردار

کو اس وادی پرخار سے اس طرح نکال کر لے گئے ہیں جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال کو نکالا جاتا ہے کہ اس میں بال برابر بھی ان پر حرف نہیں آیا، اور پڑھنے والے کو وسوسہ بھی ان کے خلاف نہیں ہوتا، مثالوں اور اقتباس کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس کا یہ موقع نہیں، البتہ بعض موضوعات کی طرف ہم اشارے کر رہے ہیں جن کے مطالعہ سے سید صاحب کی تاریخی بصیرت، ناقدانہ اور مجتہدانہ صلاحیت اور فقہی اجتہاد میں توازن و اعتدال کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور ان کی بہتان تراش کے مخفی پہلوؤں اور پُرفریب اسالیب بیان سے سید صاحب کی براہ راست گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے جگہ جگہ سید صاحب نے کہیں نام کی تعیین کے ساتھ اور اکثر بغیر نام لیے غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور اس کا انداز بھی مثبت اور ٹھوس علمی سند کے ساتھ سنجیدہ ہے، واقعہ افک کی تحقیق میں صرف ایک ماخذ پر بھروسہ کرنے کے بجائے سید صاحب نے صحاح ستہ کے علاوہ مزید چار مسانید کا بھی حوالہ دیا ہے جو دس صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک دیدہ ور مؤرخ کے علاوہ سید صاحب ایک باکمال مفسرؒ، محدثؒ اور فقیہ بھی نظر آتے ہیں لیکن ایسے مفسر و محدث اور فقیہ جس کی شان مجتہدانہ اور مبصرانہ ہوتی ہے۔

دوسری صفت جو سید صاحب کی تمام تصنیفات میں جاری و ساری دکھائی دیتی ہے بلکہ اس طرح رچ بس گئی ہے جس طرح پھولوں میں خوشبو، وہ ہے ادبی استعارات و تشبیہات اور بلیغ و موثر تعبیرات کا برمحل استعمال۔ لیکن تحقیق کے تقاضوں کو قربان کر کے نہیں بلکہ سند اعتبار کو ہر قیمت پر ترجیح دیتے ہیں چاہے ادب کو قربان کرنا پڑے، علامہ شبلی اور مولانا حکیم سید عبدالحی جو سید صاحب کے اساتذہ و رہنما ہیں، ہمیشہ تاریخ و ادب کو تبلیغ کے لیے استعمال کرتے ہیں، سید صاحب بلکہ تمام ندوی فرزندوں نے تاریخ و ادب سے یہی کام لیا ہے۔

یوں تو یہ پوری کتاب تاریخ وادب کا حسین امتزاج ہے، لیکن چند بلیغ تعبیرات اور فکر انگیز تلمیحات وتشبیہات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سید صاحب نے ادب اور تاریخ کو باہم کس طرح جمع کیا ہے۔

سید صاحب نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح کی تقریب کا تذکرہ کرتے ہوئے دور حاضر پر بھی بلیغ انداز میں تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں! آج کا نکاح مسرفانہ مصارف اور مشرکانہ مراسم کا مجموعہ ہے "یہ مقدس تقریب اس کی عملی تکذیب ہے، مسرفانہ مصارف اور مشرکانہ مراسم میں لفظی رعایت سے کام لے کر سید صاحب نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اس سے زیادہ بلیغ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہو سکتا ہے،

کاشانۂ نبوی کی تصویر کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں: مسکن مبارک گو منبع نور تھا، لیکن راتوں کو چراغ جلانا صاحب مسکن کی استطاعت سے باہر تھا، غور فرمائیے کہ سید صاحب نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ گھر میں تاریکی رہتی تھی اور اندھیرا رہتا تھا بلکہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جو جملہ استعمال فرمایا اس میں کتنی بلاغت اور حالات کی صحیح عکاسی ہے اور تعریف کا پہلو لیے ہوئے مثبت انداز میں۔

سید صاحب ایک جگہ واقعہ افک کا تذکرہ کرتے ہوئے انسانی زندگی میں عفت وعصمت اور عزت وشرف کی غیر معمولی قدر وقیمت کا ذکر فرماتے ہیں "دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نازک نہیں یہ وہ شیشہ ہے جو پتھر پھینکنے سے نہیں بلکہ پتھر پھینکنے کے ارادہ سے بھی چور چور ہو جاتا ہے"

سید صاحب ایک جگہ مستشرقین کی جہالت پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس طرح جاہلانہ کمال کا تماشہ یورپ کے عجائب زار کے سوا ہم کو کہاں نظر آئے گا۔ لفظ ابو بکر

سے جو مفہوم مستشرقین نے لیا ہے اس کے پس منظر میں ایک بڑے نامور مستشرق ولیم میور کی تحقیق کے تانے بانے کو بکھیرتے ہوئے ان کے علمی منہج اور تلاش و تحقیق کے اسلوب کا تذکرہ کر کے سید صاحب فرماتے ہیں کہ ولیم میور کے بتائے ہوئے اشارے پر ہم نے جستجو شروع کی تو نظر آیا کہ تصویر کا قصور نہ تھا بلکہ خود یورپ کے سب سے بڑے ماہر بیان کے دماغی شیشہ کا قصور تھا۔

سید صاحب نے دیباچہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ سیرت عائشہؓ دنیا کے بزرگ ترین انسان کی نصف زندگی کا وہ نصف حصہ ہے جو مرأۃ کاملہ کا وہ بہترین مرقع ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ نصف بہتر کو نصف زندگی سے تعبیر کیا ـــــ ایک دوسری جگہ اسی تعبیر کو اس طرح استعمال کرتے ہیں، "آج مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں ان کے انحطاط کا بحصہ رسدی آدھا سبب عورت ہے" یہ جملہ سید صاحب نے آج سے نوّے سال پہلے لکھا تھا جو ایک طرح سے پیشین گوئی تھی وہ پوری ہو رہی ہے۔ کاشانہ نبوت میں حضرت عائشہ صدیقہ کے وجود کو سید صاحب نور باطن سے تعبیر فرماتے ہیں۔

یوں تو تین سو صفحات کی اس کتاب میں ہر سطر اپنے جلو میں دلائل و شواہد کا لشکر لیے ہوئے ہے، لیکن کتاب کے اختتام پر عالم نسوانی میں حضرت عائشہ کے درجہ کے عنوان سے سید صاحب نے جو کچھ تین صفحے میں تحریر فرمایا ہے وہ بلاشبہ معلومات کی وسعت و تنوع اور گہرائی کے لحاظ سے شاہکار ہے، اس کے ساتھ اختصار و ایجاز کا اعجاز ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سید صاحب نے سات سمندروں کو ایک کوزہ میں بند کر دیا ہے

تو مبالغہ نہ ہوگا، ان صفحات میں سید صاحب نے پہلے حضرت عائشہ کی جامع کمالات شخصیت کا موازنہ کرنے کے لیے پوری نسوانی تاریخ کو کھنگال ڈالا ہے، اس کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ مستقل انسائیکلو پیڈیا یا سمندر ہے، اسلام ہی نہیں پوری عالم انسانی کی تاریخ کی تاریخ کے ہر پہلو پر ماہرانہ بلکہ مجتہدانہ نظر ہے، وہ ایک ناقد و مبصر اور معمار کی طرح تاریخ کے اس ملبہ سے ہر چیز صحیح تناسب سے لیتے ہیں اور اس کو اپنی جگہ نگینہ کی طرح فٹ کر دیتے ہیں۔

کتاب خشک اور زاہدانہ نہیں بلکہ اس کو پڑھنے والا کہیں بے اختیار مسکرا دیتا ہے، اس کے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے، کہیں یہ آئینہ دیکھ کر اپنی زندگی سے ندامت اور شرمندگی اتنی ہوتی ہے کہ اس کی آنکھوں میں نمی آجاتی ہے اور اس پاکیزہ گروہ میں اپنے کو شامل کرنے کی تمنا اور دعا کرنے لگتا ہے کہ:

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاللذین آمنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔

سید صاحب ایک جگہ اپنے شوہر سے حضرت عائشہ کے ناز و انداز کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی توجیہہ میں یہ بلیغ جملہ تحریر فرماتے ہیں:

دریائے محبت کی بہت سی لہریں عورت کے خالص نسوانی خصوصیات کے اندر پنہاں ہیں، ناز و انداز عورت کی فطرت ہے۔

دوسری فطری خصوصیت عورت کی یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی محبت میں کوئی دوسرا شریک ہو

با سایہ ترا نمی پسندم

یہاں حال یہ تھا کہ ایک ہی شمع کی سب پروانہ تھیں، تاہم محبت کا ایک ہی چراغ سب کے سینوں میں جل رہا تھا، شرف صحبت سے یہ سارے آیئنے ہر قسم کے گرد وغبار اور زنگ سے پاک تھے، اس نازک اور حساس موضوع کو سید صاحب نے جس طرح نبھایا ہے وہ اس میں منفرد ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیرت حضرت عائشہ رضؓ کی زندگی اور کمالات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، ایک سوانح نگار، مورخ، محقق اور ادیب سے اس موضوع پر جو توقعات کی جاتی ہیں وہ اس کتاب سے پوری ہوتی ہیں، اُردو کے سوانحی ادب میں یہ کتاب تاریخ اور ادب کا حسین امتزاج ہے۔

مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی
مدرسہ احمدیہ ابابکر پور، ویشالی

اسلامی بیداری
بہار کے چند اردو نثر نگار علماء کا حصہ

ہندوستان میں اسلامی بیداری کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶-۱۱۱۴ھ) سے ہوا، جمود، تعطل اور مخالف اسلام سرگرمیوں کے عہد میں وہ اسلامی نشأۃ کے نقیب بن کر اٹھے، انھوں نے اس کام کے لیے جو زبان استعمال کی وہ جامعیت خطابت، قوت استدلال، سادگی اور شگفتگی کی وجہ سے منفرد اسلوب اور تحریک ولی اللٰہی کی خاص پہچان بن گیا۔ انھوں نے ادب کی فنی نزاکتوں اور معانی کی رفعتوں کا خاص خیال رکھا اور کوشش کی کہ بقول مولانا گیلانی وہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور ان ہی محاوروں سے کریں جو لسان نبوّت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں اس تعلق کا ہی نتیجہ ہے کہ آپ کی زبان کی روانی اور عربیت بڑے بڑے ادیبوں کو متاثر کرتی تھی۔ نمونہ کے طور پر شاہ صاحب کی شاہکار اور شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کو ہی دیکھ لیں بقول شیخ مصطفےٰ مکیؒ اس کا اسلوب نگارش ایسا ہے کہ عرب کے کاملین بھی نہیں لکھ سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

اسلامی بیداری کا جو کام حضرت شاہ صاحب نے کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، اسی وجہ سے آپ کو بارہویں صدی کا مجدد کہا جاتا ہے، انھوں نے خود بھی تفہیمات الٰہیہ میں لکھا ہے۔

"مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، وصی اور قطب ہوں اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہو جائے گی،،

حضرت کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور ہندوستانی مسلمانوں کی سوچ، طرز زندگی اور مخالف اسلام سرگرمیوں میں تبدیلی پیدا ہوئی ان کے بعد ان کے نامور ذی علم اور فخر خاندان صاحبزادگان شاہ عبدالعزیز (۱۲۳۹-۱۱۵۹ھ) شاہ رفیع الدین (۱۲۳۳-۱۱۶۳ھ) شاہ عبدالقادر (۱۲۳۰-۱۱۶۷ھ) اور شاہ عبدالغنی (۱۲۰۳-۱۱۷۱ھ) نے اس تحریک کو جاری رکھا، ہندوستان میں تحریک نے خاص طور پر زور پکڑا، سماجی، مذہبی علمی، تعلیمی ہر میدان میں انقلاب آیا اور اس کے اثرات ہندوستانی سماج، تحریکات، زبان وادب سب پر پڑے۔ ادبا وشعرا بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے ادبی شہ پاروں، غزلوں، نظموں، خطابت، مواعظ وملفوظات اور مکتوبات میں شعوری وغیر شعوری طور پر اس کو اپنا لیا، انھوں نے رجائیت، ملی شعور وآگہی کا سبق زمانہ کو پڑھایا اور غیر مذہبی رسم ورواج، ظلم وستم، جبر واستحصال کے خلاف ماحول کو بیدار کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادگان نے اسلام کی ترویج واشاعت اور اس کے پیغام کو عام کرنے کے لیے جو زبان استعمال کی وہ دہلی کی ٹکسالی زبان سمجھی جاتی تھی، ناصر نذیر فراق نے لکھا ہے کہ جب ذوق دہلوی سے ان کے استاذ خفا ہو گئے اور شعر وسخن میں اصلاح موقوف ہو گئی تو ذوق شاہ عبدالعزیزؒ کے خطبہ جمعہ میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ استاذ

مجھ گناہ گار سے ناخوش ہو گئے شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں ہے اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کہ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں۔ (لال قلعہ کی جھلک)

شاہ صاحب کے دوسرے صاحب زادے رفیع الدّین دہلوی کا مقام بھی عربی ادب وانشاء میں بلند تھا، ان کی زبان میں سلاست و روانی اور ان کے اشعار میں رفعت تخیل، شوکت الفاظ، عمدہ اور نادر تشبیہات، عجیب وغریب استعارات اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

شاہ صاحب کے تیسرے صاحبزادہ شاہ عبدالقادرؒ عربی وفارسی اور اردو کے نامور ادیب بہترین انشاء پرداز اور تینوں زبانوں میں تحریر وتقریر کا ملکۂ تام رکھتے تھے، زبان سلیس اور شگفتہ اور سادہ ہوتی تھی اُردو زبان وادب کے تعلّق سے ان کا نام اولین معماروں میں آتا ہے ان کا ترجمہ قرآن ایسا رواں اور سلیس ہے کہ ایک غیر مسلم شاعر گلزار دہلوی نے لکھا ہے ؎

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو بھی منظور
ورنہ قرآں بھی اترتا بزبان دلّی

حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ عبدالغنیؒ کے نامور فرزند مولانا سیّد اسمعیل شہید کے ذریعہ یہ تحریک بہار پہنچی، شاہ ولی اللہ کا علم وفضل عام ہوا اور مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا چونکہ عام بول چال کی زبان اس دور میں اردو تھی، اس لیے اردو زبان وادب کو زیادہ تر کام میں لایا گیا۔ اس عہد میں تحریک کی ترویج واشاعت کے لیے جو زبان استعمال کی گئی اس کے بارے میں اختر اورینوی نے

لکھا ہے:۔

بہار کے اُردو نثر ادب کے آغاز میں بھی اسلامی مذہبیت کا تیز رنگ دکھائی دیتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بہار کی ابتدائی اُردو نثر اسلامیات کے تار و پود سے ہی بُنی گئی ہے۔ (بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء)

اس تحریک کو علماء صادق پور نے پوری قوت کے ساتھ اپنایا انھوں نے اپنے خیالات کی ترسیل و تبلیغ کے لیے اُردو زبان میں جو رسائل لکھے اس نے اپنے اسلوب و اَدا کے ساتھ لوگوں میں اسلامی مزاج پیدا کیا، مشرکانہ خیالات، فاسد رسومات اور غیر شرعی افکار سے مسلمانوں کو بچانے کا اور بیزار کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس کام میں مولانا ولایت علی کا قلم آگے آگے تھا۔ ان کے پانچ رسائل اُردو میں ہیں۔ اور تین فارسی میں، فارسی رسائل کا ترجمہ مولوی الٰہی بخش بہاری نے کیا ہے، مولوی صاحب کا ترجمہ بہت رواں سلیس، شگفتہ اور ادبی زبان میں ہے۔ نمونہ کے طور پر مولانا ولایت علی کی کتاب رد شرک کے ترجمہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"وہ زبان کہاں ہے جس سے ہادیٔ مطلق کا شکر بجالاؤں، اور وہ ہاتھ کہاں ہے جس سے اس کی تعریف لکھنے میں ہمت کروں، اس خدا نے ہم لوگوں کو امواج شرک کے ہچکولوں سے بچا کر توحید کے کنارے پر پہنچایا باوجود اس کے کہ طوفان شرک میں ایک جہان ڈوبا ہوا ہے اور میدان ضلالت میں عالم سرگرداں ہے"

مولانا ولایت علی ہی کی ایک دوسری کتاب رسالہ عمل بالحدیث کا ترجمہ بھی مولوی الٰہی بخش کے قلم سے ہے ترجمہ کی زبان دیکھئے:۔

"... کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دل مردہ رکھتے ہیں اور ظاہر سے باطن تک نہیں پہنچتے ہیں اور ہمت کا قدم غور و تامل کے میدان میں نہیں رکھتے ہیں اور چور کی طرح ہر آشنا نا آشنا کی تھیلی میں نگاہ ڈالتے ہیں اور اندھوں کی طرح ہر عاقل اور دیوانے مونڈھے پر ہاتھ رکھتے ہیں۔"

ان حضرات کے علاوہ مولانا فیاض علی، ظہور الحق ظہور، محمد تقی فردوسی، بلخی، سید شاہ عطا حسین منعمی، سید محمد اسحاق بیر دمڑیا، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، آزاد عظیم آبادی وغیرہ کے رسائل بھی حلقہ مریداں اور اہل نظر کے نزدیک مقبول رہی ہیں ان کے موضوعات مذہبی ہیں اور انداز ناصحانہ، مواعظانہ، مباحثانہ ہے، لیکن زبان ادب کی چاشنی لیے ہوئے ہے اس عہد کی تصنیفات میں مولانا احسن گیلانی کی بھی ایک کتاب کا پتہ چلتا ہے جو ماہ صفر ۱۲۶۶ھ میں مکمل ہوئی اور جسے مولانا مناظر احسن گیلانی نے بہار میں اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ مولانا گیلانی نے اس کتاب کا کوئی نام تو نہیں لکھا ہے، لیکن تبصرہ سے پتہ چلتا ہے کہ پوری کتاب حقائق و اسرار اور معارف نکات سے پر ہے مولانا نے اس کے موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اسلام کی جدید دینی ضرورتوں اور آئندہ پیش آنے والے عقلی اور علمی خطروں کو بھانپ کر سارے ہندوستان میں بھی اس وقت تک کوئی کتاب اردو زبان میں تصنیف نہ ہوئی تھی۔

یہ رسائل چھوٹے تھے لیکن ان کے اثرات دل و دماغ پر دیرپا ہوئے

اور یقیناً ان کے مندرجات نے اسلامی بیداری میں اہم رول ادا کیا ہے زبان و ادب نے جب اور ترقی کی اور عظیم آباد اردو کے دبستان اور اسکول کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا تو ہمارے ادباء نے ادب و شاعری کی مشاطگی میں اپنا خون جگر جلایا اور پھر اسے عظیم مقصد کے لیے استعمال کرکے اسلام کی بیداری کی راہ ہموار کی ان ادباء و شعراء کی تعداد بہت ہے اور یہ پوری کتاب کا عنوان ہے، مختصر سے مقالہ میں سبھوں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے اس لیے مجھے معاف رکھیں اگر کوئی اہم نام آپ کے ذہن میں ہو اور میں اسے چھوڑ دوں کیونکہ انتخاب میں لازماً لوگ رہ ہی جاتے ہیں۔

بہار کے نثر نگاروں میں جن کی تحریر نے دیرپا اثر چھوڑا ہے اور باطل نظریات کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھا، ان میں مولانا محمد علی مونگیریؒ کا نام بڑے احترام اور عقیدت سے لیا جاتا ہے مولانا کی زیادہ تر کتابیں فرقِ باطلہ کے رد میں ہیں، مولانا سید محمد حسنیؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے رد قادیانیت پر سو سے زائد کتابیں اور رسائل تصنیف کیے جن میں سے چالیس کتابیں ان کے نام سے طبع ہوئیں اور بقیہ دوسروں کے نام سے مولانا نے رد قادیانیت کو ایک تحریک کی شکل دیدی، مولانا کا کہنا تھا کہ "اتنا لکھو اور اس قدر طبع کرلو اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے رد قادیانی کی کتاب پائے"۔

مولانا کی مشہور کتابوں میں فیصلۂ آسمانی، شہادت آسمانی، رسالہ چیلنج محمدیہ، چشمۂ ہدایت اور معیار صداقت وغیرہ ہیں۔ فیصلۂ آسمانی کے بارے میں مولانا سید محمد حسنیؒ لکھتے ہیں:

"قادیانیت کے خلاف سارے لٹریچر میں جواب تک لکھا گیا ہے یہ کتاب

ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اور اپنے محکم طرز استدلال، اسلوب کی وضاحت اور صفائی، صحیح وطاقت ور گرفت کے اعتبار سے بہت کم کتابیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔" آگے لکھتے ہیں:

حقیقت یہ کہ کتاب حشو وزوائد اور غیر ضروری دلائل سے بالکل پاک ہے اور اس میں اپنے جذبات کو تسکین دینے کے بجائے قاری کو مطمئن کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے، دوسری طرف لکھنے والے کے درد وسوز اور اخلاص وحسن نیت نے اس کی قیمت اور افادیت اور قوت تاثیر میں اور اضافہ کردیا ہے۔

غرض مولانا نے جو کچھ لکھا اسے مستند تاریخی حوالوں اور قرآن وحدیث سے اس طرح مدلل لکھا کہ کسی شک وشبہ اور بے یقینی کی گنجائش باقی نہ رہی اور مخالفین کو اس کا موقع نہیں رہا کہ وہ دوبارہ استفسار وسوالات کریں یا اس سے کوئی غلط معنی نکالیں مولانا کے یہ اسلوب اور طرز تصنیف نے لاکھوں انسانوں کو ختم نبوت کے قرآنی عقیدے پر راسخ کردیا اور اس طرح بڑی آبادی قادیانیوں کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہوگئی اور ان کے اثرات پنجاب بنگال، مدراس، بمبئی گجرات، حیدر آباد، سلہٹ، ڈھاکہ نواکھالی کے حدود سے گزر کر برما اور افریقہ تک پہنچے اور قادیانیوں کو منھ کی کھانی پڑی۔

بہار کے نثر نگار علماء میں بڑی قدآور دلآویز شخصیت سید سلیمان ندوی ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۲ء کی ہے۔ اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ اور اس کی قدر وقیمت کی تعیین مولانا سید سلیمان ندوی کے ادبی شاہکاروں کے ذکر کے بغیر ممکن نہیں۔ سید صاحب کی سیرت النبی، رحمت عالم، حیات امام مالک، عرب وہند کے تعلقات، خطبات مدراس،

عربوں کی جہازرانی، خیام، حیاتِ شبلی، بہادر خواتین اسلام، لغات جدیدہ، تاریخ ارض القرآن وغیرہ ان کی تبحر علمی اور تصنیفی بصیرت کا آئینہ خانہ ہے۔ ان کا اسلوب عمدہ ان کی نثر رواں، بلیغ اور برجستہ ہوتی ہیں، جس میں بقول نعیم صدیقی، شوکت الفاظ فقروں کی برجستگی، ترکیبوں کی چستی اور بیان کی دل کشی کا اہتمام نظر آتا ہے، مثال کے طور پر خطبات مدراس کی یہ عبارت دیکھیے:

"نوحؑ کا جوشِ تبلیغ، ابراہیمؑ کا ولولۂ توحید، ہارونؑ کی رفاقتِ حق، اسحاقؑ کی وراثتِ پدری، اسماعیلؑ کا ایثار، موسیٰؑ کی سعی و کوشش یعقوبؑ کی تسلیم، داؤدؑ کا غربتِ حق پر ماتم، سلیمانؑ کا سرودِ حکمت، زکریاؑ کی عبادت یحییٰؑ کی عفت، عیسیٰؑ کا زہد، یونسؑ کا اعتراف قصور، لوطؑ کی جانفشانی ایوبؑ کا صبر، یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں ان صفات عالیہ کا وجود ہے وہ ان ہی بزرگوں کی مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے۔"

مولانا کو جو تنقید میں درک تھا، اس کو سمجھنے کے لیے جگر کی شاعری پر جو انھوں نے تنقید کی ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں لکھتے ہیں۔

"جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بلبل کی آئینہ بندی، نہ اس کے محبوب کے ہاتھ میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچے میں شعراء کے دل و جگر کی گل کاری ہے۔ وہ مست ہے اور اس مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا

مشتاق نظر ہے" (مقدمہ شعلۂ طور از نقوش سلیمانی ص۱۳۴)

سید صاحب کی تحریروں نے ایک زمانہ کو متاثر کیا، اور ان کے اسلوب نثر نے اہل قلم سے خوب خوب داد پایا۔ مولانا عبدالماجد دریاباآبادی کی نظر میں شستگی، متانت، شرافت، یہ تو ان کے اسلوب کے جوہر اصلی ہیں اور اس میں شوخی وظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتم سلیمانی میں نگیں مولانا علی میاں کی رائے ہے کہ "نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔

بہار کے نثر نگاروں میں مولانا مسعود عالم ندوی (م ۵۴ء) کا بھی اپنا ایک مقام ہے، بہار شریف میں پیدا ہوئے ندوہ میں تعلیم پائی اور زندگی کا بیشتر حصہ علم وادب کی طلب وتحقیق میں گزرا، بقول ماہر القادری "عربی ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، پورے ہندوستان وپاکستان میں بس دو تین شخصیتیں ہی مشکل سے ایسی نکلیں گی جو عربی زباں دانی اور انشاء پردازی میں ان کی برابری کر سکتی ہو"

وہ عربی کے علاوہ اردو کے بھی بہترین ادیب تھے، ان کی متعدد کتابیں یادگار ہیں ماہر القادری نے لکھا ہے کہ ان کی اردو تحریر بہت نچی تلی اور باوقار ہوتی تھی، طرز نگارش پر افسانوی انداز کی پرچھائیں بھی نہ پڑتی تھی اس لیے ان کی تحریر میں شرح واطناب کی جگہ ایجاز پایا جاتا تھا مگر کوئی بات مبہم نہ رہتی، چند لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرنے پر قدرت تھی (یادرفتگاں ص۳۰۹)

بہار کے علمائے کرام میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحریروں کا بھی سماج پر بڑا اثر پڑا۔ ان کی تقریروں نے بھی مسلمانوں میں اسلامی بیداری کی لہر دوڑادی

ان کی سترہ کتابیں اور بیسیوں مقالات میں جو ادب پارے پھیلے ہوئے ہیں وہ انھیں بہترین ادیب قرار دینے کے لیے کافی ہیں، وہ برجستہ لکھتے تھے اس لیے ان کی تحریروں میں آورد کا نام ونشان نہیں پایا جاتا وہ ایجاز واطناب پر یکساں قادر تھے، ایجاز دیکھنا ہو تو، النبی الخاتم دیکھئے اور اطناب دیکھنا ہو تو سوانح قاسمی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے لکھا ہے کہ،، نہ ایجاز لذّت سے خالی نہ اطناب دلچسپی سے عاری ؛؛

مولانا کی نثر بعض حضرات کی نظر میں ادب کے موجودہ معیار پر پورا نہیں اترتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تحریر کی بے ساختگی زور بیان، مضبوط استدلال، اور سوز وگداز انھیں بڑے ادیبوں کی صف میں شامل کرنے کی مستحق ہے، غلام محمد صاحب بی۔اے نے بجا لکھا ہے:

مولانا ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے اس لیے وہ جدید زبان اور اسلوب بیان میں عالمانہ مضمون بخوبی پیش کرتے رہے بلکہ ادبی حیثیت سے مولانا کی تحریروں پر غائر نظر ڈالی جائے تو بیسیوں عمدہ اور اچھوتی اصطلاحات ملیں گی جو مولانا کے ہاتھوں زبان اُردو کو ملی۔ (مقالات احسانی ص۱۶-۱۷)

مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں۔

,, قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا گیلانی کو حاصل تھا اس سے ناظرین صدق نا آشنا نہیں، وہ ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں خود اس کے موجد تھے، تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی، جب اور جس موضوع

پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے، جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگا دیتے، خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہیں تھا تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی"۔ (دنیاتِ ماجدی ص۷۷)

مولانا نے القاسم اور الرشید کے ذریعہ بھی صحافت کو ایک رُخ دیا، اور اس کے ذریعہ بہت سارے لوگ اسلام سے قریب ہوئے، مولانا نے اپنی زندگی کا بہت سارا وقت سیرت کے جلسوں میں تقریر پر لگایا، اور ایک زمانہ کو متأثر کیا، مولانا کے سامعین میں نواب بہادر یار جنگ اور نظام حیدر آباد بھی ہوا کرتے تھے، مولانا دریابادی لکھتے ہیں:۔

"موضوع کوئی سا بھی دیدیجئے، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا دریا ہے کہ اُبلتا اور اُمنڈتا چلا آرہا ہے، کہاں سے مضمون پیدا کر لیتے اور نکتہ سنجی دقیقہ آفرینی قرآن عنوانات میں اور زیادہ نمایاں ہوتے اور قرآن کے بعد نمبر حدیث کا رہتا، ایسی نکتہ سنجیوں کو اب کان ترس گئے ہیں"۔ (معاصرین ص۱۸۳)

مولانا کی کتاب النبی الخاتم پر تھوڑی گفتگو اوپر گزر گئی ہے، جی چاہتا ہے کہ حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کا ایک اقتباس نقل کر کے اس تذکرہ کو ختم کروں حضرت مولانا لکھتے ہیں:

"میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر

بھی شامل ہے۔"

مرحومین میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا سید احمد عروج قادری کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی نثر نے نئی نسل کو خاصا متأثر کیا، میں سید احمد عروج قادری کے تذکرہ پر اس مقالہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

سید احمد عروج قادری کے مقالات زیادہ تر رسالہ زندگی میں شائع ہوتے تھے، جسے بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ان کی نثر کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا کی نثر نہایت شستہ، رواں اور سلیس ہے، ان کے اسلوب میں قدرے مزاح کی چاشنی بھی ہے جس میں ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ گرچہ کبھی کبھی طنز کا نشتر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ خاص کر جب وہ فاسد خیالات یا ناقص افکار پر تنقید کرتے ہیں اس سے طرز بیان میں تلخی تو نہیں مگر تیکھاپن پیدا ہو جاتا ہے، ان کی رائے سے اتفاق کرنے والوں کو یقیناً دلچسپ معلوم ہوگا۔"

آگے لکھتے ہیں:۔

"جدید ہندوستان کے علمائے دین میں مولانا عروج قادری اپنی ایک جگہ رکھتے تھے، آزادی کے بعد جن چند علماء نے اپنے افکار و خیالات سے ملّت اسلامیہ کے سلیم الطبع نونہالوں کی دینی تربیت کی ان میں ایک نمایاں نام مولانا کا ہے۔"

(رفیق عروج قادری نمبر ص۵۲)

مولانا نے اسلامی ادب اور غیر اسلامی ادب پر اپنے خالص لب و لہجہ میں تبصرہ کیا ہے لکھتے ہیں :۔

"اسلامی ادب ایک ایسا سدا بہار گلشن ہے جو توحید کی زمین پر اگتا وحی الٰہی کی پاکیزہ بارش سے سیراب ہوتا ہے اور آخرت کی لازوال خوشبو سے مہکتا ہے، اور غیر اسلامی ادب ایک ایسا صحرائے خاردار ہے جو الحاد و شرک کی زمین پر پنپتا ہے، مادیت کے گدلے پانی سے پھیلتا ہے اور نفسانیت، عریانیت، فحاشی اور ہوا و ہوس کے بدبو سے وبال جان بنتا ہے۔

مختصر یہ کہ آپ نے اپنی تحریروں میں اسلامی ادب کے اصول وضوابط کی پوری پابندی کی اور اسلامی ادب کا وہ نمونہ پیش کیا جس میں اسلامی فکر و دعوت عمل اور جوش کی فراوانی ہوتی ہے۔"

جی چاہتا تھا کہ اس مقالہ میں بہار کے اور نثر نگار، مولانا ریاست علی ندوی، نجیب اشرف ندوی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، شاہ فرزند علی صوفی منیری وغیرہ کی خدمات کا ذکر کیا جاتا، کچھ دور جدید کے نثر نگاروں کا بھی تذکرہ ہوتا جو بہار میں اسلامی ادب کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کی تحریروں نے ٹوٹتے اخلاقی قدروں اور ظالمانہ برتاؤ اور ستم ناروا کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور ایک بڑا طبقہ ان کی تحریروں سے متاثر ہوا ہے لیکن ابھی ہمیں بہت سارے مقالہ نگاروں کو سننا ہے اس لیے اتنے ہی پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی
صدر شعبہ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ
فارن لنگویجز، حیدرآباد۔

ناول میں کردار نگاری

انسان جب اپنے اظہار خیال اور مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے زبان کے استعمال پر قدرت حاصل کرنے کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کو الفاظ کے پیکر میں بیان کرنے پر قادر ہوگیا، اور اپنے احساسات کو الفاظ کے جامہ میں ڈھالنے کا فن اس نے سیکھ لیا تو روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو الفاظ کی صورت میں دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے ان میں دلچسپی لینے کا جذبہ پیدا ہوا، تجربات، مشاہدات اور واقعات کو بیان کرنے میں بسا اوقات فکر و تخیل سے بھی کام لیا، ابتدائی دور میں انسان جب کسی چیز کا مشاہدہ کرتا یا کسی تجربہ سے گزرتا تو کسی فرد یا افراد کے سامنے ان باتوں کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرتا، اور اس میں دلچسپی کا عنصر شامل ہوتا، اسی انداز بیان نے قصہ کی شکل اختیار کرلی، قصہ گوئی پھر قصہ نگاری نے افسانہ، ناول اور فکشن کی شکل اختیار کرلی۔

ابتدا میں انسان جو بھی قصہ کہتا اس میں دل چسپی کے لیے تجسس کی کیفیت پیدا کرتا اور یہ تجسس قصہ کو قصہ بنانے میں معاون ثابت ہوتا، ان قصوں میں زندگی کا جو بھی پہلو ہو، کسی نہ کسی طرح ضرور پایا جاتا تھا، اور اس میں عام طور پر تجسس کے بعد کوئی

نہ کوئی نتیجہ برآمد ہوتا تھا، جب تجسّس، زندگی اور نتیجہ لازمی طور پر قصّہ میں شامل ہوتے تو سننے والا اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول کرتا، تجسّس اور زندگی دونوں کا بنیادی طور پر تعلق انسان کی ذات اور اس کی شخصیت سے ہے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قصّہ کے ارد گرد انسان کا وجود عام طور پر پایا جاتا ہے یا قصّہ کے عنصر میں انسان شامل ہوتا ہے۔

قدیم قصّوں میں انسانی زندگی اور شخصیات قصّہ کے بنیادی عنصر کے طور پر پائے جاتے تھے، لیکن بعض قصّوں میں حیوانوں کو مرکز خیال بنایا جاتا تھا، اور حیوانوں کو کردار کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، لیکن قصّہ نے جب فن کی شکل اختیار کرلی تو حیوانوں کو بطور کردار پیش کرنے کا رجحان کم ہوگیا، بلکہ انسانی کرداروں کو ہی اہمیت دی گئی، اور انسانی کرداروں کو ناول یا قصّہ کا بنیادی عنصر بنا کر پیش کیا گیا۔ E.M. FASTER نے اپنی کتاب ASPECTS OF THE NOLEL (جس کا ترجمہ ابوالکلام قاسمی نے "ناول کا فن" کے عنوان سے کیا ہے) میں ناول کے عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے کردار کے باب میں تحریر کیا:۔

"چونکہ کہانی میں عام طور پر انسانی کرداروں ہی کا وجود ہوتا ہے، اس لیے اس باب کو "انسانی کردار" کے نام سے موسوم کرنا مناسب سمجھا گیا ہے، کہانی میں ویسے تو بعض حیوانی کرداروں کو بھی پیش کیا گیا ہے، مگر ایسا بہت ہی محدود کامیابی کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کی نفسیات کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں[1]"

---

[1] ناول کا فن، مطبوعہ ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۸ء ص ۔ ۲۱

وہ قصے جو اب قصۂ پارینہ ہوگئے، اور جن قصوں کا مستند مذہبی کتابوں میں ذکر نہیں، وہ تخیلات پر مبنی تھے یا لوگوں نے دل چسپی کی خاطر ان قصوں کو بطور قصہ بیان کیا یا توہمات یا غیر مذہبی عقائد کی وجہ سے وجود میں آئے، ان قصوں کے واقعات اور کرداروں میں زندگی کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کی گئی کہ معاشرتی زندگی کے لیے ان قصوں کو اہمیت نہیں دی جاسکتی، لیکن قصے نے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے جب "ناول" کی صورت میں فنی ادب کی حیثیت اختیار کرلی تو انسانی زندگی کے حقائق کے اظہار کے طور پر یہ فن وجود میں آیا، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"علاوہ اس کے قصے قرین قیاس بھی ہوتے ہیں، اور دور از قیاس بھی، پرانے افسانوں یا پرانی داستانوں کے قصے زیادہ تر دور از قیاس ہوتے تھے، الف لیلیٰ (الف لیلۃ ولیلۃ) کے قصے بھی اس طرح کے ہیں مگر جو خصوصیت ناول کو ان پرانی داستانوں یا افسانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ ناول میں قصہ کی بنیاد انسانی زندگی پر ہوتی ہے اور اس میں روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان ہوتے ہیں، ناول نگار اس کہاوت پر عقیدہ رکھتا ہے کہ حقیقت جھوٹ سے زیادہ تعجب انگیز ہے"[1]

ناقدین ادب نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی ہے کہ دوسرے علوم و فنون کی طرح قصہ کی ابتداء بھی مشرق سے ہوئی لیکن ناول کا فن بحیثیت ناول مغرب میں پروان چڑھا، چونکہ قصہ اور ناول میں انسانی زندگی کا اظہار ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا اظہار بغیر شخصیت اور کردار کے

---

[1] محمد احسن فاروقی، نورالحسن ہاشمی۔ ناول کیا ہے، مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۷۶ء ص ۱۹

نہیں ہوسکتا اس لیے قصے میں انسانی شخصیت اور کردار کے ساتھ انسانی افکار و خیالات کا اظہار لازمی ہے، مشرق و مغرب کے قصے اور ابتدائی دور کے ناول میں انسانی کردار کی تصویر کشی اور افکار و خیالات کے اظہار میں جو واضح فرق پایا جاتا ہے۔ علی عباس حسینی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"مشرق روحانیت کا مرکز ہے، مغرب مادیت کا منبع، ہم حیات بعد الممات کے عاشق، وہ حیات فی الدنیا کے سودائی، ہم قنوطیت کی طرف مائل دنیا کو سجن سمجھنے والے، وہ رجائیت کی طرف راغب، دنیا کو دار السرور ماننے والے اسی لیے ہم نے جب کوئی حکایت بیان کی تو کسی وعظ کے سلسلے میں، کسی نصیحت کے دل نشین کرنے کے لیے کسی اخلاقی تعلیم کے زیر نظر۔ انھوں نے جب قصہ کہا تو ہنسنے ہنسانے کے لیے، لطف و لذت زندگی میں اضافہ کی غرض سے حیات دنیوی کو زیادہ ہوشیاری سے بسر کرنے کی غایت سے۔"[۱]

علی عباس حسینی کے افکار سے کسی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے مشرق و مغرب کے درمیان زندگی کے تصور کا جو فرق ہے اسی تحریر میں اس کی وضاحت موجود ہے اور الدنیا سجن المومن کی بات اپنی جگہ پر درست ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ "ہم قنوطیت کی طرف مائل" صحیح نہیں ہے، اس دنیا کی زندگی کو مومن فانی سمجھتا ہے لیکن اس دنیا میں زندگی رجائیت کے ساتھ گزارتا ہے، مغرب جس کی فکر اس دنیاوی زندگی کے لیے بظاہر رجائیت ہے لیکن درحقیقت قنوطیت ہی کی وجہ سے لہو و لعب میں مبتلا ہے اور خواہشات نفس کی اتباع میں ایسی زندگی گزارتا ہے جس کو نیچرل کہا جاتا ہے۔ (درحقیقت وہ زندگی غیر فطری ہے اس لیے کہ وہ انسانی زندگی کے بجائے حیوانی زندگی کا مظہر ہے

---

[۱] علی عباس حسینی۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۳

مہذب زندگی کے بجائے وحشیانہ زندگی کا طریقہ ہے) یہی وجہ ہے کہ مغربی ناول کے کرداروں میں اور مشرق کے وہ ناول نگار جنھوں نے مغرب کے فلسفہ اور فن کی پیروی کی وہ زندگی کی حقیقت کے اظہار کے نام پر قنوطیت میں مبتلا ہو گئے ہیں، مشرق و مغرب کے درمیان زندگی کے مقاصد اور اقدار میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں اس کی وجہ سے حقیقی زندگی ہو یا ناول کے کردار کی تصویر کشی، دونوں میں مشرق و مغرب کے فنکاروں اور ناول نگاروں کے افکار میں فرق پایا جانا یقینی ہے۔

"ناول کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ناول علمی و تہذیبی کارنامہ ہے، تہذیبی اور ذہنی مطالعہ ہے۔"[1]

یہ حقیقت ہے کہ علم و تہذیب اور ذہن و فکر کا تعلق انسان سے ہے اور ناول میں علم و تہذیب اور ذہن و فکر کا مطالعہ جب ہی سامنے آئے گا جب ناول کے قصّہ اور پلاٹ (پلاٹ میں واقعات کا بیان ہوتا ہے مگر اس میں سبب اور مسبب کے مطابق ترتیب پر زیادہ زور دیا جاتا ہے) کا کردار انسان ہوگا، انسان کے تہذیبی اور ذہنی مطالعہ کی بنیاد پر رچرڈسن نے کہا کہ کہانی کی غرض "نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔"[2]

رچرڈسن نے جس نیکی اور اخلاق کے سدھارنے کی بات کہی، واقعہ ہے کہ اس کا تعلق بھی انسان اور کردار سے ہے، انسان کے علاوہ کسی بھی مخلوق کے لیے نیکی اور اخلاق کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا، مغربی ناول نگاروں نے ناول کے ذریعہ نیکی اور اخلاق کو سدھارنے کے مقصد سے ناول لکھے لیکن عام طور پر جن کرداروں کے ذریعہ نیکی اور اخلاق کی تعلیم دینے کی کوشش کی وہ سراسر گمراہی میں مبتلا ہیں، صرف انجام کار سے نیکی اور اخلاق کی تعلیم نہیں دی جا سکتی، اس لئے کہ

۱؎ آل احمد سرور، مقدمہ ناول کیا ہے ص ۵، ۱۱ ۲؎ علی عباس حسینی ص ۔ ۳۶

ناول نگار کردار نگاری میں عام طور پر بداخلاق کرداروں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ناول پڑھنے والا کردار کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے کردار کا ہمدرد بن جاتا ہے اور جب ناول پڑھنے والا اس بداخلاق کردار کا ہمدرد بن جاتا ہے تو یقیناً وہ کردار کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا، معاشرہ پر ناول کے ان کرداروں کا جو اثر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

ایک اور مغربی ناقد ایچ جی ویلز نے تحریر کیا:

"ہر اچھے ناول کی پہچان اس کی حقیقت نگاری، اس کی غرض زندگی کی نمائش ہے، اس کو حقیقی زندگی اور سچے واقعات پیش کرنا چاہیے نہ کہ ایسی زندگی اور ایسے واقعات جو کتابوں سے لیے گئے ہوں[1]"

ویلز کے قول کے مطابق بھی ناول میں زندگی کی تصویر کشی بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، اور زندگی کی تصویر کشی کے لیے کردار اور شخصیت لازمی عنصر ہے، ویلز کے نزدیک حقیقت نگاری حقیقی زندگی، اور سچے واقعات کا مفہوم ہے اس میں زندگی کا ہر ایک پہلو خواہ صالح یا غیر صالح سب ہی شامل ہیں ـــــــ زندگی کی نمائش، حقیقی زندگی، اور سچے واقعات کو سامنے رکھ کر ناولوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو صالح معاشرہ کی تصویر ناول کی دنیا میں بہت کم نظر آتی ہے بلکہ ناول کی دنیا میں ایک ایسی دنیا اور دنیا کے لیے انسان اور کردار نظر آتے ہیں جس میں عام طور پر دانشوری، دانش مندی اور انسان کے عقل و فہم کے استعمال سے جو خوبصورت پاکیزہ معاشرہ سامنے آنا چاہیئے وہ نظر نہیں آتا ہے۔

اس کے علاوہ بیکر نے ناول کے سلسلہ میں جو اظہار رائے کیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے اس نے تحریر کیا۔

---

[1] علی عباس حسینی ص۔۔ ۴۰

"ناول نثری قصّے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے، وہ بجائے

ایک شاعرانہ وجذباتی نظریۂ حیات کے ایک فلسفیانہ، سائنٹفک یا کم سے کم
ایک ذہنی تنقید حیات پیش کرتا ہے"[1]

بیکر کی رائے میں بھی ناول میں شخصیت اور کردار کی حیثیت بنیادی عنصر کی ہے، غرض کہ ناول کا وجود شخصیت اور کردار کے بغیر ناقص ہے۔ بیکر کے نظریے کے مطابق ناول کا فن واقعی ایک اعلیٰ فن کی صورت میں سامنے آسکتا ہے جب کہ انسان کی زندگی کا مطالعہ نظریۂ حیات کی صورت میں فلسفیانہ اور سائنٹفک انداز میں ذہنی تنقید حیات کے ساتھ پیش کیا جائے، لیکن ناول کا فن بسا اوقات فن کا وہ اعلیٰ نمونہ نہیں پیش کر سکا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیانہ، سائنٹفک ہونے کے باوجود نظریۂ حیات کے اختلاف اور ذہنی تنقید حیات کے رویّے کے مختلف ہونے کی وجہ سے سطحی زندگی اور سطحی افکار و خیالات کا ترجمان ہو کر رہ گیا، ذہنی تنقید حیات کی پیش کش کی وجہ سے معاشرہ اور زندگی کی جو سچّی اور حقیقی تصویر سامنے آنی چاہیے تھی وہ نہیں آئی بلکہ زندگی کے ایسے کردار سامنے آئے جو خود انسانی زندگی کے لیے ناسور تھے اس طرح کردار کی کردار کشی خوب خوب ہوئی اس کی مثال اکثر و بیشتر ناولوں میں ملے گی۔

ناول نگار کے فن میں فاسٹر کے نظریۂ کردار کو بہت اہمیت دی گئی ہے، مغرب و مشرق کے سبھی ناقدین جب ناول میں کردار نگاری کے موضوع پر بحث کرتے ہیں تو فاسٹر کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں، فاسٹر کے نزدیک ناول میں دو طرح کے کردار ہوتے ہیں ایک سپاٹ یا سادہ اور دوسرا مکمل یعنی کردار میں انسان کے کسی ایک ہی وصف یا خوبی کو بیان کیا جاتا ہے یا انسان کی مختلف خوبیوں اور خرابیوں کو مکمل طور پر پیش کیا جاتا ہے، پہلی صورت

[1] علی عباس حسینی ص ۳۸

میں سپاٹ یا سادہ کردار کہلاتا ہے، دوسری صورت میں مکمل کردار۔

یہاں پر دو باتیں قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ فاسٹر جس کردار کو مکمل کہتا ہے اور ناول نگار مکمل کردار کے طور پر جس کردار کو پیش کرتا ہے وہ مکمل نہیں ہوتا اور ناقدین کی رائے میں بھی جو بھی کردار مکمل ہو ہماری رائے میں وہ مکمل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ انسان زندگی کے جس نشیب وفراز سے گزرتا ہے اس کی مختلف کیفیات کے اظہار سے کوئی کردار مکمل نہیں ہوتا اس کو فنکاری کہہ سکتے ہیں لیکن زندگی کی ایسی تصویر کشی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی انسان مکمل تصویر کشی ہو ـــــ عام طور پر مکمل کردار کے نظریے نے واضح اور اعلیٰ مقصدیت سے ناول کو خارج کر دیا، سادہ اور سپاٹ کردار کو اس لیے کم تر سمجھا گیا کہ اس میں کردار کے کسی ایک خاص وصف یا خوبی کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اس خوبی کو ناول نگار اس لیے اجاگر کرتا ہے کہ اس سے اعلیٰ مقصد کا حصول ممکن ہو، سادہ کردار عام طور سے سطحی جذبات اور عام زندگی سے ہٹ کر کسی مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے، سادہ کردار میں مکمل کردار کی زندگی کے سطحی جذبات اور سوقیانہ پن کی بات نہیں پائی جاتی ہے۔ اردو میں نذیر احمد کے کردار اور راشد الخیری کے کرداروں کی مثال سادہ یا سپاٹ کردار سے دی جا سکتی ہے، جن کی زندگی میں اصلاح معاشرہ کی مقصدیت پائی جاتی ہے اس طرح انگریزی میں رچرڈسن کے بعض ناولوں میں جن میں کردار کے ذریعہ نیکی اور اخلاق کی تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے کردار بھی سادہ کردار کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اشتراکی نظریہ کے تحت جو ناول لکھے گئے ہیں ان میں مقصدیت غالب ہے، ان کے کردار بھی خاص جذبہ اور کاوش کے تحت کام کرتے ہیں، اس طرح سادہ کردار میں مقصدیت پائے جانے کے باوجود بھی ہر ایک کردار کا مقصد الگ ہو سکتا ہے۔ کرداری نگاری پر غور و فکر کرتے وقت سادہ کردار کی مقصدیت پر

غور و فکر بھی ضروری ہے، سادہ کردار کا ناول ادب برائے زندگی یا ادب برائے اخلاق کے دائرے میں ہوتے ہوئے بھی ایسے نظریات اور افکار سے متصادم ہو سکتا ہے جس کا نظریہ حیات اخوت، مساوات، نیکی، شرافت، عدل وانصاف، ذات الٰہی کی حاکمیت وحدانیت، عقیدۂ آخرت اور دین کے بنیادی افکار پر مشتمل ہے، اسی لیے ہمارے نزدیک مکمل کردار جس کی توضیح اور تشریح عام طور پر مشرق ومغرب کے ناول نگار کرتے ہیں ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے اس لیے کہ کوئی انسان نہ تو ہمہ گیر خصوصیات کا مالک ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کردار کسی انسانی زندگی کی مکمل تصویر کشی کر سکتا ہے، سوائے یہ کہ کسی بھی انسان کی خوبیوں کے ساتھ تمام خرابیوں کو طشت از بام کیا جائے تاکہ دنیا اسی کے نقش پر چلے اور اس کو حقیقت نگاری سمجھ کر انسان تمام خرابیوں کو اپنا لے اور یہی زندگی کا مقصد بن جائے جیسا کہ فرانس کے مشہور ناول نگار فلابیر (FLAUBER) اور دوسرے نیچرل اسکول کے ناول نگاروں میں مشہور ناول نگار گان کورٹ (GONCOURT) زولا (ZOLA) (MAUPASSANT) وغیرہ کے کرداروں میں یہ بات نظر آتی ہے۔ اردو میں عصمت چغتائی اور دوسروں کے ناول میں ایسے کردار پائے جاتے ہیں کہ جس کا کسی باحیا انسان کے لیے پڑھنا بھی دشوار ہے۔ سادہ کردار کے متعلق انگریزی نقاد میور (MUIR) کی رائے قابل قدر ہے وہ کہتا ہے :۔

> "سپاٹ کردار صرف وہی ہے جو ناول نویس کا مقصد حل کرے یعنی کہ وہ اس کا ضروری آلۂ کار ہے جس کے ذریعے وہ ایک نظریۂ زندگی کو پیش کرتا ہے[لے]"

لے بحوالہ شمیم نکہت، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، مطبوعہ نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۵ء۔ ص ۸۵

میور نے ناول کے لیے مقصدیت کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن یہ بات واضح نہیں ہے ناول کس مقصد کے لیے لکھا جائے، مقصد اور نظریہ سے اخلاقی تعلیم اور ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر بھی ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مقاصد بھی ہو سکتے ہیں، مقصد کے اظہار اور طریقۂ کار میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ سماجی اصلاح کے نام پر بڑی تعداد میں ناول لکھے گئے ہیں، لیکن ان ناولوں میں ان کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کردار کشی کی ایسی بدترین مثالیں ملنا مشکل ہے۔ گرچہ مقصد اور نظریہ کا اظہار اس میں شامل ہے۔ بہرحال مقصد اور نظریہ کے ساتھ کردار کو ناول میں اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ایک اچھے انسان کی تصویر سامنے آتی ہے اور ایک مثالی انسان نہیں بلکہ پاکیزہ اوصاف کے انسان سامنے آئے تو معاشرہ یا سماج کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے اور ناول پڑھنے والا اس سے ایک اچھا تاثر قبول کر سکتا ہے۔

فاسٹر دوسری جگہ کردار کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہماری زندگی دو زندگیوں سے مل کر بنی ہے، ایک زندگی وقت کے حساب سے اور دوسری زندگی قدروں کے حساب سے، لیکن ناول وہی اچھا ہے جس میں دوسری قسم کی زندگی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔"[1]

فاسٹر نے زندگی کو سن و سال اور اقدار حیات کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے اس نے اقدار حیات کو ان دونوں قسموں میں زیادہ اہمیت دیا ہے، اور یہ بھی اظہار خیال کیا ہے کہ دوسری قسم یعنی اقدار حیات کا موضوع ناول میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور بنیادی موضوع ہے، اقدار حیات کا ناول کے فن کے لیے ضروری قرار دینا فنی اعتبار سے اہم اور

[1] ناول کیا ہے ص ۔ ۲۲

اچھی بات ہے، لیکن ناول نگاروں نے "اقدار حیات"، کو جس طرح مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے اور اپنے اپنے اعتبار سے اقدار حیات کو پیش کیا ہے اور ناقدوں نے جس طرح اقدار حیات کی توضیح، تشریح کی وہ قابل غور ہے، اقدار حیات کی تلاش وجستجو اور کرداروں میں اس پیش کش نے مختلف افکار و نظریات کو جنم دیا ہے، اور کرداروں کے مختلف اقسام اور مختلف زاویہ نگاہ کی وجہ سے ناول مختلف خانوں میں منقسم ہو گیا ہے۔

ناول میں زندگی اور اقدار حیات کا زیادہ تر کردار نگاری کے ذریعہ سے ہوتا ہے جب بھی ناول نگار اور ناول کے ناقدین زندگی اور اقدار حیات کی بات کرتے ہیں تو عام طور پر ان کے سامنے اس دنیا کی موجودہ زندگی اور انسان کے شب و روز کے اعمال ہوتے ہیں، ابتدائی دور کے ناولوں میں نیکی، سچائی، اور اخلاقی تعلیم پر توجہ دی گئی اور ان میں رومان بھی پایا جاتا ہے لیکن اس رومان میں فرانسیسی انقلاب کے بعد کی رومانیت نہیں پائی جاتی ہے، انقلاب فرانس جس نے زندگی کے تمام قیود و بندش توڑ دیئے اس کا اثر زندگی، معاشرہ اور ادب سب پر پڑا، خاص طور سے بلند انسانی اخلاقی اقدار کو معاشرتی زندگی سے مٹا دیا، بقول علی عباس حسینی:۔

> "انقلاب فرانس کا یورپ و انگلستان پر اپنے اپنے ظرف کے مطابق اثر پڑا، یورپ میں میڈم اسٹیل اس انقلاب کی ترجمان ہیں، وہ جنسی معاملات میں سوسائٹی کے ہر قانون کو ٹھکرا دینا ہر فرد کا حق بتاتی ہے اور مذہب و اخلاق کی تمام بندشوں کو توڑ دینا ہی انسانی تکمیل کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے[1]"

اقدار حیات کے نظریے کی تبدیلی کے ساتھ انگریزی ناول نگاروں میں رچرڈسن کے

---

[1] علی عباس حسینی: اردو ناول کی تاریخ و تنقید ص ۔ ۳۱

مقابلہ میں فیلڈنگ (اس کے ناول TOM JONES) اور دوسروں نے ناول کے فن کو آگے بڑھانا شروع کیا، انقلاب فرانس کی وجہ سے زندگی کے نظریات اور اقدار حیات میں جو تبدیلی آئی اس نے ناول کے فن کو حقیقت نگاری اور حقیقی زندگی کی عکاسی کے نام پر نیچرلزم تک پہنچا دیا، اس دنیا میں انھوں نے دیکھا کہ زیادہ تر بے عقل، بدقماش، احمق، غریب، مزدور، کسان، دہقانی، لالچی، بداخلاق اور بدکردار انسان بستے ہیں۔ انھوں نے ایسے ہی لوگوں کی زندگی کو اس دنیا کی حقیقی زندگی سمجھا اور ناولوں کے کرداروں میں ایسے لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی کو فن اور ادب سے تعبیر کیا۔

کرداروں کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ متنوع قسم کا ہونا چاہیے تاکہ ہر ایک ناول میں یکسانیت نہ ہو، اور ہر ایک ناول میں دلچسپی پائی جائے، مغربی ناقدین اور اس کے پیروکار ناقدین صرف اس زاویۂ نگاہ سے ناول کے کردار کو دیکھتے ہیں کہ معاشرتی زندگی میں شب و روز انسان کس طرح گزارتا ہے اور نفسیاتی طور پر اس کی زندگی میں کس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں اس کو ناول میں پیش کیا جائے، بقول ان ناقدوں کے ناول کا کردار اس انسانی دنیا کا مخلوق ہو کسی اور دنیا کا نہیں، اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ کردار کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ گرد و پیش کا ماحول ناول میں محسوس کیا جائے، یہ اصول اپنی جگہ پر ہے لیکن کیا کسی بھی معاشرہ میں وہی غیر صالح عناصر ہی پائے جاتے ہیں جو عام طور پر ناول کا موضوع ہوتے ہیں، صرف اسی ایک عینک سے معاشرہ کو دیکھنے کی کوشش کیوں کی گئی، اور کیوں کی جاتی ہے؟ معاشرہ کا صالح عنصر جو کسی بھی معاشرہ کا جز ہے بلکہ اس دنیا کا وجود اور معاشرہ کی بقا صالح اقدار کی وجہ سے ہی ہے اس کو ناول کے کردار کی شکل میں کیوں نہیں پیش کیا جاتا ہے، اگر پیش کیا جاتا ہے تو اس طور پر کہ ناول میں اقدار درمیان ٹکراؤ پیدا کر کے غیر صالح عناصر سے ہمدردی کا رجحان پیدا کیا جاتا ہے، اور ناول پڑھنے والا اس سے متاثر ہو کر زندگی کے ایسے اقدار کو اختیار

کرلیتا ہے جو کسی معاشرہ کے لیے رستا ہوا ناسور بن جاتا ہے۔

اگر کوئی ناول نگار اخلاقی تربیت اور اعلیٰ انسانی اخلاق کا حامل کردار ناول میں پیش کرے تو اس کردار کو مثالی کردار کہہ کر ناول کا مرتبہ کم کر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کردار میں حقیقت نگاری نہیں ہے اور وہ کردار اس دنیا کا انسان نہیں ہے بلکہ وہ ایک مافوق الفطرت چیز ہے، ڈاکٹر وقار عظیم کا قول ملاحظہ کیجئے:۔

"مثالی کردار کا مقصد بے حد بلند ہے، ان کی مثالیں لوگوں کو کچھ نہیں تو کم از کم اچھے خیالات کی طرف تو رجوع کر دیتی ہیں، لیکن مثالی کردار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مافوق الفطرت بن جائے، ایک بلند نمونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ انسان نہ معلوم ہو"[1]

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس دنیا کے وجود کے لیے اور پر سکون معاشرہ جس میں انسان کسی حد تک پر سکون زندگی گزار سکے اس معاشرہ کا انسان کس طرح کا ہونا چاہیئے، اگر ناولوں میں اور فن پاروں کے کردار میں اچھے انسان کی خوبیوں کو نمایاں نہیں کیا جاتا ہے اور اچھے اوصاف کے انسان کی تصویر کشی نہیں کی جاتی ہے تو کیا ناول کے پڑھنے والے سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ اچھے اوصاف اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا شاید کہ ایسی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جس طرح کے نمونے انسانی کردار اور چیزوں کے اس کے سامنے آتے ہیں اس کا اثر قبول کرتا ہے۔

اگر ناول کے کردار اچھے اوصاف کے ہوں گے اور اس کا اثر قاری پر پڑے گا تو یقیناً

---

[1] وقار عظیم۔ فن افسانہ نگاری

ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا، دنیا کے وجود کے لیے اور سچائی، دیانت داری، نیکی اور شرافت جو اس دنیا کے بقا کے لیے ضروری ہے انسانی کردار کے ان بہتر اوصاف کی عکاسی کے بغیر ان اوصاف کا معاشرہ میں پیدا ہونا مشکل ہے اسی لیے مثالی کردار کے ذریعہ ہی بہتر معاشرہ کی تشکیل ممکن ہے۔

مغرب کے ابتدائی ناولوں میں اخلاقی تعلیمات کی طرف قدرے توجہ دی گئی، اردو میں نذیر احمد کے ناول اخلاقی اقدار کے ترجمان ہیں' ان کے کردار معاشرتی زندگی کی اصلاح کے نمونے ہیں، ابواللیث صدیقی نے نذیر احمد کے ناول اور اس کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا:۔

"نذیر احمد کا ایک واضح نقطۂ نظر تھا، جو ان کی جملہ تصانیف کا مقصد اوّل ہے، یہ نقطۂ نظر ایک صحت مند دین داری کا نقطۂ نظر ہے، جہاں دین کا مقصد محض چند رسوم کی اَدائیگی، عبادت و ریاضت یا ترکِ علائق نہیں بلکہ جس میں دنیاداری، اس کے حقوق و فرائض، تربیت اولاد، تعلیم، درستی اخلاق سب کچھ شامل ہیں۔"[1]

اور مزید تحریر کرتے ہیں:

"زندگی سے بھرپور کرداروں کو ناول کا ایک بنیادی عنصر بتایا گیا ہے، ان کے کردار عام پر گھریلو زندگی سے لیے گئے ہیں۔"[2]

---

[1] ابواللیث صدیقی۔ آج کا اردو ادب، مطبوعہ علی گڑھ بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۔ ۱۴۵

[2] ایضاً

ابواللیث صدیقی کی ایک عبارت ملاحظہ کیجئے:

"نذیر احمد کے ناول اُردو میں اس اعتبار سے ایک نیا تجربہ ہیں کہ ان میں پہلی مرتبہ محض دل چسپی اور تفریح کے مقصد کو نظر انداز کر کے ایک مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے، یہ مسئلہ ایک سماجی اور تہذیبی مسئلہ ہے۔ مادیت اور روحانیت کی کشمکش ہو، دنیاداری یا دین داری کی بحث، تربیت اولاد کا مسئلہ ہو یا لڑکیوں کی تعلیم کا، مغرب اور مشرق کے نظریات اور تہذیبی عناصر و عوامل کی کشمکش ہو یا دو بیویوں کے رکھنے کا مسئلہ، نذیر احمد کے قصے مسائل کے محور پر ہی گردش کرتے ہیں، اور یہ مسائل محض خیالی یا جذباتی نہیں، اس دور کے حقیقی اور واقعی مسائل ہیں، جو زندگی سے متعلق اور معاشرہ کے مسائل ہیں، قدرتی طور پر ان قصوں کے کردار بھی اصل اور حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں"[1]

لیکن جنھوں نے کردار کو سفلی جذبات کے اظہار کی نظر سے دیکھا اور اس کو اصل کردار نگاری سمجھا انھیں نذیر احمد کے کردار میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں، علی عباس حسینی نذیر احمد کے ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولانا نذیر احمد نے اپنی قصص سے غیر انسانی ذرائع ضرور نکال دیئے تھے، مگر ان کا مطمح نظر اخلاقی تعلیم و تربیت تھی، ان کی مولویت انھیں سوسائٹی کی مرقع کشی سے ہمیشہ مانع رہی"[2]

---

[1] ایضاً ص۔ ۱۹۷ [2] علی عباس حسینی۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید ص۔ ۱۹۰

علی عباس حسینی کا یہ جملہ کہ " ان کی مولویت انھیں سوسائٹی کی مرقع کشی سے ہمیشہ مانع رہی، اس جملہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسینی کے نزدیک کردار نگاری اور معاشرتی زندگی کی حقیقت نگاری کا تصوّر کیا ہے، نذیر احمد نے معاشرتی زندگی کی جن خرابیوں کی طرف توجہ دلا کر اصلاح معاشرہ کی کوشش کرداروں کے ذریعہ کی تھی وہ سوسائٹی کی مرقع کشی ہی تھی، جس انداز میں حقیقت نگاروں نے حقیقت نگاری کے نام پر سوسائٹی کی مرقع کشی کرتے ہوئے انسانیت کا پردہ چاک کیا، نذیر احمد نے اس انداز کی مرقع کشی نہیں کی۔

لیکن اس کے بعد چند ایک ناول نگاروں کے ناول چھوڑ کر اردو ناول مغربی ناول کی تقلید میں بہت آگے نکل گیا، مغربی ناول نگاروں کے کردار سے اردو ناول نگاروں کے کردار کسی طرح کم نہیں، عریانیت، فحش نگاری اور جنسی لطف اندوزی ہی کو حقیقت نگاری سمجھ کر ناول کے فن کو آگے بڑھایا گیا، اور اسی کو فنی ناول قرار دیا گیا۔ محبّت کے ذکر کے بغیر خواہ کسی بھی قسم کا ناول ہو اس کا تصوّر کرنا محال ہو گیا۔

جب اشتراکیت کی تحریک عام ہوئی تو اس کا اثر ہندوستان کے فنکاروں پر بھی پڑا، انھوں نے مادیت ہی کو اس دنیا کے انسان کا متاع عزیز قرار دیا، اشتراکی نظریہ کے طرف داروں نے مساوات، اجتماعی عدل وانصاف کے پردہ میں جس طرح مادیت کی تبلیغ کی، ڈاکٹر قمر رئیس کی ان عبارتوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

" ادبی تحریکیں اپنے رویّے اور رجحان کے لحاظ سے تین طرح کی ہوتی ہیں، اوّل ایسی تحریکیں جو زبان وبیان، اسلوب واظہار یا تکنیک میں تبدیلیوں اور تجربوں کو اپنا مطمح نظر بناتی ہیں، دوم ایسی تحریکیں جو مخصوص نوعیت کے انفرادی تجربات اور ان کے تخیئلی اظہار پر زور دیتی ہیں، سوم ایسی تحریکیں

جن کی اساس اجتماعی احساس وشعور اور ایک واضح فکری نظام پر ہوتی ہے اوّل الذکر دونوں قسم کی تحریکوں کے مقابلے میں آخر الذکر کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع، اس کے سرچشمے زیادہ متنوع، اس کی جڑیں زیادہ گہری اور تہذیب ومعاشرت کی سطح پر اس کے اثرات زیادہ نتیجہ خیز ہوتے ہیں[1]۔"

ڈاکٹر قمر رئیس کی یہ بات کہ ایسی تحریکیں جن کی اساس اجتماعی احساس وشعور اور ایک واضح فکری نظام پر ہوتی ہے اس کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے، اپنی جگہ درست ہے لیکن ترقی پسند تحریک اور اس کے مصنفین کا فکری نظام جو خالص مادیت پر مبنی تھا، اس مادیت کی تبلیغ نے انسانی معاشرہ کو جس نظام کی طرف لے جانے کی کوشش کی اس نے انسان کے بلند اخلاقی اقدار اور نظام حیات کو تباہی کی طرف دھکیل دیا۔ ترقی پسند ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کو خالص مادیت اور جنسیت کا پیکر بنا کر پیش کیا۔ اس کے جو اثرات مرتب ہوئے اور جو نتیجہ برآمد ہوا وہ یقیناً انسانیت اور مہذّب وشائستہ دنیا کی ترجمانی نہیں کرتے۔ لیکن ڈاکٹر قمر رئیس ترقی پسند ادیبوں کے ناول اور کرداروں کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد اس عہد کے نمائندہ ناول نگار تھے، ان میں سے ہر ایک کا اپنا طرز فکر واحساس تھا، لیکن یہ سب متوسط طبقے سے متعلق رکھتے تھے، اور اس طبقے کی زندگی میں قدامت پرستانہ رسم ورواج اور فرسودہ اخلاقی ممنوعات سے

---

[1] ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر: ترتیب پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی۔ مضمون۔ ترقی پسند تحریک اور اردو ناول) مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۹ء ص - ۳۷۹

پیدا ہونے والی گھٹن سے بیزار تھے۔"[1]

اور کرداروں کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس تحریر کرتے ہیں:

"ان ترقی پسند ادیبوں کے ناولوں میں جو کردار ہیں، وہ تصوّر کی گیلی اور چکنی مٹی کے بجائے حقیقت کی کھردری اور سخت پتھریلی مٹی کے ڈھالے ہوئے ہیں، وہ پُرانے عقائد اور فرسودہ سماجی رشتوں کی شکست و ریخت ہی نہیں آزادی، انصاف اور انسان دوستی کے نئے تصوّرات اور نئے خوابوں کی علامت بھی ہیں۔"[2]

اشتراکی نظریات کے حامل ترقی پسند مصنفین، روحانیت اور اعلیٰ انسانی اخلاقی اقدار کی تعلیمات سے آراستہ کردار کو تصوّر پرستی کی گیلی اور چکنی مٹی سے بنائے ہوئے کردار سے تعبیر کرتے ہیں، ترقی پسندوں نے سماجی مساوات کے نام پر حقیقت کی کھردری مٹی سے جو کردار ڈھالے اور سماجی مساوات کے پردے میں جو کردار نگاری کی، ان کے متعلق پروفیسر یوسف سرمست کی زبانی سنیے:

"ترقی پسندی کی تحریک میں حقیقت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے حقیقت نگاری سے یہ غیر معمولی شغف ترقی پسند ادب کو کوئی مشترک مقصد عطا نہیں کر سکا، اس لیے کہ سعادت حسن منٹو نے بھی حقیقت نگاری سے کام لیا، عزیز احمد نے بھی، عصمت نے بھی، حقیقت نگاری کو شعار بنایا، اور ن۔م۔راشد نے بھی، . . . . . اس حقیقت نگاری کے چکر میں عریاں

---

[1] ایضاً ـ ص ۳۸۰　　[2] ایضاً ص ـ ۳۸۱

نگاری کا الزام ترقی پسند ادیبوں پر لگا۔"[1]

پروفیسر یوسف سرمست ترقی پسندوں کے انصاف اور "انسان دوستی" کے نئے تصورات اور نئے خوابوں کی علامت، پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"اس حقیقت نگاری کا سب سے تاریک پہلو یہ ہے کہ انگارے والی تاریخ پھر دہرائی جا رہی تھی، ہندوستان میں جب جنگ آزادی پوری شدت سے لڑی جا رہی تھی، ترقی پسند ادیب فحش اور عریاں نگاری کے الزام میں عدالتوں میں جواب دیتے پھر رہے تھے۔"[2]

ترقی پسندی اور دوسرے افکار و خیال کے حامل ناول نگار جنھوں نے اس دنیا کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا، انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو کو مادی اور سطحی انداز فکر سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی، انھوں نے ناول میں انسانی بلند اقدار اور اعلیٰ اقدار و کردار کی کردار کشی میں غیر معمولی دل چسپی دکھائی، اور ان کے نزدیک مادیت و روحانیت صالح و غیر صالح اور اقدار کی عظمت و سطحیت کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا۔

ناول یا قصہ کا بنیادی محور زندگی اور واقعات ہی ہیں۔ اور زندگی کے واقعات کو ناول کا بنیادی عنصر قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں زندگی کے مختلف اقدار میں جو مختلف واقعات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ادب اور فن کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ زندگی کے خواہ کسی بھی قسم کے واقعات ہوں ان کو فنکاری اور فن کے نام پر ادبی چاشنی کے ساتھ پیش کر دیا جائے بلکہ واقعات کے انتخاب میں اقدار حیات کے ان پہلوؤں پر

---

[1] یوسف سرمست۔ ادب نقد حیات، مطبوعہ آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالر کونسل حیدر آباد دسمبر ۱۹۹۳ء ص۔ ۵۹ [2] ایضاً

نظر رکھنا ضروری ہے جو بہتر معاشرہ کو وجود میں لانے کا سبب بنے، اور اسی وقت ہوگا جبکہ ناول یا قصّہ میں ایسے کردار پیش کیے جائیں گے جو بحیثیت مجموعی ایک انسان ہونے کے ساتھ پڑھنے والے پر صالح اقدار اور نیکی و شرافت کا تاثر دے سکے۔

قصّہ نگاری اور کردار نگاری کی اچھی مثال قرآن کریم میں بھی ملتی ہے وہ آجکل کے فنکاروں اور ناقدوں کے فن کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، اس میں جو حقیقت نگاری ہے اور انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی ـــــــ ناول نگار یا ناقد جب ناول کے کردار کی بات کرتا ہے تو کردار کے احساسات و جذبات کی بھی کرتا ہے، اس لیے کہ کوئی بھی کردار اس وقت تک انسانی زندگی کی تصویر کشی نہیں کرتا ہے جب تک کہ اس کے احساسات اور جذبات کی عکاسی نہ ہو، احساسات و جذبات کی عکاسی صالح افکار و خیالات کی ہو یا غیر صالح افکار و خیالات کی، لیکن وجدان و احساس اور جذبات کے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا ہے۔ اور اس میں شخصیت کا عنصر نہیں پایا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے انسان کے بحیثیت انسان کے اس کے جذبات و احساسات کی تصویر کشی اور انسانی نفسیات کی عکاسی جس انداز سے کی ہے اس سے ایک بہتر معاشرہ کا ایسا تصوّر ابھرتا ہے کہ انسان "انسانیت" کے ساتھ زندگی گزار سکے۔

قرآن کریم میں انسانی نفسیات اور انسان کے احساسات و جذبات اور وجدان کی جو تصویر کشی کی گئی ہے سید قطب نے فنی اعتبار سے اس کی تشریح اور توضیح اپنی کتاب التصویر الفنی فی القرآن میں کی ہے، لیکن نجیب محفوظ نے سید قطب پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ سید قطب نے قرآن کریم کے قصّے کے انسانی کردار کی نفسیاتی تحلیل اور تجزیہ کرنے میں احساسات و وجدان کے جن عناصر کو قصّے کے کردار کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔

درحقیقت وہ شاعری کے عناصر ہیں یعنی جذبات و احساسات اور وجدان کا اظہار اور تخیل کا بیان شاعری کا کام ہے نہ کہ قصّہ کا ــــــ نجیب محفوظ کا یہ اعتراض برائے اعتراض ہے، اس لیے کہ قصّہ کے کردار یا شخصیت کا اظہار اس وقت تک پوری طرح سامنے نہیں آئے گا جب تک بیانیہ، مکالمہ اور عمل سے احساسات اور وجدان کا اظہار نہ ہو۔

ناول درحقیقت، حقیقت اور تخیل کے امتزاج کا نام ہے، حسن تخیل سے اچھے کردار کو ناول میں پیش کیا جا سکتا ہے، پاکیزہ خیالات، جذبات، احساسات اور وجدان سے ناول کے کردار میں تاثیر پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس سے ایک بہتر معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے لیکن ناول نگاروں اور ناقدوں نے ناول کے فن کو غیر انسانی اقدار جس کو وہ انسانی اقدار کہتے ہیں اس سے داغدار کر دیا، اور اس قسم کے ناول نے معاشرہ کو کہاں پہنچا دیا وہ نہایت دردناک اور افسوس ناک ہے، زندگی کی تعبیر و تشریح کے نام پر زندگی کو تباہ و برباد کر دیا، اگر ناول کے فن کا رخ نہ موڑا گیا اور اس کے کردار نگاری کا تصور اور اصول نہ بدلا گیا تو معاشرہ اور دنیا کی زندگی کس عذاب میں مبتلا ہوگی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی

ادب کا تعلق فلسفہ اور سائنس سے

ادب کا تعلق فلسفہ اور سائنس سے ہے۔ لیکن ادب نہ فلسفہ ہے نہ سائنس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب نوع بشر کے سینے میں فطرت کی ایک امانت ہے جس کا ہر مظہر فطرت کی بالیدگی سے عبارت ہے، ادب ٹھہرا ہوا نقطہ نہیں، معاشرتی حدوث وارتقا کا تخلیقی عکس ہے۔ وہ محض زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا، اس کی توسیع بھی کرتا ہے۔ ادب حقیقتوں کا متحرک عکس ہے۔ وہ ایک نامیاتی عمل ہے۔ اس کی کوئی آخری منزل نہیں۔ زندگی، فلسفہ کا آہنگ نہیں، جذبات کا نغمہ ہے جو ادب میں داخلی تاثیر پیدا کرتا ہے۔

ادب کا فلسفہ سے تعلق یہ ہے کہ فلسفہ، ادب میں زندگی کی بصیرت لاتا ہے ادب میں فلسفہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادب میں رونق اور قوت پیدا کرتا ہے، زندگی اپنی دوامی رفتار ارضی میں عقل مفکر سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ ادب میں فلسفہ کی اتنی ہی مقدار کافی ہے جو آثار ادبیہ کو مضبوط اور مستحکم بنائے، لیکن اگر مقصد عقل کی امداد کرتا ہے خالص اصول کے ذریعہ تو وہ علم ہے۔ اس کو عقلیت خالصہ سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ جو نہ فن ہے نہ ادب بلکہ علم ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ

ایک چیز ہے علم فلسفہ اور دوسری چیز ہے فلسفیانہ افکار۔ ادب کا تعلق علم فلسفہ سے نہیں بلکہ فلسفیانہ افکار سے ہے اس کی وجہ ہے کہ فلسفہ حقائق علمی کی تعبیر دقیق انداز میں کرتا ہے۔ وہ شخصیت ادیب کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے فلسفہ، طبیعات، کیمیا اور حساب کا شمار ادب میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اصلاحی زبان میں آثار شخصی کو سمونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ فلسفہ کی علمی زبان، موضوعی مسائل اور حقائق علمی سے بحث کرتی ہے۔ اس میں جذبے کو دخل نہیں ہوتا۔ عقلی اسلوب یا علمی طرز ادا، باریکی میں علم ریاضی کی زبان سے قریب ہوتا ہے بسا اوقات علم ریاضی کی زبان دقیق ترین زبان ہوتی ہے خالص عقل کی تصویر کشی کے لیے اس سے زیادہ سچی یا راست انداز کوئی بھی نہیں ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب اور علم فلسفہ میں فرق ہے۔ اس فرق کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طبیعت علمیہ ہے اور دوسری طبیعت ادبیہ۔ طبیعت علمیہ یا علم فلسفہ کا مقصد اشیاء کا تحلیل و تجزیہ کرنا ہے۔ طبیعت علمیہ، عناصر اور ان کے تعلق بالغیر سے بحث کرتی ہے۔ جب کہ طبیعت ادبیہ اشیاء سے اس طور پر بحث کرتی ہے کہ ان کا تعلق جذبات سے کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ عقل و شعور کے باہمی تعاون سے فن کتابی کی ساخت استوار ہوتی ہے۔ حقیقت عقلیہ اگر جذبے کا دامن چھوڑ دے تو نہ قصیدہ، حیات جاوداں پا سکتا ہے اور نہ افسانہ۔ ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقل و شعور کے درمیان توازن برقرار رکھے۔ فکر اور وجدان دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔

عقلیت اور حسیت میں سے دونوں کو ایک دوسرے پر غالب آنے نہ

دے۔ ان میں سے ہر طاقت کو زندہ رکھے۔ نہ جذبات کا غلام بن جائے اور نہ بندۂ عقل و فلسفہ۔ جذبے کی بندگی سے فکری سطحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور محض عقل کی پاسبانی زندگی کی تنگ و دو میں حیات ادبی کی فطری نشاط کو زائل کر دیتی ہے۔

ادب اور فلسفہ کے تعلق کو مزید واضح کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے اس بات کو سمجھا جائے کہ خود فلسفہ کیا ہے؟ چنانچہ علم فلسفہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ علم جو اشیائے خارجی اور صورت ذہنیہ کے حالات سے بحث کرے، اس کو فلسفہ یا حکمت کہتے ہیں منطق، حکمت کا ایک جزء ہے اسی لیے منطق کو معقولات ثانیہ کہتے ہیں۔ جس کا ظرف عروض ذہن ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو ذہن میں موجود ہوتی ہیں ان کا تعلق منطق سے ہے۔

فلسفہ میں خارجی اور داخلی موجودات دونوں کے حالات سے بحث ہوتی ہے خود فلسفۂ اولی کا محل وقوع بھی ذہن ہے خارج نہیں، کیونکہ وجود اور امکان ذہنی چیزیں ہیں۔ ذہن، کلیات سے بحث کرتا ہے۔ فلسفے کو علم کلّی بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اُن امور عامہ سے بحث کرتا ہے جن کا وجود خارج میں نہیں ہوتا۔ جیسے وجود اور امکان۔ اس لحاظ سے فلسفہ اور منطق دونوں ذہنی چیزیں ہیں۔ ذہن انسانی یا عقل، مدرکِ کلّی ہے۔ اگر ہم وجود اور امکان کا وجود تسلیم کریں تو اس کے تسلسل محال لازم آتا ہے۔ جو باطل ہے۔ مثلاً اگر ہم کتاب کے وجود کو وجود خارج میں مان لیں تو پھر اس کے وجود کا ماننا پڑے گا۔ اور پھر اس وجود کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس طرح غیر منتہی سلسلہ لازم آئے گا جو باطل ہے۔

منطق یا معقولات ثانیہ، کلیت، جزئیت، ذاتیت اور عرضیت سے بحث

کرتی ہے۔ یہی اس کے موضوعات ہیں۔ مطلق حکمت کی دو قسمیں ہیں (۱) حکمت عملی (۲) حکمت نظری۔ حکمت عملی نام ہے ایسی چیزوں کے حالات کے جاننے کا جو ہمارے قدرت واختیار میں نہیں ہیں۔ جیسے انسانی افعال واعمال۔ ان کے حسن وقبح، عدل وظلم کا علم حاصل کرنا حکمت عملی ہے۔ اور حکمت نظری یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے حالات کا جاننا جو ہمارے قدرت واختیار میں نہیں ہیں۔ جیسے زمین، آسمان، وجود، امکان، صفات باری واجب وغیرہ۔ حکمت عملی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اپنی قوت عملی کو کامل بنائے۔ اس طور پر کہ حیات دنیوی واُخروی کو اعمال حسنہ اور فضائل ومحاسن سے آراستہ کرے اور معاش ومعاد کو درست کرے۔ حکمت نظری کا مقصد یہ ہے کہ انسان علوم تصوری اور تصدیقی کے حاصل کرنے میں قوت نظری کا کمال حاصل کرے۔ حکمت نظری کا مقصد کسی چیز کو وجود دینا نہیں بلکہ محسوسات ذہنیہ کا عرفان تمام حاصل کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حکمت عملی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اچھے اعمال سے اپنی دنیا وآخرت سنوارے اور حکمت نظری کا مقصد یہ ہے کہ انسان عقائد کی بصیرت حاصل کرے اور خیالات درست ہوں۔ حکمت نظری کی تین قسمیں ہیں (۱) طبعیات (۲) ریاضیات (۳) الٰہیات۔ وہ امور جو اپنے وجود خارجی اور ذہنی دونوں میں مادے کے محتاج ہوں۔ ان کے حالات کے جاننے کا نام طبعیات ہے۔ جیسے انسان اور حیوان۔ انسان خاص مزاج کے مادے کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ انسان لکڑی یا لوہے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی ہیئت کذائی، ایک خاص مادے سے مرکب ہوتی ہے۔ وہ امور جو اپنے وجود خارجی میں مادے کے محتاج ہوں لیکن ذہن میں مادے کے محتاج نہ ہوں یعنی ایسی چیزوں کے

حالات کا جاننا جو صرف اپنے وجود خارجی میں مادے کے محتاج ہوں جیسے مثلث، مربع یہ چیزیں اپنے وجود ذہنی میں کسی مادے کی محتاج نہیں۔ بلکہ لکڑی لوہے کسی بھی مادے کی شکل میں ان کو متصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ریاضیات کہتے ہیں۔ ایسی چیزوں کے حالات کا جاننا جو اپنے وجود ذہنی اور خارجی کسی میں مادے کا محتاج نہ ہوں۔ اس کو الٰہیات کہتے ہیں۔ جیسے اللہ، وجود، امکان۔

حکمت الٰہیہ، مطلق حکمت کی قسم ہے۔ الٰہیات، معقولات اولیٰ اور ثانیہ دونوں سے بحث کرتی ہے روح اور عقل جو مشائیین کے نزدیک مجردات ہیں۔ وہ بھی اس میں داخل ہیں متکلمین سوائے خدا کے کسی کو مجرد نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک روح اور عقل مادی چیزیں ہیں۔ اس کو الٰہیات کہتے ہیں۔ وجود، مفہومات ذہنیہ میں سے ہے۔ خارجیہ سے نہیں۔ اس اعتبار سے مفہومات عقلیہ یا فلسفہ اولیٰ اور مفہومات شاملہ یا معقولات ثانیہ یعنی منطق بھی الٰہیات میں شامل ہے۔ اختراع اور انتزاع فلسفہ کی اصلاحات ہیں۔ اختراع یہ ہے کہ جس کا منشا بھی خارج میں موجود نہ ہو جیسے شریک باری تعالیٰ اور انتزاع یہ ہے کہ چیز تو موجود نہیں ہے مگر اس کا منشا خارج میں موجود ہے جیسے ریاضیات کی اصطلاحیں۔

حکمت نظری کی طرح حکمت عملی کی بھی تین قسمیں ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ (۱) تہذیب اخلاق (۲) تدبیر منزل (۳) سیاست مدنی و ملکی۔

شخصی اعمال کے نفع نقصان کو جاننا اور ان پر عمل درآمد کرنے کا نام تہذیب اخلاق ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی معاش و معاد کو درست کرے۔ نیکیاں حاصل کرے اور برائیوں سے بچے۔ گھریلو آداب معیشت کے سنوارنے کا

نام تدبیر منزل ہے۔ مثلاً یہ جاننا کہ ماں باپ کے حقوق کیا ہیں، بہن بھائی کا کیا درجہ ہے؟ آقا اور غلام کا کیا رشتہ ہے؟ اچھا سلوک بہتر برتاؤ، پاکیزہ فضائل و عادات کی اجتماعی منزلی ہیئت کا نام تدبیر منزل ہے۔ اور شہری و ملکی امور میں نفع، نقصان کے جاننے کا نام سیاست مدنی و ملکی ہے۔

فلاسفہ حکمت عملی سے بحث نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ اور ان کی قائم کردہ شریعت سے پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فلاسفہ حکمت نظری کی قسم۔ ریاضیات سے مع اس کی چاروں قسمیں (۱) حساب (۲) ہندسہ (۳) ہیئت (۴) موسیقی سے بھی بحث نہیں کرتے۔ فلاسفہ صرف الٰہیات اور طبعیات سے بحث کرتے ہیں۔ اس کی غالب وجہ یہ ہے کہ ریاضیات کی بناء خیالی چیزوں پر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ طبعیات کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان چیزوں کے حالات جاننا جو اپنے وجود ذہنی اور خارجی مادۂ خاص کی محتاج ہوں۔ جیسے انسان، حیوان، اس علم کی غرض و غایت یہ ہے کہ قوت نظری میں کمال حاصل ہو۔ طبعیات کا موضوع جسم طبعی یا جسم طبیعی ہے۔ اس طور پر کہ وہ حرکت اور سکون والا ہے۔ یعنی متحرک اور ساکن ہے یا تغیر پذیر ہے۔ جسم کا اطلاق دو معنوں میں آتا ہے۔ (۱) جسم طبیعی (۲) جسم تعلیمی۔ مادہ اور صورۃ جسمیہ ہر دو جوہر کے مجموعے کو جسم طبعی کہتے ہیں۔ وہ جوہر مرکب محسوس جس کا وجود بداہتاً معلوم ہو۔ لیکن درحقیقت جسم طبعی معقول چیز ہے محسوس نہیں۔ جو اپنے وجود میں زمان، مکان اور حیز کا محتاج ہے۔ وہ خود محل ہے باقی سب عوارض ہیں۔ جیسے موم بذاتہٖ جو مادہ اور صورۃ سے مرکب جوہر ہے یہ جسم طبعی ہے۔ اور اس سے جو مختلف شکلیں بنتی ہیں مثلاً

موم بتی وغیرہ وہ جسم تعلیمی ہے۔ جسم طبعی جوہر ہے اور جسم تعلیمی عرض ہے۔ غرض جسم تعلیمی وہ عرض ہے جس میں ابعاد ثلثہ یعنی طول، عرض اور عمق ہوں۔ جسم تعلیمی، حکمت تعلیمی یا حکمت ریاضیہ یعنی ریاضیات کا موضوع ہے۔ اور جسم طبعی، طبعیات کا موضوع ہے۔ فلسفہ میں جسم کی تعریف یہ ہے کہ اس میں طول عرض، عمق ہو۔ جسم طبعی وہ جوہر مرکب ہے جو ہیولیٰ اور صورۃ (دو جوہر) سے ترکیب پائے۔ جیسے پانی، برتن کے بدلنے سے اس کی کمیت بدل جاتی ہے۔ لیکن ہیولیٰ باقی رہتا ہے۔ کم یا کمیت۔ طول، عرض اور عمق کو کہتے ہیں۔ انہی کو ابعاد ثلثہ کہتے ہیں۔ ابعاد ثلثہ کا محل، جسم طبعی ہے۔ اہل فلسفہ نے جسم کی تعریف یہ کی ہے۔

الجسم الطبيعي، هوالجوهر الطويل العريض العميق بمعنى أنه جوهر "يمكن أن يغرض فيه ابعاد"۔

یعنی جسم طبیعی وہ جوہر ہے جو طویل، عریض اور عمیق ہو۔ جس میں ابعاد ثلثہ یعنی طول، عرض اور عمق کا وقوع ممکن ہو۔ یا ان کا ممکن ہونا فرض کیا جا سکے۔ جسم طبعی ایک ایسا جوہر ہے کہ جس میں ایک بُعد کو فرض کیا جائے تو وہ طول ہے پھر ایک دوسرا بعد فرض کیا جائے جو پہلے بُعد کو کاٹ رہا ہو زاویۂ قائمہ کے ذریعہ تو وہ عرض ہے پھر ایک تیسرا بعد فرض کیا جائے جو ان دونوں ابعاد کے نقطۂ تقاطع میں نفوذ کیے ہوئے ہو تو وہ عمق ہے۔ جیسے

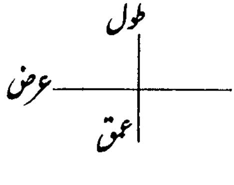

اس تعریف میں جوہر کی شرط جنس ہے اور باقی ابعاد فصل ہیں۔ امکان کی شرط اس لیے ہے کہ من حیث الجسمیۃ تقاطع ممکن ہے۔ ورنہ ہر چیز کا تقاطع نہیں ہوتا۔ فرض سے مراد واقعی نفس الامر ہے۔ فرض سے مراد اختراع یا خیال نہیں۔ کیونکہ اگر فرض سے مراد عام لے لیں جو محض خیالی اور اختراع ہو تو پھر اس میں مجردات۔ یعنی روح، اور عقل بھی داخل ہوجائیں گے۔ حالانکہ مجردات میں ابعاد ثلثہ کا فرض کرنا ایسا ہے جیسے ناممکن کو فرض کرنا۔

جوہر۔ ماہیت ممکنہ کو کہتے ہیں۔ اور طبیعت اس کو کہتے ہیں جو بالذات حرکت اور سکون کا مبدأ ہو۔

اب بحث یہ شروع ہوتی ہے کہ جسم طبعی مفرد یا ہے مرکب۔ اگر جسم طبعی مرکب ہے تو وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ا۔ یا تو وہ مختلف طبیعتوں والے جسموں سے مرکب ہوگا جیسے حیوان کہ وہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے مرکب ہے۔

(۲) یا پھر وہ ایک جیسی طبیعت والی جسموں سے مرکب ہوگا جیسے خاک کے دو ذرّے اب اگر جسم طبعی مفرد ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جسم مفرد قابل تقسیم ہے یا نہیں۔ اگر قابل تقسیم ہے تو اس کے اجزاء کیسے نکلتے ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اور فلسفہ کی اصل بنیاد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ بظاہر بات یہ ہے کہ جسم مفرد قابل تقسیم ہے۔ ورنہ خط یا سطح کا جوہری ہونا لازمی آئے گا۔

جسم مفرد کی تقسیم سے جو اجزاء حاصل ہوتے ہیں وہ یا تو اس جسم مفرد میں بالفعل موجود ہیں۔ یا بالفعل تو موجود نہیں ہیں۔ لیکن اس میں موجود ہونے کی صلاحیت ہے یعنی وہ اجزاء جسم مفرد میں بالقوہ موجود ہیں۔ اب یہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔

یا تو وہ اجزاء متناہی (ختم ہونے والے) ہوں گے یا غیر متناہی ہوں گے۔ اس طرح جسم مفرد کی تقسیم کے بعد چار صورتیں ہو گئیں۔

۱۔ اجزائے ممکنہ مقداری متناہی موجود بالفعل

۲۔ اجزائے ممکنہ غیر متناہی موجود بالفعل

۳۔ اجزائے ممکنہ متناہی موجود بالقوہ

۴۔ اجزائے ممکنہ غیر متناہی موجود بالقوہ

یہ چار مذاہب ہیں۔ ان ہی پر فلسفہ کے تمام مذاہب کا دارومدار ہے۔ ان میں سے پہلا مذہب یعنی اجزائے ممکنہ متناہی موجود بالفعل غیر متجزّی، متکلمین کا مذہب ہے۔ غیر متجزّی یعنی ناقابل تقسیم اس لیے کہا کہ اگر جزء میں تقسیم ہوئی تو وہ جسم مفرد نہیں ہوا بلکہ جسم مرکب ہوا۔ مقداری، جس میں طول، عرض، عمق ہو۔ جسم تعلیمی اور جسم مقداری ایک چیز ہے۔ متکلمین اجزائے ممکنہ موجود بالفعل کو متناہی اور غیر متجزّی مانتے ہیں۔ جزء لایتجزّی کا دوسرا نام جوہر فرد بھی ہے جو مقداری نہیں۔ یعنی اس میں طول، عرض، عمق نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ ناقابل تقسیم ہے۔ لیکن فلاسفہ جزء لایتجزّی یا جوہر فرد کو تسلیم نہیں کرتے۔ خط، طول، بلا عرض اور عمق کو کہتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ منتہائے سطح کو خط کہتے ہیں۔ اور سطح مجموعہ طول وعرض کو کہتے ہیں۔

دوسرا مذہب یعنی اجزائے ممکنہ متناہی موجود بالقوہ، عبدالکریم شہرستانی کا مذہب ہے۔ ان کے نزدیک جسم اگرچہ متصل واحد ہے لیکن اس میں بالقوہ اجزا کی صلاحیت ہے۔ جو متناہی طور پر تقسیم ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایک منزل ایسی آتی ہے جب اجزاء تقسیم نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اجزاء غیر متجزّی ہیں۔ اس مسلک کو انھوں نے اپنی کتاب الملل والنحل میں بیان کیا ہے۔

تیسرا مذہب اجزائے ممکنہ غیر متناہی موجود بالفعل، نظام معتزلی کا مسلک ہے نظام مشہور معتزلی فلسفی ہے۔ جس سے اعتزال میں فرقۂ نظامیہ منسوب ہے اس کے نزدیک ہر جسم فی الحال اجزائے لامتناہی پر مشتمل ہے۔

جزء لایتجزی وہ جوہر ہے جو کسی بھی طریقۂ تقسیم سے منقسم نہ ہو سکے۔ اس جوہر کو جوہر فرد بھی کہتے ہیں۔

چوتھا مذہب یہ ہے کہ اجزائے ممکنہ غیر متناہی موجود بالفعل ہیں۔ یہ فلاسفہ کا مذہب ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک جسم فی نفسہٖ متصل واحد ہے۔ اور یہ اتصال ذاتی ہے۔ خارجی نہیں۔ فی الحال اس میں کوئی اور مفصل جوڑ نہیں لیکن اگر اس کو غیر متناہی طور پر تقسیم کیا جائے تو اس میں انقسام کی صلاحیت موجود ہے۔ اس تقسیم کی کوئی نہایت نہیں۔ تقسیم بلا نہایت ہے۔ اس لیے اجزائے ممکنہ، متجزّی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ، جزء لایتجزی کو نہیں مانتے بلکہ جزء کو قابل تجزّی مانتے ہیں۔ اور وہ بھی لامتناہی طور پر۔ فلاسفہ کی طرح مشّائیں اور اشراقیین کا بھی یہی مذہب ہے۔ متکلمین کا یہ مذہب نہیں۔ وہ جزء کو جزء لایتجزّی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک جوہر فرد، غیر متجزّی ہے۔

یہ وہ مباحث ہیں جو علم فلسفہ میں آتے ہیں۔ اور جن کا تعلق ادب سے نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز علم فلسفہ ہے اور دوسری چیز فلسفیانہ افکار ہیں۔ ادب کا تعلق علم فلسفہ سے نہیں بلکہ فلسفیانہ افکار سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ افکار کون سے ہیں جن کا تعلّق ادب سے ہے۔ اور جن سے مسلم مفکرین نے بحث کی ہے۔

مسلم مفکّرین میں پہلا نام بوعلی سینا کا ہے۔ جو ازبکستان کے شہر بخارا کے رہنے والے تھے۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا شہرۂ آفاق عقلی فلسفی ہیں۔ انھوں نے منطق، طبیعات اور مابعد الطبیعات پر کتابیں لکھیں۔ انھوں نے فلسفے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا۔ فلسفے میں ان کی مشہور کتابیں کتاب الشفاء (۲) النجات (۳) اشارات ہیں۔ بوعلی سینا کی ان کتابوں نے مشرقی اور مغربی فلسفے پر گہرا اثر ڈالا۔

مسلم مفکرین میں دوسرا نام فارابی کا آتا ہے۔ جو ترکستان کے شہر فاراب کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے فارابی کہلائے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فاراب اور بخارا میں حاصل کی تھی۔ وہ وسط ایشیا کے عظیم مفکر اور فلسفی تھے۔ انھوں نے طبیعات اور الٰہیات پر کتابیں لکھیں۔ فارابی نے ارسطو کی متعدد کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ اسی لیے ان کو معلم ثانی کہا گیا۔ شیخ بوعلی سینا نے فارابی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ابن سینا نے فارابی کے مقابلے میں روح، مادہ، خدا اور دنیا کی دوئی کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا ہے۔ امام غزالی نے ان کے عقلی استدلال پر تنقید کی ہے۔ فارابی یونانی مکتب فکر کے مقابلے میں مسلم فلسفے کے اسکول آف تھاٹ کا موجد ہے۔ فلسفے میں فارابی کی کتاب کا نام فی اغراض مابعد الطبیعات ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے فارابی سے عقل سیکھی۔ انگریز فلسفی اسپنسر نے بھی فارابی سے اس حد تک استفادہ کیا کہ وہ حیات بعد الممات کا قائل ہو گیا۔ بوعلی سینا، ابن رشد، رازی، رومی غزالی سب فارابی سے متأثر ہوئے ہیں۔

مسلم مفکرین میں تیسرا نام عمر خیام کا ہے۔ عمر خیام اگرچہ نیشاپور کا رہنے والا تھا لیکن بخارا (ازبکستان) میں اس نے کافی عرصہ قیام کیا۔ یہیں اس نے اپنی کتاب

الجبر والمقابلہ لکھی۔ علوم ریاضی، الجبرا اور اقلیدس سے خیام کو دلچسپی تھی۔ فلسفۂ فناء وبقا پر اس کی ایک رباعی ہے ؎

روزے کہ تو گذشتہ باشد یادمکن فرداکہ نیامدامت، فریادمکن

ازآمدہ وگذشتہ، اندیشہ مدار حالاخوش باش وعمر بربادمکن

مسلم مفکّرین میں ایک اور نام ابوریحان البیرونی کا ہے۔ بروفولٹ نے اپنی کتاب۔ تعمیر انسانیت اور سارٹن نے ہسٹری آف سائنس میں لکھا ہے کہ بیرونی جھیل ارل (ARAL) کے قریب خیوا کے شہر میں پیدا ہوا، جو ازبکستان اور قزاقستان کے درمیان واقع ہے۔ البیرونی فلسفی اور سائنسداں تھا۔ علم طبیعات میں دستگاہ رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں بیرونی کی کتاب الہند سے استفادہ کیا ہے۔ البیرونی نے دریافت کیا کہ روشنی آواز سے زیادہ تیز رفتار ہے۔

وسط ایشیا کے مسلم مفکرین میں ایک نام محمد بن موسیٰ الخوارزمی کا ہے وہ خوارزم (ازبکستان) جدید خیوا میں پیدا ہوا۔ جو دریائے آمو یعنی جیحون کے نشیبی علاقے میں واقع ہے۔ اس نے یورپ کو الجبرا سے متعارف کرایا۔ جو ریاضی کی قسم ہے۔ وہ الجبرا موجد تھا۔ یہ ہیں وہ مسلم مفکرین جنھوں نے فلسفہ طبیعات اور مابعد الطبیعات کو اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کون سے فلسفیانہ افکار ہیں جن کا تعلق ادب سے ہے۔ تو ان میں سے کچھ یہ ہیں (۱) خیر وشر (۲) جبر وقدر (۳) وجود خداوندی (۴) آزاد ارادہ واختیار (۵) خیر ایجابی خیر سلبی (۵) مُثُل SUMMUMBONUM (۶) وحدۃ الوجود (۷) وحدۃ الشہود۔

اب جہاں تک ادب کا تعلق سائنس تعلق کا مسئلہ ہے تو عرض یہ ہے کہ

جس طرح ادب کا تعلق فلسفے سے ہے۔ لیکن ادب فلسفہ نہیں۔ اسی طرح ادب کا تعلّق سائنس سے ہے لیکن ادب سائنس نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب کا تعلق سائنس سے ہے اس طور پر کہ سائنس نام ہے مطالعہ فطرت کا اور ادب کا موضوع بھی فطرت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہم نے زمین و آسمان کو تمہارے لیے مسخر بنا دیا۔ اسی کو اقبال نے کہا ہے ؎

محبّت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

مسلم سائنسدانوں میں الخوارزمی، ریاضی میں جدید یورپ کا معلّم تھا۔ اس نے فلکیاتی جدولیں اور زیچے ترتیب دیں۔ اس نے بطلیموس کے جغرافیہ کی کتابوں کی تصحیح کی۔ اور صورۃ الارض کے نام سے اپنی الگ کتاب لکھی۔ مسلم سائنسدان خیام نے جیومیٹری کو علم کے مرتبے تک پہنچایا۔ اور حکیم اقلیدس کی کتاب مصادرات پر اضافہ کیا۔ مسلم سائنسداں البیرونی نے روس اور شمالی یورپ کا جغرافیہ تحریر کیا۔ اسی طرح وسط ایشیا کے مسلمان ماہرین ارضیات نے زمین کا محیط دریافت کیا اور یہ ثابت کیا کہ زمین گول ہے اور متحرک ہے۔ اسی بنیاد پر گلیلیو نے بعد میں اس بات کا دعویٰ کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ مسلم سائنسدانوں کا ہے۔ جس کو بعد میں گلیلیو کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

مسلم سائنسدانوں میں ابن سینا اور فارابی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے استقرائی طریق استدلال پر زور دیا۔ مغرب نے استقرائی طریق استدلال انھیں مسلمانوں

سے سیکھا۔ چنانچہ بیکن نے استقرائی INDUCTIVE طریقے کی وکالت کی۔ ڈیکارٹ نے شک سے اثبات کا راستہ نکالا۔ یہ بوعلی سینا کا مسلک ہے۔ غزالی نے ابن سینا پر تنقید کرتے ہوئے فلسفۂ یونان کا رد لکھا۔ اور اپنی کتاب تہافۃ الفلاسفہ لکھی۔ ابن رشد نے امام غزالی کا رد تہافۃ التہافۃ کے نام سے کیا۔ اس کے نزدیک روح ایک شئی بسیط ہے۔ یونان کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات ایک بے حس و حرکت وجود ہے۔ اس میں سکون و جمود ہے۔ کسی تغیر یا اضافے کی گنجائش نہیں۔ اہل یونان کی نظر متناہیت پر تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کائنات متناہی ہے۔ محدود ہے۔ اہل یونان کے برعکس مسلم سائنسدانوں نے زندگی کا حرکی تصور پیش کیا۔ چنانچہ البیرونی ۱۰۴۸ء اور الخوارزمی ۸۴۷ء نے نظریہ حرکت و تغیر کو فروغ دیا۔

ملا جلال الدین دوانی اور فخرالدین عراقی ۱۲۸۷ء نے وقت کا اضافی تصور دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس پر آئن سٹائن ۱۸۷۹۔۱۹۵۵ء نے اپنے فلسفۂ اضافیت کی بنیاد رکھی۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت بہت بعد کا ہے۔ آئن سٹائن سے پہلے مسلم فلاسفہ اس نظریے کو جنم دے چکے تھے۔ چنانچہ عراقی نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے غایۃ الزمان فی درایۃ المکان اس میں اس نے نظریہ زمان و مکان سے بحث کی ہے۔ عراقی سے چھ سال بعد کانٹ اور ڈیکارٹ نے مسلم فلاسفہ سے استفادہ کیا۔ کانٹ، غزالی کے بعد پیدا ہوا۔ کانٹ کی تنقید عقل محض، اشاعرہ کے نظریۂ عقل کی آواز بازگشت ہے۔ اشاعرہ نے عقل کو محدود اور نارسا قرار دیا۔ اشاعرہ نے نظریہ عینیت دیا یعنی حقیقت غیر مادی ہے۔ اور عقل سے ماوراء ہے۔ کانٹ نے اپنی کتاب

The critique of Pure Reason میں عقل کی اسی نارسائی کو پیش کیا۔ اور کہا ہے کہ فکر متناہی ہے۔ اس لیے وہ لامتناہی خدا تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ خالص اسلامی فکر ہے۔ ابوالعلاالمعری خدا کے وجود میں شک کرتا تھا۔ اسی سے رواقیت یعنی Stoicism کا فلسفہ پیدا ہوا۔ نظریہ زمان و مکان اور حرکت و تغیر کی طرح رواقیت کا تعلق بھی ادب سے ہے۔ لاک، عقل کے اور خدا کے وجود کا اعتراف کرتا ہے۔ ہیوم Hume تشکیک کا شکار ہے۔ تشکیک اور علت و معلول کے مسائل ادب میں آتے ہیں۔

برگسان، عقل اور دماغ میں فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عقل قوت ہے۔ دماغ مادہ ہے۔ برگسان کا نظریہ وجدان Intution مسلم مفکرین کے نظریہ عقل استقرائی کی دوسری شکل ہے۔ وسط ایشیا کے مسلم مفکرین کے کلامی مناقشات نے عقلیت کو فروغ دیا۔ اشاعرہ کا تعلق وسط ایشیا سے نہ تھا۔ مگر انھوں نے عقلیین کے نظریۂ مادہ پر ضرب کاری لگائی۔ اشاعرہ ایک تحریک تھی۔ اس کے بانی حسن الاشعری ۸۷۳۔۹۴۱ء تھے۔ عقلیین کے مقابلے میں اشاعرہ صفات الٰہی اور وجود واجب کے قائل تھے۔ اس تصوّر سے عقلیت کے خلاف ردعمل سے ادب میں مابعد الطبیعات اور الٰہیات کو فروغ ہوا۔

اشاعرہ نے ایران کے نظریہ ثنویت (ظلمت و نور) کو مسترد کیا۔ امام فخرالدین رازی کا تعلق وسط ایشیا سے نہ تھا۔ لیکن انھوں نے جبر کا نظریہ پیش کیا۔ رازی نے فلسفہ پر سخت تنقید کی۔ اسی طرح شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول ۱۲۳۴ء نے اپنی کتاب "حکمۃ الاشراق" میں وحدت الوجود سے بحث کی۔ وہ

فلسفہ اشراق کے بانی تھے۔ حقیقت نور ہے یہ اشراقی نظریہ ہے۔ وسط ایشیا کے مفکر، عمر خیام لاادری تھے۔ ملا صدرا کا فلسفہ، ابن سینا کے فلسفے کی تجدید ہے۔

غرض عقل استقرائی، رواقیت، عینیت، وجدان، وجود واجب، زمان ومکان، شک وتشکیک، حکمت اشراق، اشاعرہ، طبیعات، الہیات، ظلمت ونور، حرکت وتغیر یہ وہ فلسفیانہ افکار ہیں جن کا تعلق ادب سے ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ ادب کا تعلق فلسفے سے ہے لیکن ادب محض فلسفہ نہیں۔ اسی طرح ادب کا تعلق سائنس سے ہے لیکن ادب علم سائنس نہیں۔

کتابیات

1- Sarton, George: History of science, Newyork 1925

2- Brockelmou: History of Arab Science, London, 1959

3- Encyclopaedia of Islam: Leidn 1936

4. Breifault: The making of Humanity

5. Bergson: creative Evolution

6- Russell: History of western Philosophy.

۷۔ قلقشندی: صبح الاعشی

۸۔ مدارک التنزیل: النسفی، ابوالبرکات حافظ الدین

۹۔ دائرۃ المعارف: محمد فرید وجدی

۱۰۔ تہذیب التہذیب: حافظ ابن حجر عسقلانی

۱۱۔ کتاب تجارب الامم : مسکویہ، ابوعلی احمد بن محمد
۱۲۔ منہاج السنّۃ : ابن تیمیہ
۱۳۔ العروۃ الوثقی : جمال الدین افغانی
۱۴۔ کتاب المحصل : امام رازی
۱۵۔ کتاب الفرق بین الفرق : ابومنصور بغدادی
۱۶ اصل الانواع : ڈارون
۱۷۔ زوال مغرب : اشپنگلر
۱۸۔ تنقید عقل محض : کانٹ

مراجع

۱۔ خیرآبادی، فضل امام : مرقاۃ (منطق)
۲۔ خیرآبادی، فضل حق : ہدیۂ سعیدیہ (فلسفہ
۳۔ خیرآبادی، عبد الحق : شرح ہدایۃ الحکمۃ (فلسفہ)
۴۔ اَبہری، اثیرالدین : ہدایۃ الحکمۃ (فلسفہ کی بنیادی کتاب)
۵۔ میبذی : (شرح ہدایۃ الحکمۃ)
۶۔ صدریٰ : (شرح ہدایۃ الحکمۃ)
۷۔ شمس بازغۃ : (فلسفہ)
۸۔ زینبی، سید علی : الاضافۃ القدسیۃ
۹۔ ابن جوزی، ابوالفرج عبدالرحمٰن محدث : تلقیح فہوم اہل الأثر فی عیون التاریخ والسیر

منطق

۱۰۔ اَبْہری، اثیر الدّین : ایساغوجی

ایساغوجی : یونانی لفظ ہے۔ معنی کلیات خمسہ۔ منطق میں کلیات خمسہ سے بحث ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نام رکھا گیا۔ نام ایک حکیم ماہر منطق کا۔

۱۱۔ شیرازی، قطب الدین : قطبی

۱۲۔ بہاری، محبُّ اللہ : سُلّم

۱۳۔ شرح تہذیب :

۱۴۔ مُلاّ حسام الدین : قال اقوال۔ شرح ایساغوجی

۱۵۔ مُلاّ مبین فرنگی محلی :
۱۶۔ مُلاّ حسن فرنگی محلی :
۱۷۔ حمدُ اللہ شرح سُلّم
۱۸۔ قاضی مبارک
(سُلّم کی شرحیں)

۱۹۔ دوّانی، مُلاّ جلال : مُلاّ جلال

۲۰۔ ہَرَوِی، میر زاہد : میر زاہد (ہرات۔ بہار)

جمیل عظیم آبادی

نعتیہ دوہے

پاک نام محمدؐ نام ہے ان کا اللہ کے ہیں میت
اُن کے رستے جو چل نکلا اس کی ہوگی جیت

اُن کے جیسا کوئی نہیں ہے کوئی نہیں دوان
سب نبیوں میں اتم وہ ہیں اتم ہے استھان

شہر مدینہ جنّت میری قبلہ میرا کعبا
جگمگ جس سے نین کٹورے جھلمل جس سے ماتھا

میرے نبیؐ کے گُن مت پوچھو، انکی انوکھی بات
اُنؐ کے کہنے سے پتھر بولے، بولے ڈالی پات

میرے نبیؐ کے جگمگ درپن، جگمگ ان کی ساکھ
اُن کے آگے مدھم سورج ابھرے سورج لاکھ

دونوں جگ کا کون ہے داتا ہم سب تھے انجان
میرے نبیؐ نے کروائی ہے اللہ کی پہچان

طیبہ کے دن رات برابر چاروں اور اُجیارا
جس کے سندر تاپر لوٹے سورج چاند ستارا

عزیز احسن

نعت شریف

نہ تو لوح کا تھا گماں کوئی نہ قلم دوات کا سلسلہ
ترے نور کا یہ طفیل ہے کہ چلا حیات کا سلسلہ

وہ جو نقشِ حسن تمام تھا اسے پہلے خلق کیا گیا
اسی نقش کا تو یہ فیض ہے کہ ہے کائنات کا سلسلہ

یہ نیا بتوں کا شعور بھی اسی مدرسے کی تو دین ہے
درِ مصطفٰیؐ کی زکوٰۃ ہے یہ شعور ذات کا سلسلہ

ہے جو کائنات میں روشنی، یہ جمال روئے نبیؐ سے ہے
اسی آفتاب سے کٹ گیا ہے طویل رات کا سلسلہ

میں نبیؐ کے شہر کو چھوڑ کر جو دیارِ غیرہ میں آگیا
تو کھلا کہ خواب و خیال تھا مری واردات کا سلسلہ

ترے در کو دیکھ کے اب نہیں کوئی آرزو مگر ایک ہے
کہ درود پاک پہ ختم ہو مری بات بات کا سلسلہ

شہ دوسرا، نگہہ کرم، مجھے پھر ستانے لگے الم
مجھے پھر ڈرانے لگا ہے اب نئی مشکلات کا سلسلہ

میں عزیزؔ نعت نبیؐ لکھوں تو امید ہے کہ پہنچ سکے
مری ذات تک بھی جزا کے دن کرم و نجات کا سلسلہ

ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی

بادۂ عرفاں

(۱)

دام ہوس وجاہ ومناصب میں نہ رکھا　　شادابیٔ خاطر کو مصائب میں نہ رکھا
دانش کے تو برعکس نہیں غیب پہ ایماں　　خوشبو کو خدا نے کسی قالب میں نہ رکھا
انعام کا لالچ ہے مگر عزم ہے مفقود　　اب ذوق طلب وقت نے طالب میں نہ رکھا
افکار پریشاں سے توکّل کو غرض کیا　　دل اپنا کبھی فکر عواقب میں نہ رکھا
دانشوریٔ عصر پہ ماتم کا ہے یہ وقت　　فرق سر مو حُسن ومعائب میں نہ رکھا
اللہ محافظ ہے تو پھر کیسے یہ اوہام　　دل کو کبھی اندیشۂ غاصب میں نہ رکھا
اخلاص وہ کیا ہے جو ہو محتاج نمائش　　میں نے اسے ایوانِ عجائب میں نہ رکھا

(۲)

میں شائق جگر لخت لخت ہونے لگا　　مرا رویّہ مرے حق میں سخت ہونے لگا
یہ اور بات ہے شاہی مری ہے تم سے نہاں　　یہ بوریا ہی مرے حق میں تخت ہونے لگا
بیاں کیا کروں اپنے اثاثے کی تفصیل　　کہ اِک جگر تھا وہ بھی لخت لخت ہونے لگا
نہ پوچھیے مرے دل کا کمالِ استغناء　　کہ بے نیاز جم وتاج وتخت ہونے لگا

قفس میں آکے نشاطِ چمن کو بھول گئے بچھونا نرم جو کل تھا وہ سخت ہونے لگا

(۳)

یہ نکتہ تم نے کبھی دھیان میں نہیں رکھا خدا نے چین کو ایوان میں نہیں رکھا
عجیب لوگ ہیں اوروں کو تولنے والے کہ خود کو تولنے میزان میں نہیں رکھا
نہیں ہے نورِ قناعت حریص کے دل میں خدا نے سونے کو اس کان میں نہیں رکھا
نمائشِ گلِ زخمِ جگر نہیں منظور کہ اس کو میز کے گلدان میں نہیں رکھا
ہے مشرکوں کی صفت پیروی توہم کی یہ وصف حق نے مسلمان میں نہیں رکھا
یہی ہے اپنے سکون و قرار کا اک راز کہ دل کو الجھا کے ارمان میں نہیں رکھا

مجھے جو غم ہے، خلش اس کی ہے جدا فطرتؔ
یہ غم تو میر کے دیوان میں نہیں رکھا

غزل

غفلت میں ہوئی اوقات بسر اے عمر گریزاں کچھ نہ کیا
تھی فکر وصال یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا

واعظ نے خموں کو چور کیا، تر کردی زمیں اے پیر مغاں
ظالم نے ذرا تیرا بھی لحاظ اے رہبر ایماں کچھ نہ کیا

مے پینے کا دل میں جوش نہ تھا ظاہر کی طلب تھی ہوش میں آ
ساقی نے ملایا زہر اگر اے منکر احساں کچھ نہ کیا

سنتا ہوں عدو کو خاک کیا مٹی میں ملایا جسم اس کا
پھونکا نہ جلا کر مجکو اگر اے شعلۂ ہجراں کچھ نہ کیا

تربت پہ بلائے گا ان کو یہ خام خیالی ہے دل کی
وہ گھر میں کرے گا کیا جاکر جس نے سر میداں کچھ نہ کیا

تکلیف کسی کو گر پہنچی، کیا اس میں تکلّف سوچ ذرا
حیراں رکھا گر قاتل کو اے دیدۂ حیراں کچھ نہ کیا

جنبش سے تری مقتل ہوتا اک آن میں دشت کرب و بلا
عشاق کی بے باکی کا عوض اے ابروئے بُرّاں کچھ نہ کیا

اٹھا نہ عراق و شام و حلب دنیا نہ ہوئی ویراں تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خون مسلماں کچھ نہ کیا

اے ننگ جہاں اے شاد بتا کچھ آتی ہے تجکو شرم و حیا
اے جہل مرکب اے حیواں اے بے خبر انساں کچھ نہ کیا

سفر نامہ حرمین شریفین

جدید تحدیات کے تناظر میں

حرفِ آغاز

تعارف عالمی رابطہ ادب اسلامی، پاکستان

"ادب" کے لغوی معنی عادت، موروثی معیار، طرزِ عمل اور ایسے دستور العمل کے ہیں جو انسان اپنے آباء واجداد سے حاصل کرتا ہے، اس کے علاوہ یہ لفظ روحانی صفات حسنہ، حسن تربیت، شائستگی اور خوش خلقی کا مفہوم بھی رکھتا ہے، جبکہ اصطلاحی طور پر "ادب" ایک ایسے "ملکے" (Talent) سے عبارت ہے جو انسان کو کسی عیب دار فعل کے انجام دینے سے مانع ہو۔

ابتداءً اسلامی تاریخ میں ادب کا لفظ اس مجموعی علم کے لیے استعمال ہوتا تھا جس سے کوئی شخص "شائستہ" اور مہذب بنتا تھا، یعنی جس سے متعلقہ فرد ثقافت دنیوی سے آراستہ ہوتا، چنانچہ اس عنوان کے تحت شعر، فن خطابت اور قدیم عربوں کی قبائلی اور تاریخی روایات سے متعلقہ علوم، مثلاً بلاغت، نحو، لغت اور عروض وغیرہ شامل سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے مکمل ادیب وہ شخص تصور ہوتا تھا جو اشعار، ایام العرب اور عرب تہذیب و ثقافت کے شاعرانہ، تاریخی اور استنادی پہلوؤں سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس تعریف کی رو سے الجاحظ، ابو حیان التوحیدی، التنوخی اور ابن المقفع جیسے لوگوں کو ادیب قرار دیا گیا۔

عصر جدید میں ادب اور ادیب کے الفاظ میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور ادب کو لٹریچر (Literature) کے مترادف قرار دیا گیا۔ یہاں تک تو غنیمت تھا، مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ "ادب" سے محض خیال آرائی اور افسانہ طرازی کو ہی مراد لیا جانے لگا

اور ہر ایسا شخص ادیب قرار پایا جس کا ذہن وفکر مذہبی حدود وقیود سے آزاد ہو اور جو ادب کو اپنی ذہنی یبوست اور قنوطیت پھیلانے کا ذریعہ سمجھتا ہو، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ادب ادب ہے خواہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبرؑ کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفے میں ہو۔ اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کی جائے کہ دل پر اثر ہو۔ کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی۔ سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے"

(کاروان ادب، شمارہ اول، پیغام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص۵).

اس اعتبار سے ادب عالی سے مراد وہ ادب ہے جو کسی آسمانی کتاب میں ہو، کسی پیغمبر کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہو، یا کسی دینی مصلح کے افکار سے رشتہ رکھتا ہو اور "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" (دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے) کا مصداق ہو.

گو یہ بات ہوا کی مخالف سمت سفر کرنے سے زیادہ مشکل اور زیادہ مشقت خیز ہے، لیکن آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو نام نہاد ترقی پسندی، اباحیت اور مادر پدر آزادی کے خلاف اپنا چراغ جلائے بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی سر فروش، درد مند اور زندہ رود اہل قلم کو جمع کرنے کے لیے عالم اسلام کے نامور مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے "عالمی رابطہ ادب اسلامی" کے نام سے ایک بین الاقوامی رابطہ تنظیم قائم کی ہے۔ یہ سفر ۲ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ ر ۱۹۸۴ء کے مبارک دن سے غار حرا (مکہ مکرمہ) کے زیر سایہ باقاعدہ "رابطہ ادب اسلامی العالمیہ" کی تشکیل کے لیے بلائی گئی عالمی کانفرنس کے بعد، جس میں دنیا بھر کے اہل قلم نے شرکت فرمائی، شروع ہوا۔ اس کے

لیے مندرجہ ذیل اصول اور لائحہ عمل طے ہوا:

۱۔ ادب اسلامی کا فروغ اور اس کے قدیم و جدید خط و خال کو نمایاں کرنا۔

۲۔ قدیم ادب کے اسلامی اصولوں کی تدوین۔

۳۔ جدید ادبی فنون خاص طور پر افسانہ، ڈرامہ، ناول اور سوانحی ادب کے ادبی معیار کے لیے مفصل نظام کی ترتیب اور ان تمام فنون کو بامقصد اسلامی نہج کے تابع کرنا۔

۴۔ تاریخ ادب اسلامی خاص طور پر اس کے نثری سرمایہ کی تاریخ کی تدوین جدید اور مؤرخین نے اس کے جن اعلیٰ نمونوں اور شاہکاروں کو نظر انداز کر دیا ہے ان کو نمایاں کرنا۔

۵۔ قابل قدر اور دل کش ادبی تخلیقات اور نگارشات جو اسلامی ادبا کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں ان کی جمع و تدوین اور انہیں مختلف مسلم اور غیر مسلم اقوام کی زبانوں میں منتقل کرنا۔

۶۔ غیر اسلامی اور باطل ادبی تحریکات کا مقابلہ کرنا اور ان کے عیوب و نقائص اور خطرات سے دوسروں کو آگاہ کرنا۔

۷۔ اسلامی تحریکات کی حمایت اور نصرت میں اس ادب کا حصہ اور کلمہ حق کے ذریعے مسلمانوں کا دفاع۔

۸۔ اسلامی ادب کو عالمی معیار عطا کرنے کے لیے مختلف ممالک کے اسلامی ادبا سے گہرے روابط پیدا کرنا۔

۹۔ اسلامی ادبا کے مادی اور معنوی حقوق کا دفاع اور ان کے ادبی کام میں

نشرواشاعت کے لیے وسائل مہیا کرنا.

عالمی رابطہ ادب اسلامی کی باقاعدہ تشکیل کے ساتھ اس کی مرکزی مجلس عاملہ منتخب ہوئی جو ۱۵ ارکان پر مشتمل تھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اس انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ مرکزی صدر دفتر ندوۃ العلماء لکھنو میں قائم کیا گیا۔ بعد ازاں اس کی ایک شاخ ریاض (سعودی عرب) میں قائم ہوئی جو مشرق وسطی کے ممالک میں مصروف عمل ہے، اسی طرح اردن، ترکی، بنگلہ دیش، ملائشیا اور کئی دوسرے اسلامی ملکوں میں اس کی تنظیمیں مصروف عمل ہیں.

پاکستان میں رابطہ کے کام کی ابتدا

پاکستان میں ادب عالی کی مستقل اہمیت کے پیش نظر ۱۹۹۵ء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی مرکزی کونسل (لکھنو) نے پاکستان اور افغانستان پر مشتمل زون کے لیے یہاں اس کی شاخ کھولنے کا فیصلہ کیا، لیکن بعض مشکلات اور مسائل کی بنا پر مئی ۱۹۹۶ء سے قبل یہاں کام کی ابتدا نہ ہو سکی۔ ۷ مئی ۱۹۹۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ایوان اساتذہ اورینٹل کالج لاہور میں منعقد ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان میں مستقل بنیادوں پر کام شروع کر دیا جائے.

اسی اجلاس میں ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کو صدر، ڈاکٹر تحسین فراقی کو نائب صدر اور ڈاکٹر محمود الحسن عارف کو سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔ بعد کے ایک اجلاس میں حافظ فضل الرحیم (ناظم تعلیمات جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور) کو سینئر نائب صدر، جاوید طفیل کو فنانس سیکرٹری اور جناب اورنگ زیب ملک کو سیکرٹری اطلاعات منتخب کیا گیا.

۱۹۔ اگست ۱۹۹۶ء کے اجلاس میں عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان کی "مجلس عاملہ" نے ۲۴۔۲۵۔۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو حرمین شریفین کے سفر نامے "جدید تحدیات کے تناظر میں" کے عنوان سے ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ (Seminar) منعقد کرانے کا پروگرام بنایا۔ اس کی اطلاع صدر دفتر (لکھنو) کو بھی دی گئی۔ وہاں سے منظوری آنے کے بعد اس پر کام شروع کر دیا گیا۔

شروع شروع میں تو یہ کام بہت آسان دکھائی دیا، لیکن جوں جوں سیمینار کا وقت قریب آتا گیا تو پتہ چلا کہ بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کا اہتمام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہر حال مخلص احباب اور مہربان دوستوں کے تعاون سے یہ مرحلہ آسان ہو گیا۔ ایسے مخلص احباب اور معاونین میں ۔۔۔ چوہدری محمد الیاس (حلیب دودھ پاکستان کے مالک)، ڈاکٹر اعجاز احمد قریشی (مدیر اردو ڈائجسٹ)، میاں احمد حسن صاحب (سابق صدر چیمبر آف کامرس لاہور)، جناب جاوید طفیل صاحب (مدیر اعلیٰ نقوش، لاہور)، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی (مہتمم جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو، لاہور)، میجر زبیر قیوم (مینیجنگ ڈائریکٹر بی۔ بی۔ جے پائپ انڈسٹریز، لاہور)، ڈاکٹر انوار احمد صدیقی (وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) اور میاں توصیف پراچہ (پراچہ انڈسٹریز، لاہور) وغیرہ شامل ہیں۔

انتظامی امور میں ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مولانا فضل الرحیم، ڈاکٹر تحسین فراقی، میاں احمد حسن، مولانا ارشد عبید (ناظم اعلیٰ جامعہ اشرفیہ، مسلم ٹاؤن) اور مولانا محمد اکرم کاشمیری ناظم جامعہ اشرفیہ کے تعاون اور سرپرستی کا اعتراف نہ کرنا احسان فراموشی ہو گی۔ اس کے علاوہ ہم ان تمام دوستوں، مہربانوں اور معاونین کے شکر

گزار ہیں جنہوں نے اس پروگرام کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا اور اس علمی مذاکرے کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

علاوہ ازیں اس وقت کے صدر مملکت جناب سردار فاروق احمد خان لغاری، وزیر اعلیٰ پنجاب جناب میاں شہباز شریف، وفاقی وزیر امور برائے مذہبی امور راجہ محمد ظفر الحق اور گورنر پنجاب جناب شاہد حامد بھی ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں، جنہوں نے اس علمی مذاکرے کی مختلف نشستوں کی صدارت کی۔

یہ انتہائی احسان فراموشی ہوگی، اگر اس شخصیت کا ذکر نہ کیا جائے جن کی ذات نے اس پورے سیمینار کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا، یہ شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم، کی ہے۔ مولانا نے علالت اور جسمانی نقاہت کے باوجود ہماری جس طرح عزت افزائی فرمائی، اس کے لیے ہم سب تہہ دل سے ان کے ممنون ہیں۔ مولانا کے نواسے ندوۃ العلماء لکھنو اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد رابع اور البعث الاسلامی لکھنو کے مدیر اعلیٰ مولانا سید واضح رشید ندوی بھی ہمارے دلی شکریئے کے مستحق ہیں، جن کی ذاتی توجہ اور عنایت سے ہمارے لیے اس علمی مذاکرے کا اہتمام ممکن ہوسکا۔ اس کے علاوہ ہم ان تمام اہل علم و فضل کے مشکور ہیں، جنہوں نے اپنے خرچ پر دور دراز کا سفر کیا اور ہماری دعوت پر لاہور تشریف لائے، خدا تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

سیمینار کی کل چھ نشستیں ہوئیں، جو بحمد اللہ بہت کامیاب رہیں اور ان میں کراچی تک کے لوگوں نے اپنے خرچ پر شرکت کی۔ ان نشستوں اور ان میں پڑھے گئے مقالات کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی، پاکستان کی مجلس عاملہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنا ایک سہ ماہی مجلہ شائع کرنے پر غور کر رہی ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ شمارہ اس کے لیے نقطہ آغاز ثابت ہوگا۔

(ڈاکٹر محمود الحسن عارف)

سیکرٹری جنرل

عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان، لاہور۔

رودادِ بین الاقوامی سیمینار

حرمین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں

منعقدہ ۲۴-۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء

مرتب: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

عالمی رابطہ ادب اسلامی، پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والا یہ بین الاقوامی سیمینار پانچ نشستوں پر مشتمل تھا. جن کی تفصیل حسب ذیل ہے.

افتتاحی اجلاس

یہ اجلاس الحمرا آرٹ سنٹر ہال نمبر ۲' میں ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، جو گذشتہ شام ہی لکھنو (بھارت) سے لاہور پہنچے تھے، اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے، وہ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۷ء ساڑھے نو بجے الحمرا ہال نمبر ۲ میں تشریف لائے۔ سردار فاروق احمد خان لغاری (صدر پاکستان) بھی، جو اس اجلاس کے صدر تھے قریباً ساڑھے دس بجے الحمراء ہال پہنچے تو اجلاس کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز کیا گیا.

قرآن حکیم کی تلاوت و ترجمہ پیش کرنے کی سعادت قاری سید صداقت علی نے حاصل کی۔ انہوں نے سورۂ الرحمن کی ابتدائی آیات کی تلاوت اپنے مخصوص انداز میں کی، جن میں علم و دانش کو عطیۂ نعمت الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہی آیات عالمی رابطہ ادب اسلامی کے "مونوگرام" پر رقم ہیں.

ہدیہ نعت سید محبوب علی ہمدانی نے پیش کیا. جس کے بعد صدر رابطہ ادب اسلامی پاکستان ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا' جس میں انہوں نے صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری' مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دیگر مہمانوں کی اس سیمینار میں آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اہداف کا تذکرہ کیا.

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم اعلی عالمی رابطہ ادب اسلامی' مرکزی شاخ) نے' جو مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ گزشتہ روز ہی لاہور میں تشریف لائے تھے' خیر مقدمی کلمات ارشاد فرمائے' جس میں انہوں نے پاکستان میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی کارگردگی کو سراہا اور اس علمی مذاکرے کے موضوع اور اس سے متوقع نتائج کے متعلق اظہارِ خیال فرمایا۔ اس کے بعد عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے بانی صدر اور اس نشست کے مہمان خصوصی مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اس علمی مذاکرے کی مناسبت سے فی البدیہہ تقریر فرمائی' جس میں آپ نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کی پاکستان شاخ کو اس سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی اور رابطہ ادب اسلامی کے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے دعوت اسلامی کے طریقے کار پر مختصر مگر جامع گفتگو فرمائی.

مولانا نے اپنے خطاب میں لاہور میں اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتلایا کہ "وہ اس شہر میں کئی مرتبہ آچکے ہیں' یہ شہر ان کے محبوب شاعر علامہ اقبالؒ کا شہر ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی ایک نظم کا عربی ترجمہ سولہ برس کی عمر میں کیا تھا' جب وہ علامہ اقبالؒ سے ملے تو انہیں ان کی بات پر یقین نہ آیا تو علامہؒ نے ان سے بہت سے سوال کیے' جس کے بعد انہیں ان کی بات پر یقین ہو گیا۔ اس طرح ان کی اقبال سے شناسائی ہوئی جو روز بروز بڑھتی گئی. پھر اللہ تعالی نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میں اقبالؒ کو عرب دنیا میں متعارف کراؤں۔ "اللہ" کا شکر ہے کہ ان کی کتاب "روائع اقبال" کو عرب دنیا میں پذیرائی نصیب ہوئی.

بعد ازاں انہوں نے سورۃ النحل کی آیت ۱۱۶ سے ادب اسلامی کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ارمغان حجاز میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے خوبصورت اشعار پر اپنی گفتگو کو ختم کیا۔

بعد ازاں اس نشست کے دوسرے مہمان خصوصی میاں محبوب احمد (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان) نے نہایت خوبصورت الفاظ میں اپنا مقالہ پیش کیا اور مختلف کتابوں سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے حرمین کے سفرناموں سے متعلق دلچسپ تاثرات بیان فرمائے۔ انہوں نے فرمایا کہ

> ہر سال ۵۰ لاکھ مسلمانوں کا حج کے لئے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ملت اسلامیہ کا مرکز سے رشتہ مضبوط ہے' ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری امت کو عالم کفر کے مقابلے میں متحد کیا جائے اور حج کو مسلمانوں کی اقوام متحدہ (United Nations) میں بدل دیا جائے' "مرکز گریز" اور "اسلام مخالف" قوتوں کو دندان شکن جواب دینے کے لئے در مصطفیٰ سے کامل وابستگی کی ضرورت ہے یہی وہ چراغ ہے جس سے کفر کی ظلمتیں لرزاں ہیں۔

تقریب کے آخر میں صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جس میں انہوں نے پاکستان میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قیام اور اس کی ادبی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے مستقبل میں اس کے کام کرنے کی نوعیت اور طریقہ کار سے متعلق چند مفید مشورے بھی دیئے۔ صدر مملکت نے فرمایا کہ :

> عالم اسلام کو اس وقت کسی زبردست علمی اور فکری تحریک اٹھانے اور ثقافتی انقلاب لانے کی ضرورت ہے' اس سے عالم اسلام ایک طرف تو حقیقی اسلامی تعلیمات سے قریب تر ہو جائے گا' دوسری طرف اس سے دنیا کے سامنے اسلامی تعلیمات پرکشش انداز میں پیش کی جاسکیں

گی۔ جو انسانی اذہان و قلوب پر اثر کر سکیں گی۔

انہوں نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتے ہوئے مزید فرمایا!

ایسا ادب جو انسانیت کے عظیم تر مقاصد کی آبیاری کرنے کی بجائے، محض ذہنی لذت اور تفریح تک محدود ہو جائے وہ نہ تو پائیدار ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اعلیٰ ادب قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادب "تعمیر انسانیت" کا وسیلہ ہے اور جب شاعری یا نثر تعمیری مقاصد سے روگردانی کرنے لگے تو اسے ادب کا نام نہیں دیا جاسکتا، آج بظاہر دنیا سائنسی اور مادی ترقی کی معراج پا چکی ہے، مگر جن معاشروں میں مادی ترقی عروج پر ہے وہ شدید اخلاقی زوال میں مبتلا ہیں اور ان کی ملت روحانی سسکیاں لے رہی ہے۔ اس وقت دنیا میں انسانوں کے مابین ایک خوفناک جنگ جاری ہے اور عالم اسلام اس سے نظریں نہیں چرا سکتا، کیونکہ عالم اسلام اس وقت اپنے معاشرے کی تشکیل نو میں مصروف ہے اس لئے کہ ایک طرف تو مغربی میڈیا کی یلغار ہے اور دوسری طرف اشتراکیت کے عملی خاتمے کے بعد مغرب اسلام کو اپنا حریف سمجھنے لگا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اسلامی معاشرے میں داخلی طور پر توڑ پھوڑ شروع ہے ان تمام مسائل کے حل کے لئے عالم اسلام کو اپنی منزل کا از سر نو تعین کرنا ہے۔

صدر مملکت کے خطبۂ صدارت کے بعد رابطہ کے سیکرٹری جنرل کی درخواست پر صدر مملکت کی اس تقریب میں آمد کی یادگار کے طور پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صدر مملکت کو اپنے دست مبارک سے شیلڈ پیش کی اور پھر صدر مملکت نے مولانا کو شیلڈ دی۔

تقریب کا اختتام دعا پر ہوا۔ دعا مولانا ابوالحسن علی نے کرائی۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی نے اس "موقع" پر ہال نمبر ۳ کی گیلری میں کتابوں،

خصوصاً حرمین شریفین کے سفر ناموں کی ایک خوبصورت نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا' صدر مملکت نے تقریباً ۱۲:۳۰ اس کا افتتاح کیا۔ نمائش کے انتظامات کی ذمہ داری سیکرٹری اطلاعات اورنگ زیب ملک (لائبریرین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور) نے احسن طریقے سے نبھائی.

نشست دوم :(۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۷ء شام ۴:۰۰ بجے تا ۷:۳۰)

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے علمی مذاکرے کی دوسری نشست شام ۴ بجے عامر ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت راجہ محمد ظفر الحق (وفاقی وزیر برائے مذہبی امور) نے فرمائی' جو اس کے لئے خصوصی طور پر اسلام آباد سے تشریف لائے تھے. جبکہ مہمان خصوصی مولانا سید محمد رابع حسن ندوی تھے۔ دیگر مہمانوں میں میجر (ر) زبیر قیوم' ڈاکٹر محمود احمد غازی (وائس پرنسپل بین الاقوامی یونیورسٹی' اسلام آباد) اور ڈاکٹر ابو بکر صدیق (ڈھاکہ یونیورسٹی' بنگلہ دیش) شامل تھے.

کاروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا' قاری سعید احمد (استاد جامعہ اشرفیہ) نے تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا' پہلا مقالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی (ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز و ھیومینیٹیز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) نے پڑھا. ان کے مقالے کا عنوان تھا "اولین سفر نامۂ حجاز: جدید تحدیات کے تناظر میں" اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے رسول اللہ ﷺ کے سفر ہجرت اور سفر حجۃ الوداع کو جدید تحدیات کے تناظر میں موضوع سخن بنایا اور نہایت خوبصورت پیرائے میں جدید مسائل کے حل کے لئے اس سے عمدہ استنباطات پیش کیے.

بعد ازاں "حرمین کے اردو سفر ناموں کے علمی و ادبی اسالیب" کے عنوان سے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مقالہ پیش کیا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں اردو ادب میں حرمین کے سفر ناموں کے جو مختلف اسالیب رائج اور متداول ہیں ان پر اظہار خیال فرمایا اور سفر ناموں کے مختلف ادوار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر احمد

صدیقی (شعبہ اردو ہندو بنارس یونیورسٹی وارنسی بھارت) کے مقالے کا عنوان تھا "اپنے گھر سے بیت اللہ تک ایک منفرد سفر نامہ"۔ فاضل مقالہ نگار نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "سفر نامے" کو اپنی تحقیق کا محور بناتے ہوئے اس کے اسلوب بیان پر گفتگو کی اور اس میں موجود اعلیٰ علمی و فکری پہلوؤں کو اجاگر کیا.

ماہر اقبالیات اور شعبہ اقبالیات جامعہ پنجاب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم نے علامہ اقبال کے "تخیلی سفر نامۂ حرمین پر" مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کی کتاب "ارمغان حجاز" سے مختلف اقتباسات پیش کئے اور اسے ایک حقیقی سفر نامے کے روپ میں پیش کرتے ہوئے شاعر اسلام علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری ان کے انداز بیان ان کی قوت تخیلیہ اور ان میں موجود تخلیقی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا.

ایک مصری سکالر ڈاکٹر جلال السعید حفناوی (جواہر لعل یونیورسٹی، دھلی) نے "ابن جبیر الاندلسی اور عبدالماجد دریابادی کے سفر نامے قدیم اور جدید دور کا تقابلی جائزہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب عربی الاصل ہونے کے باوجود بڑی روانی سے اردو بولتے ہیں اور یہ مقالہ ان کی اردو دانی کا واضح ثبوت ہے.

تقریب کے آخر میں تقریب کے مہمان خصوصی راجہ محمد ظفر الحق صاحب نے صدارتی کلمات میں اس سیمینار کے فکر انگیز موضوع اور مقالہ نگاروں کے، علمی اور فکری اسالیب کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی اپنے علمی مذاکرات میں خصوصاً نوجوانوں کو شامل کرے. انہوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وزارت مذہبی امور پاکستان اس سیمینار کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرے گی۔ راجہ صاحب کے صدارتی کلمات کے بعد مولانا فضل الرحیم صاحب نے دعا کرائی جس کے بعد نشست اختتام کو پہنچ گئی. اجلاس کے دوران میں بی۔بی۔ جے پائپ انڈسٹریز کی طرف سے معزز شرکاء کی تواضع چائے اور لوازمات سے کی گئی.

تقسیم شیلڈز کی تقریب (پرل کانٹی نینٹل لاہور)

چونکہ قرآن و سنہ میں "محسنین" کے لئے اظہار تشکر پر زور دیا گیا ہے' اس لئے عالمی رابطۂ ادب اسلامی پاکستان نے اپنے کارکنوں اور اس سیمینار کے مہمانوں کی خدمات کو یادگار بنانے کے لئے توصیف پراچہ (مالک پراچہ انڈسٹریز) کے تعاون سے خصوصی طور پر متعدد شیلڈز تیار کرائیں چنانچہ مؤرخہ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۷ء رات کو ۸ بجے "پرل کانٹی نینٹل" ہوٹل میں تقسیم شیلڈز کی تقریب ہوئی' جس میں گورنر پنجاب محترم شاہد حامد مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا. قاری سید صداقت علی نے تلاوت فرمائی. مولانا فضل الرحیم نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا. جس کا جواب دیتے ہوئے' گورنر پنجاب نے کہا کہ کائنات میں سب سے اعلیٰ وارفع مذہب اسلام ہے' اسلام نے عالمی تاریخ میں پہلی مرتبہ مساوات' اخوت اور انسانی بھائی چارے پر زور دیا ہے۔ اسلام انسانوں میں کسی بھی قسم کی تفریق' اونچ نیچ' یا ذات پات کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ آج کی انتشار زدہ دنیا میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی ان تعلیمات کو سامنے لایا جائے جس میں انہوں نے ہم سب کو انسان کے اصل مقام سے روشناس کرلیا ہے. انہوں نے زور دے کر کہا کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تو ہمارے معاشرے میں ایسی اخوت وجود پذیر ہو گی' جو ہمیں ایک ملت واحدہ میں ڈھال کر ایک جسم کی شکل دے دے گی........... ان حالات میں رابطۂ ادب اسلامی جیسے اداروں کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل ہے' انہوں نے مزید فرمایا کہ رابطہ ادب اسلامی ایسے ادارے اس لئے بھی قابل تحسین ہیں کہ یہ ہماری توجہ اس شعبے کی طرف دلاتے ہیں جسے حضور ﷺ نے مومن کی گم شدہ میراث قرار دیا تھا' آج امت مسلمہ کی وحدت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے' اس لئے ضروری ہے کہ تمام مسلم ممالک کے ادیب اور دانشور باہم مل کر مسلمانوں کی فکری قیادت کا فریضہ سرانجام دیں اور اسلامی ادب کے ذریعے مسلمانوں' بالخصوص نوجوانوں کو اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور نصب العین کی جانب راغب

کریں۔

اس کے بعد گورنر پنجاب نے وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے چیف جسٹس میاں محبوب احمد، رابطۂ ادب اسلامی پاکستان کے صدر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ و عربیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی، وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ڈاکٹر انوار حسین صدیقی، عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر محمود الحسن عارف، شعبہ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک، شعبہ عربی گورنمنٹ کالج کے سابق صدر شعبہ ڈاکٹر محمد خورشید الحسن رضوی، جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاد مولانا محمد یوسف خان، جامعہ نعیمیہ کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، خیر المدارس ملتان کے مہتمم قاری محمد حنیف جالندھری، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سینئر نائب صدر حافظ فضل الرحیم، بین الاقوامی سیمینار کے ناظم مہمانداری مولانا محمد اکرم کاشمیری، روزنامہ وفاق کے مدیر اعلیٰ اور سینئر رکن استقبالیہ کمیٹی بین الاقوامی سیمینار میاں مصطفیٰ صادق، ناظم جلسہ گاہ اکمل اویسی، ناظم نمائش کتب اورنگ زیب ملک، ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے پرنسپل اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، استاد مدرسہ صدیقیہ (مکہ مکرمہ) مولانا عبدالحفیظ مکی اور سعید عنایت اللہ، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر ڈاکٹر تحسین فراقی، رکن استقبالیہ میجر (ر) زبیر قیوم اور رکن استقبالیہ احمد حسین میاں کو شیلڈز دیں۔........جس کے بعد دعا ہوئی........اور مہمانوں نے کھانا کھایا۔

نشست سوم: (مؤرخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء ۹ تا ۱ بجے دوپہر)

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ہونے والے بین الاقوامی علمی مذاکرے کی تیسری نشست عامر ہوٹل کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اجلاس کے صدر یادگار اسلاف مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اور مہمان خصوصی ڈاکٹر انوار حسین صدیقی (وائس چانسلر علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد) تھے۔

اجلاس کی کاروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی جس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا. سب سے پہلے شعبہ اردو (پنجاب یونیورسٹی) کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور اس نشست کے میزبان ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنا مقالہ پڑھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر نامۂ حجاز". انہوں نے مولانا کے بیان کی ندرت اور مولانا کی قادر الکلامی کو سراہا' جس کے بعد ڈاکٹر امین اللہ وثیر (سابق ڈائریکٹر جنرل وزارت مذہبی امور سابق) نے "قیام پاکستان سے پہلے کے چند اردو سفر نامے" کے عنوان پر مقالہ پیش فرمایا۔ انہوں نے برصغیر پاک وہند کے اردو زبان میں لکھے گئے چند سفر ناموں کو موضوع سخن بناتے ہوئے بیان کیا کہ یہ سفر نامے قدیم ہونے کے باوجود بے حد معلومات افزا ہیں اور ان سے اس دور کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگلا مقالہ مولانا سید واضح رشید ندوی (استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ بھارت) کا تھا' جس کا عنوان "الرحلة الحجازية : مناهجها و اسلوبها" تھا' جس میں انہوں نے سفر نامہ ہائے حجاز کے اسالیب پر عربی زبان میں مدلل بحث فرمائی۔ اس کے بعد ڈاکٹر خالق داد ملک (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی اورنیٹل کالج لاہور) نے اپنا مقالہ پڑھا. عنوان تھا "رحلۂ ابن جبیر الی الحرمین" انہوں نے بتایا کہ اس سفر نامے میں' قدامت کے باوصف' حرمین کے متعلق بے حد قیمتی اور وقیع معلومات ملتی ہیں.

اگلے مقرر ڈاکٹر محمود احمد غازی (نائب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) تھے. ان کے مقالے کا عنوان تھا "منفرد سفر نامۂ حج : ارمغان حجاز" دور جدید کی تحدیات کے تناظر میں انہوں نے حکیم الامت کے خیالی سفر نامۂ حجاز میں موجود جدید چیلنجوں کے مقابلے کے لیے مواد پر نہایت عمدہ انداز میں اظہار خیال فرمایا۔ اس مرحلے پر مولانا ابوالحسن علی ندوی' ضعف کی بنا پر' اٹھ کر جانے لگے' جانے سے پہلے آپ نے حرمین شریفین کے سفر ناموں کے موضوع پر مختصر' مگر جامع خطاب فرمایا۔ اس کے بعد نصف گھنٹے کا وقفہ ہوا' جس کے دوران میں حاضرین کی تواضع چائے سے کی گئی' جس کا اہتمام علامہ اقبال

لوپن یونیورسٹی نے کیا تھا۔اس کے بعد "ڈاکٹر انور حسین صدیقی" کی صدارت میں اجلاس جاری رہا

اگلا مقالہ ڈاکٹر سید عبدالباری (شعبہ اردو لودھ یونیورسٹی بھارت) کا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "ماہر القادری بحیثیت سفر نامہ نگار کاروان حجاز کی روشنی میں" ان کے مقالے کو بھی حاضرین نے بے حد پسند فرمایا۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی اگلے مہمان مقرر تھے' انہوں نے "علی طنطاوی کا سفر نامہ حجاز "اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر حجاز کا مقابلہ و مطالعہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے شیفتہ کا سفر حرمین (مومن خان مومن کے نام ایک غیر مطبوعہ نادر خط) کے عنوان سے مقالہ پڑھا' جسے مقرر کے خصوصی انداز بیان اور مشتملات کے علمی اور فکری پہلوؤں کے باعث بے حد سراہا گیا۔

سب سے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالباری (صدر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) نے نواب صدیق حسن خان قنوجی کے سفر نامے "رحلة الصديق الى البيت العتيق" کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا' جس میں انہوں نے نواب صاحب کے اسلوب بیان پر اظہار خیال فرمایا۔

تقریب کے آخر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر انور حسین صدیقی نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ انہوں نے عالمی رابطہ ادب اسلامیہ کے تحت ہونے والے اس علمی مذاکرے کو سراہتے ہوئے کئی مفید تجاویز بھی پیش کیں۔

نشست چہارم : مؤرخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء

رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے دو روزہ بین الاقوامی علمی مذاکرے کی چوتھی نشست ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو شام ساڑھے چار بجے عامر ہوٹل لاہور کے ہال میں شروع ہوئی۔ اس نشست کے صدر رابطہ ادب اسلامی ہندوستان کے ناظم

اعلیٰ کاروانِ ادبِ اسلامی کے مدیر اور بھارت کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تھے. مہمانانِ خصوصی میں' سابق وزیر مذہبی امور مولانا سید وصی مظہر ندوی' علیگڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر عبدالباری ندوی اور بنارس ہندو یونیورسٹی (وارنسی) شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی اور جامعہ اسلامیہ بنوی ٹاؤن شعبہ قرات کے صدر مدرس قاری سید رشید الحسن ندوی تھے.

اس نشست کی میزبانی کے فرائض زاہد منیر عامر (استاد شعبہ اردو' پنجاب یونیورسٹی اوری اینٹل کالج لاہور) نے انجام دیئے.

اس نشست میں شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے سینئر مدیر ڈاکٹر محمد امین نے "شاہ ولی اللہ کے سفر نامۂ حج""فیوض الحرمین پر ایک نظر کے عنوان سے مقالہ پڑھا" جبکہ ڈھاکہ یونیورسٹی' بنگلہ دیش' کے شعبہ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ابو بکر صدیق نے "ادب الرحلات الی الحرمین الشریفین" رویۃٌ ادبیۃٌ و دینیۃٌ کے عنوان پر مقالہ پیش کیا.

جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاد مولانا محمد یوسف خان نے بعض افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے "سفر نامہ ہائے حجاز" کا جائزہ پیش کیا. جبکہ ممتاز ماہر اقبالیات اور شعبہ اردو' اوری رینٹل کالج کے استاد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے عبدالرحمٰن عبد کے چار جلدوں پر مشتمل سفر نامے "آنحضور کے نقش قدم پر" کے حوالے سے اظہار خیال کیا. مدینہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد' جوان دونوں جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی میں مہمان استاد کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں' پروفیسر اجتبیٰ ندوی نے نواب صدیق حسن خان قنوجی اور ان کے سفر نامۂ حج پر مقالہ پیش کیا۔ دیگر مقالہ نگاروں میں شعبہ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے صدر ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی جذب القلوب الی دیار المحبوب اور شیخ رفیع الدین مراد آبادی کا سفر نامۂ حجاز : ایک تقابل) 'مولانا سعید احمد عنایت اللہ استاد

مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ (ادب رحلة الحرمین و تاثیرہ فی حیوٰة السلمین) اور ڈائریکٹر سیرت سٹڈیز سیالکوٹ پروفیسر عبدالجبار شیخ شامل تھے۔

آخر میں صدر مجلس مولانا سید محمد رابع حسنی نے دعا کروائی، جس کے بعد یہ اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس موقع پر عامر ہوٹل کی انتظامیہ نے رابطہ کے مہمانوں کی چائے سے تواضع کی۔ ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر نے حرمین کے سفرنامے اور بلوچستان کے عنوان سے مقالہ ارسال کیا تھا، مگر وقت کی کمی کے باعث اسے پیش نہ کیا جا سکا یہ مقالہ مجموعہ مقالات میں شامل ہے۔

اختتامی نشست (مورخہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۷ء بمقام الحمراء ہال نمبر ۳)

دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کی اختتامی نشست کی صدارت پنجاب کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد شہباز شریف نے فرمائی اور اس کے مہمانان خصوصی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مفتی محمد حسین نعیمی (پرنسپل جامعہ نعیمیہ) میاں مصطفیٰ صادق (مدیر اعلیٰ روزنامہ وفاق) اور میاں احمد حسین تھے۔ کاروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، قاری امتیاز الرحمان تھانوی نے تلاوت فرمائی، اور نوجوان نعت خواں سلمان گیلانی نے ہدیۂ نعت بحضور سرور دو عالم ﷺ پیش کیا۔ اس موقع پر حافظ فضل الرحیم (سینئر نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان) نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا، جس میں انہوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی اس نشست میں آمد پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی...... اس کے بعد تین قراردادیں بھی متفقہ طور پر منظور کی گئیں، جن میں سے پہلی قرارداد ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی (صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد) نے دوسری ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی (دھلی) نے اور تیسری زاہد منیر عامر (لیکچرر شعبہ اردو، اوری اینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے پیش کی، حاضرین نے ان کی توثیق فرمائی:

اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے پاکستان میں قائم عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ارکان اور منتظمین کو اس سیمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی اور اس سیمینار کو انتظامات کی عمدگی کے اعتبار سے ایک تاریخی سیمینار قرار دیا' صدر مجلس وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد شہباز شریف نے چونکہ کسی اور تقریب میں جانا تھا اس لئے انہوں نے اجلاس کی کاروائی روک کر صدارتی خطبہ پڑھا' جس میں آپ نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا اور اس میں شرکت کرنے والے اہل علم اور اہل قلم کو وقت کے فتنوں خصوصاً فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی اور اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ ان کی حکومت فرقہ پرستی کے خلاف جنگ جاری رکھے گی' انہوں نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ علمائے کرام خود ساختہ حد بندیوں سے باہر نکلیں اور اپنی اخلاقی سیاسی اور فکری ذمہ داریوں کو محسوس کریں.......... انہوں نے مزید کہا کہ اب جبکہ بیسویں صدی اختتام کو پہنچنے والی ہے اور تمام دنیا ایک ولولہ تازہ کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریاں کر رہی ہے مسلم امہ کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہونا چاہئے' انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں اس حقیقت کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ قوموں کی زندگی اور ان کے عروج و زوال کا بہت گہرا تعلق علوم و فنون کی موزوں طریقے پر تعلیم و تدریس اور ان کی شبانہ روز محنت اور جدوجہد میں مضمر ہے' اس لئے ہمیں اس میدان میں پورے اعتماد کے ساتھ اترنا چاہئے۔

اس کے بعد میاں محمد شہباز شریف اٹھ کر چلے گئے اور اجلاس مولانا ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں جاری رہا۔

اس موقع پر حیدر آباد سے آئے ہوئے مندوب اور سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور جناب وصی مظہر ندوی نے تاثرات پیش کیے اور قطر کے مہمان ڈاکٹر خالد حسن ہندلوی نے عربی نظم پیش کی' جس میں انہوں نے اس سیمینار اور اس کی مختلف نشستوں کے متعلق

عمدہ انداز میں اظہار خیال فرمایا۔ ان کی نظم کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خالق داد ملک نے پیش کیا. جس کے بعد مولانا ندویؒ کی دعا پر اجلاس برخاست کردیا گیا.

اختتام

مجموعی طور پر یہ علمی مذاکرہ بہت کامیاب رہا. عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا. کراچی تک کے لوگ اپنے خرچ پر سیمینار میں شریک ہوئے اور اس کے مختلف جلسوں میں شرکت کی.

خطبہ استقبالیہ

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
(صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان)

عزت مآب جناب فاروق احمد خان لغاری صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان
فضیلت مآب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بانی صدر، عالمی رابطہ ادب اسلامی
مندوبین کرام مہمانان گرامی!

میرے لئے یہ انتہائی خوشی و مسرت اور بے اندازہ فخر و اعزاز کا باعث ہے کہ میں آپ سب کو عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اس بین الاقوامی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہہ رہا ہوں!

جناب صدر!

عالمی رابطہ ادب اسلامی دنیا کے ادبا کی ایک بے سروسامان اور درویشانہ تنظیم ہے، مگر سخن کی دلنوازی اور جان کی پرسوزی کے ساتھ ساتھ اس کا عزم پختہ و بلند اور مقاصد عظیم ہیں. ان مقاصد میں یہ بات سرفہرست ہے کہ ادب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو اجاگر کرتے ہوئے انسانیت کی عظمت اور اس کے احترام کا پیغام دیا جائے اور زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب کے ذریعہ تعمیر سیرت و اخلاق اور معرفت و دانش کا ایسا سامان کیا جائے جو انسان کے ذوق حسن کی بھی تسکین کرے اور بلند اقدار کا پاسدار و علمبردار ماننے کے لئے رہنمائی بھی مہیا کرے۔ دنیا بھر کے اسلامی ادبا کی سرپرستی، حوصلہ افزائی، خدمت اور رہنمائی بھی ہمارے مقاصد میں شامل ہے، ہماری اس تنظیم کی یہ آرزو ہے کہ اسلامی معاشرے کے لیے بالخصوص اور تمام انسانیت کے لیے بالعموم ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو معاشرے کے ہر طبقے خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے لئے بہتری کا سامان پیدا کرے۔

صدر گرامی قدر!

عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عالم اسلام کے عظیم مفکر و ادیب اور بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کے عظیم فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے درد مند دل و دماغ اور بلند عزم و تخیل کا مرہون منت ہے۔ یہ ۱۲ربیع الاول ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۴ء کی بات ہے کہ غار حرا کے قرب وجوار اور وادی بطحا کے مرکز اسلام بیت اللہ کے زیر سایہ مکہ مکرمہ میں دنیا بھر کے اسلامی ادبا مولانا ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں جمع ہوئے اور یہ عالمی تنظیم وجود میں آئی۔ اس وقت سے مسلسل یہ تنظیم ہر سال کسی نہ کسی اسلامی ملک میں ادب اسلامی کے موضوعات پر بین الاقوامی سیمینار منعقد کرتی ہے' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ اور ریاض کے علاوہ ترکی' بنگلہ دیش اور بھارت میں متعدد سیمینار منعقد ہو چکے ہیں' ہماری تنظیم کا صدر دفتر ندوہ العلماء لکھنو میں حضرت مولانا ندوی کی سرپرستی اور رہنمائی میں کام کر رہا ہے' اس کے علاوہ ایک علاقائی دفتر ریاض (سعودی عرب) میں قائم ہے۔ بھارت اور بنگلہ دیش وغیرہ کے لیے علاقائی دفتر بھی لکھنو میں ہے' اقلیم پاکستان و افغانستان کے لئے ہمارا علاقائی دفتر لاہور میں ہے۔ اور اس اقلیمی شاخ کے زیر اہتمام' یہ ہمارا پہلا بین الاقوامی سیمینار ہے جس کا موضوع ''حرمین شریفین کے سفر نامے'' ہے۔

مندوبین کرام اور معزز حضرات!

ہمارے اس اولین بین الاقوامی سیمینار کے لیے یہ موضوع منتخب کرنے کی متعدد وجوہ ہیں' ایک تو اس لئے کہ مسلمان دنیا کے کسی خطے یا گوشے میں ہو' اس کا مرکز نگاہ اور محور ایمان بیت اللہ ہے۔ اسے جب بھی سفر کی سہولیات میسر آتی ہیں تو۔ وہ حج اور عمرہ کی نیت سے حرمین شریفین کا رخ کرتا ہے اور ان مقامات مقدسہ سے وابستہ روح پرور یادیں اس کے لئے سرمایہ ایمان' توشہ آخرت اور سرچشمہ سرور بن جاتی ہیں۔

جناب والا!

ادب کیا ہے؟ اور ادیب کون ہوتا ہے؟ اور اسی قسم کے بے شمار سوال ہیں جو لٹریچر کے حوالے سے مشرق و مغرب میں صدیوں سے زیر بحث رہے ہیں' ارسطو سے لے کر جاحظ

تک اور قدامہ بن جعفر سے ابن رشیق قیروانی تک ادب اور ادیب کے موضوع پر قدیم اہل ادب ونقد نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے' جدید دور کے ادبا اور ناقدین نے بھی اس موضوع پر بڑی تفصیل اور وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ "ادب اور ادیب کو سیاسی نظریات رکھنے والوں نے بھی اپنے اپنے رنگ میں دیکھا ہے۔ کہیں اشتراکی ادب ہے تو کہیں بورژوائی ادب ہے' کوئی ادیب کمیونزم کا علمبردار اور ترجمان ہے تو کسی کو سرمایہ دارانہ ذہنیت کا پرچار کرنے والا ادیب تصور کیا گیا ہے' کوئی "ادب برائے ادب" کے نظریے کا قائل ہے تو کسی کے نزدیک ادب برائے ادب کافی ہے' کوئی ادب کو سیاست سے دور رکھنے پر زور دیتا ہے اور کسی کے نزدیک ادب برائے زندگی مناسب ہے' کسی کا خیال ہے کہ ادیب کو واعظ اور ناصح نہیں بننا چاہئے' ادب اور ادیب کے متعلق' اگر اس قدر اختلاف رائے اور تنوع موجود ہے تو پھر دینی ادب اور دیندار ادیب کیوں نہیں ہو سکتا اور ایک قدم آگے بڑھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ادبی تخلیقات اسلامی کیوں نہیں ہو سکتیں؟!

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ادب اور ادیب کو ایک پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "پھول خواہ چمن میں کھلے یا عبادت خانے کے صحن میں وہ تو ہر حال میں پھول ہے' پھول کہیں بھی کھلے اس کا ایک رنگ ہوگا۔ اس کی اپنی ایک خوشبو ہو گی۔" اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے' اگر یہ سچ ہے تو پھر ادب بھی اسی طرح جہاں کہیں بھی تخلیق ہوگا' اس کا اپنا اسلوب ہوگا' ایک معنویت ہوگی' ایک پیغام ہوگا اور کچھ نہ کچھ تاثیر بھی ہو گی' اس لئے جو ادب ایک سچے اور پکے مسلمان ادیب کے قلم سے نکلے گا وہ اگر حقیقت کا ترجمان' حق کا پاسبان اور اعلیٰ انسانی اقدار کا حامل ہے تو وہ اسلامی ادب ہے' اگر یہ ادب گمراہی اور مبالغہ آرائی سے پاک ہے جس سے سورۂ شعراء میں قرآن کریم نے شعر وادب کو پاک رکھنے کا اشارہ دیا ہے' اگر یہ ادب اس کے ایمان وعمل صالح کا بھی نقیب ہے تو یہ ادیب اور اس کا یہ ادب یقیناً اسلامی ادب ہے جس کی قرآن کریم کی مذکورہ سورۃ کی آخری آیات میں نشاندہی کی گئی ہے۔

معزز ومحترم حاضرین!

عالمی رابطہ ادب اسلامی ایسے ہی تعمیری ادب کا علمبردار ہے اور ایسے ہی تعمیری ادب

کے خالق ادبا کو تنظیم و تعاون باہمی کے ذریعہ ایسے مواقع مہیا کرنا چاہتا ہے جہاں وہ ہمت و حوصلے کے ساتھ انسانی 'بلکہ اسلامی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں' دنیا نے انواع و اقسام کے ادیب دیکھے ہیں ان کی ادبی تخلیقات کو بھی دیکھ لیا ہے 'ان انواع و اقسام کے ادب اور ادبا کے اثرات اور نتائج بھی دیکھے ہیں' تو کیوں نہ اسلامی ادب اور اسلامی ادبا کی ادبی تخلیقات کو بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جائے ؟ ادب کی اس قسم کے اثرات و نتائج بھی دیکھ لیے جائیں! یہ سچ ہے کہ شعر و شاعری کو پیغمبر اسلام ﷺ کے شایان شان تصور نہیں کیا گیا' لیکن رسالت مآب ﷺ نے شعر و ادب کی تاثیر سے انکار یا اعراض نہیں فرمایا' بلکہ اہل علم جانتے ہیں کہ اس ضمن میں آپ کی رائے اور آپ کے ارشادات موجود ہیں جو تنقید ادب کے ضمن میں اہل علم کے لیے مشعل راہ ہیں' سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے بھی تنقیدی افکار وجود ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں' مگر ان سے ایک بات پوری طرح واضح ہے کہ اسلام کا منشا بامقصد اور تعمیری ادب و فن کی تخلیق اور تائید ہے' یہی اسلامی ادب ہے اور عالمی رابطہ ادب اسلامی اس کا علمبردار ہے۔

صدر گرامی قدر!

ہماری تنظیم کے بانی صدر مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہ نے جہاں اسلامی ادب کے خط و خال واضح کرنے اور اسلامی ادبا کی خدمت اور حوصلہ افزائی کے لیے بہت سی عملی صورتیں پیدا کی ہیں' وہاں آپ نے اسلامی ادب کے اولین سرچشموں اور جیالوں کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف عنوانات و موضوعات پر علمی مذاکروں اور سیمیناروں کا انعقاد بھی کیا ہے 'مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' ریاض' استنبول اور بھارت و بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں ایک درجن سے زائد مذاکرے منعقد ہو چکے ہیں' ہم یہاں پاکستان میں لاہور کی سطح پر ایک مقامی نوعیت کا سیمینار "یاد گار پروفیسر عبدالقیوم بعنوان "پاکستان میں عربی اور علوم اسلامیہ کی تدریس" منعقد کر چکے ہیں مگر بین الاقوامی سطح کا یہ پہلا سیمینار ہے جس کا افتتاح آج آپ فرما رہے ہیں۔

مندوبین کرام اور معزز حاضرین!

شاید میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا ہے' جس کے لئے دلی معذرت پیش ہے' آپ کی طرح میں بھی صدر گرامی جناب فاروق احمد خان لغاری کی باتیں سننے کے لیے بے تاب ہوں' لیکن اجازت لینے سے پہلے یہ میں اپنا منصبی فریضہ تصور کرتا ہوں کہ آپ سب کی تشریف آوری کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کروں' خصوصاً محترم جناب صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری اور ہماری تنظیم کے بانی صدر مولانا ابوالحسن علی ندوی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں' جنہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات ہمارے لیے وقف کیے اور زحمت سفر کے بعد ہماری حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے لئے تشریف لائے۔ اپنی تنظیم کے کارکنان اور بالخصوص جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نعیمیہ کے سربراہان کے تعاون کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دوروزہ بین الاقوامی سیمینار

تعارفی کلمات

سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم اعلیٰ رابطۃ الادب الاسلامی العالمیہ' وناظم ندوۃ العلماء' لکھنو)

الحمدلله الذی کفی وسلام علی عباده الذین اصطفی'

حضرات! مجھے بہت مسرت ہے کہ آج میں علم وادب کے اس مشہور اور تاریخی شہر لاہور میں حاضر ہوا ہوں اور اس کی ایک علمی محفل میں شرکت کر رہا ہوں.

شہر لاہور قدیم سے پورے برصغیر کے شہروں میں ایک خاص شان رکھتا رہا ہے' برصغیر کے مسلمانوں کے علم وادب کے فروغ میں اس کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ تقسیم برصغیر سے قبل پورے برصغیر کے شائقین علم یہاں کے دانشوروں اور دانش گاہوں سے مستفید ہوتے تھے' یہاں اورینٹل کالج ہے جو علم شرقیہ کا ادارہ ہے جو عرصہ سے ایک بڑا علمی مرکز ہے اور اسکے علاوہ متعدد ادب وعلم ودین کے مراکز ہیں۔ اس عظیم شہر کی کسی علمی وادبی مجلس میں شرکت میرے لیے عزت اور مسرت کی بات ہے۔ خاص طور پر جبکہ اس محفل میں ملک کے صدر عالی مرتبت متعدد عظیم شخصیتوں کے ساتھ تشریف فرما ہوے ہیں' اور رابطہ ادب اسلامی کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ باوجود اپنی پیرانہ سالی کے شریک ہوے ہیں.

اس محفل علمی کا انعقاد رابطہ ادب اسلامی پاکستان کی علمی وادبی کوششوں کا ایک بیش قیمت آغاز ہے' اس میں پاکستان اور عالم اسلامی کے مختلف ملکوں کے مندوبین شرکت کر رہے ہیں جو حرمین شریفین کے سفرناموں کے موضوع پر اپنے عالمانہ مقالات پیش کریں

گے' میں رابطہ ادب اسلامی کے مرکز برائے ممالک مشرقیہ کی طرف سے اس سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

حضرت! اس سیمینار کے انعقاد کے لیے اورنٹیل کالج کے پرنسپل پروفیسر ظہور احمد اظہر اور ان کے رفقاء ڈاکٹر تحسین فراقی' ڈاکٹر محمود الحسن عارف' میاں احمد حسین اور جامعہ اشرفیہ کے مہتمم حافظ فضل الرحیم اور دیگر مقتدر شخصیتوں نے جو فکر مندی و توجہ کی اور جو مخلصانہ کوشش کی وہ لائق صد تحسین ہے۔ یہ حضرات پاکستان کی رابطہ ادب اسلامی کے روح رواں ہیں' انھوں نے ادب اسلامی کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے یہ مفید قدم اٹھایا ہے۔

حضرات! عالمی رابطہ ادب اسلامی کوئی رواجی قسم کی تحریک یا ادارہ نہیں ہے۔ یہ ایک ادبی برادری کا نام ہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلی ہوئی ہے' یہ برادری ادب کے ساتھ انصاف چاہتی ہے اور ادب کو انسانیت کے صحیح اور مناسب حدود کا پابند رکھنے کی قائل ہے'۔ یہ ادبی برادری قدیم بھی ہے اور جدید بھی' یہ اصطلاح سے مستغنی ہو کر کام کرتی رہی ہے' اس کے لیے "اسلامی" کی اصطلاح مناسب و مستحسن ادب کو فروغ دینے کے لیے اختیار کی گئی ہے' کیونکہ موجودہ عہد میں جو نت نئے رجحانات کی یلغار ہوئی ہے اس میں ادب کے انسانیت نواز ہونے کا تصور ختم ہوتا جارہا ہے' بلکہ کہنا چاہئے کہ ادب کا رشتہ انسانیت سے ٹوٹ کر بشریت کے سطحی تقاضوں کے اندر محصور ہوتا جارہا ہے' یہ بات ادب کی انسان دوستی اور مستحسن وسعت کے خلاف ہے۔ پھر ادب کو اخلاق بیزاری اور بددینی کا نقیب بنادینا بھی بڑا غلط رجحان ہے ادب کا آغاز تو در حقیقت دین سے گہری وابستگی سے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو الحاد نواز بنادینا اس کے ساتھ بڑی بے انصافی کی بات ہے۔ ادب کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ابتدا مذہبی نغموں اور گیتوں میں ملتی ہے' پھر اس کے بعد بھی برابر اس کو مذہبی احساسات و جذبات سے سوغات ملتی رہی ہے' وہ انسان کے انسانیت نواز احساسات کی وسعتوں کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ادب انسان سے ہے اور انسان اپنے متنوع جذبات و احساسات کے ساتھ ہے' اس کے نمونے دو دوستوں کے مابین خط و کتابت میں'

مظلوم کی فریادرسی اور مصیبت زدہ کی داستان میں 'مسرت وشادمانی کے تذکروں میں 'مسافر کی رودادِ سفر میں 'دوسرے کے حال کو دیکھ کر اظہار تاثر میں 'ہمدردوں کی ہمدردی میں 'غمگساروں کی غمگساری میں 'احساس لذت کے بیان میں اور احساس غم کے اظہار میں ملتے ہیں 'یہ نمونے کہیں ان کے زور وشدت کو دبا دیتے ہیں اور کہیں ان کو ابھار دیتے ہیں 'کہیں احساسات میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں اور کہیں جذبۂ وہمت کے لیے مہمیز بن جاتے ہیں۔

یہ نمونے ادب کی صرف رسمی کتابوں تک محدود نہیں ہیں 'ان کو تاریخ وسوانح میں 'مکاتیب و مواعظ میں 'تربیت و نصیحت کی کتابوں میں اور مذہبی صحیفوں اور اخلاقی تذکروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حدیث شریف جو تربیت و نصیحت کا اعلیٰ صحیفہ ہے۔ اس کو دیکھا جائے تو جستہ جستہ نہایت اثر انگیز کلام کے نمونے ملتے ہیں 'مثلاً غزوہ ہوازن کے بعد ایک موقع پر حضور ﷺ نے حضرات انصارؓ کو جو خطاب فرمایا وہ ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے جس میں انسانی نفسیات اور قلبی تاثرات کا غیر معمولی لحاظ اور اسکے لیے مناسب اور مؤثر طرز ادا اور الفاظ ملتے ہیں۔

حضرت علیؓ کی عبادت کے تذکرہ میں حضرت ضرار بن ضمرہ کا طرز ادا اور حسن بیان اور حضرت کعبؓ بن مالک کے غزوۂ تبوک میں پچھڑ جانے پر موردِ عتاب ہونے کے تذکرہ میں خود ان کا اپنے حال کا اثر انگیز بیان یہ اور اسی طرح کے دوسرے نمونے بتاتے ہیں کہ مذہبی احساسات کے ساتھ بھی ادب کی گہری وابستگی ہے۔

اس عہد زریں کے بعد دیکھیے تو حضرت حسنؒ بصری کے مواعظ میں اور امام ابن جوزیؒ کے نصائح اور اظہار خیال میں اثر انگیز ادبی نمونے ملتے ہیں۔ ہندوستان آجایئے تو مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات 'حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کلام دل پذیر' حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اثر انگیز مکتوبات دیکھیے اور پھر حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفاء کا تصنیفی کام دیکھیے کیسے کیسے اثر انگیز ٹکڑے ملیں گے 'پھر تحریک خلافت اور آزادی برصغیر کی کوشش کرنے والوں کا ادب دیکھیے 'یہ سب ادبی نمونے اگرچہ پیشہ ورانہ اور رسمی ادب کے نمونے نہیں ہیں 'لیکن وہ ادب کے تسلیم شدہ اور شاندار نمونوں کی صنف میں ہی داخل کیے

جانے کے حقدار ہیں اور جہاں تک سفروں کی روداد کا تعلق ہے تو وہ بھی ادب کی ایک صنف شمار کرنے کے لائق ہے۔

حضرات! سفر در حقیقت انسان کے متنوع خیالات و محسوسات کی آماجگاہ ہوتے ہیں اور خاص طور پر قدیم زمانے کے سفر جبکہ وسائل اور سہولتیں آج جیسی نہیں تھیں، زحمتوں اور دشواریوں سے بھرے ہوتے تھے اور سفر اگر آرام کے ساتھ ہوں تو بھی کچھ نہ کچھ دشواریوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ پھر اس میں غیروں سے سابقہ پڑتا ہے اور عادت کے خلاف حالات ملتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ ساتھ لطف و سرور کے مواقع بھی ملتے ہیں، نئے نئے مشاہدات ہوتے ہیں، بعض وقت کچھ کھونا پڑتا ہے اور بہت کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اور سفر اگر دیار محبوب کا ہو تو وہ لذت ذہنی اور لطف باطنی کا خاص طور پر حاصل ہوتا ہے اور محبوب اگر محبوب مجازی نہ ہو محبوب حقیقی ہو تو اس کی اور بھی شان دوبالا ہو جاتی ہے، یعنی دیار قیس و لیلیٰ نہ ہو حرم مکہ و حرم مدینہ ہو جہاں ذروں پر نظر پڑنے پر ذرے ستارے محسوس ہوں، بے آب و گیاہ زمین سبزہ زار محسوس ہو، بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی ہچکیاں بندھ جائیں، قبۂ خضراء دیکھنے پر مدہوشی سی طاری ہو جائے یا آنسو رواں ہو جائیں، خشک و ریتلی زمین کو دیکھ کر حرم کے شیدائی کے جذبہ قلبی کو وہ آسمان یا آسمان جیسی عظیم محسوس ہونے لگے۔ اور شاعر بے اختیارانہ یہ کہہ اٹھے:

نہ یہاں پہ سبزہ اگتا ہے نہ یہاں پر پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمین سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

جب آدمی کے الفاظ محسوسات ہی نہیں، بلکہ احساسات کی بھی ترجمانی کرنے لگیں، دین کی بات ہو لیکن رعنائی سے پر ہو، یہی وجہ ہے کہ حرمین شریفین کے سفرنامے ادب کا قیمتی جزو شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔

ہمارا رابطہ ادب اس طرح کے ادب کو اپنے ترجیحی موضوعات میں شامل کرتا ہے اور دین بیزار لوگوں کی نظر میں اس کم لائق اعتنا ادب کو مکمل لائق اعتنا ادب کی فہرست میں شامل کرتا ہے اور یہی ہمارے اس سیمینار کے داعیوں نے بھی کیا ہے، ہم اس پر اپنی مسرت

کا اظہار کرتے ہیں۔

حضرات! رابطہ ادب اسلامی کا قیام پانچ سال کی کوششوں اور مشوروں کے بعد عمل میں آیا ہے۔ یہ کوششیں یوں تو سابق میں برابر ہوتی رہی ہیں، لیکن اس صدی کی چوتھی دہائی میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے عربی ادب کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جو صرف اسلامی ادوار پر مشتمل تھا اور اس میں تاریخ خطب و مواعظ، خطوط حکایات و روایات کے چودہ سو سالہ ذخیرہ سے ایسے چیدہ چیدہ ٹکڑے اکٹھا کیے کہ وہ ادب کی فنی طاقت و برجستگی، کہیں ادبی رعنائی، کہیں اسلوب کی سادگی، کہیں زور اور کہیں گداز کے حامل تھے، کتاب کا نام "مختارات من ادب العرب" رکھا اور تعلیمی نصاب میں داخل کیا۔

کتاب نے عربوں کو بھی متوجہ کیا اور ان کے انصاف پسند ادیبوں نے اچھی داد دی، دمشق کے ادب عربی کے مقتدر ادارہ "المجمع العلمی العربی" نے مولانا کو اپنا رکن منتخب کیا تو مولانا نے اس کا شکریہ اپنے ایک قیمتی مقالہ سے ادا کیا جس میں اپنا وہ نظریہ بیان کیا جو "مختارات" میں اختیار کیا تھا، وہ نظریہ ہی ہمارے رابطہ ادب اسلامی کا بیج ہے جس کو پانی دینے سے وہ پودا بنا اور درخت بنا۔

چنانچہ ۱۹۸۱ء میں عرب و عجم کے ادباء ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جمع ہوئے اور انہوں نے ادب اسلامی کو فروغ دینے کے لیے ایک سکریٹریٹ کی تشکیل کی، پھر پانچ سال کے بعد ایک کانفرنس کے موقع پر عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا، یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے، اس وقت سے یہ رابطہ اپنے دو مرکزی دفتروں سے سیمیناروں اور اشاعتی کاموں کے ذریعہ کام انجام دے رہا ہے، ایک مرکزی دفتر لکھنؤ میں مشرقی ملکوں کے لیے ہے، جس کی رہنمائی میں ہندوستان، پاکستان اور اسکے کئی پڑوسی ممالک کے ملکی دفاتر ہیں، دوسرا ریاض میں عرب ممالک کے لیے ہے۔ لکھنؤ کے مرکزی دفتر نے ۱۹۸۱ء سے ابتک کئی سالانہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیے۔

ان میں سے ہر سیمینار تقریباً ایک بالکل نئے موضوع پر منعقد ہوا اور ان میں سے اکثر میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے مندوبین بھی شریک ہوئے، کئی سیمیناروں

میں پاکستان کے مندوبین نے بھی شرکت کی۔

سیمیناروں کے علاوہ کئی سال تک ادب اسلامی کا ایک ماہانہ عربی خبر نامہ شائع کیا اور اب تین سال سے "کاروان ادب" نامی ایک معیاری سہ ماہی مجلہ نکال رہا ہے جس کے ہر پرچہ میں کسی نہ کسی سیمینار کے منتخب مضامین دیگر اصناف کے مضامین اور حصہ شعر کے ساتھ ہوتے ہیں۔

الحمد للہ رابطہ ادب اسلامی کا تعارف اس وقت دور دور تک ہو چکا ہے اور ہمارے مشرقی ممالک کے دائرہ میں پانچ ملکوں میں باقاعدہ رابطہ ادب اسلامی کی انجمن کام کر رہی ہے، جن میں پاکستان بھی ہے، جس میں ادب اسلامی کے ایک دلنواز موضوع "حرمین شریفین کے سفر ناموں" پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے اور یہاں کا رابطہ ادب اسلامی اس کا میزبان ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ ادب اسلامی کے متنوع کام کا جو سلسلہ عالمی رابطہ ادب اسلامی نے شروع کر رکھا ہے اس کو برابر فروغ حاصل ہوگا اور اس سے ادب کے اثر انگیز اور روح پرور نمونوں میں اضافہ ہوگا اور ان کو بڑھاوا ملیگا۔

"حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں"

جسٹس میاں محبوب احمد (چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت' پاکستان)

آج کی باوقار اور بابرکت تقریب میں جس مقدس عنوان پر اظہار خیال ہونا ہے وہ میرے لیے اور آپ سب کے لیے سرمایۂ حیات' ذریعۂ نجات اور افتخار ایمان ہے۔ یہ ذکر ہے حرمین شریفین کا یہ بات ہے معبود حقیقی کے نگر اور محبوب حجازی کے شہر کی' یہ گفتگو ہے حسن محبوب کے جلووں اور زلف محبوب کی خوشبوں میں رچی بسی غاروں کی' یہ کہانی ہے یٰسین وطٰہٰ کے تصور میں صدیوں سے مستغرق پہاڑوں کی' یہ قصہ ہے شہیدوں اور غازیوں کی شہادت و جرات کے شاہد بدر واحد اور حنین و تبوک ایسے میدانوں کا' یہ تذکرہ ہے بیت اللہ کے جلال اور گنبد خضریٰ کے جمال کا.

سامعین کرام! زیارت مکۃ المکرمہ اور دیدار مدینۃ المورہ ہر مومن کے دل کی خواہش ہے جو زاد راہ اور اسباب سفر رکھتا ہے وہ بھی کہتا ہے کہ "میرے آقا بلالو مدینے مجھے" اور جو بے کس' نادار' محروم اسباب ہے وہ بھی تڑپتا ہے: "مرے مولا بلالو مدینے مجھے" اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے' جب یاد مدینہ آتا ہے.

ہمیں منتظمین تقریب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے تحدیات جدیدہ کے تناظر میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ حرمین شریفین کے سفرناموں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ایسا موضوع کہ جس پر بات کرتے ہوے زبانوں سے پھول جھڑتے اور کانوں میں رس گھلتا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے باوضو ہوتی' اور روحیں وجد کر اٹھتی ہیں اور پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ 'بقول مظہر:

جہاں جہاں سے وہ گذرے جہاں جہاں وہ ٹھہرے
وہی مقام محبت کی جلوہ گاہ ہے

سامعین محترم! زمانہ قدیم ہی سے ہر زبان میں سفرنامے لکھے جاتے رہے ہیں اور لکھے جارہے

ہیں۔ ان سفر ناموں نے ہر دور میں ٹھوس معلومات فراہم کی ہیں اور آج بھی ان کے فیض کی برکتیں جاری وساری ہیں۔ بقول قطب النساء ہاشمی :

"ہر سفر نامہ نگار کنواں کھود کر اپنی پیاس بجھاتا اور دوسروں کی تشنگی دور کرنے کا سامان کرتا ہے" پھر دنیا کے تمام مذاہب نے سفر کی عظمت واہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے' اسے روحانی کیف اور عبادت کا حصہ قرار دیا ہے۔ جہاد اور حج کے لیے تو مسلمان سفر اختیار کرتے ہیں مگر اس کے علاوہ بھی قرآن مسلمانوں کے فکر و شعور کو جلا دینے ان کے قلب و نظر کو وسعت اور ایمان و یقین میں پختگی لانے کے لیے انہیں بساط ارض کے مشاہدہ کا حکم دیتا ہے ارشاد باری ہے :

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ "تم یعنی زمین میں سیر کرو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"

قرآن حکیم مسلمانوں کے ذوق سفر کو تیز تر کرنے کے لیے انبیاء کرام کے قصص بیان کرتا ہے۔ گویا وہ ایک ہی محبوب اور معبود کی آتش عشق میں مصروف طواف قافلوں کے سفر ناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ کہیں آدم علیہ السلام جنت سے زمین کے لیے عازم سفر ہوتے ہیں۔ کہیں ابراہیم علیہ السلام کا زمینِ اورؔ سے مصر اور مکہ کا سفر ہے۔ کہیں یوسف علیہ السلام کا کنعان سے مصر کے سفر کا جمال منظر ہے اور کہیں موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے وادی سینا کی طرف سفر شوق کا پر جلال نظارہ ہے۔ قرآن حکیم سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے سفر ہجرت کی داستان جذب و شوق بھی بڑے دل نشین پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ قرآن مسلمان کو ایک جگہ کے جوہڑ کے بجائے متحرک و فعال جوئے رواں بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے سارے انبیائے کرامؑ کے سفر نامے بیان کرتا ہے۔ اقبال نے اسی ذوق کو ابھارتے ہوئے کہا :

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

غر میں جہاں ہزارہا شجر سایہ دار ملتے ہیں۔ وہاں قدم قدم پہ خطرات وخدشات کی گہری گھاٹیوں

سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ صبر و تحمل' برداشت اور استقامت کے بغیر سفر کی صعوبتوں کا مقابلہ از بس دشوار ہوتا ہے۔ قرآن بڑے دل آویز لہجے میں ان تکلیفوں کو سہارنے کا حوصلہ دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ ترجمہ: "یعنی اور جو اپنے گھر سے نکلا اللہ رسول کی طرف ہجرت کرتا پھر اسے موت نے آلیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگا۔

سامعین محترم! تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ مقامات مقدسہ ہیں اور ان کی طرف سفر کی روایت بھی موجود ہے۔ مگر جو مقصدیت اسلامی سفر میں ہے اور جو جاذبیت اسلامی مراکز محبت میں ہے وہ کسی اور جگہ میں نہیں پائی جاتی۔ مکہ کے عنوان سے انگریزی میں لکھی گئی ایک جدید کتاب کا مصنف اس کے حرف آغاز ہی میں لکھتا ہے کہ مکہ دنیا کے مراکز مذہبی سے حیرت ناک حد تک مختلف ہے.

یہ تعمیری عظمت یا فنی کمال نہیں جو اہل ایمان کو یہاں کھینچ لاتا ہے۔ یہ مرکز اسی کروڑ انسانوں کو اسی مقناطیسیت سے اپنی جانب کھینچتا ہے کہ دوسرے مقدس مقامات اس کے مقابلے میں دھندلا کر رہ جاتے ہیں۔ لاماؤں کا لاسہ 'عیسائیوں کا کنٹربری' سکھوں کا گولڈن ٹمپل اور ہندوؤں کا بنارس ان قوموں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں' مگر یہ سب مکہ کے پاسنگ بھی نہیں ہیں.

حاضرین کرام! یوں تو اردو' انگریزی اور عربی میں بے شمار سفرنامے لکھے گئے ہیں مگر ابن بطوطہ' المسعودی' البیرونی اور ابن جبیر اندلسی کے سفرنامے کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں.

انگریزی میں رچرڈ برٹن کی **Pilgrimage to Madina And Makah** اور محمد اسد کی **The Road To Makkah** معرکے کی چیزیں ہیں۔ جدید انداز میں مصر کے مایہ ناز مصنف اور معروف سیرت نگار محمد "حسین ہیکل کی "منزل الوحی" اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جو اپنے قاری کو سرمست کر دیتی ہے۔ ہیکل دیدہ و دل سے مشاہدہ کرتے ہیں اور وجدان و دماغ سے پرکھتے ہیں اور قلب و روح کو جگمگاتے ہیں پھر خون جگر کی روشنائی اور محبت رسول ﷺ

کے قلم سے لکھتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف شہر نبوی اور مسجد نبوی میں ہی نہیں لے جاتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں دور نبوی اور محافل صحابہؓ میں بھی لے جاتے ہیں اور ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہم اس پاکیزہ فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اسی طرح اردو میں بھی خوب خوب سفر نامے لکھے گئے ہیں مگر معلومات کی وسعت' مشاہدے کی گہرائی انداز بیان کی گرفت میں "آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر" کے مصنف عبدالرحمٰن عبد نے بھی حق کمال ادا کیا ہے۔ اسے بجاطور پر قدیم و جدید سفر ناموں کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ سفر ناموں کی تاریخ میں قدیم ترین مورخ یونان کا ***He-rodotus*** ہے اور وہ سفر نامے کا **A motion Picture Orillustrated Lecture De-scribing The Travel** لکھتا ہے.

اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کامیاب سفر نامے وہی ہیں جو ہمیں اس عہد کے سیاسی' سماجی اور تمدنی حالات کی ایک متحرک تصویر سے روشناس کراتے ہیں۔ ایسے سفر ناموں کا مطالعہ صدیوں کے پردے چاک کر کے ہمیں محبوب حجازی کے مقامات محبت اور مجالس نور و نکہت میں لے جاتا ہے اور ہم براہ راست ان کے انوار سے اپنے عہد کی ظلمتوں کا مداوا کرنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اک اک مقام سے گذرتے ہوئے رہ رہ کر ہمیں خیال آتا ہے:

خوشا وہ دور کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

اور پھر ہمارے قلب و جگر کی گہرائیوں سے ایک تمنا فریاد کرتی ہے:

لوٹ جا عہد نبی کی سمت رفتار جہاں
پھر مری درماندگی کو ارتقا درکار ہے

جناب صدر گرامی قدر! جدید عہد کے چیلنجوں کے تناظر میں روداد سفر حجاز بیان کرنے میں مجھے پھر حکیم الامت علامہ اقبالؒ ہی کی فریاد یاد آتی ہے کہ جب وہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اور یہود و نصاریٰ کی سازشوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ملت اسلامیہ کے غم میں کہتے ہیں کہ:

ع۔ نگاہ یا رسول اللہ ﷺ نگاہے

اور بے چینی اور اضطراب میں ہوا ہی کو پیغام بر بنا دیتے ہیں' اقبال کہتے ہیں'

اے باد صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
اب ہاتھ سے اُمت کے تیری دین بھی گیا دنیا بھی گئی

آج کے تباہ کن حالات میں نصف کروڑ لوگوں کا ہر سال حج کے لیے مکہ و مدینہ میں دیوانہ وار حاضر ہونا اور حاضر نہ ہو سکنے والے کروڑوں مسلمانوں کا صبح و شام حاضری کے لیے تڑپتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ ملت اسلامیہ کا رشتہ اپنے مرکز سے استوار ہے۔ اس رشتے کو فکر اقبال کی روشنی میں پختہ تر کرنے کی ضرورت ہے' اقبال نے بجا کہا ہے کہ

تو فرمودی رہ بطحا گرفتم
وگرنہ جز تو مارا منزل نیست

ضرورت ہے حرمین شریفین کی مرکزی مقناطیست کو کام میں لا کر پوری امت' عالم کفر کے مقابلے میں یکجا و متحد کیا جائے۔ حج کے انسٹی ٹیوشن کو مسلمانوں کی عالمی اقوام متحدہ میں بدل دیا جائے۔ جہاں ہر سال مشرق و مغرب کے اہل الرائے دانش ور اور مسلم مفکرین مجتمع ہو کر عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کو درپیش چیلنجوں کا جائزہ لیں اور ان کے حل پیش کریں۔

سامعین کرام!

اطلاعاتی تکنیک (Infromative Technology) کو ترقی کے بل بوتے پر آج انسان پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج (Gloobal Village) یعنی عالمی قریے میں بدلنے کے خواب دیکھتا ہے۔ مگر رنگ نسل اور زبان کی بنیاد پر فکری اختلافات اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں جو اسے یکسو اور یکجان نہیں ہونے دیتے۔ اگر ہم غور کریں تو حج کی صورت میں مسلمان تو صدیوں سے عالمی قریے کا تجربہ کرتے چلتے آرہے ہیں۔ Multicultral Society اور Multiracial Society کو جو خطرات درپیش ہیں حج ان سے نپٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جہاں تمیز خورد و کلاں مٹ جاتی ہے جہاں عربی و عجمی' حبشی و رومی' ہندی و شامی کالے اور گورے سب Unicultural اور کچھ دیر کے لیے Unilangual سوسائٹی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی تشکیل اور فروغ میں یہ اجتماع بہت اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

حاضرین کرام! آج دنیا کو دہشت گردی کا سامنا ہے۔ عالمی امن کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ جرم اور بدی کو عروج مل رہا ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں لاکھوں لوگوں کا اپنے پیسے خرچ کر کے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ حاضر ہونا اس امر کی یقین دہانی کراتا ہے کہ مسلمان من حیث القوم دہشت گرد نہیں، عالمی امن کے پرچارک ہیں۔ اقوام عالم کو مسلمانوں سے خائف ہونے کی بجائے قیام امن کے لیے ان کی طرف دست تعاون بڑھانا چاہیے۔

خواتین و حضرات! اقبال نے مسلمانوں کے بدن سے روح محمد ﷺ نکال دینے کی سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے امت مسلمہ کو سبق دیا تھا کہ تمہارا وجود تمہارے رسول ﷺ کی بدولت ہے۔ اس لیے اگر اپنی بقا چاہتے ہو تو اپنے اساسی مرکز سے مضبوطی سے جڑے رہو۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف حج و عمرہ اور زیارات کے لیے سفر ہمیں اپنے مرکز سے مضبوط تعلق عطا کرتے ہیں۔ اس وقت جتنی مرکز گریز اور اسلام دشمن قوتیں اور تحریکیں کھل کر یا زیر زمین سرگرم عمل ہیں، شاید پہلے نہ تھیں، ان سب کا دندان شکن جواب ذہناً قلباً ظاہراً باطناً اور مصطفیٰ ﷺ سے کامل وابستگی میں ہے۔ دیار رسول ﷺ کی حاضری اور پھر اس کے تذکرے اس وابستگی کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ یہی ایک چراغ ہے کہ جس کی لو سے کفر کی ظلمتیں لرزاں ہیں۔ اس لو کو مسلسل تیز کرتے چلے جانے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد (ﷺ) سے اجالا کر دے

محترم سامعین! در رسول ﷺ کی حاضری کس طرح تعلق باللہ اور تعلق بالرسول ﷺ کو مضبوط کرتی ہے۔ اس کے روح پرور مناظر کیلئے میں چند اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں پہلے ایک غیر مسلم رچرڈ برٹن کی کتاب ***Pilgrimage To Madina And Makkah***

کا حوالہ دیکھیے "وہ لکھتا ہے مدینہ منورہ کو دیکھتے ہی اپنے اونٹ سب قافلے والوں نے اور سلف الصالحین کی اقتداء میں تمام قافلے والے اونٹوں سے اتر آئے اور زمین پر بیٹھ کر بڑی دیر تک سب نے اپنی آنکھیں اس مقدس شہر پر لگائے رکھیں۔ پھر ننگے پاؤں بصد احترام مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اس طرح سر جھکائے ہوئے، یہ زائرین پاپیادہ مدینۃ النبی پہنچے"

دیکھا آپ نے کیا ادب ہے کیا محبت ہے جیسے کچے دھاگے سے بندھے دل و جان آپ ہی کھنچے چلے جا رہے ہیں۔

اب محمد حسین ہیکل کی "منزل الوحی" کا حوالہ دیکھئے، وہ لکھتے ہیں:

ہم حجرۂ مطہرہ و قبر رسول ﷺ کے سامنے پہنچ گئے۔ میں اس مقدس و محترم حجرہ کے سامنے اپنی جگہ مؤدب کھڑا ہوں ڈرتے ہوئے کہ کہیں کوئی بے ادبی نہ ہو جائے کیوں کہ میں شہ کونین کے حضور ﷺ میں ہوں جو سکون جاں بھی ہیں اور قرار دل بھی جو آیۂ رحمت بھی ہیں حاصل حیات بھی مکمل حسن بھی ہیں اور قرآن مجسم بھی"

یہ سلسلہ محبت تو بہت طویل ہے میں ایک آخری اقتباس پیش کرتا ہوں در رسول ﷺ کی حاضری پر پروفیسر عاصی کرنالی لکھتے ہیں:

"میں اس وقت عدم کا ایسا نقطہ تھا جو مٹ رہا تھا، مٹ چکا تھا، نقطہ بھی معدوم ہو چکا تھا ایسے میں کیا کرتا مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ بس میں بے ساختہ درود پڑھنے لگا، بے تحاشا رونے لگا، میں ان کے سامنے ذرہ تھا جو اڑ گیا۔ یا موم تھا جو پگھل گیا۔ یا آنسو تھا جو بہہ گیا بس درود، مسلسل درود، لگاتار درود، زبان سے درود، دل سے درود پورے وجود سے درود"۔

آیئے! ہم بھی یہاں بیٹھے ہوئے اپنے آقا و مولا ﷺ کی دہلیز نور کا تصور کرتے ہوئے روح و دل و نگاہ سے درود پڑھتے ہیں:

خاک یثرب زدو عالم خوش تراست
آں خنک شہرے کہ آنجا دلبراست

نمائش کتب
بین الاقوامی سیمینار

اورنگ زیب ملک (سیکرٹری اطلاعات رابطہ ادب
اسلامی و منتظم خصوصی برائے نمائش کتب)
لائبریرین پنجاب ٹیکسٹ بورڈ گلبرگ لاہور

عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام "حرمین شریفین کے سفر نامے: جدید تحدیات کے تناظر میں" کے موضوع پر 24 - 25 اکتوبر 1997ء کو لاہور میں پہلے بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس سیمینار کے کو زیادہ موثر اور نمائندہ بنانے کے لئے دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ الحمرا آرٹ سنٹر میں نمائش کتب کے اہتمام کا بھی فیصلہ کیا گیا جس کی ذمہ داری راقم کو سونپی گئی۔ نمائش کتب کے بنیادی مقاصد میں اس امر کو پیش نظر رکھا گیا کہ ملکی و غیر ملکی مندوبین کو پاکستان میں شائع ہونے والی اسلامی مطبوعات سے روشناس کرایا جائے اور موضوع کی مناسبت سے پاکستان میں شائع ہونے والے حرمین شریفین کے سفر نامے بھی ایک خصوصی سٹال پر رکھے جائیں.

ابتدا میں تو یہ کام بہت آسان نظر آیا لیکن جب مجلس منتظمہ نے نمائش کتب کے سلسلہ میں پیش آنے والے مسائل خصوصاً سیمینار کے موضوع کے حوالے سے کتب کی دستیابی کے مسئلہ پر تفصیلاً غور کیا تو کئی مشکلات سامنے آئیں تاہم ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور ڈاکٹر محمود الحسن عارف کی رہنمائی اور تعاون سے ان کتب کا دستیاب ہونا آسان ہوا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی علمی و تحقیقی خدمات کا اظہار فوری طور پر سامنے آیا اور ان کی تیار کردہ ایک جامع فہرست راقم کو ملی جس سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا.

اسی دوران میں متعدد طباعتی و اشاعتی اداروں کی فہارس کتب کے ساتھ ساتھ مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ بھی استعمال میں لائے گئے اور جہاں جہاں ممکن ہوا ان سفر ناموں کے مصنفین سے بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ کیا گیا۔ بالخصوص ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی ذاتی کاوش سے کئی ایک سفر نامے حاصل ہوئے اور اورینٹل کالج کی لائبریری کے لائبریرین جناب شوکت اور

بشیر احمد بشیری کے مخلصانہ تعاون سے مزید کتب بھی مل گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے چیف لائبریرین محترم سید جمیل احمد رضوی نے ذاتی طور پر وائس چانسلر جامعہ پنجاب سے اجازت لے کر جامعہ پنجاب کی مین لائبریری سے سفرناموں کا ایک گراں قدر ذخیرہ عنایت فرمایا۔ ان کی محبت اور خلوص کا ایک اظہار یہ بھی تھا کہ وہ خود یہ تمام کتب نمائش کے مقام الحمراء تک ساتھ لائے اور انھیں ترتیب دینے میں مدد فرمائی۔

الحمرا میں نمائش کتب کے لئے فراہم کی گئی جگہ ناکافی تھی' مزید براں رات 9 بجے کے بعد بجلی گُل ہو جانے کی وجہ سے پیش آنے والی دشواریاں یقیناً ہمارے کام میں رکاوٹ بنتی رہیں۔ تاہم نمائش کے انتظام میں مدد دینے والے ہمارے رفقاء کی انتھک محنت سے نہایت خوبصورت انداز میں ہال کو سجایا گیا۔ اسلامی مطبوعات کے سٹال لگانے کے لئے اردو بازار لاہور سے "نذیر سنز" اور "شیخ غلام حسین اینڈ سنز" نے اپنی خدمات پیش کیں اور ان سٹالوں پر قرآن حکیم' احادیث' تفاسیر' سیرت النبی اور دیگر موضوعات پر کتب کا بہترین انتخاب موجود تھا۔ جامعہ پنجاب کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی جانب سے شعبہ کے چیرمین ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے خصوصی طور پر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مکمل سیٹ اور دیگر مطبوعات نمائش کے لیے عنایت فرمائیں اور یہ مطبوعات ایک خصوصی سٹال پر استفادۂ عام و فروخت کے لیے پیش کی گئیں۔ الحمرا ہال نمبر 3' جہاں پر نمائش کا انتظام کیا گیا تھا' میں ایک خصوصی کارنر میں قرآن حکیم کے لاتعداد نسخے شائقین علم کی توجہ کا مرکز بنے رہے' یہاں نمائش کتب کے ساتھ ساتھ پتوں پر اسلامی خطاطی کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا اور عالمی شہرت یافتہ برگ مصور جناب ناصر حق کے یہ شہ پارے' جن پر اللہ تعالیٰ' حضور اکرم ﷺ' خلفائے راشدین' امہات المؤمنین اور صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی نہایت خوبصورتی سے تحریر کئے گئے تھے' نمائش میں عوام کی "۔ حاصل کرتے رہے' ایک سٹال پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے اپنی مطبوعات اور ویڈیو تعلیمی سلسلہ کے ساتھ ساتھ نئی ویژن سرکٹ کا انتظام کر رکھا تھا' جبکہ ہال کو عالمی رابطہ ادب اسلامی کے مختلف بینرز سے سجایا گیا۔

24 اکتوبر کو بین الاقوامی سیمینار سے صدر مملکت جناب فاروق احمد خان لغاری نے خطاب فرمایا اور نمائش کتب کا افتتاح کرنے کے لئے ہال نمبر 3 میں تشریف لائے۔ صدر مملکت' گورنر پنجاب جناب شاہد حامد کے ہمراہ نمائش کے تمام سٹالوں پر آئے اور متعدد سوالات کیے۔ انھوں نے خصوصاً اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی اشاعت اور تکمیل پر مسرت کا اظہار فرمایا اور

نہایت دلچسپی سے مختلف جلدوں کا جزوی مطالعہ کیا۔ انہوں نے نمائش کتب کے شاندار انتظامات کو سراہا۔ صدر مملکت کو اس موقعہ پر جناب ناصر حق کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ پر مشتمل دو فریم پیش کیے گئے۔

سیمینار کے اختتامی اجلاس کے بعد ملکی و غیر ملکی مندوبین نے نمائش کا دورہ کیا اور پاکستانی مطبوعات میں گہری دلچسپی لی۔

بین الاقوامی سیمینار کے دوسرے روز (۲۵ اکتوبر) کی اختتامی نشست کا اہتمام الحمرا ہال نمبر ۳ میں کیا گیا تھا۔ جس کی صدارت کے لئے پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب میاں محمد شہباز شریف تشریف لائے۔ اس موقع پر وہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالحسن ندوی کے ہمراہ نمائش کتب ہال میں تشریف لائے اور مختلف سٹالوں پر گئے۔

الغرض اس موقع پر منعقد شدہ نمائش ہر اعتبار سے کامیاب رہی۔

عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کے اختتامی اجلاس میں منظور کی جانے والی قراردادیں

قرارداد نمبر ۱

رابطۂ ادب اسلامی کا یہ اجلاس پاکستان و بھارت میں مولانا الطاف حسین حالیؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، حافظ محمود شیروانیؒ، ڈاکٹر مولوی محمد شفیعؒ، ڈاکٹر سید عبداللہ، علامہ سلیمان ندوی، پروفیسر عبدالقیوم اور سید ابوالحسن علی ندوی کی اسلامی و ادبی روایات کو قائم رکھنے اور شعر و ادب کے ذریعہ اسلامی نظریہ حیات، اقدار اور تہذیب و معاشرت کے اسلامی و ادبی و معیارات کو اپنی کاوشوں کے ذریعہ پیش کرنے اور الحادی، گمراہ کن اور غیر اسلامی نظریات کی یلغار سے ادب کو محفوظ رکھنے اور فحش و مخرب اخلاق ادب کے اثرات کو زائل کرنے، نیز صالح و تعمیری ادب کی ترویج کرنے کی کوششیں جن اہل قلم نے کیں ان سب کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور ان کے کارناموں کو اسلامی ادب کا بیش بہا سرمایہ قرار دیتا ہے اور ان کی خدمات کے لئے اظہار تشکر کرنا اپنا اولین فریضہ تصور کرتا ہے۔

(پیش کنندہ ڈاکٹر ضیاء الحسن، دہلی)

قرارداد نمبر ۲

عالمی رابطہ ادب اسلامی کا یہ نمائندہ اجلاس رابطے کے کارپردازان سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

رابطے کا دائرہ کار اور اعضا میں توسیع کی جائے اور اسے علوم عربیہ و اسلامیہ کے اساتذہ تک محدود نہ کیا جائے، بلکہ ادب کی ہر صنف اور ہر زبان کے ادیب کو شریک فرمایا جائے۔

(۲) سیمینار کے انعقاد کا سلسلہ وسیع کیا جائے اور اسے دیگر شہروں تک پھیلایا جائے تاکہ ایک ہمہ جہتی پیش رفت پیدا ہو سکے۔

(۳) موضوعات کے انتخاب میں عصری تقاضوں کو اہمیت دی جائے۔

نیز حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے۔

کہ پاکستان و بھارت اور تمام اسلامی ممالک کے مسلم ادبا، علما، فضلا، اور سکالرز کے باہمی روابط کو مستحکم کرنے کے لیے وفود کے تبادلے اور اہل علم کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی کتب اور رسائل وغیرہ کی ترسیل کو آسان بنایا جائے۔

(پیش کنندہ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی)

قرارداد نمبر ۳

رابطہ ادب اسلامی کی یہ کانفرنس پاکستان کی سرزمین پر دنیا کے مختلف ممالک کے اسلامی ادبا' مفکرین اور محققین کی تشریف آوری اور اسلامی ادب کے پلیٹ فارم پر باہم ربط وضبط کے اس قیمتی موقع کی فراہمی کو ایک نیک فال تصور کرتی ہے۔ خاص طور پر ہندوستان سے ادیبوں کے ۱۵ افراد پر مشتمل ایک قافلہ کی آمد جس میں وہاں کی مختلف جامعات اور علمی اداروں سے وابستہ ممتاز اہل علم و قلم شامل ہیں اور پاکستان کے اہل قلم اور ممتاز افراد کے ذریعہ ان کے پر خلوص استقبال پر مسرت کا اظہار کرتی ہے۔ کانفرنس کو یقین ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں ختم ہوں گی اور خیر سگالی کے جذبات اور دوستی و اخوت کے جذبات کو فروغ حاصل ہوگا۔ اس موقع پر کانفرنس اپنے اس احساس کا اظہار ضروری سمجھتی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان سفر کی جو موجودہ زحمتیں ہیں وہ دور ہونی چاہئے خاص طور پر ایسے غیر سیاسی اور خالص علمی اجلاسوں میں شرکت کے لئے آنے والے دانشوروں اور ادیبوں کے لئے ویزا حاصل کرنے اور دونوں ملکوں میں زیادہ دن قیام کی سہولت ہونی چاہئے اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا جانا چاہئے۔ سفر کے سلسلے میں اس وقت جو دقتیں ہیں ان کی وجہ سے براہ راست علم و ادب کی ترقی اور اردو زبان و ادب کے فروغ' نیز اسلامی ادب کے صحتمندانہ خیالات کی حالت پر خراب اثر پڑتا ہے. کانفرنس اس وقت دونوں ملکوں کی فراخدل سیاسی قیادت سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے اہل قلم کے سفر کو آسان بنائے گی.

(پیش کنندہ : زاہد منیر عامر۔ لاہور)

"اسلامنا أدب وأخلاق"

ألقيت في قاعة الحمراء بمدينة "لاهور" باكستان بمناسبة ندوة أدب الحرمين لرابطة الأدب الاسلامى

خالدحسن هنداوى
عضو رابطة الأدب الاسلامى العالمية

يا مرحباً بجماعة الأدباء ... جئتم لباكستان حلف إخاءِ
الدين وحدكم فلاجنسية ... تعلو عليه بشرعة الحنفاء
بكم بدت "لاهور" مثل عروسة ... طربت لمن غنى بخير غناء
بلد الحضارة والثقافة والنهى ... غرس العلى و العلم والصلحاء
يكفيك من أعلامهم ورجالهم ... "اقبال" فهو ذؤابة الشعراء
قم يا محمد فالمشاعر قد خبت ... فالميتون بصورة الأحياء
أنت الذى حركت وجدان الورى ... و بعثت فيهم همة العلياء
من ظن أن الشعر والآداب لن ... تجدى ثنا من أجهل الجهلاء
فا المصطفى المختار حب للورى ... شعر الفضائل فهو نفع غذاء
واستنطق الفصحاء واستقوى بهم ... نعيم الهدى من سيد الفصحاء
"اقبال"(١)يابدراً تلألأ فى الدجى ... طلع الكواكب بعده بضياء
"فنسيم" (٢) قصاصٌ يعز كمثله ... وعلى رواياتٍ أخص روائيِ
ونعيم صديقي (٣) بشعر رائق ... فحل كبير فى دنى الشعراء

و "ظهور" (٤) وقد شعلة الأ دب التي　　استنير درب السائرين النائي

أدب الشريعة للحياة سعادةٌ　　و حضارة تضئ بخير بناء

هانحن قد سرنا على منهاجه　　فالتف هذا الركب رمز وفاء

لم يعيهم بُعد المسافة والعنا　　أن يمرحوا بحقيقة غناء

هذا هو "الندويٌ" (٥) كوكبناالذى　　مع رائه آوى لخير دواء

هوإن توارى ضوء شمسٍ لم يغب　　عن هذه الدنيا بضوء ذُكاء

العلم والإخلاص فى دمه' وإن　　ضنت رجال فهو فيض عطاء

فارو الظماء فانت حياتنا　　يا طيب إرواءٍ لنا ورُواء

علّمتنا أدب الحياة وكنهها　　من ديننا السامى على الآراء

أدب الفضيلة ربح وردٍ بينما　　أدب الرذيلة منتن الأرجاء

يحيى التبذل والميوعة والخناق　　و يحطم الأخلاق دون عناء

قل للذين استهزؤا و تكبروا　　هل ينفع المرضى طريح الداء

أدب التناقض والتشتت والأذى　　ألقى فتي الفكر فى إعياء

اسلامنا ادب و اخلاق فمن　　برم العلاء خفيه خير علاء

فيِ ندوه الحرمين هذى منيتي　　فاسمع أخيّ بلهفةٍ لندائي

شوقى إلى الحرمين شوق جارف　　إذ فيهما أنسي وحظّ شفائي

فالأولون إليهما قد هاجروا　　بل جاورو المولى بخير دعاء

والعالمون تبحروا حتى غداد　　اشياخ والطلاب بحر غناء

يا ليت رحلتنا تعود إليهما　　بالنفع لا لمجرد الأهواء

عوداً إلى الأدب الرفيع ورجعةً　　فالله أنزله بوحي سماء

ما كان من هدى الإله فطيب　　والخبث كل الخبث فى الإغواء

سظل رغم المرجعين أماجداً الشرع حادينا بكل حداء
عَلَم الشريعة لن يزال مرفرفاً مادام فى الشريان عرق دماء
أدب يقوم على الشريعة خالد ولواؤه يزرى بكل لواء
فمتى نوافى العالمين بعزنا ليعود بالأمجاد و العظماء
وتغرد الأطيار لحناً خالداً يا مرحباً بالشرعة الغراء
ولتسعد البشرية الحيرى بنا ولنمش فيها سيرة الخلفاء

لاهور ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۷ء

حواشی جات

(۱) محمد اقبال لاهوری، شاعر فیلسوف معروف .

(۲) نیسم حجازی کاتب باکستانی شهیر مؤلف روایات اسلامیه عدیده .

(۳) نعیم صدیقی شاعر اسلامی من اصحاب ابی الاعلیٰ المودودی .

(۴) دکتور ظهور احمد اظهر، رئیس رابطه ادب الاسلامی فرع باکستان .

(۵) سماحه شیخ الحسن علی الندوی الرئیس المرکزی للرابطة .

تاثرات

مولانا عبدالحفیظ المکی

(مکہ مکرمہ، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ)

الحمدللہ وحدہ والصّلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین ، امابعد عالم کفر کی قوتیں یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ اسلام ہی ان کے لیے خطرہ ہے۔اس لیے ان کی پوری کوشش ہے کہ اسلام آنے نہ پائے جس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر رہی ہیں اس میں خاص طور پر انکی سعی دو امور پر زیادہ ہے:

نمبر 1: مسلمانوں کو انکے رب سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کیا جائے۔ ان سے محبت و تعلق میں کمی پیدا کی جائے کہ وہ انکے احکامات پر عمل نہ کرنے پائیں۔

نمبر 2: مسلمانوں میں آپس میں مختلف انواع سے نزاع و خلفشار پیدا کیا جائے تاکہ وہ ایک متحدہ قوت نہ بن سکیں اور جسد واحد کی بجائے مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہو جائیں۔

اگر اس وقت کفر کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مختلف سازشوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو ان دو پہلوؤں پر اس کی مختلف انواع کی سازشیں صاف صاف نظر آئیں گی۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کا یہ مبارک سیمینار بعنوان (حرمین شریفین کے سفرنامے۔ جدید تحدیات کے تناظر میں) فی الحقیقت ان دونوں کفریہ سازشوں کو توڑنے کے لیے بروقت مناسب اقدام تھا کہ حرمین شریفین ظاہر ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے تذکروں سے ان سے تعلق کا بڑھنا لازمی امر ہے اور جتنا تعلق اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھے گا اتنا ہی ان کے احکامات و تعلیمات کو اپنانے کا جذبہ بڑھے گا۔ پھر حرمین شریفین اور حج و زیارت سے وحدت امت کا جو تعلق ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ واقعی طور پر امت مسلمہ مناسک حج و زیارت ادا کرتے ہوئے

حرمین شریفین اور مشاعر مقدسہ میں باوجود ظاہری اختلاف رنگ و نسل اور زبان و لباس کے جسد واحد کا مظہر تام ہوتی ہے۔

اللہ تعالی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے فیوض و برکات کو عام و تام فرمائے، پوری دنیا میں ان کے رفقائے کرام کو اپنے فضل و کرم سے نوازے اور رابطہ کے ذریعے ان کی عظیم دینی خدمات کو قبول فرمائے اور مزید توفیق سے نوازے۔ یہ راقم اس موقع پر خصوصی طور سے عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے مسئولین کرام کا ممنون و مشکور ہے کہ انہوں نے اس مبارک سیمینار میں مدعو فرما کر شرکت کا موقع مرحمت فرمایا۔

اس موقع پر ایک تجویز بھی ذہن میں آرہی ہے کہ اگر ہر حج کے موقع پر رابطہ ایک اجلاس مکہ معظمہ میں منعقد کر لیا کرے تو یہ ان شاء اللہ نفع بخش ہوگا، یہ راقم اپنے اور اپنے رفقاء کی طرف سے اس ذیل میں ہر طرح کا تعاون پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

تاثرات

مولانا سعید احمد عنایت اللہ
(مدرس مدرسہ صدیقیہ۔مکہ مکرمہ، سعودی عرب)

رابطہ ادب اسلامی کی پاکستانی شاخ کے صدر استاد محترم ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور سینئر نائب صدر رفیق محترم حافظ فضل الرحیم کی پر خلوص طلب پر ارض حرم سے ارض پاک کا سفر ہوا تاکہ قلب پاکستان (لاہور) کو ذکر حرمین شریفین سے منور و معطر کیا جا سکے اور رابطہ ادب اسلامی کے تحت منعقدہ دو روزہ سیمینار میں شرکت کی سعادت حاصل ہو سکے۔ سیمینار کا عنوان کچھ پیچیدہ، مگر پرکشش تھا" حرمین شریفین کے سفر نامے اور عالم اسلام کو پیش آمدہ چیلنج" اپنی نوعیت کا یہ منفرد سیمینار تھا جس نے امت کے تمام طبقوں کو جمع کر دیا ان میں درویش بھی ہیں' علماء اور فضلا بھی روحانی پیشوا بھی ہیں' صدر مملکت' صوبے کے گورنر' مرکزی وزرا' ملک کے ممتاز سکالر، دانشور، مفکرین، قلم کار بھی۔ الغرض سب کو اس سیمینار نے جمع کر کے حیران کر دیا کہ کیا یہ اشرفی سلسلے کی کرامت ہے یا جامعہ پنجاب کے قابل قدر اساتذہ کرام کی حسن تدبیر یا پھر یہ دونوں سلسلوں کی حسن آمیزش کا لذیذ ثمرہ۔ کچھ بھی کہا جائے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرز کا روحانی' فکری اور نظریاتی سیمینار' جو اس قدر کثیر اہل علم و فکر حضرات کو ان کے گراں قدر مقالات اور ادب اسلامی کی سحر انگیزیوں سمیت مجتمع کر دے مستحیل نہیں تو بے نظیر ضرور ہے۔ پھر مزید اس پر طرہ یہ کہ یہ سیمینار چند اہل خیر کے تعاون سے منعقد ہوا' حکومت سے تعاون کی نہ اپیل نہ خواہش' نہ طلب' پھر اس سیمینار جس نے اس کے بانی صدر حضرت مولانا علی میاں ندوی حفظہ اللہ کی خدمت میں عالم اسلام کے نامور ادبا کو جمع کر دیا تاکہ وہ ان سے مکمل فکر دل کی بات کہہ سکیں جو انہوں نے کہہ دی وہ ان کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر کے ان سے خدمت اسلام کا عہد و پیمان لے لیں جو انہوں نے لے لیا' اگرچہ یہ بات رسما تو نہیں ہوئی' مگر سیمینار کے ہر مندوب نے اس عظیم مفکر اسلام کی ہر بات کو اپنے لیے خزینہ معرفت جان کر پلے باندھ لیا ہے اور ادب کو برائے دعوت استعمال کرنے کا عزم کر لیا ہے۔

یہ اسی سیمینار ہی کی برکات ہیں کہ دعوت و عزیمت کے امام حضرت مولانا ندویؒ کو موقعہ فراہم کیا کہ وہ حکمرانوں اہل علم و دانش' دینی درسگاہوں اور سرکاری اداروں میں جلوہ افرو

ہو کر ان میں دعوت و عزیمت کی روح پھونک سکیں۔ سیمینار کے شرکا اور پیش ہونے والے مقالات کی علمی عظمتیں تو ایک الگ موضوع ہے جس پر مستقل گفتگو کی ضرورت ہے، مگر عمومی طور پر میرا تاثر، جس میں مبالغہ کی ذرہ بھی آمیزش نہیں، یہ ہے کہ رابطہ ادب اسلامی پاکستان کی طرف سے منعقدہ سیمینار نے امت کے ہر طبقے کو بہت کچھ دیا اور ہم طالبان علم کے لیے تو اس کی ہر نشست علم و عرفان کا وہ بحر عمیق تھا جس کے جواہر ثمینہ کو ایک مدت تک ہم جمع کرتے اور پروتے ہی رہیں گے۔ پھر انتظامات کے اعتبار سے بھی یہ سیمینار انتہائی کامیاب تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے منتظمین اور معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

أدب الرحلات إلى الحرمين الشريفين فى مواجهة التحديات المعاصرة: رؤية أدبية و دينية

دكتر محمد ابوبكر صديق' ·

استاذ القسم العربى جامعة داكا بنغلاديش۔

أدب الرحلات هو نوع أدبى يقوم على وصف الأديب لما شاهده فى رحلاته من عمران" وأحداث' وأشخاص و عادات و تقاليد وغيرها فنزلت الرحلة فى الأدب الحديث منزلة رفيعة' وأصبحت فناً من الفنون الشائعة فى معظم البلدان العالمية وقد ساعدعلى از هارها اختلاط الشعوب وسهولة المواصلات وحب الإطلاع ومعرفة مافى العالم من عادات وأخلاق يقتضى التأليف فيها ثقافة واسعة ودقة فى الملاحظة والتقاط الملامح المعبرة' ومشاركة فى عدد كبير من المعارف و الاحتواء الرحلة على معارف وعلوم متعلقة بالتاريخ والجغرافية والفلسفة والاجتماع والأدب · تعرض الأناقة فى تجيبوالمفردات' وصياغة العبارات وتنسيق الفصول۔ وإن في الرحلة متأتية من الوصف الطريق للواقع' والسرد الفنى للمغامرة الإنسانية" و العواطف المحركة للبشرونابعة أيضاً من أنواع الشخصيات التى تبرزها بحيث تبدو للقارئ متوافقة فى كثير من نزعاتها' و متفاوتة فى جوانب أخرى ليحتفظ كل منها بميزاته الفردية ١۔

والرحلات عند الإنسان فطرة أوهكذاتبدو. و من قديم ارتحل الانسان وحده وارتحلت القبائل' جرهم مثلاً وإياد وقضاعة' و تنوع الهدف أواختلفت الضرورة. وأشهر الرحلات رحلة الخضرو ذى القرنين' وأبرزها رحلة سيدنا ابراهيم من أقصى شمال الجزيرة العربية إلى مصر والبلد الحرام أى المكة المكرمة وفى العصر النبوى رحل النبى صلى الله عليه من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى'

حيث قال الله تعالىٰ سُبۡحٰنَ الَّذِىٓ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِىۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا‌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ وفى العصر لحاضرجاب الجزيرة العربية كثير من المشارقة والمغاربة مجموعة الأجانب المستشرقين على رأسهم بركهارت.(٢)

إن أدب الرحلات مازال مستمراً ولكنه أقل مماكان عليه سابقاً۔ فقد كتب الأولون وتركوا تراثاً غزيراً فى هذا الميدان فما أجمل أن نهتم بهذا الجانب ونكتب عن البلدان التى نزورها ونشاهدها ونطلع على آثارها ومعالمها وثقافتها و حضارتها بأسلوب ممتع يزيل السأم عن القارئ ويجدد نشاطه لمواصلة القرائة۔ فلقد أفاد أسلافنا فى كتاباتهم عمن أشرنا إلى أسمائهم و لكن انتفع الكثيرون من رحلات ناصر خسرو (ت٤٨١ھ/١٠٨٨م) الذى كان شاعراً من بلخ ومن اقطاب الأدب الفارسى حج إلى مكة وزار سورية وفلسطين ومصر والجزيرة العربيةُ ترك لنا أخبار رحلاته فى كتابه "سفرنامه" كما دوّن الكثيرمن المعلومات فى الكتاب" فتوح البلدان ممن أمد الثقافة العربية بثروةٍ فكريةٍ و تاريخيةٍ كذلك فى رحلات الاستاذ عبدالوهاب عزام الشئ الكثير من المعارف والآداب والعلوم.(٣)

كمالاننسى مجموعة من المستشرقين ممن عنوابالتقيب والسياحة والتاريخ ودارسة الآثار فى الشرق العربى وقاموا برحلات فى أنحاء مختلفة من البلاد العربية و جمعوا قدراً كبيراً من المعلومات ودربسوٰاها دراسته علمية ونشرواتلك الدراسات وكتبواالرحلات التى قاموا بها وهى تحوى آراء و معلومات عن بلاد العرب خاصة الجزيرة العربية أى المكة المكرمة والمدينة المنوره على جانب كبير من الأهمية ومهمايكن من نقص فيما نكتبه خلال زياراتنا فإن فى ذالك فائدة للآخرين وخاصة فيما يتصل بالمجالات الاقتصادية و الدينية والعلمية وغيرها۔ فإن ذلك يساعد المهتمين بها۔ فكم ترك الأول للآخر فاذا زار

أحد بلداً من البلدان وتحدث عن جامعا تها ومكتباتها وآثارها الدينية والعلمية وما تحويه من مخطوطات فإن ذلك بعين الباعث والمهتم بذلك.(٤)

إن الكثيرمن العلماء والأدباء والمفكرين يزورون بلداناً كثيرة ويحضرون مؤتمرات شتى فما أجمل أن يسجل هؤلاء افكارهم وآراء هم و مشاهداتهم لتلك البلدان عند زيارتهم لها وخلال زياراتهم لمكتباتها ومصانعها ومجامعها العلمية والفكرية ومقابلاتهم للشخصيات العلمية المرموقة فيها۔ إن أدب الرحلات حينما يتصدى له العلماء والمفكرون فانه يظل مخصباً و مفيداً وذاعطاء علمي غزير بحيث يبرزفيه الجانب التصويرى والسياق الأدبى والتحقيق التاريخي والاجتماعي وتطعمه بمأثور الشعر والمثل والحكم مماتقتضيه المناسبة.(٥)

إن الكثيرمن الناس قدلاتتاح له فرص الاسفار والتجوال ولذافهو يجدمتعة و فائده فيمايقرأه من تلك بفضل اتصال العالم مع بعضه وتوفرمن مسائل المواصلات فينبغي أن نهتم بأدب الرحلات وتدوينه وتسجيله أذالملاحظ عدم الاهتمام بذلك مع انه عن بلاد العالم الآخربل كتاب مفتوح يقرأالمرء بين ثنايا سطوره دقائق حياة الأمم ومآثرها وتراثها وحسنها وسيئها وخاصة فى هذا العصر الجديد الذى اصبحت المسافات فيه بين الدول متقاربة والانتقال من بلدإلى آخر اصبح ميسوراً بل ها هى القارات تصل وتلتحم ببعضها إنه عصر الاتصالات السريعة بكافة أنواعها وألوانها وذلك بفضل التقدم العلمي الحديث الذى افرزهذه الانجازات الباهرة إذ أخذ نا نرى و نسمع و نشاهد بالصوت والصورة مايحدث فى شتى أنحاء العالم، كما أن الاقمار الصناعية التى أخذت مداراتها حول الكرة الارضية لتسجل وتلتقط آلاف الصور رغم طول المسافات لها دور كبير۔ واسلافنا الذين كانوا يستخدمون الجمل والخيل والحمار الزاجل ومع ذلك كانوا يأتون على ذكر كل الأهوال والأوصاف و وصفوا النياق كما ورد فى معلقة طرفة بن العبد.(٦)

كأن حدوج المالكية غدوة خلايا سفين بالنواصف من دد

بين ان يقول:

وإن شئت لم ترقل وإن شئت ارقلت مخافة ملوى من القد محصد

تبارى عتاقاً ناجيات وأتبعت وظيفاً وظيفاً فوق مورمعبد

ومع صعوبة تلك المواصلات فلم يترك اسلافنا باباً من أبواب العلم والمدنية الاوطرقوه ولاعلما من العلوم و الصناعات إلابرزوافيه وقدتحت مدينتهم بأجلى مظاهرها فى الشام ومصر والمغرب والاندلس وكانوا يدونون مايسمعونه من العلوم خلال رحلاتهم ويحفظونه فى صدورهم كماقال الامام الشافعیؒ .(۷)

علمى معى حيثما يممت ينفعنى

صدرى وعاء له لابطن صندوق

إن كنت فى البيت كان العلم فيه معى

أوكنتُ فى السوق كان العلم فى السوق

لقد كانوا فى رحلاتهم ينشرون العلوم والمعارف والآداب والفضائل۔

فنعيد الى الأدب الخالد مجده الرفيع أوشيئا منه بأن نتصفح أدب الرحلات والمحور الذى يدورعليه فهويعطينا صورة لاولئك الرحالة من الأدباء والمؤرّخين الذين اكتسبوامعارفهم عن طريق المشاهدة والاسفار والمعاينة فأتواباًعمال علمية باهرة فى تاريخ الحضارة والنهضة الإسلامية حيث قاموا برحلات بعيدة وواسعة عملاً بالتوجيه الالهى (قُلِ انْظُرُوا مَاذَا فِىْ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ) و (قُلْ سِيْرُوْافِىْ الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَالْخَلْقَ) فخرجوايطلبون العلم بالارض الواسعة ومعرفة آداب وطبائع واخلاق وتواريخ الأمم والديار اذيقول المسعودى (ت ۹۵٦م) وهو رحالة معروف "ليس من لزم جهة وطنه وقنع بما نماإليه من الأخبار عن اقليمه كمن قسم عمره و قطع الاقطار ووزع أيامه بين

تقاذف الأسفار واستخراج كل دقيق من معدنه وآثارة لكل نفيس من ممكنه، ولقد كانت رحلاته مصدراً هاماً من مصادر معرفة الجغرافية.(٨)

إن الرحلات كمايقال تحقق التاريخ و تثبت ماكان صحيحاً منه وتنقض المكذوب فيه فالرحالة يميط اللثام والنقاب عن الحقائق الغامضة ويبدغيوم الأوهام وينقل الحقيقة كما هى ولقدقيل "الرحلات والأسفار وتغيير المكان تمنح صاحبها قوة". وأن المكتبة العربية لفى حاجة إلى كتب الرحلات فى مختلف الأدوار التاريخية واذاكان لأسلافنا المصنفات الممتعة فانه يحسن بنا وقد اتسعت دائرة الرحلات أن نعنى بهذا الجانب الذى سيثرى الادب العربى باستنهاض الهمم وحفزالمواهب والقدرات وسيقوى على ذلك كل عالم واديب منحه الله القوة والصبروالاحتمال۔

وهكذا فأدب الرحلات ارتياد لمناهل الثقافة والأدب والعلم والمعرفة اذتبدو البلاد أمامه كتاباً مفتوحاً يقرأبين ثنايا سطوره دقائق حياة الأمم وثقافتها وتاريخها و مآثرها وتراثها.(٩)

وأماالحرمين الشريفين هما المكة المكرمة والمدينة المنورة۔ المكة المكرة هى البلد المقدسة العظمى عندالاسلام لاحتوائها البيت المعظم الحرام والكعبة الشريفة مناسك الحج و مسقط رأس النبى محمد صلى الله عليه وسلم وعاصمة الحجاز۔ وهى مركز للملة الاسلامية يقال فى الجاهلية لهابكة قال الله تعالى: إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ.

والمدينة المنورة هى مدينة فى الحجاز وهى أسست على التقوى عمّرها خير البرية محمد صلى الله عليه وسلم هى ثانية البلاد المقدسة الاسلامية وفيها ثانى الحرمين وقبرالنبى صلى الله عليه وسلم . قال النبى صلى الله عليه وسلم لاتشدّوالرحال إلا الى ثلاثة مساجد المسجد الحرام والمسجد الأقصى ومسجدى

هذا.

الرحال جمع رحلة وهي كورا لبعير والمراد نفى فضيلة شدها وربطها ومعناها نهى' اى لاتشدوا الى غيرها' لأن ماسوى الثلثة متساوفى الرتبة غير متفاوة فى الفضيلة۔ فالحديث إنما كان نهياً عن الشدلغير الثلاثة من المساجدلتماثلها بل لابلد إلا وفيها مسجد فلامعنى للرحلة إلى مسجد آخر وأمازيارة القبور والمشاهد فلاتساوى بل بركة زيارتها تكون على قدردرجاتهم عندالله فالمسجدالحرام هوبيت الله و قبلة المسلمين رفع قواعدها ابراهيم خليل الله و اسماعيل ذبيح الله فقال تعالىٰ وَإِذْيَرْفَعُ اِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ والمسجد الاقصى هوالبيت المقدس وهو قبلة الأمم السابقة عمّرها سليمان عليه السلام۔ والمسجدالنبوى هوأسس على التقوى عمّره خير البرية۔ فكانت رحلة اليها وفادة إلى باريها . (۱۰)

لقد استأثرأدب الرحلات إلى الحرمين الشريفين باهتمام كثيرمن مفكرى ومثقفى العالم الاسلامى قديماً وحديثاً' وعنى به أعلام بارزون وأدباء ماهرون عبرمراحل التاريخ' ويحرص كثير من الناس على الاهتمام بأدب الرحلات إلى الحرمين فمن أشهرالرحلات والرحالين ۔

۱۔ ابن بطوطة (ت ۷۷۹ھ/۱۳۷۷م) فمازالت رحلته مصدراً كبيراً من مصادر علمى التاريخ والجغرافيا فى القرون الوسطىٰ' حيث أنه أول من جاب الأقطار العالمية وكتب عن حياتها الاجتماعيه والسياسية واحوال الأمم وأسرارها وعاداتها وتقاليدها' وكشف عن الكثير من مخبا تها۔ ولقد كتب الكثيرون من المستشرقين والباحثين حول ذلك حيث أحلوه المرتبة والمكانة اللائقة به۔ فهورحالة واسع المعارف والمدارك راغب فى اقتحام المخاطر والأهوال فهويعتبرمن اشهرالرحالين۔ وله شهرة فى عالم الرحلات والأسفاروحب التجوال

فقد دامت رحلته ثمانية وعشرين عاماً جاب في أثنائها شتى البلدان والأمصار والممالك' حيث انطلق من طنجة افريقيا' ثم مصر' فلسطين وسوريا والحجاز حيث ادىٰ فريضة الحج ثم تابع رحلتهٔ إلى العراق وفارس والهند والصين وبخارى وخوارزم وأفغانستان وسيلان والملايو وسرمطرة وإسبانيا وجبل الطارق' وغير ذلك مما جاء في كتابه المسمّٰى تحفة النظار في غرائب الأمصار وعجائب الأسفار" المعروفه برحلة ابن بطوطة التي ترجمت إلى الفرنسية والانكليزية والألمانية .(١١)

٢ـ المؤرخ حسن حسنى عبدالوهاب (ت ١٩٦٨م) فقال في رحلته القيمة "حج المغاربة قديماً وحديثاً" أما المراحل التي كان يسلكها الراكب فهي مراحل مألوفة معروفة من قديم الزمان' وقد ضبط اسماء ها بعض المغاربة الذين دونوا رحلاتهم' وقدنص اولئك الكتاب على محطات النزول ووصفوها كما ذكروا ايضاً مالاقوامن العقبات في اجتيازهم الطريق من المحيط الاعلىٰ إلى الحجاز ووضح لنا المؤرخ حسن حسنى بتفصيل أسماء طرق الحج البرية بالمغرب العربي وتحدث عن اصعب الطرق البرية على حجاج المغاربة . (١٢)

٣ـ الرحالة العبدى الحيحى' وهوالذى سحرالناس ببيانه في رحلته الحجازية "الرحلة المغربية" وشوقهم فيها إلى زيارة الاماكن المقدسة لدى المسلمين مكة والمدينة و قبرالرسول ﷺ۔ إنه رحالة عالم مجتهد' مجهول البلاد والوفاة' ولكن اشتهراسمه برحلته الحجازية التي هي حسب بعض النقاد المصنفين تفوق رحلة ابن جبير الشهير بلاغة واسلوباً وبياناً۔

٤ـ ابن جبير' محمد بن أحمد (ت ١٢١٨م)' ولدفي بلنسية في الاندلس وتوفي في الاسكندرية۔ وهورحالة عربي' درس الفقه والحديث في شاطبة شرب الخمرة مدفة فحج تكفيراً۔ زار الاسكندرية والقاهرة ومكه والمدينة والكوفة

والموصل والحلب و:.الدّمشق والعكا والصقلية۔ ووصف رحلاته الثلاث فی كتاب قيم يعرف "برحلة ابن جبير".(١٤)

٥۔ الرحالة احمد الهوارى (ت ١٩٥٣م) كاتب صحفی ورحالة معاصرمبدع مغربی رحل إلی الحجازسنة ١٣٥٢ھ/ ١٩٣٤م وبعد رجوعه من الحج وزيارته الحرمين الشريفين ألف رحلته الحجازية القيمة "دليل الحج والسياحة" علی نهج "الرحلة الحجازية" للبتنونی و "مرآة الحرمين" لابراهيم رفعت امير لواء الركب المصری۔ ورحلة تحتوی علی ٣١٠ صفحة۔طبعت بالمطبعة الرسميه بالرباط عام ١٣٥٤ھ/ ١٢٣٥م وهی تعتبر اليوم نادرة لاقد ميتها.(١٥)

٦۔ الأديب الرحالة احمد بن المأمون البلغيثی (ت١٣٤٨ھ)، وهو فقيه عالم رحالة و أديب شاعر بحاثة، ولد عام ١٢٨٢م بفاس وتخرج من جامعة القرويين وعيّن فيهااستاذًا و تولی القضاء فی مدن مختلفة بالمغرب نظم قصيدة حجازية سماها" النحلة الموهوبة النحازية فی الرحلة الميمونة الحجازية"۔ يصف فيها مقامه فی مكة وجدة وما وقع له بعد دخوله المدينة المنورة، فانشد : (١٦)

قصدت بيت اللّٰه للطواف والسعی فی تجرد الاعطاف
سبحانه هو الكريم ظننا به جميل لايخيب قصدنا
وبعد يومين و صلنا للتی هی لنا فی القصد أسنی مُنية
تلك الحبيبة و تلك طيبة تلك و تلك و هی ذات الهيبة
المصطفٰی محمد من ارسله ربُّ الأنام رحمة مسلسلة

٧۔ الرحالة عبداللّٰه كنون (ت ١٤٠٤ھ/١٩٨٩م)، وهو رائد الادب المغربی المعاصر۔ نشرت رحلته الحجازية ضمن كتابه"تحركات اسلاميه" وفی مقدمة كتابه تكلم عن انواع آداب الرحلة(١٧)

٨۔ الرحالة مصطفٰی الصباغ (ت١٩٦٦م)، هو أديب من أبرز كتاب صحيفة

"العلم" المغربية' كبرى صحف المغرب واقدمها وأشهرها' عصامى فى تكوينه' كتب فى السياسة والاجتماع والقصة والرحلة ' حج وسجل رحلته الحجازية فى ٤٩ صفحة نشرت مع المقالات التى جمعت بعد وفاته فى كتاب "رحلة فى حياة قصيرة".(١٨)

٩۔ الرحالة عبدالغنى سكيرج (١٣٣٥ھ/١٩١٧م)'وهو شاعر طنجة' له رحلة حجازية لازالت مخطوطة فى نحو ١٠ صفحة عنوانها "مشاهد من البقاع المقدسة (٧٢۔ ١٩٧٣)".(١٩)

١٠ الرحالة الداعية عمر مفتى زاده (ت١٩٧٤م)' كان رحمه الله داعية الله مخلصاً فى دعوته محباللإسلام مدافعاً عنه بقلمه ولسانه' كثير الرحلة اوالتجوال فى بلدان العالم نشر الدعوة الاسلامية فى كل من افريقيا وأوروبا واسياولدسنة ١٩١٩م بتركيا۔ استقرمع اهله بمكة المكرمة وفيها توفى وكان يتمنى ان يموت فى مكة .كتب يوميات نشاطه فى الحجاز تحت عنوان "فى طريق مكة المكرمة" ورحلة هذه يمكن ان ندرجها ضمن الرحلات فى سبيل نشرالدعوة الاسلامية كرحلة الدكتورتقى الدين الهلالى (ت ١٩٧٤م) "الدعوة إلى الله فى اقطار مختلفة" و سواها.(٢٠)

١١۔ عبدالسلام المكى بنيحى' هو قاض و شاعر معاصر من اهل شفشاون' نشررحلته الحجازيةفى طنجة (١٣٩٣ھ)' تحت عنوان "حج وحاجة" و قدقسمها إلى اربعة فصول: الأول طريق الذهاب' ذكر فيه المشاهد التى زارها' الثانى خاص بمناسك الحج' الثالث خاص بحياة الرسول ﷺ و جهاده' الرابع طريق الذهاب وهوالفصل الذى تحدث فيه عن المدينة المنورة والمسجد النبوى ومكة المكرمة.(٢١)

١٢۔ احمد الشريف السنوسى (ت ١٣٥١ھ)' هو من كبار المجاهدين والقواد

الاسلاميين فى عصرناالحاضر' برز اسمه على الساحة الاسلامية والعربية أثناء الحرب الطرابلسية التى قادها مدة اربعة عشرعامًا' ومن تلاميذه و قواده المجاهد الشهيد عمر المختار۔ انتقل الشيخ احمد السنوسى الى مكة المكرمة معتزلاً السياسة ولقى كل مساعدة من السعودية .(۲۲)

۱۳۔ الطيب المهاجرى (ت ۱۹۷۲م)' هو من أبرز العلماء بالجزائروله رسالة فى مناسك الحج ورحلته العلمية والحجازية "انفس الذخائر وأطيب المأثرفى اهم ماتفق لى فى الماضى والحاضر" هى أهم كتبه۔

۱٤۔ محمدحسين هيكل (ت ۱۹۵٦م)' هو مؤرخ مصرى كبير و صحافى و سياسى ورحاله وله "فى منزل الوحى" وهى رجلة القيّمة الى الحجاز حيث اطلق فيها لقلمه العنان' وكتب بصدق وحبّ عدة صفحات عن المدينتين المقدستين' لاسيما المدينة المنورة مثوى الرسولﷺ ومما عبرعنه بإيمان قوى كله اعتزاز بالاسلام و تعلق متين' كله تضرع و خشوع بين كعبة و صفوة انبيائه ورسوله' قوله "وبدأالناس ينصر فون من المسجد وأقمت مكانى' حتى إذا خلت أروقة المسجد أوكادت ذهبت أؤدى للحجرة النبوية ولقبرالرسول زيارة الوداع ......قائلاً: السلام عليك يا رسول الله............"(۲٤)

۱۵۔ ابراهيم عبدالقادر المازنى (ت۱۹٤۹م)' هواديب وصحافى مصرى مجدد' ناقدمن كبار الكتاب وله رحلة لطيفة "إلى الحجاز" قام بها سنة (۱۳٤۱ھ/۱۹۳۰م) بمناسبة الاحتفال بجلوس الملك عبدالعزيز آل سعود طبعت سنة ۱۹۳۰ فى ١٦٦ صفحة مزينة بالصور وهى تعتبرفى حكم النادرجديرة بالنشر من جديد اعتباراً لأسلوبها المشرق الرفيع.(۲۵)

١٦۔ ناصر خسرو كماذكرنا وله رحلة حجازية "السفرنامه" حج للمرة الأولىٰ ٤۳۸ھ خروجاً من مدينة الخليل إلى بيت المقدس و من بيت المقدس خرج

مسيراً على الاقدام إلى الحجاز وحج للمرة الثانية سنة ۴۳۹ه. و وصف فيها مكة المكرمة والمدينة المنورة بعبارات أنيقة .(۲۶)

۱۷۔ الرحالة السويسرى بوركهارت (ت۱۸۱۷م)، وله رحلة حجازيه "رحلات العرب" وصف فيها المدينة المنورة و مكة المكرمة بعبارات بليغة، فيقول: المدينة حسنة البناء فكل مبانيها من الحجر، وتتالف منازلها فى اكثر الامرمن طابقين عاليين، و سقفها مسطح.........أما الآن وقد نقصت مواردهم لايقدرون على مايكلفه البناء من عظيم النفقة...... ولذلك ترى المنازل الخربه والجدران التى توشك ان تنقص فى كل مكان، ومن ثم كان منظر المدينة كاكثرمدن الشرق ممايبعث إلى القلب الحسرة ولايعيدإلى الذهن من بهائما القديم إلاصورة ذابة".(۲۷)

۱۸۔ الأميرة خناثة بنت الشيخ بكارا لمعفرى: من أغرب رحلات الحج التى سجلها لنا التاريخ رحلة كنكوملك مالى الذى خرج من بلاده وتوجه إلى الحج وهو يحمل أطفاناً من الذهب الخالص على خمسمائة بعير من العبيد فى يدكل واحدقضيب من ذهب وأينماحل بدأيجزل عطاياه للناس من الذهب، وعند مابلغ مصرسقطسعرالذهب فيها بسبب كثرة الذهب الذى وزعه على الناس مجانا۔ و "رحلة خديو مصر الغربية" التى دون اخبارهذالبتنونى فى الرحلة الحجازية، ورحلة ام المعتصم ـالله من بغداد سنة ۶۴۱ه التى رافقتها فى حجها قافلة ضخمة تكون من مائة الف و عـ ـن الف حمل ورحلة ملك مصرالظاهر بيبرس بحيثه الحرار اندى واجه فيه امريكه ــ : ادبه معة وقضى عليه ودخل المدينتين المقدستين منتصرا راكبا عىى جواده ورحلة زبيدة قرينة هارون الرشيد التى بذت عينا تحمل اسمها وانفقت عليها اموالاً طائلة وحبستها على الحجاج۔ ورحلة خناثة بنت الشيخ بكارا المعفرى قرينة السلطان مولاى اسماعيل العلوى دونها عبدالقادر

الجيلاني المعروف بالاسحاقي بعدرجوعه من عام ١١٨٠ه وهي لازالت محطوطة في خزانة القرووين' وقد نشرمنهاد۔ عبدالهادي التازي مؤرخ المغرب الدبلوماسي الجزء الخاص بليبيا' التي خصصت لموكب الأميرخناثة استقبالاً شعبيأرا ئعاً۔

فيتعذر على أي باحث أومورخ عدد الشخصيات البارزة التي حلت بمكة المكرمة وبالمدينة المنورة عبر مختلف العصور' وكتبت رحلاتهم الحجازية۔ فهذا المؤرخ المقريزي يكتب خمسة مجلدات خاصة بالملوك الذين حجوا' ونجد أيضاً المؤرخ تقي الدين الفاسي يكتب ثمانية مجلدات خاصة بتراجم اعلام مكة والمدينة في هذا الموضوع۔

ادب الرحلات في مواجهة التحديات المعاصرة

إن أدب الرحلات إلى الحرمين الشريفين قديماً وحديثاً حينما يتصدى له العلماء والشعراء والادباء والمفكرون في وحدة الملة الاسلامية والأمة الإسلامية العالمية فإنه يظل مخصباً ومفيداً ومتحدياً و ذاعطاء علمي غزير بحيث يبرز فيه الجانب التصويري الحقيقي والسياق الأدبي الرفيعي والتحقيق التاريخي والاجتماعي الاسلامي وتطعيمه بمأثور الشعر الموزون بقافية والمثل الحقيقي والحكم ممااتقتضيه المناسبة في العصر الحاضر ومن الرحالة خاصه في أواخرالعهد العثماني ابراهيم رفعت الذي صور في كتابة "مرآة الحرمين" في وقائع رحلاته الاربع إلى الديار المقدسة' اذكان أميراً للحج المصري خلال السنوات ١٣١٨ه و ١٣٢٠ه و ١٣٢١ه و ١٣٢٥ه الموافق ١٩٠١م' ١٩٠٢م' ١٩٠٤م' ١٩٠٨م' وكذلك محمدلبيب الخديوي عباس سنه ١٣٢٧ه/ ١٩٠٩م ١٩١م' وقد أمره الخديوي "بوضع شئ عن هذالرحلات المبارك" وكلاالمؤلفين ليس لديهما اهتمام كبير باللغة العربية ولابالادب العربي' وإن كانا قد أشارا أشارات لطيفة إلى

لهجات بعض القبائل وأشعارها۔ ولعل أشهر رحلتين فى أواخرالعهد الهاشمى همارحلة خير الدين الزركلى فى "مارأيت وما سمعت" سنة ١٩٢٠م' ورحلة أمين الريحانى "ملوك العرب أورحلة فى البلاد العربية" سنة ١٩٢٢ ـ وكلاهما أديب و شاعر كما هو معروف۔ ولكن الزركلى كان بالمخطوطات و تحقيق الواضع والآثار۔ وقدأتاحت له رحلته إلى مدينة الطائف أن يتحدث من الكثير من معالمها و آثارها' كما تحدث عن البدو وآدابهم۔ وأماالريحانى فقد قدم لمهمة سياسية' لم تقتصر على الحجازبل شملت كذلك تهامة وعسيراً ونجداواليمن والكويت والنواحى اتسمح المحمية وعلى الرغم من النزعة الأدبية عند كل من الزركلى والريحانى فإنهما لم يتحدثاعن أدباء تلك الفترة۔ اماالرحلات العربية فى أوائل العهد السعودى فقد كثرت و تنوعت على الاماكن المقدسة مكة المكرمة والمدينة المنورة ولم يتعدهاإلى المناطق الأخرىٰ۔ ومن أهم هذه الرحلات: رحلة إبراهيم عبدالقادرالمازنى (ت ١٩٤٩م) "رحلة الحجاز" سنة ١٩٣٠م ورحلة الأميرشكيب ارسلان (ت ١٩٤٦م) "الارتسامات اللطاف" (سنة ١٩٣١)' ورحلة الطنطاوى (ت ١٨٦١م) "من نفحات الحرم" (سنة ١٩٣٥) ورحلة محمدحسين هيكل "فى منزل الوحى" (سنه ١٩٣٧) ورحلات عبدالوهاب عزام فيما بين سنتى ١٩٣٧م و ١٩٤٨م' ورحلة بنت الشاطئ "ارض المعجزات" (سنة ١٩٥١)۔

ومع أن هذه الرحلات جميعها قلما دفت ظهور الصحف والمجلات فى البلاد العربية' أى بداية تكوّن الأدب الحديث ونشره فى جرائد "ام القرى" و "صوت الحجاز" و "المدينة المنورة" و "البلاد" ومجلة "المنهل" فإن أحداً من أولئك الرحلة الأدباء لم يتوقف عندتلك الحركة النشيطه الناشئة الأدبية' ولم يشرأ ويسجل شيئاً مما أباحه الرواد الشباب فى تلك الفترة الأدبية۔ فنلاحظ مماسبق من الرحلات وأدبائها والرحالة الى الحرمين الشريفين أن الرحلات بطبيعتها عين

سريعة، تخطف الأشياء خطفاً وتسحلها عفواً، تبحث مدالمدهش والغرب، ولاتصل إلى أحكا مها نتيحة البحث والدارسة، بل غالباً ماتنطلق من تصورات ذاتية، وأحكام مسبقة وظروف خاصة و معظم السواح والرحالة الذين ذكرناهم لم يقدموا إلى الحجاز بدافع الحب أو البحث عن الحقيقة، وهم من هذه الناحية يصعب مقارنتهم بأسلافهم من الرحالة العرب القدماء، من أمثال ابن جبيروابن بطوطة، بل ولابالرحالة الأجانب الذين جابوا الجزيرة العربية والحرمين الشريفين طولاً وعرضا منذقرون مضت، ولقوا في سبيل الوصول إلى الحقائق الكثيرمن الجهدوالعنت۔

وإذاكان أدباء الشرق قداشتهروا في ميدان القصة، والرواية، والمسرحية، والمقالة العربية والادب الموسيقي فان المغاربة تفوقوا عليهم في ميدان الرحلات والتاريخ و الجغرافية والفلك، والمكتبة العربية والاسلامية تزخربمئات المخطوطات في هذه الفنون۔ وإن قمتُ باحصاء عدد الرحلات الحجازية التي ألفت عبرالعصورفرأيت الرحلات الحجازية المغربية تأتي في الدرجة الاولى بدون أن ينافسهاأيٌ دولة من دول العالم الاسلامي والعربي ۔ ويظن بعض الناقدين بأن السفربالطائرة أوالباخرة إلى الحج ولزيارة الحرمين الشريفين قضى على تلك الرحلات ولم يعد أحديقوم بتدوين رحلته الى الحج ' والحقيقة عكس ذلك، فالمغاربة لازالواعلى عادتهم مهتمين أشدالاهتمام بتدوين رحلاتهم الحجازية إلى الحرمين في العصر الحاضر فظهرمن الآيات الكريمة والأحاديث النبوية و آثار الرحالين الى الحرمين الشريفين من الأدباء والشعراء والخطباء والعاشقين لله تعالىٰ وللرسول ﷺ بأن الله سبحانه تعالىٰ فرض على الأمة الاسلامية حج البيت من استطاع اليه سبيلاً ليجتمع المسلمون من جميع الأقطار العالمية فيتجهوا إلى الله تعالىٰ ويتبهلوا إليه أن يؤيدهم بنصره ويعينهم على اتباع دينه القويم و دين النبي

الكريم ﷺ فيجتمعون في الكعبة المشرفة من حيث ليس فيهم فرق النسب والحسب والبلد والجنس و الشعب المذهب فيحصل فيه تقوية الرابطة الاسلامية العالمية واتحاد القلوب المشتة والفائدة الابدية العظيمة فنرى اليوم أن أفئدة المسلمين تهوى إلى مكة المكرمه والمدينة النبوية نعني الحرمين الشريفين من كل فج عميق ليشهدوامنافع بهما ويذكروا اسم الله في أيام معلومات دواهنالك الشعائر الالهٰية الدينية في أطهرالبقاع ويكفرواعن أثامهم وأوزارهم التي اثقلت كواهلهم وكم من أناس من الرحالين إلى الحرمين تعرضوا للضياع وألقوا بأنفسهم إلى التهلكة خاصة من استهوتهم الرحلات في المحيطات والصحاري والجبال۔

المراجع والمصادر

١ـ الدكتور اميل يعقوب وغيره، قاموس المصطلحات اللغوية والأدبية (بيروت: دارالعلم للملايين، ١٩٨٧م) ص ٢٥؛ جبوّر عبدالنور المعظم الأدبى (بيروت: دارالعلم للملايين،/ ١٩٧٩م)، ص ١٢١ـ١٢٢ـ

٢ـ علوى طهٰ الصافى، الفيصل، العدد ١٣٠، ص،/ ٤٦ (ديسمبر ١٩٨٧) /التحقيق الكتاب "سفينة الصحراء" لعبدالعزيز المسند.

٣ـ عبدالله بن حمد العقيل "أدب الرحلات: فن متميز" المنهل مجلة العرب الأدبية العدد/٤٩٧، ج ٥٤ (جدة: ١٤١٢هـ/١٩٩٢م)، ص ٥١ـ

٤ـ المصدرنفسه.

٥ـ المصدرنفسه.

٦ـ المصدرنفسه.

٧ـ المصدرنفسه.

٨ـ المصدرنفسه، ص ٥٢ـ

٩ـ المصدرنفسه.

١٠ـ مشكوة المصابيح، باب المساجد ومواضع الصلوٰة، ص ٦٨ـ

١١ـ عبدالله بن حمدالعقيل "ادب الرحلات" فى الفيصل، العدد ٢١٧ (رجب ١٤١٥هـ) ص ١١٥؛ الاستاذ كرم البستانى وغيره، المنجدفى اللغة والأعلام (بيروت: دارالشرق ١٩٨٦م)، ص ٩ـ

١٢ـ المجلة المنهل، العدد ٤٩٩، ج ٥٤ (١٤١٣/١٩٩٢) ص ١٨٦ـ

١٣ـ المصدرنفسه، ص ١٨٨ـ١٨٩ـ

١٤ـ المنجدفى اللغة والاعلام، ص ٩ـ

١٥ـ مجلة المنهل، عدد المدينة المنورة، ص ١١١ـ١١٢ـ

۱۶۔ المصدر نفسہ 'ص ۱۹۷۔

۱۷۔ المصدر نفسہ 'ص ۱۹۸۔

۱۸۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۰۱۔

۱۹۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۰۲۔

۲۰۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۰۵۔

۲۱۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۰۵۔۲۰۶۔

۲۲۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۲۔

۲۳۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۲۔۲۱۳۔

۲۴۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۴۔۲۱۵۔

۲۵۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۶۔

۲۶۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۸۔

۲۷۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۹۔

۲۸۔ المصدر نفسہ 'ص ۲۱۱۔۲۱۲۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ؕ

الرحلة الحجازية ومناهج المؤلفين فيها في العصر الحديث

سيد واضح رشيد الندوى (ندوة العلماء لكهنو الهند)

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله واصحابه اجمعين وبعد .

فان الرحلة ووصفها صنف منْ اصناف الأدبُ فى كل لغة من لغات العالمُ لأن الرحلة تنقل الانسان من حالة إلى حالة أخرى، ومن مكان إلى مكان آخر، ويلتقى المرتحل فى خلالها برجال واصناف من الناس، ويواجة أوضاعاً مختلفة وتتغير حالته الذهنية، ويشاهد مواضِع الجمال والقبح والمحاسن والمساوى، ويجرب ما لذّ وطاب، وما خشن وما تعسر، فاذا كان المرتحل ذا شعور مرهف، ويملكُ قدرة بيانية وصف كل ماشاهده وجربه وكل ما أحس به و تتحت فى ذهنه معان و تصورات، و يعلق عليها باعتبار شعوره ووجدانه و باعتبار ثقافته و علمه، فيحمل وصفه مادة علمية وفنية، تفيد غيره ويشتمل ادب الرحلة على فن و ادب و علم، ويلتقى فيه الوصف والمدح و التصوير للمناظر و تشخيص الأحاسيس ورسم الشخصيات، ويلتقى فيه علم التاريخ والجغرافيه، والسياسة والدين ومشاهد الحياة والطبيعة .

وقدكانت الرحلة عند العرب بصفة خاصة مميزة من مزايا الحياة، تميزهم عن غيرهم من الأمم، لانهم بحكم طبيعة حياتهم ولوضعهم قوم رحل، لايستقرون فى مكان كما قال شاعر عربى جاهلى(١)

ونحن اناس لااحجاز بازضنا مع الغيث مانلقى ومن هو غالب

وقدوصف العرب رحلاتهم فى أدبهم، نثرهم ونظمهم، وظل السفرووصفه

صنفاً من أصناف الادب العربی فلاتخلو قصیدة طویلة من قصائد العرب فی الجاهلیة م وصف السفروالارتحال . ولاحاجة الی ذکر امثلته وهی کثیرة عامة' سواء فی المعلقات اوالقصائد الاخری ویکاد یصبح وصف الارتحال سمة اللشعر العربی' وعرفت بعض القبائل بالرحلة لاغراض التجارة' وهی آمنة' فاذا کانت بعض القبائل ورجالها یرحمو ویختارون الغربة' ویصفون مهالکها 'ومغامراتهاکما قال الاخنس بن شریف اوکمایصف تابط شرا اوالشنفری أو السلیك بن ابی السلکه کانت قبائل آمنة تفو بالرحلة للتجارة کماکان بعض المرتحلین یرتحلون لزیارة الأمراء و الاغنیاء لطلب المال فکانوا یصفون مناظر السفرالطویل ویصفون القصور' وسکان القصور و مناظرها .

وقد أشار القرآن الکریم الی هذا الرحلة فی سورة مستقلة " لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ " (قریش) و ذکر القرآن الکریم رحلات کثیرة ووصف مشاهدها کرحلة موسی علیه السلام للقاء خضر علیه السلام وهی رحلته علمیة' ورحلته لدی خروجه من مصر خائفاً' ورحلة اخوة یوسف علیه السلام الی مصر فی طلب الرزق ورحلة سلیمان علیه السلام ورحلة ذی القرنین و تشمل جمیع هذه الرحلات علی صور بیانیه مؤثرة .

وتذکر کتب التاریخ ان العرب کانو یرتادون الی الهند و فارس والروم للتجارة. ووصف بعض هذه الرحلات التی اشتملت علی المغامرات محفوظة فی کتب التاریخ والتراجم .

وفی العهد الاسلامی ازداد هذا الارتحاه' فخرج العرب من بلادهم ووصلوا الی أبعد أماکن الارض . و بلغت قوافلهم الی افریقیا و اور باواقصی الشرق فی اوائل القرن الأول . وکانت هذه الرحلات للجهاد وللدعوة' وللعلم وللتجارة تحملوا فی هذه الرحلات شدائد و محناً لم تحتملها الأمم الاخری واشتملت کتب المغازی والسیرعلی وصف هذه الرحلات .

وقدحث القرآن الکریم علی السفر والسیاحة لتوسیع المعرفة . والتدبر فی آیات

الله . والتذكر برؤية عواقب الأمم السابقة' وذكر السفر والسياحة ورد فى القرآن الكريم في مواضع كثيره .

فالرحلة طبيعة عربية' وهى صنف من أصناف الأدب العربى ' القديم والحديث' وهى طبيعة اسلامية كذلك . وقد وسع دائرتها المسلمون سواء كان خروجهم فى الدعوة ام كان فى الجهاد أم فى السفارة الى الملوك والحكام أم كان فى طلب العلم' أم كان فى طلب الرزق' وكان الخروج من الوطن' وقطع مسافات طويلة' وتحمل الشدائد فيها . والرحلة الى اراضى حديثة' والالتقاء بامم اخرى سمة الحياة الاسلامية' وسجل كثير من هولاء المرتحلين انطباعتهم بأسلوب مؤثر جميل . وقصة جعفر بن ابى طالب لدى النجاشى' و قصة هجرة الرسول صلى الله عليه وسلم من مكة الى المدينة وقصة ربعى بن عامر لدى رستم وقصة الخروج لغزوة تبوك وحديث الافك وقصّة الاسراء والمعراج' وقصة سيدنا عمر بن الخطابؓ لدى فتح القدس نماذج رائعة لأدب الرحلة فى العصر الاسلامى الأول.

وتشتمل كتب التاريخ والتراجم على ادب الرحلة فى طلب العلم وصبر العلماء الباحثين فى السفر.

ونشأ فى العصر العباسى الأول قسم جديد من ادب الرحلة وهى الرحلة الخيالية و تمثل هذه الرحلة رسالة الغفران لأبى العلاء المعرى والتوابع والزوابع لابن شهيد الاندلسى' وهما أثران أدبيان لهما صلة بالرحلة وان كانت هذه الرحلة خيالية .

ومن اصناف ادب الرحلة الرحلة الحجازية وهى الرحلة للحج والعمرة يصف فيها العازم على الحج و العمرة سفره من بلده الى البلاد المقدسة' ويصف ما جربه من رحلته' ويصف مشاعره' ويصور مناظر خلاّبة' ويصف وعثاء السفر' لأنه يمر بالجبال والاوديه' والمروج والبيد' والغابات والبحار والأ نهار ويلتقى فيها برجال و يصادف الاقطار' والمخاوف' فتشتمل رحلته على وصف ومدح و تصوير للمناظر' و تشخيص للأحاسيس الذهنية . ورسم للشخصيات والمواد العلمية والجغرافية' والاحوال

الاجتماعية والرحلة الحجازية' وهو صنف اسلامى خالص رغم كونه صنفا أدبيا خالصا باعتبار المواد الأدبية' واشترك فى التاليف فيها كبارالادباء فى عصور مختلفة و قائمة الكتاب فى هذا الصنف طويلة' و توجد نماذجاً فى كل لغة من لغات المسلمين مثل المدائح النبوية التى توجد فى كل لغة من لغات المسلمين' وقد وصف القرآن الكريم هذه الرحلة باسلوبه المعجز الموجز فقال :

"وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالاً وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ' ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ"

مناهج الكتاب

تختلف مناهج الكتاب فى وصف الرحلة الحجازية باختلاف طبائعهم و ثقافتهم' فيغلب على بعض الرحلات الطابع الجغرافى اذاكان الكاتب مهتماً بجغرافية الأماكن التى زارها' ولا يطغٰى ذلك على العنصر الفن' لأن الرحلة عندما تنقله الى الاماكن المقدسة التى يشتاق اليها وكان حريصا على زيارتها منذ مدة اذا وقع بصره عليها فاضت قريحته' وثارت الأشجان والاشواق فتصبح هذه القطعة أدبية خالصة' ويبدو كأنه وصف لديار الحبيب' فان انتقل الى جوانب اخرى انتقل بعد تحيتها تحية لائقة' و منهج كاتب آخر منهج علمى رزين هادئ غيرمنهج وصف للمناظر والعرض الجغرافى' و سنقدم فى هذا المقال بعض نماذج من هذه المناهج المختلفة' .

نقدم اولا نماذج العرض الفنى الوجدانى' وقد اخترناه من كتاب من نفحات الحرم للاديب الكبير الاستاذ على الطنطاوى' وهو يصف رحالته برؤية جبال المدينة و نحدفيها كيف انتقل من حاله عادية إلى الىٰ حالة عاطفية :

يقول "صحت بالدليل يا محمد' ايش تكون هذه الجبال؟ فقال هذه يا خوى جبال المدينة ' ونحن ان شاء الله الظهر فيها . قلت ما تقول بى؟ ووثبت وثبة تطاير منها اليأس والخمول عن عاتقى' واحسست كأن قدصبّ فى أعصابى عزم امة و قوة جيش' وظننت انى لو أردت السحاب لنلته' ولوغالبت الاسود لغلبتها' ولو قبضت على الصخرلفتقته' وجعلت اقفز واصرخ' لا اعى ما انا فاعل' فقد استخفنى الفرح' وسرنى من هذه الكلمة اكثرما يسرنى ان يقال لى انت اميرالمؤمنين صحت بأصحابى وقاموا كالاسود"

واقراواهذا الوصف للاماكن و بيان الموقع الجغرافى' وكله باسلوب أدبى :

"خرجنا من الوادى' وانتهينا الى الفضاء الرحب' رأينا وجه أحد وعلى سفحه النخيل والبساتين . ورأينا سلعاً وهو جبل عال أسود يقوم حيال احد' فيحجب المدينة وراء ه' فلايبدو منها إلا جانب الحرة' وطرف النخيل' فذكرت قول محمد بن عبدالملك الزيات وقد ورد بغداد' فحن الى المدينة :

الا ليت شعرى هل ابيتنّ ليلة بسلع ولم تغلق علىَّ دروب
وهل حد بادٍ لنا وكأنه حصان امام المقربات حبيب
يخب السراب الضحل بينى وبينه فيبدو لعينى تارة ويغيب

وهل شعريكون اكثر تاثيراً من هذا البيت :

فان شفائى نظرة ان نظرتها الى أحد و الحرتان قريب
والى لأرعى النجم حتى كأننى على كل نجم فى السماء قريب
واشتاق للبرق اليمانى إن بدا وازداد شوقا أن تهب جنوب

ان الاشواق التى عبرعنها الشعراء هى أشواق مادية زائلة' سواء كان بيت امرئ القيس :

وان شفائى عبرة مهراقة فهل عند رسم دارس من معول

أوقول شاعر عربى:

هواى مع الركب اليمانيين مصعد　جنيب　وجثمانى　بمكة　موثق

أما الاشواق التى يذكرها محمدبن عبدالملك فهى اشواق روحانية' خالدة ووصفها وصف خالص و مؤثر يعالج القلب تأثيراً مباشراً .

وعندما يدخل هٰذا المشتاق حمآة الذى تخيله وتصوره فى ذهنه وعشقه وحن اليه فى حياته كلها . فكتب يقول و . يصف حيرته وهى حيرة العاشق أذا وقف امام حبيبه أومنزل حبيبه فيقول :

"نظرت فى خريطة المدينة كانت معى' وقلت للدليل أما هٰذا (ذباب) قال بلى والله فمايدريك انت' قلت أما هذا (مسجد الرأية) قال بلى' قلت هذه ثنية الوداع' وخفق قلبى خفقانا شديداً و خالطنى شعور بالهيبة من دخول المدينة' والسلام علىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم على ما فى نفسى من الفرح والسرور' وجعلت اتأمل المدينة' وقد دنونا منها حتى لقدكدنا نسيرين بيوتها واحدق بالقبه . وتحتها افضل من مشى على الأرض وقد شخص بصرى وكدت لا أرى ماكان حولى لفرط ما أحس من جيشان العواطف فى نفسى' حتى غاصت المشاهد فى عينى و تداخلت كانها صورة يضطرب بهاالماء وأحسست كأنى قد خرجت من نفسى' وانفصلت عن حاضرى . و ذهبت أعيش فى عالم طلق لاأثر فيه لقيود الزمان والمكان .

ويقول : ونظرت فاذا السيا رات امام باب السلام فأ شترأيت الأعناق' وبرقت الابصار' ودمعت العيون' وخفقت القلوب . وتعالى الهتاف' ونزلنا ندخل مسجد الرسول وكانت حال لاسيل الى وصفها قط . اللهم اجعل لنا الى تلك البقاع التى شرفتهابمحمد معاداً" .

ويصل هٰذا الملهوف والمشتاق الى مكة ويأتى موعد زيارة الكعبة فيخاطب صحبه :

"كانكم تدنون من الحبيب و دونه الحجب والأستار' فلاتزال ترفع لكم حجابا بعد حجاب' وستراً بعد ستر حتى تروا طلعة الحبيب واين طلعته من طلعة الكعبة

وقبلة الاسلام و مهوى القلوب .

ها هى ذى الكعبة ياناس، هٰذا الحطيم، وزمزم، والمقام، لقد صحت الرؤى، وتحققت الاحلام"

ويصف الطواف ثم يقول وهو يشعر بأنه عاجز عن البيان "انه ليس الوصف كالعيان ولايستطيع قلم ولا لسان ان يصف لكم هاتيك العواطف السماوية التى تملاء قلب المسلم انه يطوف بالكعبة فيخرج من حاضره وينسى دنياه". (۲)

ان هٰذا الكاتب الذى ذكرنا امثلته من رحلته الحجازية هوعربى يعيش فى جوار البلد الذى زاره، وهو ليس بغريب، فاذا كانت هذه رحلة أديب يعيش على بعد الاف الأميال فكم تثورعواطفه و تهيج سشحونه.

يقول الشيخ ابوالحسن على الحسنى فى كتابه "الطريق الى المدينة" وهو يعلل أسباب الشوق والهيام الذى تزخربه المدائح النبوية فى اللغتين الفارسية والهندية "علل بعضهم بالبعد والهجر، فلهما تاثير غريب فى تفجير منابع القلب والحب و توليد المعانى الغريبه و اشعال المواهب اللدفينة" (۳)

وهذه انطباعات نفس الكاتب الذى يزاورالمدينة المنورة، فيصف حاله وأشواقه، ويتصور عظمة المكان و قدسيته و تاثيره على قلب الملهفَ الولهان فيقول:

"توجهت بعد الحج الى المدينة المنورة على جناح الشوق، يحدوني حادى الحب والوفاء، أتحمل متاعب السفر، و أتمثل ذلك الراكب الأول الذى ملاء الفضاء نوراً و سكينة، ووصلت الى المدينة المنورة، وصليت ركعتين فى مسجد الرسول صلى الله عليه وسلم، وحمدت الله على ذلك ثم وقفت و انا مثقل بمنن لا استطيع أن اكافئها، ولاأستطيع ان أقضى حقها، وصلّيت عليه صلى الله عليه وسلم، وسلمت عليه صلى الله عليه وسلم، وشهدت أنه صلى الله عليه وسلم، قدبلّغ الرسالة وادّى الأمانة، و نصح الامة وجاهد فى الله حق جهاده . وعبدالله حتّى آتاه اليقين، وسلّمت على صاحبيه الوفيين الامينين اللذين لم يعرف التاريخ البشرى صاحباً أوفىٰ لصاحبه منهما ولاخليفة اقوى على

حمل أعباء الخلافةفنهما رضى الله عنهما وارضاهما؟ ثم توجهت إلى البقيع' تلك قطعة صغيرة التى تحتضن اعظم ثروةفى الصدق والصفاء والخلة والوفاء وهناك رجال آثروا الآخرة على الدنيا و آثرو الغربة والهجرة فى سبيل الايمان والعقيدة على البقاء فى الوطن فى سبيل الشهوة والراحة' وآثروا جوار الرسول صلى الله عليه وسلم على جوار الاحبة والأقارب' فلم يبغوا عنها حولاً ولم يطلبوا له بدلاً : مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰه عَلَيْهِ".

"وتوجهت الى أحد تلك القطعة التى مثلت أروع رواية واعظمها تاثيراً على تاريخ الانسانية رواية الايمان واليقين' رواية البطولة و الوفاء' رواية الحب الطاهر والولاء النادر' وكأنى اسمع من انس بن النضرؓ "انى لأجد ريح الجنة من دون أحد" ويقول سعد بن معاذؓ : ماذا نصنع بالحرب بعد محمد صلى الله عليه وسلم وقد طار فى الناس انه قتل' فيقول انس :' ماذا نصنع بالحياة بعد محمد صلى الله عليه وسلّم وهنافى أحد ترس ابودجانه على رسول الله صلى الله عليه وسلم بظهره و النبل يقع فيه' وهناترس طلحة بيده حتى شلّت' وهنا قتل حمزة ومثل به وقتل مصعبؓ بن عمير أنعم فتيان قريش عيشاًولم يجدوا مايكفنونه به الاالكساء الذى لا يغطى كل جسده' ياليت احداً اعار العالم شيئاًمن هٰذا الحب والولاء وأهدى للعالم شيئاً من الايمان واليقين' فتبدلت الأرض غير الارض والعالم غير العالم"(٥)

هذان نموذجان للكتابة الأدبية الفنية التى اشتملت على العواطف واليكم نموذجاً آخر اسلوبه اسلوب هادى' تحليلى' علمى' لأن الكاتب باحث محقق اديب يركز على النقط العلمية ومواضع الاختلاف و آراء العلماء والأدباء فينتقل من وصفه للأماكن الى المباحث العلمية حولها.

انه مأخوذمن رحلة الحج الى بيت الله الحرام للعلامة محمد الأمين الشنقيطى' وقد سافر من موريتانيا الى الحجاز' والعلامة الشنقيطى فقيه' فينتقل ذهنه الى المسائل الفقهيه كما ينتقل ذهنه الى المسائل النحوية واللغوية التى يذكرها بمناسبة لقاء اته'

اواسئلة علمية وجهت اليه خلال زيارته من ادب و نحوو فقه واصول و تفسير وعقائد و منطق و تاريخ و بيئة وطبيعة.

وقد كتب الاستاذ عطية محمد سالم أحد تلاميذ الشيخ مؤلف الرحلة فى تقديمه لهذه الرحلة، و بيان ما تتميز فيه عن غيرها من الرحلات الحجازية فقال:

"يغلب على أساليب الرحلات و موضوعاتها أن يكون مبناها عرض خط السير من منطلق صاحبها الى منتهاه، وتسجيل معالم الطريق وأحداث المسير وماجرى لصاحبها من أحداث تسرّ او تحزن وتضحك أوتبكى و كل ما تشتمل على مجالس ادبية أومباحث علمية، وبين ايدينا من أشهرالرحلات، رحلة ابن بطوطة، ورحلة ابن جبير، وكلاهما رحلا من المغرب الى الحجاز وعادا الى بلده فلم نجد فيهما من المجالات العلمية اكثرمن عرض لمشاعر الحج.

ولم اقف على رحلة عنيت بمسائل علمية أومجالس العلماء ومباحث دقيقة وجليلة، اللهم إلا رحلة النابلسى الى المدينة المنوره، فقد بسط فيها مباحث فقهية واحاديث نبوية وان كانت لم تتعرض لشئ من المعقول كالمنطق والأصول ورحلة ابى على القالى.

وهٰذه الرحلة التى أتشرف بالتقديم لها قد تميزت عن جميع الرحلات بما زخرت به من مباحث غاية فى الدقة وآية فى الروعة (٦) و مؤلف الرحلة الشيخ امين الشنقيطى يبين نفسه منهجه فى رحلته فيقول:

"فليكن فى علم ناظره أنا أردنا تقييد خبر رحلتنا هٰذه الى بيت الله الحرام ثم الى المدينة خير الأنام عليه افضل الصلاة والسلام ليستفاد مما تضمنته من المذاكرة والاحكام و اخبار البلاد والرجال وما تجول فيه الادباء من المجال، والغرض الاكبر من ذلك تقييد ما أجبنا به عن كل سوال علمى سئلنا عنه فى جميع رحلته"

انه يبدأ رحلته بقوله:

خرجنا من عند اهلنا بجانب الوادى ذى البطاح والمياه والنخيل وودعنا كل

قريب و خليل' والبين يهيج فى القلوب الداء الوخيل' فترى ورد الخدود يطله جمود الدموع' والأعين تنكر السنة والهجوع' ماء العيون فى الجفن حائره حسبما قال الشاعر:

ولما شجاني انها يوم ودعت تولت دماء العين فى الجفن حائر
فلما اعادت من بعيد بنظرة إلى التفاتا اسلمته المحاجر

كان يوم الخروج لهذه القاعدة الكبيرة لسبع مضين من جمادى الآخرة من سنة سبع وستين و ثلاثماة والف."

و بعد وصف خروجه من منزله' ووصوله الى مكان "كيفيته واقامته هناك لمدة قليلة يقول "سألتنا كريمة من بنات العجم عن مسألتين' أولاهما الفرق بين علم الجنس واسم . والثانية قول المتكلمين ان الصفة النفسية لايدرك بدونها الموصوف وان الإنسان مثلاً بدون النطق غير معروف .

ويجيب الشيخ عن السؤالين بالتفصيل فى رحلته :

ثم يقول : وصلنا قرية تا شكط عند صلاة المغرب فزارنا رجل من فيها من الأكابر والعلماء وعاملونا معاملة الكرماء . وكنا فى ضيافة الرئيس سيدى احمد بن العربى .

ويقول : وجّه اثناء تلك المذاكرة السوال عن مسألتين' احداهما بيان كيفية استحاله تسلسل هيولىٰ العالم .

وبحث المؤلف هٰذه المسالة ثم استانف رحلته فكتب : ثم سرنا متوجهين تلقاء قرية العيون' والعيون التى تسمٰى بها القرية عيون متعددة متفجرة من جبال هناك يقال لها باللسان الدارجى "عيون العتروس" وهو بلسانهم الدارجى "التيس" فقابلنا من فيها من الفضلاء باللائق من الاكرام و التبجيل' وبالغ فى اكرامنا قاضيها مع هدية سنية واخلاق" وينتقل الى بعض المسائل الفقهية التى جرت فى مجلس القاضى و هكذا ينتقل من مكان الى مكان فى رحلته ويذكر المسائل التى توجه اليه ويذكر بعض المسائل اللغوية :

طلب منا بعض القوم ان نبين لهم تنقيح المناط وتخريج المناط وتحقيق المناط فكان جوابنا :

المناط بفتح الميم هو علة الحكم .

والمناط فى اللغة مكان النوط وهو تعليق الشىء على الشئ والصاقه به كما قال حسان رضى الله عنه :

وانت زنيم ينط من ال هاشم كما ينط خلف الراكب القدح الفرد

وقال ابو تمام :

احب بلاد الله ما بين منج الىّ وسلمى ان يصوب سحابها

بلاد بها ينطت على تمائمى وأول أرض مس جلدى ترابها

وسميت العلة مناط الربط الحكم بها و تعليقه عليها .

ثم يبحث تنقيح المناط وتخريج المناط .

يذكر الشيخ هذه المجالس العلمية خلال رحلته من بلده الى ام درمان ويصف فى آخر الرحلة توجهه الى الحجاز' فيصف رحلته' وبين خروجه من بلده الى ركوبه سفينة الحجاج فى امّ درمان ٢٥٤ صفحة' استغرقها كلها فى مسائل فقهية' و لغوية' وبلاغيه واصولية' واستقباله الذى قوبل به فى كل محطة نزل بها .

يقول : "ركبنا فى السفينة متوجهين الى جدة' فمكثت السفينة بنا يوما وليلة فى البحر' ثم نزلنا من الغد فى جده' فنزلنا فى بيت لآل جمجوم غمومى لنزول اهل قطرنا' فمكثنا ليلتين فى جده ولم نجتمع بأحد من أهلها .

ركبنا من جده بعد صلاة المغرب محرمين ملبين تلبية النبى صلى الله عليه وسلم لبيك اللهم "لبيك' لبيك لاشريك لك لبيك' ان الحمد والنعمة لك والملك' لاشريك لك" .

ويبحث الشيخ مسألة الاحرام فقهياً ويقول "كان احرامنا بالحج مفرداً لان الافراد فى مذهبنا افضل من التمتع والقران" ويذكر الأدلة الفقهية ايجاباً وسلباً .

ویصف دخوله فی مکة المکرمة :

" ثم دخلنا مکة المکرمة تلك اللیلة محرمین ملبیین تلبیة النبی صلی الله علیه وسلم وطفنا تلك اللیلة طواف القدوم و سعینا بعده بین الصفا والمروة' و کنا عند دخولنا المسجد الحرام قلنا' "اعوذ بالله العظیم وبوجهه الکریم وسلطانه القدیم من الشیطان الرجیم اللهم افتح لنا ابواب رحمتك"

وعندما وقعت ابصارنا علی الکعبة المشرفة' قلنا "اللهم زدهٰذا البیت تشریفاً و تکریما وتعظیما و مهابة' وزد من شرفه و کرمه لمن حجه او اعتمره تشریفاً و تکریماً و تعظیماً وبراً" ثم ابتدأنا طوافنا من رکن الحجر فقبلنا الحجر الأسود و قلنا "بِسْمِ اللّٰه اَللّٰهُ اَکْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ".

وهکذا تسیر رحلة العلامة امین الشنقیطی الحجازیة وهی من أولها الی آخرها رحلة علمیة یجد القاری فیها مجالس علمیة و مباحث فقهیة ولغویة وبلاغیة' ولا یجد فیها وصفاً لمنظر او تعبیراعن عواطف لأن طبیعة الکاتب وذوقه علمی خالص کم لا تجدفیها بحثا جغرافیاً ولا تاریخیاً کعادة الرحالة الا ان الرحلة حافلة بالمواد العلمیة والفوائد اللغویة' ویبدو الکاتب فی المجالس العلمیة حیث یقیم اویمکث یوما او یومین مرجعاً توجه الیه الأسئلة التی یحار فیها الباحثون' وهو یحل المشکل منها' وعندما یصل الی الاماکن المقدسة ینزل من مرتبته العلمیة' ویصبح زائراً عادیاً ویسوده الخشوع والحشمة .

وهنا نموذج آخر وهو عبارة عن وصف ادبی و تأثیر قلبی بمشاهدة الدیار الحبیبة ابدع فی وصفها الکاتب الادیب' وهو محمد حسین هیکل فی کتابه "منزل الوحی" وکم یختلف هذا الوصف من وصف الکاتب السابق الذکر' . اقرأوا وصفه لمدینه جده اول ظهورها وهو فی الباخرة :

"اقتربنا من جدة' وبدت لنا ظهرها و دورها و عماراتها' وازدادت وضوحاً علی رغم نزول الظلام' وکان مظهرها یغری بالظن انها خططت تخطیطاً جمیلا' وبنیت علی

الطراز الحديث، وذلك الشان فى كل مايبدوللمقبل فى البحرمن مظاهر اليابسة فلذا اقتحمناه كنا كالجراح اذ يقتحم بمشرطه جسداً جميلاً، واحسب الذين لم يعرفوا من ذلك ماعرفت قد خدعوا بمظهر جدة . وكان من حقهم ان يخدعوا بهذه المبانى التى تمتد امامهم على الشاطئ اميالاً فى نظام زاده البعد اتساقاً وجمالاً .

وفى رحلته الحجازية يقصد الطائف ويصف الطريق اليها ويصل الى حيث كانت تقام قديماً سوق عكاظ، ويقف ويقول :

" وهنا المكان الذى يقولون انه عكاظ، اما أنا فلم أرشيئاً استطيع أن ابتنيه، فقد هبطت كشف الظلام، وانطوى الوجود فى دجنة الليل، و كنا فى الثلث الاخير من ذى الحجة، فلم أر للقمر فى السماء من اثر ولم تكن النجوم لتكشف من غطاء الليل شيئاً وهذه الاودية الصامتة فى اربعة النهار هى الساعة اشدصحتاً ومهابةً .

والذى يلاحظهٔ الناظر فى كتابته الوصفية أن اروعها ما يتناول الصور المعنوية او المشاعر النفسية، فها هو مثلاً يزور غار حراء فى الحجاز، فتهتز نفسه لديها لذكرى النبى صلى الله عليه وسلم ونزول القرآن عليه، و يتخطى بذهنه القرون الى الماضى البعيد، واذا هو مسحور بصورة ذلك ليقوم الفذ فى التاريخ، اذ ليترأى له النبى بعين الخيال متمدداً فى الغار وكأنهٔ يسمع صوت الملك اذ يهيب بالنبى ان يقراء فيتردد وجلاً ويعود اليه الصوت ان اقرأ فيجيبه ماذا أقراء؟ فيتلو عليه الصوت :

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ"

وهنايقف هيكل متأثراً فيقول :

" خيّل الىّ وانا فى موقفى من الغار، انى ارى هٰذ المشهد الفذ، وانى اسمع هذه الاصوات........ فصفدنى الفزع مكانى، واقمت ماينتظر مايكون من بعد، فاذا النور الباهر ترفع، و محمد فى الغار يتصبب عرقاً ويدور بنظراته فيما حوله، و يهتز مضطرباً من رأسه الى اخمصه، ثم يفرك ويمسح بيده جبينه العريض المضئ سمة من يخشى مكروها

أصابه' و يزداد به الرعب' فينطلق من الغار ما هائماً فى شعاب الجبل لعل فى هوائ
يدفع عنه روعه "

هاهوذا يقف منصتاً كانما يناديه مناد من السماء انه الصوت الذى كان يح
فى الغار وهو يحدق فى مصدر الصوت ويرى صاحبه فيزداد فزعاً . ويقفه الرعب مكا
ويلقى بنظره الى الجبل' ويصرف وجهه يمنةً ويسرة ثم لاينفك يسمع ويرى بيت حو
اذن مصدر سمعه ورؤيته انما مصدرها روحه .

وهذا الصوت الذى اتصل به هو صوت الروح الامين' ماأشدّ هذه الساعة ه
وهى مع ذلك للانسانية ساعة النور والرحمة والهدى (٦)

الرحلة الحجازية الخيالية

وصاحبهاالدكتور محمد اق

و نقدم فى الختام نموذجا من الرحلة الحجازية الخيالية وهى ابداع فنى
لقد عاش الدكتور محمد اقبال شاعر الاسلام وفيلسوف العصر مدة حياته فى حب ا
صلى الله عليه وسلم والاشواق إلى مدينته وتغنى بهما فى شعره الخالد' وقد طفح
الكأس فى آخرحياته' فكان كلما ذكرت المدينة فاضت عينه' وانهمرت الدموع'
يقدر له الحج وزيارة الرسول صلى الله عليه واله وسلم لجسمه الضعيف الذى كان يه
من زمان الأمراض والاسقام' ولكنه رحل الى الحجاز بخياله القوى وشعره الخص
العذب وقلبه الولوع الحنون' وحلق فى اجواء الحجاز' وتحدث الى الرسول الا
صلى الله عليه وسلم بما شاء قلبه وحبه و اخلاصه ووفاء ه ' وتحدث اليه عن نفسه و
عصره و عن امته و عن مجتمعه' وقد فاضت فى هذا الحديث قريحة الشاعر و انفج
المعانى و الحقائق التى كان الشاعر يغالبها ويمسك بزمامها و ينتظر فرصة اطلاقها'
رأى ان فرصتها قدحانت وهذا أوانها ومكانها' فخاطب نفسه بقول' الشاعر :

حمامة جرعى حومة الجندل اسجعى فانت بمرأى من سعاد ومس

فكان شعره فى النبى صلى الله عليه وسلم من ابلغ اشعاره واقواها، وكان حشاشة نفسه وعصارة عمله و تجاربه، وكان تصويراً لعصره وتقريراً عن امته، و تعبيرا عن عواطفه.

لقد قال محمد اقبال هذه الابيات، وهو يتخيل انه مسافر الى مكة و المدينه شرفهما الله، يهوى به العيش ويسير به الركب على رمال وعساء يتخيل بشدة شوقه وحبه انهما انعم من الحرير وان كل ذرة من ذراتها قلب يخفق فيطلب من السائق ان يمشى رويداً و يرفق بهذه القلوب الخفقة، ويحدو الحادى بما لايفهمه، فتثور اشجانه و تترنح اعطافه، و تهيج شعريته وتنطلق قيثارته بشعر رقيق بليغ.

ثم يسعد بالمقول بين يدى الرسول فيصلى ويسلم عليه بما يفتح الله به عليه، وينتهز الفترة فيحدثه عن نفسه وبلاده، والفترة التى يعيش فيها وعن امته و عن الازمات والمشاكل التى تعانيها وما فعل بها الزمان وطوارق الحدثان ومافعلت بهاهذه الحضارة الغربية والفلسفات المادية، ومافعلت برسالتها والامانة التى حملتها واين هى من ماضيها وخصائصها يرثى لها تارة ويبكى ويشكو مامرة ويعاتب ويشكو غربته فى وطنه و وحدته فى مجتمعة وضيعة رسالته فى امته، وقد سمى هذه المجموعة "بهدية الحجاز" كانها هدية حملها من الحجاز لاصدقائه و تلاميذه، ولاشك انها هدية مباركة للعالم الاسلامى و نفحة فائحة من نفحات الحجاز.

يقوم الشاعر بهذه الرحلة الحبيبة، وقد أربى على الستين ووهنت قواه، فى سن يفضل فيها الناس الراحة والاقامة، فمابياله يسافر وهو شيخ وقد أضعفه المرض والشيب، والسفرالى الحجاز شاق مضن، وقد نصحه الاطباء والاحبة بالراحة والهدوء، ولكنه يعصيهم ويطيع أمرالحب، ويلبّئ منادى الشوق و يقول، لقد توجهت الى المدينة رغم شيبى وكبرسنى، أغنىّ وأنشد الابيات فى سرور و حنين، ولاعجب فان الطائر يطير فى الصحراء طول نهاره فاذا ... و اقبل الليل رفرف بجناحيه، وقصد وكره ليأوى اليه و يبيت فيه.

كانه يقول لماذا تعجبون اذا قصدت المدينة وهى وكرطائر الروح وه
المؤمن فى أصيل حياتى وفى سن اشرفت فيها شمس الحياة على الغروب أما ر
الطائر اذا جن الليل أسرع الى وكره.

بدأ محمد اقبال سفره وهو شيخ مريض' وسارت به الناقة بين مكة و الم
سيرا حثيثا وقلقال لها' رويدك يا حبيبتى' فان راكبك لاغب و مريض و كبيرال
فمشيت فى نشوة وطرب ولم تبال كأن الصحراء حرير تحت ارجلها.

يسيرا الشاعر فى هذا الركب الحجازى الذى يحدو بالصلوة على النبى ص
الله عليه وسلم ويريد الشاعر ان يسجد سجدة على هذه الرمضاء ' يدوم أثرها فى ج
طول حياته ' ويقترح ذلك على اصحابه وزملائه' ويملكه الشوق فيحدو وينشد أبيات
شعر العرقى والجامى فيتسأل الناس من هذا الأعجمى الذى يغنى ويحدو بلغ
نفهمها؟ ولكنها نغمة تشجى القلوب و تملؤها ايماناً وحناناً حتى يذهل الرجل فى
الصحراء عن الغذاء والماء.

ويلذ الشاعر بكل ما يعتريه فى الطريق من سهروعناء وقلة طعام و شراب
يستطيل الطريق ولا يستبطئ الوصول' بل يقترح على سائقه أن يا خذ طريقاً اطول
يعيش فى هذه الأشواق وفى هذا الحنين مدة أوسع' و تشتد لوعة الفراق لأنه
العشاق و هة المشتاق.

وهكذا يطوى محمد اقبال هذه المسافة فى سرور و حنين حتى يصل
المدينة' فيقول لزميله "تعال يا صديقى نبك سروراً ونتحدث ساعة و نرسل النفس
سجيتها' فان لنا شأنا مع هذا الحبيب الذى أسعدنا به الحظ بعد طول فراق و
اشتياق.

ويقبل على نفسه فيتعجب كيف اختص من بين أقرانه هذه السعادة ثم
"لاعجب فان المحبين المتيمين اكرم هنامن الحكماء المتفلسين' يا سعادة
ويا حسن الطالع ' لقد سمح لصعلوك مملوك ان يدخل على السلاطين والملوك.

ولايثث محمد اقبال وهو فى هذا الفيض من السرور والسعادة ان يذكر امته لمسلمة والشعب المسلم الهندى يذكر آلا مهما وآما لهما . فيذكر كل ذلك فى بلاغة لشاعر و صدق لرائد وما اجملهما اذا التقيا' يقول :

'ان هذا المسلم البائس الذى لاتزال فيه بقية من شمم واباء وانفة الملوك وعزة الآباء' قد فقد مع الأيام يا رسول الله' لوعة القلب واكسير الحب' ان قلبه حزين منكر و لكنه لايعرف سرّذلك"

ماذا حدثك به يا رسول الله عن آلامه و رزيئته' حسبك انه هوى من قمة عالية' نه هبط من تلك العليا التى وصلت به اليها وكلما ارتفع المكان الذى يسقط منه كان لمه شديداً' فكانت الصدمة عظيمة' فلطف الله بهذه الأمة النكوبة الهاويه من قمة لمجد العالية .

انه لايزال الزمان يعاديه' ولايزال ركبه تائهاً فى الصحراء بعيدا عن غايته و منزله' حسبك من هذا الأمة ومايسود فيها من الفوضى والاضطراب' انها تعيش من غيرايام"

"ان غمده فارغ ككيسه 'فهواعزل فقير' ان الكتاب الذى فتح به العالم وضعه فى بيته الخرب على طاق تراكمت عليه الاتربة' ونسج عليه العنكبوت"

"انه أصبح بطول عهده بالمغامرات و البطولات لايفهم لغة المغامرين واصابة الشجعان المجاهدين و قدالف نغمة المغنين' وعاش بين الزفرات و الأنين"

"وان عينه فقدت النور' وان قلبه حرم السرور' ان رزيئته انهٗ يعيش ولايعرف لذة الوصال والحضور"

ثم يذكر الفرق بين ماضيه العظيم الذى كان فيه موضع رعاية وعناية واحتناء' وحاضرة القاسي الكالح' وكيف صعب عليه ان يتقشف و يعتمد على نفسه' ويكدح فى الحياة وما ابلغ قوله :

"انه طائر مدلل' كنت تطعمه بيدك' وقد ربيته بالفواكه فشق عليه البحث عن

رزقه في الصحراء"

هذه بعض نماذج الرحلات الحجازية' وهى كثيره وقداخترت ثلاثة ا
منها' النوع الأدبى الفنى' النوع العلمى' النوع الخيالى' وفى كل نوع من هذه الا
نماذج كثيره' و قصرت عملى و بحثى على اللغة العربية' امااللغة الأردية و الفارسية
اكثرواوسع واكثر تأثيرا لأن اللغتين الاردية والفارسية هما نعتا الحب والحنان وا
ولذلك فاق الشعراء فيهما فى المدائح النبوية غيرهم فى التعبير عن عواطفهم وولاء ه

يقول الشيخ ابوالحسن على الحسنى الندوى وهو اديب اللغتين وقد ق
نموذ جا من كتابته العربية' وله رحلة حجازية فى اللغة الأردية باسم "من منزلى الى
الله(گھرسے بیت اللہ تک)و قد جرب كثير من القراء ان هذا الرحلة اذا قرأها احد لم يتما
قلبه' و انهمرت الدموع من عينيه' واجهش بالبكاء ولا يستطيع احد ان يتراء ه ق
واحدة .

يقول فى عواطف الهنود والفرس عن النبى صلى الله عليه وسلم "وقد تم
عندالمطلعين على الادب الاسلامى العالمى الذين د رسوا آداب اللغات التى تكلم
بهاشعوب الاسلامية فى بلادها' و تذوقوا شعرها أن اللغة الفارسية هى اغنى ث
واسعدحظًا فى المدائح النبوية من غير ها و تليها اردو التى هى سليلة الفارسية' ا
ماقيل فى ايران والهند فى هذا الموضوع يمتازمن غيره قوة و تاثيرا' ورقّة وعذوبة' و
تجلت فيه العاطفة اقوى واروع منها فى غيره"

وكان من حق الرحلات الحجازية باللغة الاردية ان ينظر اليها' وتدرس' ول
العواطف الجياشة والحنان المتدفق لايترجم' ولايقدر على نقله الأديب اكثر قدرة ع
البيان' وانا اعترف بعجزى عن ذلك .

الحواشی والتعلیقات

(۱) الاخنس بن شریق .

(۲) من نفحات الحرم لعلی' الطنطاوی' دارالفکر بدمشق 'ص ۹۷

(۳) الطریق الی المدنیه .

(٤) الایة ۲۳ من سورة الاحزاب .

(٥) الطریق الی المدینة ' للشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی .

(٦) کلمة تقدیم الاستاد عطیة سالم' الرحلة الحجازیة للشیخ محمدامین الشنقیطی .

(۷) منزل الوحی ' لمحمد حسین هیکل .

****

رحلة ابن جبير إلى الحرمين الشريفين

الدكتور خالقداد ملك

استاذ المساعد بالقسم العربی جامعة بنجاب' لاهور

الحمدلله رب العالمين' والصلاة والسلام على سيدالمرسلين' وعلى آله واأصحابه أجمعين.

أمابعد' فإننا لن نبالغ إذا قلْنا إنّ أدبَ الرحلاتِ إلى الحرمين الشريفين (زادهما الله شرفاً وكرامةً) هومن أهم فنون الأدب العربى قدراً و أكبرها تاثيراً فى نفوسْ المسلمين' وذلك لِسَبَبَيْن بسيطين أحدهما أن أرض الحجاز المقدسة هى مركزُ الوحدة للأمة الإسلامية ومنبع البركات والتجليات الإلهية' ولايزال قلب كل مسلمٍ' مهماتناء ت الديار وتباعدت البلاد' معلقاً بها ومولعاً بذكرها فى جميع اونة حياته' فهذا ماجعل أُدباءَ الأمة الإسلامية و شُعراءَ ها يُدَوِّنون رحلاتهم إلى الحرمين الشريفين ويسجلون فيها مشاهداتهم وملاحظاتهم شعراً و نثراً و أماالسبب الثانى فهوأنّ هذه الرحلات خيرُ ردٍّ على التُّهمة التى طالما اُتُّهِمَ بها الأدب العربى و نقصد بهاتهمةَ قصوره فى فن القصة و نقول من غير شكٍّ أنّ من يتهمونه بهذه التُّهمةَ لم يقرأوا قطّ ما نُقَدِّمُه كُتب الرحلاتِ هذه من أساليب فنية للقصة العربية.

وعنى كثير من الرَّحاَّلين و على رأسهم البتانونى بوصف الرحلة إلى الحرمين الشريفين و كتابه "الرحلة الحجازية" ذائع مشهور وفيه كثير من المُصَوِّرات' وهو غَنِيٌّ" بالمعلومات عن مناسك الحج' ولمحمد حسين هيكل "

من وحی النبوة" وهی رحلة فی البلاد الحجازية، كتبها بأسلوبه البليغ، واشتهر الأندلسيون بكثر ماكتبوا من رحلاتهم إلى المشرق مثل رحلة أبی القاسم التجيبی فی القرن الهجری الخامس(١) ورحلة ابن الرُشيد السبتی فی القرن الهجری الثامن (٢) وقدعنوا فی رحلاتهم بأخبار العلماء والأدباء والأراضی المقدسة فی كل قطر شاهدوه.

ووراء من سمّيناهم كثيرون يكتبون عن الحجاز وبواد يها وديارها ذلك لحاجة دينية إذكان الحج إلى مكة المكرمة فريضةً على كل مسلم، وكان المسلمون يتجشّمون راضين كلَّ شقةٍ فی سبيل أداء هذه الفريضةِ وزيارة قبر الرسول صلى الله عليه وسلم فی المدينة المنورة، ويصف كثير من هؤلاء الحاج طريقهمَ إلى الأماكن المقدسة فی كتب أوفی رحلاتٍ مختلفة.

ومن أشهر ماكتب فی ذلك فی العصور الوسطى، رحلة ابن جبير الأندلسی إلى المشرق لزيارة الحرمين الشريفين، وقدسمّاها "بتذكرة بالأخبار عن اتفاقات الأسفار" وهی معروفة "برحلة ابن جبير" (٣) وقداخترنا دراستها لمقالنا هذا.

حياة ابن جبير وتجواله فی البلاد

هوأبوالحسن محمد بن أحمد بن جبير الكنانی، الأندلسی، وأصل أسرته من بلدة شاطبة (Jativa) ووُلد فی بلنسية (Valence)سنة ٥٤٠ھ/١١٤٥م و عنی أبوه بتربيته عناية خاصة، فدرس العلوم الدينية واللغوية، ولم يلبث أن يتفتحت فيه مواهبه الأدبية فأخذ فی قرض الشعر. (٤)

وانتشرصيته ولمع اسمه فی بلاد الأندلس، فألحقه حاكم غرناطة

أبو عثمان سعيد بن عبدالمؤمن بكتّاب ديوانه' و خفّ على نفسه' وكان يحضره مجلس شرابه' وكان ابن جبير ينقبض عن الشُّرب' فألح عليه الحاكم أن يشرب معه و أقسم عليه ليشربنّ سبعاً' وجاراه' فشرب سبعَ كؤس وسُرّ الحاكم' وملأله الكأسَ بالدنانير سبعَ مرآتٍ' و صبّها فى حجره' فأصرّ فى نفسه أن يُكفِّرعن سيئته' وأن يُنفق هذه الدنا نير فى الحّج إلى بيت الله الحرام' ولم يلبث أن أعلن عزمه لأبى عثمان' وأنه حلف بأيمان لامحيص له من البرّبها' فأعانه على ما ابتغاه. (٥)

وكان ابن جبير الأندلسى من علماء الأندلس فى الفقه والحديث' وكانت له مشاركةٌ فى الآداب العربية والاسلامية وقد وَصَفه لسان الدين ابن الخطيب فى كتابه "الإحاطة بأخبار غرناطة" بأنه: كانٌ أديباً بارعاً شاعراً مُجيداً سريَّ النفس' كريم الأخلاق" (٦) ولكنّ شهرتَه لم تَقُم إلاّعلى كتابه المعروف "برحلة ابن جبير" الذى وضعه بعد أن قام برحلات ثلاث أهمها رحلة استغرقت أكثر من ثلاث سنوات.

وفَصَلَ ابن جبير من غرناطة فى الثامن من شوال سنة ٥٧٨هـ/الثالث من فبرائرسنة ١١٨٣م' وركب البحرَ فى سفينة لبعض أهل جنوة قاصداً إلى الاسكندرية' و نزل بها' وولّى وجههَ إلى القاهرة ومنها إلى (قوص) بصعيد مصر فعيذاب حيث اجتز الحجرالىٰ جُدة واتجه من فوره الىٰ مكة فادىٰ فريضة الحج' وزار المدينةَ المنورة' وظل فى الحرمين الشريفين نحوستة أشهر' ثم قصد إلى الكوفة' فبغداد فالموصل ولم يمرّ مروراً عابراً بهذه البلاد' بل كان يمكث بعض الوقت يدرس و يفحص' و انتقل إلى الشام وكان للصليبيين فيها مستعمرات كثيرة' فمر بديارهم' وأخيراً ركب البحرمن عكا عائدًا إلى بلاده على مركب مسيحى' وأرسى المركب بصقلية' فنزل فيها وطاف ببلادها' ثم رحل إلى بلاده' ووصل إليها

فی ١٥ من المحرم سنة ٥٨١هـ/٢٥ من ابريل سنة ١١٨٥م.

ورحلة ابن جبير هذه تقصرّ ماشاهده في طريقه إلى حجه وعودته منه' وهى مكتوبة بشكل مذكرات يومية' فمع كلّ مشهد وكلّ بلدة التاريخ باليوم والشهر' وقد وصف فى هذه الرحلة كلّ مامرّبه من مُدنٍ وماشاهد من عجائب البلدان وغرائب المشاهد وبدائع المصانع و الأ حوال السياسية والأخلاقية' وعنى عناية خاصة بوصف النواحى الدينية والمساجد والمشاهد المقدسة وقبور الصحابة ومناسك الحج ومجالس الوعظ والبيمارستانات والمستشفيات' ووَصَفَ وكذلك الكنائس والمعابد والحصون والعواصف البحرية وماكابده المسافرون من ضيق وخوف و ذعر' وذَكَرَ الحروب التى كانت دائرة فى الشرق بين الصليبيين والمسلمين.

والجدير بالذكرهنا أن ابن جبير كان قد رحل إلى المشرق بعد هذه الرحلة مرتين' فانه قد سمع بفتح صلاح الدين الأيوبى لبيت المقدس و استيلائه عليه من أيدى الصليبيين' فحدثته نفسُه أن يزور هذ الأماكن وعَلَمُ الاسلام يُرفرف عليها' فرحل رحلته الثانيةَ فى سنة ٥٨٥هـ/ ١١٨٩م وعاد إلى بلاده فى سنة ٥٨٧هـ/١١٩١م وماتت زوجته فحزن عليها حُزناً شديداً' ولم يجد عزاءً عنها إلاّأن يحجّ إلى بيت اللّٰه عزوجلّ' فرحل رحلته الثالثة فى سنة ٦١٤هـ/١٢١٨م و أقام بمكة المكرمة مدة' ثم تحوّل عنها إلى الإسكندرية' وأقام بها يُحدّث ويُوخَذ عنه إلى أن لبىّ نداءَ ربّه فى ٩ من شعبان سنة ٦١٤هـ/٣٠ من نوفمبر سنة ١٢١٧م.(٧)

وإن رحلة ابن جبير هذه مكتوبة بلُغة سهلةٍ بسيطةٍ مُلائمة تماماً لموضوعها' و طريقته فى السرد محببة إلى النفس' وهويصف كلّ مايُشاهده و صفاً

دقيقاً مسهبًا يدلّ على دقة ملاحظته وسعة اطلاعه و علمه و قدترك نفسه على سجيتها خلال الوصف فلم يتكلف في عبارة ولا في فكرة، وأدىّ ماداخله من عواطف وأحاسيس إزاء بعض الحوادث والمواقف أداءً صادقاً صريحاً، وكان شديد الإعجاب بالسلطان صلاح الدين الأيوبي، عظيم الإ كبارله، فلاتمرّ سانحة إلاّ بيّنَ فيها ما كان عليه هذالسطان العظيم من العدل والخلق والكرم (۸) وكذالك كان ابن جبير قوى العاطفة الدينيه يختم كل كلام بالدعاء الى الله تعالىٰ والتوكل عليه جل جلاله وهذه العاطفة الصادقةُ دفعته إلى إرسال الأدعيةِ للمدن التى مرّبها، فمنها مايدعو لها بـ "حَرَسَها الله و عَمَرَها اللهُ وحَمَاها الله " أو "أعادها الله" إذا كانت مما خرج من أيدى المسلمين إلى الصليبيين، ومنها مايدعوعليها بـ "دَمَّرها الله" إذاكانت تحت سُلطان الأفرنج.

رحلته فى الديارالمصرية

يركب ابن جبير البحرَ بإحدى سُفن جنوة و ينزل في الإسكندرية، فيلقى موظفو الميناء السفينةَ بتفتيش دقيق، ويأخذونَ من راكبيها بعض الضرائب، ولا ينز لونهم منهاإلاّ بعد تَحَرٍّ وثيقٍ، و شكا ابن جبير من ذلك مُرّالشكوى، ولمااستوثق الموظفون منه ومن صحبه الأندلسيين تركوهم و شأنهم، فجاس خلال الإسكندرية و أعجب بمبانيها و مناراتها ومدارسها وما رُتِّبَ فيها للطلبة والمدرسين من مرافق و منافع، ومايجرى على غُرباء المغاربة من خُبز يوميّ معلوم، ومايَسُود ذلك من أمن ورفاهية فى المعيشة. (۹)

ثم يأخذ ابن جبير طريقه إلى القاهرة والفسطاط ويصف المدن المختلفة التي يمربها، ويذهل أمام آثار القاهرة العجيبة ويتحدث عن مشهد الحسين و يصف

القلعة والمارستان والأهرام وأباالهول والجيزة وجزيرة الروضة القائمة بينها وبين الفسطاط، وهويكثر من مدح السلطان صلاح الدين ورعايته لشؤون المصريين وماينزل بقُطره من المغاربة إذيجرى عليهم الأرزاق ويخصهم بعطفه وقدنّوه باهتمامه بالمدارس وما بهامن مناهج التعليم و أشاد بمحوه للضرائب التى كانت تؤخذ فى القاهرة من حُجاّج المغرب ومحوها أيضا من بلاد الحجاز بفضل ما أناء على هذا القطر من ماله فعوَّضَ الحاكمين هناك أجملَ عِوَضٍ بما أدىّ إليهم.(١٠)

ويبرح ابن جبير القاهرة فى شهر المحرم من سنة تسع و سبعين و خمس مأة متوجهاً نحو (قوص) حتى يصل إليها و يحتاز الصحراء الشرقية من (قوص) إلى (عيذاب) على البحر الأحمر واصفاً كلّ مابطريقه من مُدن و آثار وكثرة القوافل الواردة والصادرة من (عيذاب) تحمل توابلَ الهند وخاصةً أحمال الفلفل والقِرفة، ولايزال فى طريقه ووصفه حتى يصل إلى (عيذاب) فهويصفها على هذا النحو:

"هى مدينة على ساحل بحر جُدَّة غير مسوَّرة، أكثر بيوتها الأخصاص، وفيها الآن بناء مستحدث بالجص" وهى من أحفل مراسى الدنيا بسبب أن مراكب الهند واليمن تحط فيها و تقلع منها، زائداً إلى مراكب الحاج الصادرة والواردة، وهى فى صحراء لانباتَ فيها، ولايؤكل فيها شئ الامجلوب، لكن أهلها بسبب الحجاج تحت مَرْفَق كثير ولاسيَّما مع الحجاج، لأن لهم على كل حمل طعام يحملونه ضريبة معلومة...... فيجتمع لهم من ذلك مال كثير فى حملهم إلى جدة وردهم وقت انفضاضهم من أداء الفريضة...... وفى بحرعيذاب مغاص" على اللؤلؤ فى جزائر على مقربة منها ويستخرج منه جوهر نفيس له قيمة سنية، يذهب الغائصون عليه إلى تلك الجزائر فى الزواريق، و يقيمون فيها الأيام، فيعودون بما

قسمّ اللّه لكل واحدمنهم بحسب حظه من الرزق' والمغاصُ فيها قريب القعرليس بعيد' ويستخرجونه فى أصداف لها أزواج' كأنها نوع من الحيتان' أشبه شيء بالسلحفاة' فإذا شُقّت ظهرت الشقتان من داخلها كأنها مَحارتا فضّة' ثم يشقّوا عليها فيجدون فيها الحبّة من الجوهر قدغطّى عليهالحْم الصدف"(۱۱)

فى الحرمين الشريفين

ويركب ابن جبير البحر إلى جُدّة ويشكومن سوء معاملة العرب للحجاج ومما يأخذون منهم من مكوس' ويشيد بالسلطان صلاح الدين لتعهده لأميرمكة أن يدفع له سنوياً ما يُعوّضه عن مكوس الحجاج' وكان يرسل إليه ألفى دينار وألفى أردب من القمح ومع ذالِك لايزال ذلك الأميرورعيته يظلمون الحجاج ويُرهقونهم من أمرهم عُسراً وقدذكر ابن جبير ذلك قائلاً:

"وأكثر هذه الجهات الحجازية وسواها فرق و شيع لادين لهم قد تفرقوا على مذاهب شتى' وهم يعتقدون فى الحاج مالايعتقد فى أهل الذمّة" (۱۲)

ويصف ابن جبير مدينة جُدّة وصفاً دقيقاً ويقول فيها:

"وجُدّة هذ قرية على ساحل البحر المذكور (البحرالأحمر) أكثر بيوتها أخصاص (بيوت من طين) وفيها فنادق مبنية بالحجارة والطين' وفى أعلاهابيوت من الأخصاص كالغرف' ولهاسطوح يستراح فيها بالليل من أذى الحرّ وبهذه القرية آثار قديمة تدل على أنهاكانت مدينة قديمة' وأثر سُورها المُحدق بها باق إلى اليوم' وبهاموضع فيه قبة مشيدة عتيقة يُذكر أنه كان منزل حَوّاء أُمّ البشر' صلى اللّه

عليها' عندتوجهها إلى مكة' فبُنى ذلك المبنى عليه تشهيرا لبركته وفضله' والله أعلم بذلك و فيها مسجدمبارك منسوب إلى عمر بن الخطاب رضى الله عنه' ومسجد آخر له ساريتان من خشب الآبنوس يُنسب أيضاإليه' رضى الله عنه' ومنهم من يُنسبه إلى هارون الرشيد' رحمه الله' وأكثرسكان هذا البلدة مع مابليها من الصحراء والجبال أشراف عَلويّون: حَسَنِيُّون و حُسَيْنِيُّون و جعفريون' رضى الله عن سلفهم الكريم' وهم من شظف العيش بحال يتصدع له الجمادإشفاقاً' ويستخدمون أنفسهم فى كل مهنة من المهن: من إكراء جمال إن كانت لهم' أومبيع لبن أوماء' إلى غير ذلك من تمريلتقطونه أوحَطَب يحتطبونه' وربّما تناول ذلك نساؤهم الشريفات بأنفسهن' فسبحان المُقدّر لمايشاءُ' ولاشك أنهم أهل بيت ارتضى الله لهم الآخرة ولم يرتض لهم الدنيا' جعلنا الله فمن يدَين بحبّ أهل البيت الذين أذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا (١٣)

ثم يتحَوّل ابن جبير إلى مكة المكرمة واصفاً الطريق إليها من جُدّة' ودَخَلها فى اليوم الثالث من شهر ربيع الآخر' وهو الرابع من شهر أغسطس كما يقول' مع طلوع الصباح' والأصوات تصك الآذان بالتلبية فى كل مكان' والألسنة تضج بالدعاء' وتبتهل إلى الله بالثناء ويصف مناسك الحج وصفاً طويلاً' كمايصف المسجد الحرام وصفا مسهبا ولندعه يصف لناذلك بقلمه' يقول:

البيت المكرم له أربعة أركان' وهوقريب من التربيع' وارتفاعه فى الهواء من الصَّفح الذى يقابل باب الصَّفا وهو من الحجر الأسود إلى الركن اليمانى تسع و عشرون ذراعاً' و سائر الجوانب ثمان وعشرون...... وأول أركانه الذى فيه الحجر الأسود' ومنه ابتداء الطواف' وأول مانلقى بعده الركن العراقى' وهوناظرإلى جهة الشمال' ثم الركن الشامى' وهوناظر إلى جهة الغرب' ثم الركن

اليمانى وهو ناظر إلى جهة الشرق، وعند ذلك تُتم شوطاً واحداً..........(١٤)

وباب البيت الكريم فى الصفح الذى بين الركن العراقى وركن الحجر الأسود......والباب الكريم مرتفع عن الأرض بأحدعشر شبراً ونصف، وهو من فضة مذهبة، بديع الصنعة، رائق الصفة، يستوقف الأبصار حسناً و خشوعاً، للمهابة التى كساها الله بيته......

وداخل البيت الكريم مفروش بالرخام المجزع، وحيطانه رخام كلها مجزع، قدقام على ثلاثة أعمدة من الساج مفرطة الطول، بين كل عمود و عمود أربع خُطاً، وهى على طول البيت متوسطة فيه........... ودائرة البيت كله من نصفه الأعلى مطلى بالفضة المذهبة لمستحسنة، يخيل للناظر إليها أنها صفيحة ذهب لغلظها، وهى تحف بالجوانب الأربعة، وتمسك مقدار نصف الجدار الأعلى..........

وسقف البيت مجلل" بكساء من الحرير الملون، وظاهر الكعبة كلها من الجوانب الأربعة مكسوّ بستورالحرير الأخضر، وسداً هاقطن، وفى أعلاها رسم بالحرير الأحمر، فيه مكتوب: "إن أول بيت وضع للناس للذى ببكة" الاية (١٥) واسم الإمام الناصر لدين الله (الخليفة العباسى) وسعته قدر ثلاث اذرع يطيف بها كلها، قد شكل فى هذه الستورمن الصنعة الغريبة التى تبصرها أشكالُ محاريب رائقة ورسوم مقروءة......

وعدد الستور من الجوانب الأربعة أربعة و ثلاثون ستراً، وله خمسة مضاوئ (١٦) وعليها زجاج عراقى بدايع النقش، أحدها فى وسط السقف، ومع كل ركن مضوأ، وبين الأعمدة أكواس من الفضة، عددها ثلاث عشرة، وإحداها من ذهب......

وأوّل مايلقى الداخل من الباب عن يساره الركن الذى خارجه الحجر الأسود، وفيه صندوقان فيهما مصاحف، وقد علاهما فى الركن بوبيان من فضة، كأنهما طاقان ملصقان بزاوية الركن، وبينهما وبين الأرض أزيد من قامة. (۱۷)

وفى الركن العراقى باب يسمى باب الرحمة، يصعد منه إلى سطح البيت المكرم، وقدقام له قَبْو، فهو متصل بأعلى سطح البيت، داخله الأدراج، وفى أوله البيت المحتوى على المقام الكريم، هومقام ابراهيم صلى الله على نبينا وعليه، وهو حجر مغشى بالفضة، وارتفاعه مقدار ثلاثه أشبار، وسعته مقدار شبرين، وأعلاه أوسع من أسفله.........

وداخل الحجر (ماحواه الحطيم المدار بالكعبة من جهة الشمال) بلاط واسع ينعطف عليه الحجر كأنه ثلثا دائرة، وهو مفروش بالركام المجزع المقطّع فى دور الكف إلى دور الدينار، إلى مافوق ذلك، ثم الصق بانتظام بديع وتأليف معجز الصنعة، غريب الإتقان، رائع الترصيع والتجزيع، رائع التركيب والرصف، يبصر الناظرفيه من التعاريج والتقاطيع والخواتم والأشكال الشطرنجية وسواها على اختلاف أنواعها وصفا تها مايفيدبصره حسنا، فكأنه يجيله فى أزهار مفروشة مختلفات الألوان، إلى محاريب قدانعطف عليها الرخام. انعطاف القسى، وداخلهاهذه الأشكال الموصوفة والصنائع المذكورة، وبإزائهارخامتان متصلتان بجدار الحجر، أحدثَ الصانع فيهما من التوريق الرقيق والتشجير والتقضيب (۱۸) مالا يحدثه الصَّنِعُ اليدين (۱۹) فى الكاغذ قطعاً بالجلمين (۲۰) فمرآهما عجيب.........(۲۱)

والميزاب فى أعلى الصفح الذى يلى الحجر المذكور وهومن صفر مذهب قدخرج إلى الحجر بمقدار أربع أذرع، وسعته مقدار شبر، وهذا الموضع

تحت الميزاب، هو أيضا مظنة استجابة الدعوة بفضل الله تعالى...........(٢٢)

وقبة بئر زمزم تقابل الركن،ومنهاإليه أربع و عشرون خطوة، وداخلها مفروش بالرخام الأبيض الناصع البياض، و تنور البئرالمباركة فى وسطها ، وعمقها إحدى عشرة قامة حسبما ذرعناه، وعمق الماء سبع قامات على مايذكر...... والحجرالأسود ملصق فى الركن الناظر إلى جهة المشرق، وسعته ثلثا شبر، وطوله شبر وعقد، وفيه أربع قطع ملصقة......(٢٣)

والمسجد الحرام يطيف به ثلاث بلاطات على ثلاث سوار من الرخام منتظمة كأنها بلاط واحد، ذرعها فى الطول أربع مئة ذراع وفى العرض ثلاث مئة ذراع وعدد سواريه الرخامية التى عددتها بنفسى أربع مئة وإحدى وسبعون سارية......والحرم محدق بحلقات المدرسين وأهل العلم......(٢٤)

وهكذا يستمر ابن جبير فى وصف المسجد الحرام ويعرض علينا وصفاً دقيقاً للكعبة وكسوتها ولكلّ مابداخل المسجد من أجزاء، ويطيل فى وصف فتحه للناس والرسوم المتخذ لذلك، كمايطيل فيوصف المنبر و هيئة خطيبه ومايقول فى خطبة الجمعة من أدعية، ولايكاد يترك شيئا فى المسجد ولافى ظاهره وسطحه إلاويصفه وصفاً دقيقاًثم يصف مكة المكرمة وآثارها ومشاهد ها وجبا لها وأوديتها وأبوابها ومطاعمها وحماماتها واحتفال الناس فيها بليلة نصف شعبان وبرمضان ويوم العيد ويفيض فى وصف مناسك الحج ومشاعره وصف المشاهد الذى لاتفوته صغيرة ولاكبيرة،وهو يقسم ذلك على الأيام والليالى والساعات، إذيكتب دائمامايكتب فى صورة يوميات، وما يزال بمكة المكرمة حتى اليوم العشرين من ذى الحجة، فيعزم على زيارة المدينة المنورة وروضة الرسول صلى الله عليه وسلم ويصل إليها فى اليوم الثالث من المحرم فهويستهل حديثه عنها بوصف

زيارته للروضة المقدسة' يقول:

"وفى عشى ذلك اليوم دخلنا الحرم المقدس لزيارة الروضة المكرمة المطهرة' فوقفنا بإزائها مسلّمين' ولترب جنباتها المقدسة مستلمين' وصلينا بالروضة التى بين القبر المقدس والمنبر' واستلمنا أعواد المنبر القديمة التى كانت موطئ الرسول' صلى الله عليه وسلم' والقطعة الباقية من الجذع الذى حن إليه (٢٥) صلى الله عليه وسلم' وهى ملصقة فى عمود قائم أمام الروضة الصغيرة التى بين القبروالمنبر' وعن يمينك إذا استقبلت القبلة فيها' ثم صلينا صلاة المغرب مع الجماعة' وكان من الاتفاق السعيد أن وجدنا بعض فسحة فى تلك الحال لاشتغال الناس بإقامة مضاربهم' وترتيب رحالهم' فتمكنامن الغرض المقصود' وفزنا بالمشهد المحمود' وأدّينا حق السلام على الصاحبين الضجيعين: صِدِّيق الاسلام وفاروقه وانصرفنا إلى رحالنا مسرورين ولنعمة الله عليه شاكرين..........(٢٦)

وكذلك قد وصف ابن جبير المسجد النبوى وصفاً طويلا ودقيقاً ومماقال فيه: (المسجد المبارك مستطيل' وتحفه من جهاته الأربع بلاطات مستديرة به' ووسطه كله صحن مفروش بالرمل والحصى' والجهة القبلية منه لها خمسة بلاطات مستطيلة من غرب إلى شرق' والجهة الجوفية لها أيضا خمسة بلاطات على الصفة المذكورة' والجهة الشرقيةلها ثلاثة بلاطات' والجهة الغربية لها أربعة بلاطات ' والروضة المقدسة (قبرالرسول وصاحبيه أبى بكر وعمر) مع آخر الجهة القبلية ممايلى الشرق' وانتظمت من بلاطاته ممايلى الصحن فى السعة اثنين وينفت إلى البلاط الثالث بمقدار أربعة أشبار' ولهاخمسة أركان بخمس صفحات' وشكلها شكل عجيب' لايكاد يتأتى تصويره ولاتمثيله..........(٢٧)

وجميع سعة الروضة المكرمة من جميع جهاتها مئتا شبر واثنان وسبعون

شبراً وهى مؤزرة بالرخام البديع النحت، الرائع النعت، وينتهى الإزار منها إلى نحو الثلث أو أقل يسيراً وعليه من الحدار المكرم ثلث آخر قد علاه تضميخ المسك والطيب بمقدار نصف شبر، مسودًا، مشققاً متراكماً مع طول الأزمنة والأيام، والذى يعلوه من الحدار شبابيك عود، متصلة بالسمك الأعلى، لأن أعلى الروضة المباركة متصل بسمك المسجد، وإلى حيّز إزارا الرخام تنتهى الأستار، وهى لازوردية اللون......(۲۸)

وفى الصفحة القبلية أمام وجه النبى صلى الله عليه وسلم مسمار فضة، هوأمام الوجه الكريم، فيقف الناس أمامه للسلام، وإلى قدميّه صلى الله عليه وسلم رأس أبى بكرالصديق رضى الله عنه، ورأس عمر الفاروق ممايلى كتفى أبى بكر الصديق رضى الله عنهما، فيقف المسلم مستدبر القبلة ومستقبل الوجه الكريم، فيسلم، ثم ينصرف يميناً إلى وجه أبى بكر، ثم إلى وجه عمر، وأمام هذه الصفحة المكرمة نحو العشرين قنديلا معلقة من الفضة، وفيها اثنان من ذهب.........

وعن يمين الروضة المكرمة المنبرالكريم، ومنه إليها اثنتان وأربعون خطوة، وهو مرخم كله وارتفاعه نحو القامةأوأزيد، وسعته خمسة أشبار، وطوله خمس خطوات، وأدراجه ثمانية، وله باب على هيئة الشباك مقفل، يفتح يوم الحمعة، وطوله أربعة أشبار ونصف، وبينه وبين الروضة الصغيرة، التى بين القبر الكريم والمنبر، وفيها جاء الأثر أنها روضة من رياض الحنة، ثمانى خطوات، وفى هذه الروضة يتزاحم الناس للصلاة، وحق لهم ذلك......

والمنبر مغشىّ بعود الآبنوس، ومقعد الرسول، صلى الله عليه، فيدخل الناس أيديهم إليه ويتمسحون به تبركاً بلمس ذلك المقعد الكريم......(۲۹)

وطول المسجد الكريم مئة خطوة وست وعشرون خطوة، وعدد سواريه

مئتان وتسعون' والبلاط المتصل بالقبلة تحف به مقصورة تكتنفه طولا من غرب إلى شرق' والمحراب فيها' وبينها وبين الروضة الكبيرة والقبرالمقدس محمل كبير مدهون' عليه مصحف كبير فى غشاء مقفل عليه' هوأحدالمصاحف الأربعة التى وجه بها عثمان بن عفان رضى الله عنه إلى البلاد' وبإزاء المقصورة إلى جهة الشرق خزانتان كبيرتان محتويتان على كتب ومصاحف موقوفة على المسجد المبارك..........

ويليهما فى البلاط الثانى لجهة الشرق أيضادفة مطبقة على وجه الأرض مقفلة' هى على سرداب يهبط إليه على أدراج تحت الأرض' يفضى إلى خارج المسجد' إلى دارأبى بكر الصديق رضى الله عنه' وهوكان طريق عائشة إليها' وبإزائها دارعمر بن الخطاب' ودارابنه عبدالله' رضى الله عنهما' ولاشك أن ذلك الموضع هو موضع الخوخة المفضية لدار أبى بكر التى أمرالنبى' صلى الله عليه وسلم' بإبقائها خاصة—(۳۰)

وأمام الروضة المقدسة صندوق كبير هو للشمع والأنوار التى توقد أمام الروضة كل ليلة' وفى الجهة الشرقية بيت مصنوع من عود' هو موضع بيت بعض السدنة الحارسين للمسجد المبارك......(۳۱)

والمؤذن الراتب فى المسجد أحد أولاد بلال' رضى الله عنه' وفى جهة جوف الصحن قبة كبيرة محدثة جديدة' تعرف بقبة الزيت' هى مخزن لجميع آلات المسجد المبارك ومايحتاج إليه فيه' وبإزائها فى الصحن خمس عشرة نخلة' وعلى رأس المحراب' الذى فى جدارالقبلة داخل المقصورة' حجر مربع أصفر قدر شبر فى' ظاهر البريق والبصيص' يقال: إنه كان مرآة كسرى .

وللمسجد المبارك تسعة عشربابا' لم يبق منها مفتحا سوى أربعة فى

الغرب: منها اثنان، يعرف أحدهما بباب الرحمة، والثانى بباب الخشية؛ وفى الشرق اثنان يعرف أحدهمابباب جبريل، عليه السلام، والثانى بباب الرجاء ويقابل باب جبريل عليه السلام دارعثمان، رضى الله عنه، وهى التى استشهد بها...... وأمام الروضة المكرّمة شباك حديد مفتوح إلى روضته، تتسّمُ منها رَوْحاً وريحانا، وفى القبلة باب صغير واحدمغلق، وفى الحوف أربعة مغلقة، وفى الغرب خمسة مغلقة أيضا، وفى الشرق خمسة أيضامغلقة، فكملت بالأربعة المفتوحة تسعة عشربابا............(۳۲)

فهكذايستمر ابن جبير فى وصف المسجد النبوى وماجاوره من الأماكن والمشاهد فى المدينة المنورة كمايصف مشاهد البقيع ومجالس الوعظ بالمسجد النبوى وسرعان مايودع المدينة المنورة، وكان قيامه فيها خمسة أيام، فى اليوم الثامن من شهر المحرم ميمها شطر العراق ومماقال فى وداعه للمدينة المنورة:

وفى عشىّ ذلك اليوم المبارك كان وداعنا للروضة المباركة والتربة المقدسة، فياله وداعاً عجبا! ذهلت له النفوس ارتياعاً حتى طارت شعاعاً، واسُتشرَت به النفوس التياعاً حتى ذابت انصداعاً! وما ظنك بموقف يناجى بالتوديع فيه سيدالأولين والآخرين، و خاتم النبيين، ورسول رب العالمين؟! إنهّ لموقف تنفطرله الأفئدة، وتطيش به الألباب الثابتة المتدة، فواأسفاه وا أسفاه! كلّ يبوح لديه بأشواقه، ولايجدبُدًّا من فراقه، فما يستطيع إلى الصبر سبيلاً ولاتسمع فى هول ذلك لمقام إلارنةً وعويلاً وكل بلسان الحال ينشد: ....(۳۳)

محبّتى	تقتضى	مُقامى
وحالتى	تقتضى	الرحيلا

الهوامش والحواشی

١. هوأحمدبن سليمان بن خلف الباجى الأندلسى،المتوفى سنة ٤٩٣ﻫ (ذيل كشف الظنون، ٥٥٠/٣)

٢. هو محمد بن عمر بن رشيد الفهرى، مجدالدين، السبتى المعروف بابن الرشيد المتوفى سنة ٧٢١ﻫ وسمى رحلته "الرحلة إلى مكة وطيبة" فى ست مجلدات (ذيل كشف الظنون ٥٥٠/٣)

٣. ورحلة ابن جبير هذه كتاب نفيس فى بابه، لاغنى عنه للمؤرخين والجغرافيين، وكل من أراد الإطلاع على أحوال تلك الحقبة،وقداهتم به المستشرقون، فترجم القسم المختص منه بصقلية إلى الفرنسية وطبع سنة ١٨٤٦م وطبع كله لأول مرّة فى ليدن سنة ١٨٥٢م مع مقدمة المستشرق وليم رايت، واعيد طبعه هنالك أيضا فى سنة ١٩٠٨ وفى صدره ترجمة لمؤلّفه وكذلك طبع بدارصادر فى بيروت سنة ١٣٧٩ﻫ/١٩٥٩م وقدقام بترجمته إلى اللغة الأردية الشيخ أحمد على خان شوق وسماه: "سفرنامه ابن جبير" وطبع بمدينة رام بوربالهند فى سنة ١٩٠٠م (راجع: دائرة المعارف الإسلامية الأردية ٤٦٠/١منشورات جامعة بنجاب بلاهور باكستان، ومعجم المطبوعات العربية والمعربة، لسركيس ٦٢/١).

٤. راجع لترجمته: الاحاطة فى أخبار غرناطة، ١٦٨/٢، ابن الخطيب، مصر ١٣١٩ﻫ ونفح الطيب للمقرى ٥١٥/١ طبعة دوزى، وشذرات الذهب لابن العماد ٦٠/٥٠ ودائرة المعارف الإسلامية الأردية

١/٤٦٠' منشورات جامعة بنجاب بلاهور: والأعلام للزركلي ٨٥/٣.

٥. مقدمة رحلة ابن جبير (ص ٥) دارصادر' بيروت ١٩٥٩م ودائرة المعارف الإسلامية الأردية' ١/٤٦٠.

٦. الاحاطة في أخبار غرناطة' ٢/١٦٨.

٧. الإحاطة في أخبار غرناطة' ٢/١٦٩ والأعلام ٣/٨٥ودائرة المعارف الإسلامية الأردية ١/٤٦٠.

٨. رحلة ابن جبير (صفحات: ١٦' ٢٧' ٣٠' ٣١) وفي مواضع كثيرة (طبعة دارصادر بيروت' ١٩٥٩م)

٩. نفس المصدر (صفحات: ١٨.٧)

١٠. ص: ٣١.١٩

١١. ص: ٥ــــ٤

١٢. ص: ٥٥

١٣. ص: ٥٣

١٤. ص: ٥٩'٦٠

١٥. سورة آل عمران' الآية: ٩٦

١٦. المضاوئ: مواضع اللإضاءة

١٧. رحلة ابن جبير (ص :٦١)

١٨. التوريق: نحت صور أوراق الأشجار' والتشجير: نحت صور الأشجار' والتقضيب: نحت صور القضبان.

١٩. الَصنِعُ اليدين: الماهرالحاذق في العمل بها

٢٠. الجَلْمان: المقص

٢١. رحلة ابن جبير (ص: ٦٤)

٢٢. ص: ٦٥

٢٣. ص: ٦٥، ٦٦

٢٤. ص: ٦٧، ٦٨

٢٥. روية حنين الجذع قدوردت في صحيح البخارى (كتاب المناقب: باب علامات النبوة، وكتاب الجمعة: باب الخطبة على المنبر، وكتاب الصلاة: باب الاستعانة بالنجار والصاع في أعواد المنبر) وسنن الدارمى (باب ماأكرم الله النبى بحنين الجذع)

٢٦. رحلة ابن جبير (ص: ١٦٨، ١٦٨)

٢٧. ص: ١٦٨

٢٨. ص: ١٦٩

٢٩. ص: ١٧٠

٣٠. رواية خوخة ابى بكر الصديق رضى الله عنه وردت في صحيح البخارى (كتاب المناقب: باب قول النبي: سدواالأبواب إلاباب أبى بكر) وصحيح مسلم (كتاب الفضائل: باب فضائل أبى بكر الصديق رضى الله عنه)

٣١. رحلة ابن جبير (ص: ١٧١)

٣٢. ص: ١٧٢، ١٧٣

٣٣. ص: ١٨٠

☆☆☆☆☆

دنیائے اسلام کا پہلا سفر نامۂ حرمین جدید تحدیات کے تناظر میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی
(ڈین کلیۂ ہیو مینیٹیز اینڈ سوشل سائنسز
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد

مجھے جب حرمین کے کسی سفر نامے پر اکیسویں صدی کے چیلنجوں کے حوالے سے لکھنے کی دعوت ملی تو میری نگاہ اس سفر نامے کی طرف گئی جس کی بدولت حرمین کے سفر ناموں کو اعتبار ملا' وہ سفر نامہ جو دنیا کی ہر متعارف زبان میں لکھا گیا۔ ہر اسلامی سکالر' مفکر' محدث' مفسر' عالم' واعظ اور خطیب نے مزے لے لیکر پڑھا اور سنایا' وہ سفر نامۂ جو اکیسویں صدی' نہیں بلکہ ایک ہزار اکیسویں صدی کے چیلنجوں کے لیے بھی اسی طرح حیات نو کا پیغام ہے' جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے والوں کے لیے زندگی بخش' روح پرور' حیات آفریں اور پیام امن و آشتی تھا' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حرمین شریفین اسی عظیم مسافر کے باعث حرمین قرار پائے ورنہ ان میں سے ایک شہر وادی غیر زرع تھا یعنی بنجر وادی اور دوسرا یثرب یعنی شہر خرابہ تھا:

هر کجا بینی جهان رنگ و بو — آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفیٰ او را بهاست — یا هنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

یہ بتانا مشکل ہے کہ اس سفر نامے کا حقیقی مؤلف کون ہے؟ حدیث و سیرت کی کوئی کتاب اس سفر نامے سے خالی نہیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رب کائنات سے لے کر غار ثور

کے دبانے پر جالا تننے والی مکڑی تک' سراقہ بن مالک مدلجی سے لے کر طلع البدر علینا گانے والی بچیوں تک کون ہے جس نے اس سفر کی داستان نہیں سنائی جس نے یثرب کو مدینۃ الرسول ﷺ ہی نہیں' بلکہ ادب گاہسیت زیر آسماں از عرش نازک تر بنادیا۔

جدید تحدیات کے حوالے سے بات کی جائے تو آج مسلمان کیا ہے؟ یہ ایرانی وہ تورانی' یہ ہندی وہ خراسانی..... اقبال کو کہنا پڑا کہ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔ اللہ چاہتا تو مکے والے شروع سے ہی الصادق الامین کی صدا پر لبیک کہتے اور وہیں سے اسلامی ریاست کا آغاز ہو جاتا' لیکن زمین سے پیوستگی جس ذلت کا پیش خیمہ بنتی ہے' اس کا قلع قمع کیسے ہوتا؟ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهُ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ کا عملی مظاہرہ دکھانے کے لیے اللہ نے اپنے حبیب سے ترک وطن کی قربانی لی اور مکہ ایسا بابرکت شہر جو پوری نسل انسانی کے لیے وجہ قیام و بقا ہے چھڑا کر یثرب کی وادی میں لے جا بسایا' جہاں کی آب و ہوا ناموافق' شہر ہے کہ یہودی سازشوں کی آماجگاہ' فضا ہے کہ اوس و خزرج کی صدیوں پر پھیلی ہوئی دشمنی سے خون آلود' لوگوں کی خاصی تعداد ایک طرف' آپ کی امامت میں شام و سحر بارگہ ایزدی میں سجدہ ریز اور دوسری طرف مسجد ضرار کی تعمیر میں مصروف۔ صرف یہ تعلیم دینا مقصود تھی کہ یہ امت کبھی زمین سے پیوستگی نہیں رکھتی۔ یہ اس نبی کے نام لیوا ہیں جنہیں مکہ ایسا شہر چھوڑ کر یثرب کی وادی میں اترنا پڑا تو انہوں نے اس کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنادیا۔

آج کا مذہبی طبقہ اسلامی ریاست کے قیام کی بات کرتا ہے تو حدود سے شروع کرتا ہے اور حدود پر ختم کر دیتا ہے' گویا اسلام کوئی دین نہ ہو' بلکہ محض ایک نظام تعزیرات ہو۔ اس سفرنامے میں بتایا گیا کہ مدینہ پہنچتے ہی مسافرِ ہجرت نے انصارؓ و مہاجرینؓ کو بھائی بھائی بنا کر ایک فریق کی معیشت اور دوسرے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا' یہی وجہ ہے کہ سیرت و حدیث کی کتابیں واقعہ مؤاخات کو شروع کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

فاخذبید علی بن ابی طالب وقال هذا اخی .... لوگ حیران ہوتے ہیں کہ حقیقی چچازاد اور ہونے والے داماد کو بھائی بنانے کی کیا ضرورت تھی' لیکن در

حقیقت یہ اعلان تھا اس بات کا کہ علیؓ کی کفالت جیسے کہ میں میرے ذمے تھی اب بھی میرے ذمے ہوگی اور میری اپنی ذمہ داری بھی کسی پر نہیں ہوگی' مبادا کوئی یہ سمجھے کہ سب کچھ اپنی یا اپنے خاندان کی کفالت کے لیے تھا۔ خویشتن پروری اور خویش نوازی کا شروع سے ہی قلع قمع کر دیا۔

ساتھ ہی قریش' جو حسب و نسب میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے' مدینے کے کسانوں کے ساتھ یوں رشتہ مؤاخات میں منسلک ہو گئے کہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

گویا یہ سفر نامہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلامی ریاست کی حکمرانی آسائشوں کے حصول کا ذریعہ نہیں' بلکہ یہ آزمائشوں کو دعوت دینے کا نام ہے۔ اسلامی ریاست کی بنیاد اس امر پر ہے کہ کوئی شخص محروم معیشت نہ ہو' نہ محروم تعلیم و تربیت۔ تمام شہری برابر ہیں اور تمام مسلمان بھائی بھائی۔

آج کے دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات میں آویزش کا عنصر ایک بڑا چیلنج ہے۔ یہ بات عجیب ہوگی اگر کہا جائے کہ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی ایک فطری امر ہے۔ اس سفر نامے نے انسانی تاریخ کے اس نازک ترین لمحے کی نشاندہی کی ہے جس میں انسانیت کا پورا مستقبل اور کائنات کی مکمل تاریخ ایک غیر مسلم کی دیانت سے وابستہ تھی۔ عبداللہ بن اریقط' جو سفر ہجرت میں آپ کو غیر معروف راستے سے مدینہ پہنچانے کے لیے اجرت کے طور پر ساتھ لیا گیا تھا' اس کے ایک طرف اجرت کا وہ ایک اونٹ تھا جو مدینے کے مسافر اسے دے رہے تھے۔ اور دوسری طرف ایک سو اونٹوں کا وہ گراں بہا انعام تھا جو محض مخبری کرنے پر اسے مل سکتا تھا۔ آج کا کنز لگر عبداللہ بن اریقط والی دیانت پیدا کرے تو مہاجرِ مدینہ کی امت کو اس سے معاملہ کرنے میں کوئی کبیدگی نہیں ہوگی۔

ہجرت مدینہ کے عظیم ترین مسافر نے انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور دے کر مسلمانوں ہی کو نہیں ان یہودیوں کو بھی جن کا وجود ہمیشہ انسانیت کے جگر کا سرطان رہا ہے'

ان عرب قبائل کو بھی جن کی زندگی کشت و خون سے عبارت تھی' ان منافقین کو بھی جو اللہ کے لیے نہیں تفریق بین المومنین کے لیے کمین گاہیں بناتے اور ان کا نام مسجد رکھتے تھے' دشمنوں سے ساز باز کر کے مدینے کو تاراج کرنے کی فکر میں رہتے جان' مال' عزت اور آبرو کا تحفظ ہی نہیں خارجی حملے سے دفاع کی ضمانت بھی دی.

داخلی امن و امان اور خارجی دفاع کا اہتمام وہ نقطۂ آغاز تھا جس سے مدینہ کی شہری ریاست صرف دس سال کے معمولی عرصے میں دس لاکھ مربع میل تک پھیل گئی اور اس پورے عرصے میں قیام امن کے لیے صرف ایک ہزار اٹھارہ لوگ کام آئے جن میں ۲۳۹ مسلمان اور ۷۵۹ غیر مسلم تھے.

اس تعداد میں بنو قریظہ کے وہ یہودی جو اپنی شریعت کے مطابق اپنے ہی قانون کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے' بئر معونہ کے ستر شہداؑ مدد مارے جانے والے لوگ بھی شامل ہیں ورنہ اصل تعداد پانچ چھ سو سے زائد نہیں۔ اتنے بڑے رقبہ پر امن و امان قائم کرنے کے لیے اتنا معمولی آپریشن انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی.

آج ترقی پذیر ممالک بالخصوص پاکستان شرح خواندگی میں اس قدر پیچھے ہیں کہ ہم مصنوعی اور فرضی اعداد و شمار کے اضافوں کے ساتھ بھی قوموں کی برادری میں سر اٹھانے کے قابل نہیں۔ اس سفرنامے میں بتایا گیا کہ مسافرؐ ہجرت نے مدینہ پہنچتے ہی مسجد کے ساتھ ایک چبوترا بنا کر مدرسے کا آغاز کر دیا اور پھر گرفتار ہو کر آنے والے غیر مسلم قیدیوں کو بچوں کا استاد مقرر کر دیا۔ ان سے دینی تعلیم تو نہیں دلائی جاتی تھی۔ نہ معلوم ہم نے کیوں تعلیم میں دینی اور دینوی کی لکیر کھینچ دی ہے اور اس کشمکش میں نسلوں کی نسلیں Single Track ہو گئی ہیں۔ گھر کی نہ گھاٹ کی.

اس سفر کا دوسرا حصہ جس کا تعلق حرم مکہ کی زیارت سے ہے اپنے اندر انسانی تہذیب کے بے شمار چیلنجوں کا جواب رکھتا ہے۔ آپ نے جب حج کا ارادہ فرمایا تو جس طرح ابوالانبیاء نے بنائے کعبہ کے بعد کھڑے ہو کر قیامت تک آنے والے انسانوں کو حج کے لیے بلایا۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ

عمیق'، اسی طرح آپ نے تمام قبائل عرب میں اعلان کروادیا کہ جو کوئی سفر حج میں مصاحبت کا متمنی ہے آجائے۔ اس طرح لوگ آتے گئے قافلہ بنتا گیا۔ ایک لاکھ سے زائد فرزندان توحید عرفات کے میدان میں نبی امیؐ کے خطاب کے موقع پر گوش بر آواز تھے۔

آپ نے اس علان عام کے ذریعے بتایا کہ کعبہ تمام نسل انسانی کے قیام کا موجب ہے۔ کسی نسل، قوم یا ملک کا نہیں، صرف ایک پابندی ہے کہ پاک ذات کے گھر میں حاضری دینے والا پاک ہو (اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ۔ اے ایمان والو مشرک پلید ہیں سو وہ مسجد حرام کے قریب نہ جائیں)۔

آپؐ نے بتایا کہ یہ سفر محض عبادت اور رسوم و مظاہر کی بجا آوری کا نام نہیں، بلکہ سفر نامہ بتاتا ہے کہ انسانی برادری میں ہمیشہ سے جن بنیادوں پر تقسیم و تفریق کا عمل جاری رہا انہیں ہمیشہ کے لیے دفنا دیا گیا۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ سب کا رب ایک ہے اور سب کا باپ ایک ہے۔ وحدت نسل انسانی کی دو ایسی بنیادیں ہیں جن کے سامنے جمع و تفریق کے تمام فارمولے ختم ہو جاتے ہیں۔

معاشی تحفظ جس کی بنیاد سفر مدینہ کے فوراً بعد رکھ دی گئی تھی اس کی تکمیل فرماتے ہوئے معاشی استحصال کا خاتمہ فرمادیا۔ معاشی استحصال کا سب سے بڑا مظہر سود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ہم نے دفنا دیئے اور سب سے پہلے میں نے اپنے چچا عباس کا سود ختم کر دیا۔

جس امن و امان کی بنیاد مدینہ میں رکھی گئی تھی آج اس کی تکمیل کر دی گئی اور فرمایا: تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں محترم ہیں جیسے آج کا دن، آج کا مہینہ اور یہ شہر محترم ہیں۔

فقہی مباحث کی تنگنائیوں میں الجھی ہوئی امت کے لیے اس سفر نامے میں ایک کھلی شاہراہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا:

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا ما تمسکتم بھما، کتاب اللہ وسنتی۔

گویا یہ بتایا گیا کہ کتاب و سنت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جس طریق کو بھی اپنی خواہشات کی آسودگی کے لیے نہیں، بلکہ اتباع رسول کے تقاضے سے اپنائیں گے وہی راہ راست ہے۔ جس فرقہ بندی کو وہاں ممنوع قرار دیا گیا اس کے بارے ہی فرمایا، لاترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض۔

یہی نہیں کہ یہ سفر نامہ صرف انہی مختصر احوال و ہدایات پر مبنی ہے، سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی وہ اجتماعیت صغریٰ، جس کا آغاز محلے کی مسجد سے ہوتا ہے، حج بیت اللہ پر آخر اجتماعیت کبریٰ میں متشکل ہو جاتی ہے۔ یہ موقع ہے جب تمام مسلم ممالک کے سربراہ اور مسلم اقلیات کے نمائندے جمع ہو کر اپنے اپنے مسائل کا حل تلاش کریں اور اسلام کے پیغام امن و سلامتی اور عدل و مساوات کو ساری دنیا میں عام کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

اس سفر نامے کے بعد حرمین کے ہر سفر نامے کا مقصد صرف اور صرف فخر کون و مکان، زبدۂ زمین و زماں کے نقوشِ پا کو تلاش کرنا رہا۔ ہر شخص حرمین کی فضا میں لمبے لمبے سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جس کے سوتے مصطفیٰ کریم ﷺ کی معطر سانسوں سے پھوٹتے تھے۔ غار حرا اور غار ثور کے پتھروں سے لوگ اس خیال سے لپٹتے کہ ان سے مدینے والے کے جسد اطہر نے مس کیا ہوگا۔ ہر وادی اور ہر پہاڑی پر عاشقان مصطفیٰ دیوانہ وار پھرتے ہوئے تلاش کرتے ہیں کہ:

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گلبدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست

ساری کائنات کا کاروان شوق جس مسافر حرمین کی جنبش لب کا گرویدہ ہے آیئے اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہم بھی اس سے عرض کریں کہ:

ترے سوا میں کہاں جاؤں کس کا کہلاؤں
نہ چھین اپنے تعلق کا آسرا مجھ سے

ذرائع ابلاغ کے ذریعے آنے والے معلومات کے سیلاب ہی دور حاضر کو اس خوش

فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ دنیا ایک *Golobal Village* ہو گئی ہے اور ٹیلی کمیونیکشن، انٹرنیٹ اور *E-Mail* وغیرہ کے ذریعے خبریں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک *Micoro Seconds* میں سفر کرتی ہیں اور ہر طرح کی معلومات انسانوں کی دسترس میں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ *Media* وہی خبریں دنیا تک پہنچاتا ہے جو اس میں *Feed* کی جاتی ہیں اور آج کی دنیا میں جو کچھ *Feed* کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے دنیا کی شائستہ ڈکشنریوں میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔ ابلاغ کی جدید ٹیکنالوجی میں کیا *Feed* کیا جائے اور دنیا کو آج جو چیلنج ابلاغیات کے حوالے سے درپیش ہے اس کے لیے اس سفرنامے میں ہمیں رہنمائی ملتی ہے کہ آپ نے تمام ہدایات دے کر فرمایا فلیبلّغ الشاہد الغائب یہ معلومات جن تک پہنچ چکی ہیں وہ ان تک پہنچا دیں جن تک ابھی نہیں پہنچ پائیں۔ ایک جملے میں ذرائع ابلاغ کے چیلنج کا جواب ہے۔

عربی زبان وادب میں حرمین شریفین کے سفرناموں کی روایت اور اس کا ارتقاء

ڈاکٹر محمود الحسن عارف
(نگران صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی لاہور)

انسان بنیادی طور پر ''جدت پسند'' واقع ہوا ہے۔ اس لئے نت نئی چیزیں دیکھنے اور دنیا کی سیاحت کرنے کا شوق اس کی فطرت میں رچا بسا ہے' لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''سفر'' (Journey) کا تصور ایک بین الاقوامی ''تصور'' ہے' جو اسلام سے قبل بھی کرہ ارض پر موجود تھا۔ چنانچہ قدیم انبیا علیہم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام کا کشتی (سفینہ) پر سفر (۱)' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا' عراق سے فلسطین (الخلیل) جاتے ہوئے ادھر سے گذرنا (۲) اور وہاں سے مکہ مکرمہ میں......... بیت اللہ شریف کی تعمیر و تاسیس کے لیے آنا' (۳) ' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سمیت مصر سے نکل کر صحرائے سینا آنا اور وہاں ''صحرا'' نوردی کرنا (۴) ' حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں بنی اسرائیل کا ارض فلسطین میں داخل ہونا ' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے اڑھائی سالہ دور نبوت میں مسلسل سفر میں رہنا ...... اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ اسلام کے سسرالی خاندان بنو جرہم کا (۵) ' سفر کر کے مکہ مکرمہ میں آباد ہونے کے لئے آنا' وغیرہ اس کی نمائندہ مثالیں ہیں.

اس عالمگیر تصور کے علاوہ خود اہل عرب بھی سفر کے تصور سے نا آشنا نہ تھے' بلکہ اگر یہ کہا جائے' تو درست ہوگا کہ ان میں سے اکثر قبیلوں کی زندگیاں سفر ہی میں گزرتی تھیں۔ یہ لوگ کسی ایک جگہ آباد ہونا اور مستقل سکونت اختیار کرنا اپنی شان مروت و مردانگی کے منافی تصور کرتے تھے۔ اس کے برعکس ' مسلسل سفر میں رہنا ...... کچھ دنوں کے بعد ' کسی نئی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہونا ' ان کی معاشرت کا مستقل عنصر تھا..... غالباً اسی لئے

عربی قصیدے کی ابتدا سفر کے نتیجے میں رونما ہونے والے المناک واقعات' یعنی ہجر و فراق کے تصور سے ہوتی ہے ..... انتہا یہ ہے کہ اس جذباتی تصور کو ایسی پذیرائی ملی کہ حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری (م ۶۰ ھ) جیسے شہری شاعر (۵۔الف) اور ان کے بعد .... کے سیکڑوں شعرا نے بھی' اسی انداز سے اپنے اپنے قصائد کی ابتدا کی ہے' جس سے سرزمین عرب پر سفر کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

دراصل سفر ایک حرکت (Movement) ہے جو کہ زندگی کی علامت ہے اور اس کے برعکس سکونت (Stay) ایک جمود ہے ...... جو موت کی نشانی ہے .... اللہ تعالیٰ نے ''اسلام'' کی دولت عطا کرنے کے لئے ایک ایسی قوم کا انتخاب فرمایا' جس کی رگ رگ میں ''حرکت'' تھی اور جس کی زندگی مسلسل سفر اور حرکت سے عبارت تھی' اس حرکت نے آگے چل کر' اسلام کی اشاعت اور ''علوم اسلامیہ'' کی تبلیغ و اشاعت میں اہم اور موثر کردار ادا کیا۔

اسلامی دور

ان حالات میں جب اسلام کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا' اور سرزمین عرب اس کی تابانیوں سے' سب سے پہلے جگمگائی' تو سفر'' کے اس ''محدود'' تصور کو مزید وسعت عطا ہوئی اور سفر نے مسلمانوں میں ''بین الا قوامیت'' کے جذبوں کو فروغ دیا۔

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ اسلام سے قبل سفر کے مقاصد بہت مختصر اور محدود تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنی ذاتی ضرورت کے تحت نقل مکانی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک قبیلہ کسی خاص چشمہ یا پانی کے ذخیرے پر آباد ہوتا' جب پانی کا یہ ذخیرہ خشک ہو جاتا' تو وہ قبیلہ وہاں سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ آباد ہو جاتا۔

اس کے علاوہ حج و عمرہ کے لیے سفر اختیار کرنے کا رواج بھی موجود تھا اسلام نے سفر یا نقل مکانی کے مقاصد میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اس کے حسب ذیل مقاصد بیان فرمائے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور فطرت کا مطالعہ

اللہ تعالیٰ نے سیاحت یا سفر کا جو سب سے اعلیٰ و ارفع مقصد بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ

انسان اس خیال سے سیاحت کرے، تاکہ وہ گھر باہر نکل کر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے تخلیقی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے، مثلاً ارشاد ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ

(۶) یعنی "کہہ دو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔ پھر خدا ہی دوسری بار پیدا کرے گا۔"

تخلیق کائنات کا اس پہلو سے مشاہدہ یقیناً انسان کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔

۲۔ تبلیغ و جہاد

سیاحت یا گھر سے نکلنے کا دوسرا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام اس کی مخلوق تک پہنچانا اور اعلاء کلمۃ اللہ یعنی جہاد و قتال کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہے ...... چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا (۷)، یعنی: "اے ایمان والو! ان لوگوں جیسے نہ ہونا، جو کفر کرتے ہیں اور ان کے (مسلمان) بھائی جب (خدا کی راہ میں) سفر کریں اور مر جائیں، یا جہاد کو نکلیں، (اور مارے جائیں) تو ان کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے"

ایک حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے "جہاد" کو مسلمانوں کی سیاحت قرار دیا ہے۔

۳۔ تجارت و شغل معاش

تیسرا بڑا مقصد، جس کے لیے اسلام نے سفر اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، تجارت کا شغل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ، اسلام نے دین و دنیا کی تفریق ختم کر کے، دونوں کو ایک ہی "جذبے" اور ایک ہی "مقصد" کے تحت جمع کر دیا ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ مال انسانی زندگی کو قائم و دائم رکھنے کا ذریعہ (جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۸)) ہے۔ چنانچہ نماز جمعہ کی فرضیت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۹)، یعنی "پھر جب

نماز کا وقت ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔"

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے رات کی نماز، یعنی تہجد میں تخفیف کی حکمت واضح کرتے ہوئے فرمایا: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنكُمْ مَّرْضٰى (۱) وَ آخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۱۰) یعنی "اس نے جان لیا ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ بیمار بھی ہوتے ہیں اور کچھ خدا کے فضل (تجارت و معاش) کی تلاش میں زمین میں سفر کرتے ہیں"

۴۔ تلاش علم

اسلام میں سفر کا ایک اور مقصد "طلب علم" کو قرار دیا گیا ہے۔ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت پر فرض قرار دیا ہے اور اسے مومن کی متاع گم گشتہ قرار دے کر اس کی تلاش و جستجو کو لازم ٹھہرایا ہے، ارشاد نبوی ہے:

"جو شخص طلب علم کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے تو فرشتے اس کے سامنے اپنی خوشی کے اظہار کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ (۱۱)"

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک "مرد بزرگ" کے پاس جانے اور کچھ وقت کے لئے ان کی معیت و رفاقت اختیار کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے محدثین کے مطابق اس سے بھی طلب علم کے لیے سفر اختیار کرنے کی ترغیب ملتی ہے (۱۲).

علاوہ ازیں طالب علموں کے قدموں تلے فرشتوں کے پر بچھانے کا تذکرہ کر کے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر کے اس اعلیٰ ترین مقصد کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے.

۵۔ ہجرت فی سبیل اللہ

سفر کرنے کی ایک اہم وجہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نقل مکانی یا ترک وطن ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب کفار مکہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ چنانچہ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے ترک وطن کی اجازت مرحمت فرما دی۔۔۔ اس موقع پر حکم آیا:

يٰعِبَادِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِىْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ (۱۳) یعنی: اے

میرے وہ بندو' جو ایمان لائے ہو' میری زمین بہت کشادہ ہے' سو تم میری ہی عبادت کرو".

۶۔ حج و عمرہ:

سفر کا ایک اور اہم ترین مقصد حج و عمرہ کی ادائیگی ہے' چنانچہ حج کی فرضیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دور دراز سے آنے اور سفر اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا (۱۴)' یعنی: "اور اللہ تعالیٰ کا حق (فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھے وہ اس کا حج کرے"

اسی طرح سورہ الحج میں اس کے لیے دور دراز کے سفر اختیار کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ (۱۵)' یعنی: اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو کہ تمہاری طرف پیدل اور دبلے پتلے اونٹوں پر' جو دور دراز راستوں سے چلے آتے ہوں' سوار ہو کر چلے آئیں.

مقاصد کے اسی تنوع کے باعث مسلمانوں نے ہر دور میں سیر و سیاحت کا طریقہ اپنایا۔ البتہ اپنے سفر کے حالات و وقائع مرتب کرنے کا اسلوب' یعنی سفر نامہ نگاری کی ابتدا' قدرے وضاحت طلب ہے.

یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اس وقت آپ اپنے گھر سے کم و بیش تین میل کے فاصلے پر ایک دشوار گزار غار (غار حرا) میں تشریف فرما تھے۔ اس طرح گویا اسلام کی ابتدا ہی "دوران سفر" سے ہوئی .... پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی تبلیغ کے لئے عرب کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کی خیمہ گاہوں کی طرف مسلسل سفر کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ کی "حیات طیبہ" کا کچھ حصہ بڑی حد تک ایسے ہی تبلیغی دوروں اور دعوتی اسفار میں گذرا۔ جس میں سے ایک یادگار سفر "طائف" کا بھی ہے۔ جہاں آپ ایک ہفتہ کا سفر کر کے گئے تھے۔ اور جہاں آپ نے ایک ہفتہ تک قیام فرمایا تھا۔ اس سفر میں اہل طائف کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناروا سلوک آپ کی دعوتی اور تبلیغی زندگی کا ایک یادگار سانحہ ہے۔"

پہلا سفر حرم

اسلامی تاریخ میں پہلا سفر حرم کونسا تھا؟ اس بارے میں مختلف آراء پیش کی جاتی ہیں لیکن ہمارے خیال میں درجہ ذیل قصہ اس کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی اعلان نبوت کیا آپ کی بھرپور مخالفت اور عداوت شروع ہوگئی۔ اور جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان کو طرح طرح سے ظلم اور زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا تھا........ انہی حالات میں حرم مکہ کی طرف تاریخ اسلام کا پہلا سفر اختیار کیا گیا اور لطف یہ کہ اس سفر حرم کو مسافر کی ذات محترم نے ہی اپنے الفاظ میں بیان کر کے اسے دنیائے اسلام کا پہلا ''سفر نامہ حرم'' بنادیا ہے........ یہ ذات محترم حضرت ابو ذر الغفاریؓ کی ہے جنہوں نے اعلان نبوت کے دوسرے یا تیسرے سال یہ سفر اختیار کیا تھا۔

حضرت ابو ذر الغفاریؓ (م ۳۱ھ/۶۵۱ء) کے نام میں اختلاف ہے، مشہور قول کے مطابق ان کا نام جندب بن جنادہ بن السکن ہے۔ ان کا قبیلہ ''بنو غفار'' تھا جو کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مابین رہائش پذیر تھا۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کا قصہ خود بیان کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"جب انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے بھائی انیس الغفاری کو کہا کہ تو اس وادی میں سوار ہو کر جا اور مجھے اس شخص کے متعلق صحیح صحیح خبر لا کر دے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ چنانچہ ان کے بھائی مکہ مکرمہ آئے اور انہوں نے یہاں آکر آپ ﷺ کی باتیں سنیں اور پھر واپس جا کر حضرت ابو ذرؓ کو بتایا کہ: ''میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ عمدہ اخلاق اپنانے کا حکم دیتے ہیں اور وہ ایسا کلام سناتے ہیں جو کہ شعر نہیں ہے''

حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا جو میں چاہتا تھا تو نے وہ باتیں بتا کر میری تشفی نہیں کی، چنانچہ انہوں نے خود زاد سفر لیا ایک مشکیزہ پانی سے بھرا اور مکہ مکرمہ چلے آئے اور مسجد (حرام) میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کیا، مگر مشکل یہ تھی کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہ تھے اور انہوں نے کسی اور شخص سے پوچھنا بھی گوارا نہ کیا۔

اسی حالت میں انہیں رات ہو گئی تو وہ وہیں لیٹ گئے۔ اس وقت حضرت علیؓ کی نگاہ ان پر پڑی تو انہوں نے فوراً جان لیا کہ یہ کوئی مسافر ہے۔ چنانچہ حضرت ابوذرؓ کو اپنے ہمراہ اپنے گھر لے آئے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے سے صبح تک کوئی بات نہ کی۔ صبح ہوئی تو حضرت ابوذرؓ نے اپنا سامان اور اپنا مشکیزہ اٹھایا اور مسجد (حرام) میں چلے آئے اور انہوں نے یہ (اگلا) دن بھی ہیں گزار دیا.

اس روز بھی انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نظر نہ آئے' چنانچہ وہ شام کے وقت اپنے آرام کی جگہ چلے آئے۔ اس روز بھی حضرت علیؓ کا ان کے قریب سے گزر ہوا تو انہوں نے فوراً پہچان لیا اور کہا کہ ابھی مسافر اپنے گھر نہیں گیا' چنانچہ وہ اس دن بھی انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اس رات بھی دونوں میں سے کسی نے دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ تیسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا اور شام کو حضرت علیؓ انہیں اپنے ہمراہ لے آئے......... اس دن حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا کہ "کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی یہاں آمد کا مقصد کیا ہے" وہ بولے اگر تم مجھے اس بات پر پختہ عہد اور میثاق دو کہ تم ضرور میری رہنمائی کرو گے تو میں اپنا مقصد بتا دوں گا" چنانچہ حضرت علیؓ نے ایسے ہی کیا...... حضرت ابوذرؓ نے اب انہیں اپنی آمد کا مقصد بتا دیا جس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ تم نے صحیح سنا ہے وہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ جب صبح ہو تو تم میرے پیچھے پیچھے چلے آنا اگر مجھے راستے میں' کوئی ایسی بات دکھائی دی جس سے مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہوا تو میں راستے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ جیسے پیشاب کر رہا ہوں' پھر جب میں وہاں سے گزر جاؤں تو تم پھر میرے پیچھے پیچھے چلے آنا' تا آنکہ ہم نے جہاں جانا ہے وہاں پہنچ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اگلے دن ایسے ہی کیا. اس طرح حضرت ابوذرؓ حضرت علیؓ کے ہمراہ آنحضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے' یہاں انہوں نے آنحضور ﷺ کی باتیں سنیں تو آپ کے ہاتھ پر فوراً اسلام قبول کر لیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: کہ تم واپس اپنے لوگوں کے پاس چلے جاؤ اور انہیں میری نبوت و رسالت کے متعلق بتاؤ تا آنکہ تمہیں میرا دوسرا کوئی حکم ملے.

لیکن حضرت ابوذر الغفاریؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم' جس کے قبضے میں میری جان

ہے' میں اسلام کا ان کفار کے سامنے ضرور اعلان کروں گا...... چنانچہ انہوں نے مسجد میں جا کر اونچی آواز سے کلمۂ شہادت کا اعلان کیا' جس پر کفار انہیں مارنے کے لئے ٹوٹ پڑے' مگر حضرت عباسؓ نے' انہیں' ان پر خود کو گرا کر' بچایا اور لوگوں سے کہا' کیا تم نہیں جانتے کہ یہ قبیلہ غفار سے ہے۔ جو تمہارے شام کے' تجارتی راستے پر آباد ہے' اگلے دن انہوں نے پھر ایسے ہی کیا اور حضرت عباسؓ نے انہیں حسب سابق کفار سے بچایا''

ہمارے خیال میں اسلامی تاریخ کا یہ قدیم ترین ''سفر حرم'' بھی ہے اور ''سفر نامہ حرم'' بھی' جسے مسلم شریف کے ہاں ''خود بیانیہ انداز'' میں اور البخاری کے ہاں ''صیغۂ غائب'' کے اسلوب ادا میں بیان کیا گیا ہے .... اس کی قدامت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خود کو ''پانچواں مسلمان'' بیان کیا ہے۔

اس کے بعد ''حرم مکہ کے سفر'' تو بہت سے لوگوں نے کیے ...... جن میں کچھ ایک (مثلاً حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ م جنگ یرموک ۱۳ھ) نے قبول اسلام کی سعادت بھی حاصل کی' مگر ان کے ان سفروں کے ''سفر نامے'' دستیاب نہیں ہیں۔

سفر ہجرت

قریش مکہ کی ضد' ہٹ دھرمی' اور اسلامی کی کھلی مخالفت و عداوت نے بالآخر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ رسول اکرم ﷺ کو اسلام کے لئے ایک نئے ''مرکز'' کی تلاش شروع ہوئی' اللہ تعالیٰ نے یہ حسن سعادت یثرب (مدینہ منورہ) کے حصے میں لکھ رکھی تھی' جسے مکہ مکرمہ کے ساتھ' اسلام کے دوسرے حرم اقدس' یعنی مقام محترم و مسعود ہونے کا شرف حاصل ہونا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہری اسباب اس طرح پیدا فرما دیئے کہ ۱۰ھ میں قبیلہ خزرج (یثرب) کے چھ خوش نصیب افراد ''حج بیت اللہ'' اور حرم مکہ کی زیارت کرنے کے لیے حاضر ہوئے........ یہ لوگ منیٰ کے ایک گوشے میں خیمہ لگا کر بیٹھے تھے کہ رحمت دو عالم ﷺ انکے پاس تشریف لائے اور انہیں اسلام قبول کر کے سعادت دارین حاصل کرنے کی دعوت دی ...... یہ لوگ چونکہ یہودیوں کے ہمسائے تھے اور یہودیوں کی زبانی نبی

آخر الزمان کی علامتیں اور باتیں سنتے رہتے تھے۔ اس لئے جب ان کے سامنے یہ دعوت آئی' تو انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور باہم کہنے لگے کہ "یہ تو وہی نبی ہیں' جن کا تذکرہ یہودی کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کو قبول کرنے میں ہم سے سبق لے جائیں' لہٰذا انہوں نے فوری طور پر اسلام قبول کر لیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے وطن جاکر' اسلام کی اشاعت کی کوشش کریں گے اور آئندہ سال اسی جگہ دوبارہ آپ سے آکر ملیں گے.

آئندہ سال سعادت مند و خوش نصیب افراد کا یہ قافلہ مزید چھ (یا سات) افراد (کل بارہ افراد) کے ہمراہ نبی اکرم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا .... ان لوگوں نے اس سال خصوصی طور پر درخواست کی کہ آنحضور ﷺ اسلام کی تبلیغ اور قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے کچھ مبلغین کو ان کے ہمراہ بھیج دیں' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو ان کے ہمراہ ارسال کر دیا۔ ان دونوں بزرگوں' خصوصاً حضرت مصعبؓ کی کوشش سے 'مدینہ منورہ میں اسلام کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوگئی' چنانچہ آئندہ سال ۷۳ مردوں اور ۲ خواتین (کل ۷۵ افراد) پر مشتمل جماعت نے "آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر اس عہد کے ساتھ بیعت کی' کہ وہ آنحضور ﷺ کی اپنے بال بچوں سے بھی بڑھ کر زیادہ حفاظت کریں گے اور آپ کو مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی.

آنحضور ﷺ نے یہ دعوت قبول کر لی' اور حج کے بعد سے مسلمان اکا دکا' اور جماعتوں کی شکل میں مدینہ منورہ روانہ ہونے لگے۔ اس موقع پر 'بعض بڑے دلدوز واقعات بھی سامنے آئے (۱۷).

جب مکہ مکرمہ مسلمانوں سے قریباً خالی ہو گیا' اور قریش مکہ نے آنحضور ﷺ کے قتل کا ناپاک منصوبہ تیار کر لیا' تو آنحضور ﷺ نے بھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی.'

آنحضور ﷺ کا یہ سفر مبارک...... کئی اعتبار سے یادگار سفر ہے ...... اس سفر ہجرت سے 'اسلامی تاریخ یا سنہ ہجری کی ابتدا ہوئی' اور پھر یہ تاریخ عالم کا پہلا سفر مبارک ہے. جس کی 'جزئیات' تک تاریخ و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس لیے ..... سفر ہونے کے علاوہ آنحضور ﷺ کا یہ "سفر مبارک" قدیم ترین

سفرنامہ حرم ہونے کا اعزاز بھی رکھتا ہے. البتہ اس سفر کا "سفرنامہ نگار" متعین نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسے بے شمار لوگوں نے اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے.

یہ سفرنامہ مبارک اپنے اندر بہت سے اسباق بھی رکھتا ہے۔ جن میں سے ایک وطنیت اور قومیت کے بارے میں اسلام کے عالمگیر اخوت والے نظریئے کا اظہار واعلان بھی ہے۔ آپ کی ولادت مکے میں ہوئی، مگر ہجرت کے بعد آپ نے اپنا جینا اور مرنا انصار مدینہ کے ساتھ طے کرلیا اور پھر مکے کی فتح کے باوجود اپنے اس مرکز و مستقر کو نہیں چھوڑا (۱۸)

۲۔ سفر صلح حدیبیہ

"سفر ہجرت کے بعد..... کفار مکہ نے مدینہ منورہ پر حملے کے لئے بار بار کوچ کئے، مگر رحمت دو عالم ﷺ نے ۶ ھ تک اس طرف جانے کا بالکل ارادہ نہیں کیا ..... سنہ ۵ ھ میں جب قریش مکہ کا مدینہ منورہ پر سب سے بڑا حملہ (احزاب)..... ناکام ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

الآن نغزوھم ولا یغزوننا یعنی اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے، مگر وہ ہم پر چڑھائی نہ کرسکیں گے.

چنانچہ اس سے اگلے ہی سال یکم ذوالقعدہ ۶ ھ / ۶۲۸ء کو آنحضور ﷺ اپنے ایک الہامی خواب سے بشارت پاکر، چودہ یا پندرہ سو صحابہ اکرمؓ کے ہمراہ عازم مکہ مکرمہ ہوئے ....ذوالحلیفہ پہنچ کر آپ نے قربانی کے جانوروں کی گردنوں میں، عرب کے مروجہ دستور کے موافق، قلادے ڈالے اور عمرے کے لیے احرام باندھا ...... چونکہ آپ کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا، بلکہ محض عمرہ کرنا مقصود تھا، اس لئے آپ ﷺ نے تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ہمراہ نہیں رکھا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کو اجازت دی.

آپ ﷺ کو اطلاع ملی کی، قریش مکہ کو آپ کے ارادہ عمرہ کی خبر ہو گئی ہے، اور وہ آپ کے مقابلے پر تیار ہو کر بیٹھے ہیں، اور یہ کہ آپ کا راستہ روکنے کے لئے بطور مقدمتہ الجیش خالد بن ولید دو سو افراد کے ہمراہ مقام کراع الغمیم تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے یہ سنا، تو راستہ بدل لیا اور

نامانوس راستوں سے ہوتے ہوئے 'حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے جو اسی نام کے قصبے کے پاس ایک کنوئیں کا نام تھا۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے (۱۹) یہاں کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان چھ شقوں پر مشتمل ایک معاہدہ ترتیب پایا' جسے اسی قصبے کے نام پر صلح (یا معاہدہ) حدیبیہ کہا جاتا ہے (۲۰).

۳۔ سفر عمرہ القضاء

اس معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ آنحضور ﷺ آئندہ سال اسی موسم میں عمرہ ادا کرنے آئیں گے اور مکہ مکرمہ میں تین دن قیام کریں گے اور عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے.

آئندہ سال ۷ ھ میں جیسے ہی ذوالقعدہ کا چاند نظر آیا نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو عمرہ کی ادائیگی کے لیے روانگی کا حکم دیا' چنانچہ ان صحابہ کرامؓ سمیت جو گذشتہ سال عمرہ ادا کرنے کے لیے آپ کے ہمراہ آئے تھے دو ہزار صحابہ کرامؓ کی معیت میں آنحضور ﷺ عمرہ القضا کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئے اور حسب معاہدہ تین دن مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد خیر دعافیت واپسی ہوئی واپسی سفر میں حضرت میمونہؓ سے نکاح اس سفر کا یادگار واقعہ ہے.

اسی سفر میں واپسی پر حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی بیٹی چچا جان چچا جان کہتے ہوئے آپ کے پیچھے چل دی۔ آپ نے اسے حضرت علیؓ کو دے دیا۔ حضرت علیؓ نے یہ بچی حضرت فاطمہؓ کو دے دی۔ اس پر حضرت علیؓ حضرت زیدؓ حضرت جعفرؓ کا اس بچی کی تربیت کے بارے میں جھگڑا ہو گیا' حضرت علیؓ نے کہا میں نے اسے لیا ہے اور یہ میری چچازاد بہن ہے۔ لہذا اس پر میرا حق ہے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ وہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے' لہذا اس پر میرا حق ہے۔ حضرت زیدؓ نے کہا کہ وہ میرے منہ بولے بھائی کی بیٹی ہے' لہذا میں اس کی تربیت کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے یہ بچی اس کی خالہ (زوجہ حضرت جعفرؓ) کو دے دی اور فرمایا خالہ ماں ہی ہوتی ہے (۲۱)۔

۴۔ سفر حجۃ الوداع

آنحضور ﷺ کے حج و عمرہ کے لئے اختیار کردہ اسفار میں 'واقعات سفر کی ترتیب و تدوین اور جزئیات کی تفصیلات' کے اعتبار سے سفر حجۃ الوداع سر فہرست ہے۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے جتنی تفصیل سے اس سفر مبارک کی جزئیات اور تفصیلات کو قلمبند کیا ہے۔ اتنی تفصیل اور جزئیات کی پاسداری کے ساتھ حیات طیبہ کے کسی اور سفر کے واقعات کو مرتب نہیں کیا.......اس لئے حیات طیبہ کا یہ سفر تاریخی ترتیب میں سب سے متاخر ہونے کے باوجو د.......سفر نامہ رکھنے کے اعتبار سے سر فہرست ہے.

پھر یہ سفر مبارک ایک ایسے وقت میں پیش آیا' جب تمام جزیرہ العرب' جنوبی عراق و جنوبی فلسطین کے خطوں سمیت اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا اور ''اسلامی حکومت'' اس علاقے کی ایک مستحکم اور آئینی مملکت کے طور پر دنیا کے افق پر ابھر چکی تھی .....اور اس اعتبار سے یہ سفر ایک پیغمبر اور رسول ﷺ کا سفر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکمران کا سفر مبارک بھی تھا.

پھر اس بار....... پہلی اور آخری مرتبہ ایسا ہو رہا تھا کہ قریباً ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرامؓ کی قدسی جماعت آنحضور ﷺ کے ہمراہ تھی ....ان میں ہر عمر ہر نسل اور ہر علاقے کے لوگ شامل تھے اور نبی اکرم ﷺ ان تمام لوگوں کے سامنے مناسک حج ادا کر کے ....حج کے طریقے اور اس کے مسائل کی تعلیم عام کرنا چاہتے تھے۔ پھر اس سفر مقدس میں عرب کے تمام ذہین و فطین لوگ خصوصاً احادیث و روایات کے تمام اساطین آنحضور ﷺ کے ہمراہ شریک حج ہو رہے تھے' اس لئے اس مرتبہ اس سفر کے واقعات کی تدوین و اشاعت میں خصوصی طور پر دلچسپی لی گئی .....اور اس طرح تاریخ اسلام کا یہ پہلا سفر حج ہے جس کے ''سفر نامے'' اتنی تفصیل کے ساتھ مرتب کئے گئے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ (۲۲)

خلافت راشدہ (۱۱۔۴۰ھ ۶۳۲۔۶۶۱ء) کے بعد.... مدینہ منورہ گو مسلمانوں کا سیاسی مرکز تو نہ رہا تھا۔ البتہ مدینہ منورہ کئی صدیوں تک امت مسلمہ کا علمی اور فکری مرکز رہنے کے علاوہ مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ پر مشتمل ہونے کے باعث بدستور غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا اور مسلمانوں کے قافلے اس شہر مبارک کی زیارت اور اس کے دیدار کے لیے

جوق در جوق آتے اور اس شہر مقدس کی زیارت سے اپنے قلب و نظر کی پیاس بجھاتے رہے...... اس طرح مکہ مکرمہ کے ساتھ ساتھ 'مدینہ منورہ کی ''مرکزیت'' بھی مستحکم ہوتی رہی۔

دورِ صحابہ و تابعین

آنحضور ﷺ کے بعد حج و عمرہ ادا کرنے کا طریقہ روز افزوں رہا۔ صحابہ کرامؓ نے 'جو آنحضور ﷺ کی ہر ایک سنت مبارکہ اور ہر ایک اسوۂ حسنہ پر عمل کو اپنے لئے لازم اور ضروری خیال کرتے تھے 'اس اسوۂ حسنہ پر عمل جاری و ساری رکھا۔ کچھ صحابہ کرامؓ ایسے تھے جو ہر سال حج و عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ جاتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ انہیں مقامات پر ٹھہرتے تھے جہاں نبی اکرم ﷺ نے اپنے سفرِ حج میں قیام فرمایا تھا ...... ایسے صحابہ کرامؓ میں سے خصوصیت کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ہر سال حج کے لئے مکہ مکرمہ جاتے اور خصوصیت کے ساتھ' (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) راستے میں انہی مقامات پر قیام فرماتے 'جن جن مقامات پر 'رسالت مآب ﷺ نے قیام کیا تھا۔ اس طرح ''سفرِ حج'' میں دو دو سعادتیں حاصل کرتے: حج و عمرہ کی اور ان مقامات کی زیارت کی جن مقامات کو آنحضور ﷺ کے قیام سے شرف و تقدس حاصل ہوا تھا........(۲۳)

چنانچہ ان بزرگوں کے سفرِ حج کے بعض واقعات کو ان کے شاگردوں نے محفوظ کر کے ''سفرنامہ'' مرتب کرنے کی اس روایت کو آگے بڑھایا ہے...... یہی سلسلہ تابعین کے دور میں بھی جاری و ساری رہا 'لیکن ان ایام میں لوگ حج کو ایک فریضے کی ادائیگی کا عمل سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ''سفرنامہ نگاری'' کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اسی لئے ...... اس دور میں سفرِ حج و عمرہ تو بے شمار ہوئے 'لیکن کوئی ''سفرنامہ'' مرتب اور مدون نہیں کیا گیا۔

البتہ ''سفرنامہ نگاری'' کا اسلوب اس حد تک برقرار رہا کہ حکمرانوں کے سفرِ حج کے وہ واقعات محفوظ رکھے گئے جن کا کسی سیاسی یا انتظامی اہمیت کے واقعے سے تعلق تھا۔ مثال کے طور پر بنو امیہ اور بنو عباس کے حکمران جب ارضِ مقدس میں حاضر ہوتے تھے تو ان کے ساتھ

ملک بھر کی سیاست اور انتظامیہ بھی وہیں پہنچ جاتی' چنانچہ یہ لوگ یہاں اس حیثیت سے جو جو اقدام کرتے تھے' اس کی تفصیلات کتب تاریخ میں محفوظ و مدون صورت میں موجود ہیں۔ خصوصاً ایسے واقعات' جن کا تعلق خاص حرم اقدس کی حفاظت یا وہاں کی تعمیر و ترقی سے ہوتا تھا.

درمیان میں کچھ عرصہ ایسا بھی آیا جب مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ ملک بھر کی سیاست کے مرکز بن گئے۔ یہ وہ سیاسی دور تھا جب سیاست کی زمام کار بنو معاویہ سے نکل کر بنو مروان کی طرف منتقل ہو رہی تھی اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ میں خلافت کا دعویٰ کر کے ان دونوں مقامات مقدسہ کو اپنا مرکز بنالیا تھا........ ان ایام میں حکمرانوں کے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کی تفصیلات بھی کتب تاریخ میں محفوظ ہیں...... اس پورے سلسلے کا اختتام حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی حجاج بن یوسف کے ہاتھوں شہادت اور مروانیوں کی فتح کی صورت میں ہوا (۷۳ھ).

بنو عباس کے زمانے میں ہارون الرشید' ملکہ زبیدہ' مامون الرشید اور بعض دیگر حکمرانوں کی حرمین شریفین میں آمد' وہاں ان کے قیام اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات کتب تاریخ میں خصوصی طور پر محفوظ رکھی گئی ہیں.

لیکن انہیں ''سفر نامہ نگاری'' کے بجائے' وقائع نگاری' کہنا زیادہ موزوں ہوگا .... یہ الگ بات ہے کہ یہ وقائع نگاری' جب کسی سفر کی تفصیلات سے متعلق ہو' تو وہ سفر نامہ نگاری' بن جاتی ہے (۲۳).

سفر نامہ نگاری کی ابتدا

تاریخ اسلام میں اس ''وقائع نگاری'' نے کب اور کیسے ''سفر نامہ نگاری'' کی صورت اختیار؟ کی' اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا بہت مشکل ہے' البتہ یہ بات یقینی ہے کہ نامور کتابیات نگار ابن الندیم (ابو الفرج محمد بن اسحاق بن ابی یعقوب الندیم الوراق البغدادی' م بعد از ۳۹۰ھ/ ۹۹۹ء) (۲۴) کی معروف زمانہ کتاب' کتاب الفہرست (یا فہرس العلوم مطبوعہ Flugel ۱۸۷۱ء) میں الرحلۃ یا' کتاب الرحلۃ کے عنوان پر کسی بھی کتاب کی غیر موجودگی جا طور پر اس استدلال کی اجازت دیتی ہے کہ اس کے سال تالیف (۳۷۰ھ / ۹۸۰ء) تک اس

عنوان پر کوئی کتاب موجود نہ تھی البتہ ...... کتاب الحج یا کتاب العمرہ کے نام سے بہت سے مؤلفین نے کتابیں ضرور مرتب کی تھیں (۲۵)، مگر ان کی حیثیت، مکمل طور پر کتب فقہ یا کتب حدیث کی تھی، انہیں "سفر نامہ" کی خصوصی صنف سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا........

ہمارے خیال میں "سفر نامہ نگاری" کی ابتدا پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ہو سکی اور جیسا کہ سید سلیمان ندویؒ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے سفر حجاز کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ میں سفر نامہ نگاری کی ابتدا "سفر نامہ ہائے حرمین" سے ہی ہوئی۔ چنانچہ تمام نامور سفر نامہ نگار، مثلاً ابن حوقل، اصطخری، ناصر خسرو، ابن جبیر، اور ابن بطوطہ وغیرہ بنیادی طور پر حج ہی کے لیے گھر سے نکلے تھے، لیکن جب باہر کی دنیا دیکھی، تو پھر وہ اس میں ایسے محو ہوئے کہ کئی ملکوں میں گھومے پھرے اور سفر ناموں کی صورت میں علمی دنیا کو ایک بیش بہا تحفہ دے گئے۔

رہا یہ مسئلہ کہ نامور سیاحوں میں سے اس بارے میں تقدم کا شرف کسے حاصل ہوا؟ اس بارے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ تاہم ہمارے خیال میں اس کی ابتدا تیسری صدی / نویں صدی میں جغرافیہ نگاری کی ضرورت کے تحت ہوئی۔ چنانچہ ابتدائی سیاحت ناموں میں ہمیں "جغرافیہ نگاری" کا جو اسلوب نظر آتا ہے اور جو ایک زمانے تک "سفر نامہ نگاری" کا حصہ رہا وہ اسی ابتدائی "سفر ناموں" کی باقیات میں سے تھا۔

اس فہرست میں ابن خردازبہ (۲۱۱ھ / ۸۲۰ء۔ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء) صاحب کتاب المسالک، ابن الفقیہ صاحب کتاب البلدان (تصنیف ۲۹۰ھ / ۹۰۳ء)، ابن حوقل (م ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء) صاحب کتاب صورۃ الارض، الاصطخری (م ۳۴۷ھ / ۹۵۷ء) صاحب کتاب صورۃ الاقالیم وغیرہ کے نام شامل ہیں، جبکہ باقاعدہ سفر نامہ نگاری کا آغاز بیک وقت عربی اور فارسی زبانوں میں ہوا... فارسی میں نامور سیاح ناصر خسرو (۳۹۴ء۔ ۴۸۱ھ / ۱۰۰۳ھ ۱۰۸۸ء) (۲۶) نے اور عربی میں اسی کے ہم عصر ابو القاسم التجیبی احمد بن سلیمان بن خلف الباجی الاندلسی (م ۴۷۴ھ / ۱۰۸۱ء) نے رحلۃ ابی القاسم التجیبی، لکھ کر اس سلسلے کی ابتدا کی (۲۷) اس طرح عربی میں الباجی کو تقدم کا شرف حاصل ہے۔

الباجی کا پورا نام القاضی ابوالولید سلیمان بن خلف بن سعد بن ایوب بن وارث التجیبی المالکی الاندلسی تھا۔ وہ اندلس کے نامور علما اور حفاظ حدیث میں سے تھے۔ انہوں نے (۴۲۶ھ/ ۱۰۳۴ء) کے قریب مشرق وسطی کا سفر اختیار کیا، وہ نامور محدث ابوذر الہروی کے ہمراہ تین برس تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے اور انہوں نے چار مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی۔

بعد ازاں الباجی نے بغداد کا سفر کیا اور وہاں بھی تین سال تک اقامت اختیار کی، وہاں وہ فقہ کا درس دیتے اور حدیث کا درس لیتے رہے۔ انہوں نے وہاں اس دور کے چوٹی کے علما (مثلاً ابوالطیب الطبری اور شیخ ابواسحاق الشیرازی وغیرہ) سے ملاقات کی......... بعد ازاں وہ موصل گئے۔ وہاں انہوں نے ابو جعفر السمنانیؒ کے ہمراہ ایک سال تک قیام کیا اور السمنانیؒ کو فقہ پڑھائی اس طرح مشرقی ممالک میں ان کا مجموعی قیام قریباً تیرہ برس رہا...... انہوں نے المریہ میں انتقال کیا اور ساحل سمندر پر واقع الرباط میں مدفون ہوئے(۲۸)

الباجی کے بعد دوسری شخصیت، جنہوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی ابن جبیر (۵۴۰ھ / ۱۱۴۵ء۔ ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء) کی ہے۔

ابن جبیر کا پورا نام ابوالحسن محمد بن احمد جبیر الکنانی الاندلسی البلنسی ہے۔ ان کی ولادت بلنیہ نواح شاطبہ میں ہوئی، وہ نامور عالم دین تھے اور صناعت القریض اور کتابت میں مہارت رکھتے ہیں۔

ابن جبیر نے تین مرتبہ پاؤں رکاب میں رکھا، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلی مرتبہ انہوں نے ۵۷۸ھ میں سفر کیا وہ تیس دنوں کے بعد الاسکندریہ (مصر) پہنچے، وہاں سے شام، عراق اور الجزیرہ گئے، اور پھر ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں واپس اندلس لوٹ آئے۔

سفر نامے کے اس حصے میں ابن جبیر نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے کے مصر کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے مسجد اقصیٰ اور الجامع الاموی کی بعض تفصیلات بھی دی ہیں۔ موخر الذکر مقام میں جو ایک عجیب و غریب گھڑی نصب تھی، اس کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔

ابن جبیر کا دوسرا سفر ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء میں، یعنی فتح بیت المقدس کے بعد ہوا، اور ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں مکمل ہوا۔

تیسری مرتبہ انہوں نے مکہ مکرمہ اور بیت المقدس کا سفر اختیار کیا اور ان مقامات مقدس کی تفصیلات بیان کیں(۲۹)۔ ان کا یہ "سفر نامہ" کئی بار چھپ چکا ہے، پہلی بار اسے مستشرق ولیم ریسط نے ۱۸۵۲ء میں طبع کیا تھا........(۳۰) اس وقت اس کا اردو میں ترجمہ بھی دستیاب ہے۔

اس کے بعد ابو العباس احمد بن محمد بن مفرح، المعروف بابن الرومیہ (م ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء) کی کتاب الرحلۃ کا نام آتا ہے۔ جس کی تفصیلات اور نسخہ کی بابت ضروری معلومات دستیاب نہیں(۳۱)۔

اب تک جن کتابوں کا تذکرہ آیا وہ عمومی نوعیت کی تھیں۔ خاص حرمین کے حوالے سے پہلا سفر نامہ نامور عالم دین محمد بن عمر بن رشید الفہری، مجدالدین السبتی (م ۷۳۱ھ / ۱۳۳۰ء) نے چھ جلدوں میں الرحلۃ الی مکہ وطیبہ کے عنوان سے مدون کیا.... اس کی باقی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں(۳۲)۔

اسی صدی ہجری میں نامور ادیب اور کاتب صلاح الدین، الصفدی ابو الصفا خلیل بن ایبک بن عبداللہ الصفدی الشافعی (۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء۔ ۷۶۴ھ / ۱۳۶۲ء) (۳۳) نے الرحلۃ القدسیہ کے نام سے اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ جس میں مؤلف نے یقیناً اپنا مقامات مقدسہ کا سفر نامہ بھی بیان کیا ہوگا، لیکن یہ کتاب بھی دستبرد زمانہ کا شکار ہو کر ناپید ہو گئی ہے۔

الصفدی وہ ادیب اور مصنف ہے، جس نے چھ سو سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور جن کی کتاب فوات الوفیات مشرق و مغرب میں بے مثال اور بے نظیر سمجھی گئی ہے(۳۴)۔

اسی دور میں نامور سیاح ابن بطوطہ (۷۰۳ھ / ۱۳۰۲ء۔ ۷۷۷ھ / ۱۳۷۵ء) نے اپنا مشہور زمانہ سفر نامہ تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار کے نام سے مدون کیا، وہ ۲۔ رجب ۷۲۵ھ / ۱۴ جون ۱۳۲۵ء کو ۲۲ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوا، حج کے بعد وہ عراق چلا گیا۔ جہاں سے وہ ایران، موصل اور دیار مکہ گیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ مکہ مکرمہ آ گیا۔

جہاں اس نے ۷۲۹ھ ۷۳۰ھ کے سال بسر کیے' اس کے بعد اس نے دنیا کے کئی ملکوں کی سیاحت کی' جس کے دوران میں اس نے ۷۵۰۰۰ میل کا سفر طے کیا۔ اس کے سفر نامہ میں ان تمام باتوں کی تفصیل ملتی ہے(۳۵)

نامور فقیہ' مورخ اور ماہر عمرانیات ابن خلدون (ابو زید ولی الدین عبدالرحمان بن محمد الاشبیلی المالکی (م ۸۰۸ھ / ۱۴۰۴ء) نے بھی رحلۃ ابن خلدون کے عنوان سے ایک سفر نامہ مرتب کیا تھا(۳۶)۔ لیکن ایک تو اس سفر نامہ میں حرمین کا تذکرہ نہیں ہے.... ثانیاً یہ سفر نامہ بھی دست برد زمانہ کا شکار ہو کر ناپید ہو چکا ہے.

ہمارے خیال میں صراحت کے ساتھ دوسرا "سفر نامہ حرم" لکھنے کا شرف نامور محدث اور مفسر قرآن علامہ جلال الدین السیوطیؒ (م ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) کو حاصل ہوا۔ اس سفر نامے کا عنوان ہے: 'الرحلۃ الفیومیہ والمکیہ والدمیاطیہ "(۳۷) ہے مگر یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے.

السیوطیؒ نے اپنے اس سفر میں جو شام' حجاز' یمن' ہند اور مغرب وغیرہ کی سیاحت کی تھی' اس سفر نامہ میں اس کا تذکرہ کیا ہوگا' لیکن اس سفر نامے کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ' انہوں نے اس کے عنوان میں "المکیہ" کا اضافہ کر کے' حرمین کے سفر ناموں کی تحریر و تصنیف کی تحریک کو آگے بڑھایا.

السیوطیؒ کے بعد یہ عنوان کافی مقبول ہو گیا اور کئی لوگوں نے ابن رشید اور السیوطیؒ کے نقش قدم کا تتبع کیا۔ چنانچہ السید علی بن یحیی الکیلانی الحموی (م ۱۱۱۳ھ / ۱۷۰۱ء) نے الرحلۃ المکیہ کے نام سے(۳۸) اور احمد بن عبدالعزیز الہلالی' السجلماسی المقری المالکی (م ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۳ء) نے بھی اسی نام سے اپنا سفر نامہ حرمین مرتب کیا(۴۱) یہ دونوں کتابیں غالباً ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اس لئے ان کے انداز و اسلوب بیان کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں.

اسی صدی ہجری کے ایک اور زائر ابو العباس احمد بن محمد بن ناصر الدرعی المعروف بہ الزیجیؒ (۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء) نے رحلۃ الی الحجاز کے نام سے اپنا سفر نامہ حرمین مرتب کیا یہ::

اجزا پر مشتمل ہے اور فاس (مراکش) سے ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں طبع ہو چکا ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف کے والد کے لکھے ہوئے مناسک حج بطور تتمہ شامل ہیں(۳۹). اس کے علاوہ اس فہرست میں مغرب. (افریقہ واندلس) کے کئی اور ''سفرنامے''شامل ہیں.

یہ انتہائی نامناسب ہو گا اگر قدیم زمانے میں مصر و شام کے بیسوں حکمرانوں اور شاہی کاروانوں کے حالات وو قائع کو ریکارڈ کرنے والے عظیم مؤلف تقی الدین المقریزی (م ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱ء) اور ان کی کتاب المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ جس میں قدیم دور کی بیسوں سیاحتوں اور حرمین کی طرف جانے والے کاروانوں کی تفصیلات محفوظ کر دی گئی ہیں۔ سفرناموں خصوصاً سفرنامہ ہائے حرمین کے سلسلے میں یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے.

رحلات الی الحرمین کا دور جدید

یورپ میں علمی بیداری کے بعد اُس کے اثرات جب عالم اسلام پر پڑنے تو اس کے تحت اسلامی دنیا میں جدید انداز اور عمدہ اسلوب میں سفرنامہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ عالم اسلام میں اُس بارے میں ترکی، مصری اور ہندوستانی علما کو تقدم اور اولیت کا شرف حاصل ہے........ اور آئندہ مقالات میں اُن میں سے بعض سفرناموں کا تذکرہ آرہا ہے اُس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں.

حوالہ جات و حواشی

(۱) توریت۔ پیدائش (۱/۶ تا ۲۲)

(۲) ایضاً۔ پیدائش (۲۴/۱۳)

(۳) ایضاً

(۴) القرآن الکریم، البقرہ (۲/ ۵۸، ۶۰، ۶۱) المائدہ (۲۰/۶_۲۶)

(۵) ابن ہشام: السیرۃ النبویہ، ص ۱۷ تا ۴۷ :الطبری، تاریخ ۱/ ۲۱۹، ۲۸۳، ۷۴۹، ۷۶۱ وغیرہ

(۶) دیوان حسان بن ثابت، مطبوعہ لاہور وغیرہ

(۷) العنکبوت (۲۰/۲۹)

(۸) آل عمران (۱۵۶/۳)

(۹) النسآء (۵/۴)

(۱۰) الجمعہ (۱۰/۶۲)

(۱۱) المزمل (۲/۷۳)

(۱۲) ابن ماجہ، مقدمہ (۸۷/۱) حدیث ۲۲۶

(۱۳) الکہف ۱۸/ (۶۰ تا ۸۲)

(۱۴) العنکبوت (۱۵۶/۲۹)

(۱۵) آل عمران، (۹۷/۳)

(۱۶) الحج (۲۷/۲۲)

(۱۷) ابن حجر العسقلانی: الاصابہ ۴/ ۶۲-۶۳، عدد ۳۰۴، بحوالہ البخاری

(۱۸) الاصابہ ۴/ ۶۳

(۱۹) اس سفر نامے کی تفصیلات البخاری اور مسلم، کے علاوہ کتب سیرت، خصوصاً ابن ہشام، السہیلی اور الزرقانی وغیرہ کی کتب میں ملتی ہیں۔

(۲۰) الزرقانی: شرح المواھب ۲/ ۱۷۹

(۲۱) البخاری، ۷/ ۲۵۳ (کتاب المغازی) باب ۳۵، غزوۃ الحدیبیہ، حدیث ۴۱۷۸۔۴۱۸۱

(۲۲) البخاری، ۷/ ۴۹۹۔ حدیث ۴۳۵۱۔

(۲۳) البخاری ۸/ ۱۰۸۔۱۰۹ احادیث ۴۴۰۶۔۴۴۰۷۔ مسلم، ۲/ ۸۸۷ تا ۸۹۲، حدیث ۱۴۱)۱۲۱۸۔ اس کے علاوہ حافظ ابن حزمؒ (م ۴۵۶/ ۱۰۶۳ء) نے کتاب حجۃ الوداع کے نام سے مستقل کتاب مرتب کی ہے، جبکہ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس سفر حج کی جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ کسی سفرنامے سے کسی اعتبار سے بھی کم نہیں ہیں۔

(۲۴) البخاری، کتاب الحج۔

(۲۵) یاقوت الحموی: معجم الادباء ۶: ۴۰۹

(۲۶) مثلاً دیکھیے کتاب الحج، لمحمد بن حسن الشیبانی (حاجی خلیفہ: کشف الظنون، ۲/ ۱۴۱۱ مطبوعہ استنبول)

(۲۷) ناصر خسرو ایک فارسی زبان کا شاعر اور ادیب تھا۔ وہ اسماعیلی مذہب رکھتا تھا۔ اس نے مکہ مکرمہ کا سفر حج کیا اور پھر شام، فلسطین، مصر اور جزیرۃ العرب کی سیاحت کی، جس کی روداد اس نے "سفر نامہ" میں مرتب کی ہے۔ اس کی وفات (۴۸۱ھ/ ۱۰۸۸ء) میں ہوئی۔۔۔ (المنجد فی الاعلام)

(۲۸) محمد اسماعیل پاشا البغدادی: ایضاح المکنون، ۱/ ۵۵۰۔ مطبوعہ استانبول ۱۹۴۵ء

(۲۹) ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۱/ ۳۶۹: الصفدی ۱/ ۱۷۵۔ الصفدی اور حاجی خلیفہ نے سال وفات ۴۹۳ھ/ ۱۰۹۹ء تحریر کیا ہے جو کہ تسامح ہے۔ ابن خلکان نے ۴۷۳ھ تحریر کیا ہے جو درست ہے۔

(۳۰) دیکھیے مقدمہ رحلۃ ابن جبیر الاندلسی۔ نیز ابن خلکان اشاریہ۔

(۳۱) سرکیس: معجم المطبوعات العربیہ، اشاریہ

(۳۲) حاجی خلیفہ: کشف الظنون ۲/ ۱۴۱۹۔

(۳۳) کشف الظنون، ۱/ ۸۳۶

(۳۴) کشف الظنون، ۱/ ۸۳۶

(۳۵) السبکی: طبقات الشافعیہ ۶/ ۹۴ کوپرولی زادہ: مفتاح السعادۃ، ۱/ ۲۱۰

(۳۶) الیان سرکیس: معجم المطبوعات، ۱/ ۵۵۱

(۳۷) کشف الظنون، ۱/ ۸۳۵

(۳۸) ایضاً، ۱/ ۸۳۶

(۳۹) اسماعیل پاشا البغدادی، ۱/ ۵۵۱

(۴۰) سرکیش: معجم المطبوعات العربیہ ۱/ ۹۸۹

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جذب القلوب اور سفر نامۂ حجاز: ایک تقابل

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد

'حرمین شریفین' کی حاضری یا حاضری کی تمنا ہر صاحب ایمان کی قلبی آواز ہے وہ معاشرتی یا معاشی حیثیت سے اس قابل ہو تو رخت سفر باندھنے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اگر بے زری اور بے توفیقی سد راہ بنے تو تصور کی پرواز کا سہارا لیتا ہے۔ مکہ مکرمہ اس کے سجدوں کا حوالہ ہے۔ اس مقام مبارک کو وہ دور رہ کر بھی قریب پاتا ہے کہ مشرق میں مقیم ہو یا مغرب میں' اس کا رخ اسی جانب ہے' قبلہ اس کی جبین نیاز سے یوں پیوست ہے کہ جیسے مقناطیس سے لوہا' کہیں ڈالو' جدھر پھینکو یوں قبلہ رو ہو جاتا ہے کہ کسی غیر کی احتیاج ہی نہیں رہتی وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ الیه سَبِيلًا (آل عمران : ۹۷) کے فرمان نے بیت الحرام کو استطاعت و توانائی کا قبلۂ مقصود بنا دیا اور اللہ کی قید نے کعبہ کو مرکز حق نما بنا دیا' اور پھر أَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحج (الحج : ۲۷) کے اعلان نے اس بلد امین کو ایمان کا فریضہ قرار دیا تو ہر فج عمیق سے قافلے جس حال میں بھی تھے راہی حرم ہونے لگے' یوں کلمہ توحید کا اشتراک' مرکز توحید کا سفر اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کی یکتائی وحدت انسانیت کی پیغام بر بنی۔ امام الناس اور مسلم لول کی ذلت نے اتحاد عالم کی کفالت کی' مرکزیت کا یہ نشان دنیا والوں کو دعوت فکر و عمل دینے لگا' مختلف رنگ و روپ کے انسان مختلف وطن اور متفاوت نسلیں' عادات و اطوار کا افتراق' سماجی اقدار اور معاشی حیثیت کا فرق' مگر کیا ہوا کہ "تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے" مختلف لباسوں میں تھے حرم کی طرف بڑھنے ہی لگے تھے کہ لباس ایک ہوا' بولیاں جدا جدا تھیں مگر قریب بھی نہ آئے تھے کہ ہم آواز و ہم زبان ہو گئے۔ پکار ایک' رخ ایک طرف' سوچ ایک' آرزوں و تمناؤں کا جھکاؤ

یک رنگ و یکساں، تمیز بندہ و آقا نہ رہی، فرق وطن و قوم نہ رہا، صرف ایک حوالہ کافی ہوا، اعمال میں یک رنگی آئی تو خیالات میں یکسوئی۔ انسانیت کا یہ بہتا ہوا دریا حدود آشنا بھی ہوا اور یک سمت بھی، وحدت عمل میں ڈھلی اور ایک امت ہونے کے تصور کی ترویج ہوئی۔

مدینہ منورہ دوسرا حرم ہے جو نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی محبتوں کا امین، نورانیت کا مرکز اور تجلیات کے ظہور کا منبع ہے، اس سرزمین پر رفعت افلاک کے مکین حاضری دیتے رہے ہیں اور تاقیامت دیتے رہیں گے، یہ شہر کرم بھی ہے اور گوشۂ مغفرت بھی، درماندہ اور نکبت زدہ گنہگاروں کے لیے یہی باب رحمت ہے کہ بقول حضرت علامہ ابن حجر العسقلانی

وانْ قَنطتْ مِنَ العصیانِ نَفسٌ   فَبابُ محمد بابُ الرَّجاءِ

مدینہ منورہ کی حاضری، ایمان کا تقاضا بھی ہے اور قلب سلیم کی پکار بھی اسی لیے تو قافلے چلے آرہے ہیں، مشتاقان دید کے جذبے مہک رہے ہیں، عقیدت کا اک جہان مدینہ منورہ کے راستوں، شاہراؤں اور گلی کوچوں میں آباد ہے، حاضر ہونے والوں کا اضطراب احترام آشنا ہے، تو وہ جو ابھی راہوں میں نہیں ان کی وارفتگی پابند آداب ہے، وہ اس تمنا کے مصداق نہیں جو کرامت علی شہیدی کے جذبوں کی امین ہے کہ:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کی جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ وجود کا جمال جب پھیلتا ہے تو جہان جذب کو جنم دیتا ہے، محبت و عقیدت ایک وجود سے ہوتی ہے، مگر جب یہ محبت سدا بہار ہو جائے تو وہ ہر لمحہ اثر آفریں ہونے لگتی ہے اور نسل، جغرافیہ اور تاریخ سب کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے اور آثار واماکن میں بھی گردش کرنے لگتے ہے، جبکہ روح کی سرمستی بدن کو لہلہادیتی ہے اور تصور کا جمال حرفی پیکروں میں اترنے لگتا ہے حرمین شریفین دو شہر نہیں، ایک ایمان کے دو مظہر اور ایک ذات ﷺ کے دو حوالے ہیں، کبھی مکہ مکرمہ میں آوازہ حق سنتا ہے تو کبھی مدینہ منورہ پیغام بر حق کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں ہوں تو مدینہ منورہ میں برپا ہونے والے

انقلاب کو پھر سے نافذ ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ مدینہ منورہ میں ہوں تو مکہ مکرمہ کی مرکزیت کی طرف صف آراء رہتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دونوں حرم مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز رہے۔ انسان کھنچے ہوئے آئے۔ دیدہ و دل کو منور کیا اور اس نورانیت کو سیرت و کردار میں سمو کر واپس لوٹے۔ ایسے بھی حاضر ہوئے جو صرف جذبوں کی زبان جانتے تھے مگر کچھ ایسے بھی آئے جو جذبوں کو حرفوں میں منتقل کرنے کی صلاحیت سے نوازے گئے تھے واپس لوٹے تو فراق کی چبھن تڑپانے لگی حرمین شریفین میں گزارے ہوئے مہ و سال کو زبان دینے لگے۔ مہینوں میں فراق کی حرارت نے ہنگامہ بپا کیا تو حرفوں کا سہارا لیا۔ یوں داستان محبت کے کئی باب رقم ہو گئے۔ سفر نامے اسی اندرونی منظر نامے کی دلاویز حکایات ہیں ہر زبان میں لکھے گئے اور ہر کہیں تذکار دلنشیں کے حوالے بنے۔

سفر نامہ ایک روایت اور ایک ادبی صنف بھی ہے۔ ہزاروں لکھے گئے مشاہدات کو زیب قرطاس کرنا قدیم روش ہے۔ سفر ایک تجربہ ہے ایک قریبی مشاہدہ ہے سیاح کا قلم اپنے تجربے اور مشاہدہ کو قاری کے لیے قلم کے حوالے کرتا ہے تاکہ وہ بھی شریک سفر ہو جائے' سفر ہر ایک کے بس میں تو نہیں' اس لیے تجربوں کو یکجا کرنا محروم سفر قارئین کے لیے طمانیت کا پیغام ہے اور جب سفر عقیدت ہو تو سفر نامہ صرف معلومات کا مجموعہ ہی نہیں رہتا ایمان و یقین کی دنیا کو مہکانے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ حرمین کے سفر نامے اس لحاظ سے بہت محترم ہیں کہ ان سے محروم جذبوں کو انشراح کی دولت نصیب ہوتی ہے یہ رموز محبت ہوتے ہیں' اس لیے قاری کے دل پر دستک دیتے ہیں۔ مسافر اگر صاحب نظر ہے اور محبت آشنا بھی تو سفر نامے کے الفاظ شاہراہ حیات کے سنگ میل بن جاتے ہیں اور اگر راہی ملک حجاز اس وادی کی نزاکتوں سے آگاہ ہے تو جذبے توازن کا دامن نہیں چھوڑتے۔

سفر ناموں کا احصاء اور ان کے مندرجات سے موضوع کی مناسبت سے تجزیاتی استخراج ایک طویل عمل ہے صرف ایک سفر نامے کا مختصر حوالہ اور پھر تحدیات عصر کا تناظر پیش کرتا ہوں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ ایک ایسے مسافر حرمین تھے جن کے دامن میں علم کی دولت بھی تھی اور عرفان کی ثروت بھی۔ آپ کا دور اکبری الحاد سے مسموم

ہو چکا تھا۔ شعائر اسلام کی توہین کی جانے لگی تھی۔ اس کی ایک مثال اکبر کا اپنے دودھ شریک بھائی مرزا عزیز خاں کوکلتاش سے رویہ تھا کہ اس کی داڑھی کا مذاق اڑایا گیا۔ دہلی سے باہر بھیج دیا گیا وہ پریشان ہوا تو کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس پر اکبر نے لکھا اپنے کعبہ دل (مراد بادشاہ اکبر) کی اجازت کے بغیر سنگ و گل کے کعبہ کی زیارت کے لیے جانا عقل کے خلاف بھی ہے اور اسلام کے خلاف بھی (منتخب اللباب' حصہ اول' ص ۲۲۳)۔ اس بگاڑ میں فیضی وابوالفضل کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ اس ملحدانہ روش کو رد کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ نے اثبات النبوۃ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمتہ نے مدارج النبوۃ لکھیں' حضرت شیخ پر آپ کے والد گرامی کی اس نصیحت کا بہت اثر تھا جو انہوں نے آپ کے تدریسی انہماک پر ارشاد فرمائی کہ "ملائے خشک و ناہموار نباشی"۔ آپ نے علم کے حصول سے فراغت پائی تو علم کو عرفان کی آنچ مہیا کی جس سے معارف اترنے لگے حرمین کو کعبہ سنگ و گل قرار دینے کی جسارت ان کے اندر ہنگامہ بپا کر گئی ۔اکبر کو نائب حق بننے کا شوق فضول گمراہ کر گیا۔ نباض امت کا فرض بنتا تھا کہ اس گمراہی کے آگے بند باندھا جائے۔ علم سے فراغت کے بعد راہ حق کا یہ مسافر مرکز یقین و ایمان کا راہی ہوا۔ ۹۹۵ میں زیارت حرمین کے لیے روانہ ہوئے۔ سال بھر راستہ میں انتظار کی جلن کا شکار رہے' مگر روانہ کیسے ہوئے' سوانح نگار لکھتے ہیں:

دہلی سے ایک جذبہ کی حالت میں بلا سامان سفر گجرات آگئے تھے۔ رمضان المبارک ۹۹۶ء سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے آٹھ ماہ قیام رہا حج کی سعادت پائی۔ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو مدینہ منورہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ مدینہ منورہ کا قیام مسجد نبوی اور روضہ اقدس کی حاضری کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے آثار کے مشاہدہ میں گزرا ایک ایک ذرہ ان کی محبت کا مرکز تھا آثار سے روایات کا تعلق ڈھونڈتے رہے۔ رجب ۹۹۸ھ تک دربار رسالت میں حاضر رہے دوبارہ مکہ مکرمہ آئے۔ شوال ۹۹۹ھ میں عازم برصغیر ہوئے فرماتے ہیں کہ "یہ عرصہ یوں گزرا ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک روز بھی قیام نہیں رہا"

جذب القلوب الی دار المحبوب (ﷺ) ان کے سفر مدینہ کی دل آویز دستاویز ہے

جس میں روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا نہ سفر کی منازل کا ذکر نہ رہائش' خوراک اور سفر کی صعوبتوں کا بیان' یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنے وجود کا زیادہ حوالہ پسند نہیں۔ اسی لیے انہوں نے حکایت دل پذیر کو ذاتی حوالوں سے بوجھل نہیں بنایا' بلکہ اس سفر کے ان اثرات کو سمیٹا ہے جو قاری کو اس سفر رحمت کے آداب اور دیار مبارکہ کے فضائل سے آشنا کرے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جذب القلوب سفر نامہ سے کہیں زیادہ تاریخ مدینہ ہے۔ اس کی تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں "اس مسودہ کی ابتداء ۹۹۸ھ مدینہ منورہ ہی میں کی گئی مگر اس کی تبییض ایک ہزار ایک میں دہلی میں مکمل ہوئی"

جذب القلوب مدینہ منورہ کی ایک ایسی تاریخ ہے جس کے تمام مندرجات حضرت شیخ کی مہم جو طبیعت کی دریافت ہیں۔ مستند واقعات' معتبر روایات اور چشم دید حکایات کتاب کے معیار کی خبر دیتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جس بصارت اور مشاہدۂ بصیرت میں ناقابل انقطاع ملاپ ہے' متلاشی علم کی تمام دریافت سیاح محبت کی ارادت میں اس طرح پیوست ہو گئی ہے کہ جہان رنگ و بو میں عقیدت کا چمنستان مہک اٹھا ہے۔ سرزمین حجاز کا ذرہ ذرہ صیاد نظر ہے تو والئی حجاز کی حیات جاوداں کا لحہ لحہ جاذب قلب و احساس ہے ۔ یہ در حقیقت روداد سفر ہی نہیں' حکایت فکر و نظر بھی ہے یہ آمد و رفت کا قصہ نہیں' سفر نصیب کا بیان ہے ہر لفظ محبت آشنا اور ہر روایت عقیدت آشکار ہے' پڑھتے جائے اور درو دیوار حرم کی بلائیں لیتے جائیے' لفظوں میں ایمان کی بہار ہے تو معانی میں ایقان کی مہکار۔

جذب القلوب کو حضرت شیخ علیہ الرحمۃ نے سترہ ابواب میں تقسیم کیا ہے' اسماء مدینہ' فضائل مدینہ' تاریخ مدینہ' مدینہ منورہ کی مساجد' کنویں' مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیانی راستہ کے کوائف و مشاہدات جنت البقیع کے مقابر کی تفصیل اور حالات کوہ احد کا مستقل تذکرہ' سید عالم ﷺ کی زیارت' گنبد اخضر کی عظمت' مدینہ منورہ میں اقامت کے آداب' ائمہ کے مسالک کا بیان اور راجح مسلک کی تائید پر دلائل واپسی کے آداب اور آخر پر درود کے فضائل' طریقہ اور صیغہ درود' یوں یہ روداد محبت اسماء مدینہ سے شروع ہو کر صلاۃ و سلام پر ختم ہوئی۔ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ تاریخی روایت' جغرافیائی معلومات اور فضائل کی

حکایت کے بیان میں اس قدر معلومات فراہم کر دیتے ہیں کہ قاری اس سفر نامہ سے تحقیق کتاب کی برکات سمیٹتا ہے' جذب القلوب کا ہر حرف قاری کو جذب دروں کی حسنات عطا کرتا ہے' یہ جاذبیت ارض مدینہ سے حکایت مدینہ تک پھیل گئی ہے' کتاب کا ہر لفظ پر تاثیر اور حرف حرف جاذب فکر و نظر ہے۔ قاری آہستہ آہستہ در محبوب کے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور بے خودی کے عالم میں درود و سلام کے نذرانے پیش کرنے لگتا ہے در حقیقت جذب القلوب کا نام متن کا خلاصہ ہے اور بلا شبہ اسم با مسمی ہے۔ غور کیجیے تو جذب القلوب ایک سفر ہی نہیں عصر موجود کے اضطراب کا مداوا ذات رسالت مآب ﷺ پر ایمان کا مضبوط استدلال اور عصری الحاد سے پراگندہ ذہنوں کے لیے اطمینان و یقین کا صحیفہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکبر کے جلال و جبروت کا نشہ مردان خوش گفتار اور صاحبان فکر و کردار نے یوں اتارا کہ وہ اپنے تمام تر طمطراق کے باوجود تاریخ کے سینے میں ناخوشگوار لمحہ گریزپا کی طرح دفن ہو گیا' آج بھی ملت اسلامیہ کو ایسے ہی خطرات درپیش ہیں' عصر حاضر کا انسان معاشی جبر' معاشرتی ناہمواری اور تعلقات باہمی کی بے ثباتی کا نخچیر ہے۔ قبلہ رو ہونا اور حرمین شریفین کو مرکز نگاہ بنانا دشوار کیوں ہوتا جا رہا ہے کیا آج کا فنکار سفر حرمین کو یہ جہت عطا کرے گا؟

اردو زبان میں لکھے جانے والے سفر ناموں کی تاریخ طویل ہے مولانا رفیع الدین مراد آبادی (م ۱۲۲۳ھ) کا سفر نامۂ حجاز اس دعوی کے ساتھ ماہنامہ الفرقان لکھنو شوال ۱۳۸۰ھ کی خاص اشاعت میں چھپا کہ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا سفر نامہ حجاز ہے۔ مولانا مراد آبادی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمتہ کے شاگرد تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمتہ سے استفسارات کی مضبوط نسبت رکھتے ہیں۔ ۱۲۰۱ھ میں سفر کا آغاز کیا اور ۱۲۰۳ھ میں واپس لوٹے اس طرح دو سال دو ماہ اور دو ہفتے حرمین یا حرمین کے سفر میں گزرے۔ مولانا متعدد کتابوں کے مصنف ہیں سفر نامہ فارسی میں لکھا جس کا مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ترجمہ کیا۔ مولانا مراد آبادی کو تصوف سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ آپ حضرت شاہ غلام غوث قادری لاہوری علیہ الرحمتہ سے نسبت ارادت رکھتے تھے اور مولانا خیرالدین

محدث سورتی سے سند حدیث حاصل کرنے کا اعزاز بھی پا چکے تھے۔ سفر نامہ میں ہندوستان کے ان تمام مقامات کا تذکرہ کیا جہاں سے وہ گزرے۔ بحری جہاز کی مشکلات کا بیان بھی ہوا اور راستے میں پیش آنے والے واقعات کو درج کیا۔ مشاہدہ قوی ہے اس لیے تاریخی بصیرت' جغرافیائی معلومات حتی کہ سماجی مظاہر کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اتحاد ملت کا داعیہ قوی ہے' اس لیے حنفی ہونے کے باوجود اتحاد کی صورت گری کے لیے مفید مشورے دیتے ہیں۔ سفر نامہ کی فضا پر عقیدت و محبت کا رنگ نمایاں ہے' اگرچہ مسالک کے اختلافی مسائل اور ان کی وقوع پذیری کا حوالہ بھی دیتے ہیں' مزارات پر حاضری کی خواہش ہر لحہ دامن گیر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان قوم کے زوال امت کی سیاسی ابتری' حکمرانوں کی بے تدبیری اور غلامی کی آمد آمد نے ان کو دروں بینی پر مائل کر دیا ہے۔ مسافران راہ حق جب راستہ بھولنے لگے تھے تو تصوف کی پناہ کے سوا کوئی چارہ بھی نہ رہا تھا۔ عصری خلفشار کا چیلنج ان کو اس پناہ گاہ کے اشارے دے رہا تھا' اس لیے انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قوم کو عافیت گاہوں سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا زوال امت کی صدی گواہ ہے کہ جب سیاسی ابتری پھیلی تو معاشی گھن بھی آئی اور تدریسی آماجگاہیں بھی شکست و ریخت کا شکار ہوئیں' علما کے گرد حصار تنگ ہوا تو صیانت عقیدہ اور تقویم دین کا فریضہ صوفیا ہی نے انجام دیا۔ مولانا مراد آبادی کا سفر نامہ بعض نادر معلومات کو بھی دامن میں لیے ہوئے ہے' مثلاً امام مالک علیہ الرحمۃ کے ذکر میں ارسال یدین کی نفی' اہل مکہ کے بعض مراسم وغیرہ کا تذکرہ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی" کی کتاب جذب القلوب اور مولانا رفیع الدین مراد آبادی کا سفر نامہ حجاز کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ دونوں بزرگ حالات زمانہ کا رخ پہچان رہے تھے قوم کو درپیش مسائل کا ادراک اور ان کا حل ان کے مقاصد کا حصہ تھا' انہوں نے اغتنابات کا مرعوب کن انداز تو نہ اپنایا' مگر راہ نمائی کا فریضہ ضرور نبھایا۔ غیر محسوس طریقے سے مرکز کی طرف دعوت اس ماہرانہ طریقے سے دی کہ قاری صاحب۔ تحریر کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے' وہ صرف حرف و حکایت کے طلسم کا شکار نہیں ہوتا' بلکہ مراد و مقصد کی طرف لپکتا ہے۔ بظاہر ایک سفر نامہ' مگر درحقیقت ایک پیغام استقامت و نجات۔

بعد کے ادوار میں سفر ناموں کا عام رواج ہوا کہ بسا اوقات تو صرف تقلیدی روش انگشت کرتی رہی۔ حرمین شریفین کی زیارت کا لازمی جزو ٹھہرا کہ تالیف و تصنیف کی کوئی صورت اپنائی جائے۔ اخباری کالموں کی طرح اور دیگر ممالک کے سفر ناموں کی روش پر بھی لکھا گیا۔ ذاتی حوالہ زیادہ نمایاں ہوا اور کبھی سفر کی مشکلات کے تذکروں کو ضرورت سے زیادہ پھیلایا گیا' حکایاتی انداز اور تصوراتی رپورتاژ کے جوہر بھی دکھائے گئے۔ اس طرح سفر نامہ ذاتی ڈائری کے روپ میں' تو کبھی کالم کی ضرورت کے لیے لکھا گیا' عصر موجود اسلام کی مرکزیت کے خلاف نت نئے حربے استعمال کر رہا ہے' مسلمانوں کو باور کرایا جا رہا ہے کہ ان کے نماز و روزہ کے لیے فضا میں کوئی گھٹن نہیں'۔ ہاں ان کو اپنی اپنی مملکت کا شہری بن کر مقامی داعیات کا ساتھ دینا ہوگا۔ عیسائیت کی طرح اپنا اپنا چرچ معتبر رہے گا' اس لیے پاکستان کے شہری کے لیے اپنی حدود و سرحد کا ہی دفاع مناسب ہوگا۔ بھارت میں کیا ہو رہا ہے یا بوسنیا میں کیا قیامت قائم ہے' یہ ان ملکوں کے شہریوں کا مسئلہ ہے' یہ اس لیے کہ دنیا میں موجود کسی مذہب کے پاس مرکزی نشان نہیں' قبلہ رو ہونے کی آفاقیت صرف مسلمان کو حاصل ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اور سیاسی و انتظامی مجبوریوں کے باوجود بھی جسد واحد ہے' یہ وحدت حرمین شریفین کے حوالہ سے حسی قوت بنتی ہے' اس لیے اس کا اہتمام ہونا چاہئے۔ سفر ناموں کو اس وحدت کا تحفظ کرنا ہے اور ملی فکر کو یک رنگی عطا کرنا ہے' عصرِ حاضر میں سیاسی وحدتوں کی کثرت نے حرمین کا راستہ ناروا پابندیوں سے ناہموار کر رکھا ہے' کبھی معاشی جبر راہ کاٹتا ہے تو کبھی سیاسی بے کلی راستہ روکتی ہے' حکمران کی پسند و ناپسند پر حج موقوف ہو جاتا ہے اور شہری باہمی اختلافات کے نتیجہ میں دیارِ اقدس میں جانے سے رکے رہتے ہیں' کبھی روسی استعمار سدِ راہ ہے تو کبھی اپنوں کی کشمکش اللہ تعالیٰ کے واضح فرمان کے باوجود سفر نصیب کی اجازت نہیں دیتی'۔ زرِ مبادلہ کے مسائل' کوٹہ سسٹم کی گرفت' قرعہ اندازیوں کی پابندیاں' ان کا حل آج کے سفر ناموں کا موضوع ہونا چاہیے' حرمین شریفین تک رسائی ہر صاحب استطاعت کا حق ہے' اس رسائی کو آسان بنانا ہی اطاعت شعاری ہے۔ مسجد حرام ہر مسلمان کی توجہ کا مرکز اور سجدوں کا قبلہ ہے۔ سجدہ گزاروں اور مسجد کے

درمیان رکاوٹیں بہر حال دور ہونا چاہئیں تاکہ معلوم دنیا کا ہر فرد اس طرف پیش قدمی کر سکے۔

یہ وہ مسائل ہیں جن کا ادراک ہر صاحب ایمان کو ہونا ضروری ہے اور سفر ناموں کو ان حوالوں سے عصر حاضر کا چیلنج قبول کرنا چاہئے۔ یقین کر لیجئے اسلامی مملکتوں میں جب تک حرمین شریفین کی مرکزیت کا شعور اجاگر نہ ہوگا۔ وحدت امت کا کوئی خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ مسرت و امتنان کا مقام ہے کہ سفر ناموں کی اہمیت تسلیم کی گئی اور ان کو جدید تحدیات کے تناظر میں عصری رہنمائی کی راہ دکھائی گئی تاکہ ادب اسلامی کا یہ شعبہ ذاتی کوائف کے حصار سے نکل کر تعمیر ملت کے لیے فعال کردار انجام دے سکے۔ یہ اعتراف بہر حال ہے کہ عصر حاضر کے بعض سفر نامے اس ضرورت کا احساس لیے ہوئے نہیں اور ملت اسلامیہ کو نئی راہیں دکھا رہے ہیں بلکہ اس دوروزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد اس لیے ضروری تھا کہ انفرادی کوششوں کو اجتماعی قوت حاصل ہو۔ امید ہے آنے والے مہ و سال اس سیمینار کے اثرات محسوس کریں گے۔ اللہ تعالیٰ یہ توفیق ارزانی فرمائے کہ ایسے با مقصد اجتماعات ہوتے رہیں آمین۔

شاہ ولی اللہ کے سفر نامۂ حج "فیوض الحرمین" پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد امین

سینئر مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

فیوض الحرمین شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا سفر نامہ حرمین ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور اس کے کئی اردو تراجم دستیاب ہیں۔ تصوف کے دیگر لٹریچر کی طرح اس سفر نامے کی عبارت بھی غامض بلکہ مبہم ہے اور اصطلاحات تصوف کی کثرت نے اسے ادق اور مغلق بنا دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ۱۱۴۳ھ میں حج کیا یعنی آج سے تقریباً ۲۷۵ قمری سال پہلے۔ یہ سفر نامہ اس لحاظ سے عجیب اور منفرد ہے کہ اس میں سفر کے کوئی حالات بیان کئے گئے نہ ان جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو ایک دینی مزاج اور حساس طبیعت کے حامل مسلمان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی علمی اور درسی مصروفیات کا بھی ذکر نہیں کیا حالانکہ خود ان کے بقول وہ ایک سال سے زیادہ حجاز میں رہے اور حرمین کے اساتذہ سے باقاعدہ کتب حدیث پڑھیں اور سند اجازت لی، بلکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مؤلف نے اس دوران حرمین خصوصاً نبی اکرم ﷺ سے کیا روحانی اور علمی فیوض حاصل کیے۔

خود شاہ صاحب کتاب کے مقدمے میں کہتے ہیں:

"سب سے بڑی نعمت جس سے کہ اللہ نے مجھے سرفراز فرمایا، یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ

اور اس کے بعد کے سال میں اس نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلے میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو میسر آئی، وہ یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ نے اس حج کو میرے لیے مشاھدات باطن اور انکشاف حقائق کا ذریعہ بنایا اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمت عطا کی گئی وہ میرے نزدیک سب سے بلند تر ہے میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حج کے ان مشاھدات باطن میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، ان کو ضبط تحریر میں لے آوٴں، اور نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانیت سے زیارت مدینہ منورہ کے دوران میں جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے، اس کو لکھ دوں"(۱)

فیوض الحرمین کا موضوع اور مواد

فیوض الحرمین میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے مشاھدات و تحقیقات کا نام دیا ہے کتاب کے مشاھدات و تحقیقات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ۴۷ مشاھدات اور ۱۲ تحقیقات ہیں۔ ان مشاہدات و تحقیقات کا مواد اور اس کے موضوعات متنوع ہیں۔ ۴۷ مشاہدات میں سے تصوف پر ۲۲، کلام و عقائد پر ۱۱، سیرت النبیؐ پر ۷، فقہ پر ۳ اور اپنی ذات کے بارے میں ۴ مشاہدات ہیں، جبکہ ۱۲ تحقیقات میں سے تزکیہ و تصوف پر ۵، عقائد و کلام پر بھی ۵، اور نبی کریم علیہ السلام پر ۲ تحریریں ہیں۔ موضوعات کی اس تقسیم سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس طرح شاہ صاحبؒ ایک جامع شخصیت کے حامل ہیں اسی طرح ان کی یہ کتاب بھی موضوعات کے لحاظ سے جامعیت کی حامل ہے.

اس کتاب میں شاہ صاحبؒ کے روحانی مکاشفات ہیں۔ تصوف و سلوک کے اسرار ہیں۔ وحدت الوجود اور تخلیق کائنات کی بحثیں ہیں۔ حکمت و فلسفہ کے نکات ہیں۔ دین و ملت کے بعض اہم بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حنفی فقہ کی چند نادر خصوصیات کا ذکر ہے، علما اور صوفیاء کے نزاع کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شیعہ و سنی میں تفضیل علیؓ و تفضیل ابو بکرؓ و عمرؓ کا جو جھگڑا ہے، اس کا حل پیش کیا ہے، ہندوستان میں کفار کے بڑھتے

ہوئے خطرہ کی طرف بھی ایک آدھ جگہ اجمالی اشارہ ہے اور سب سے زیادہ اس پر زور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے مجددیت، وصایت اور قطبیت کے مقامات پر سرفراز فرمایا ہے، میں قائم الزمان ہوں کہ میرے توسط سے اہل اسلام کو کفار پر غلبہ نصیب ہوگا۔ مجھے "زکی" اور "نقاط علم کا آخری نقطہ" سے ملقب فرمایا گیا ہے وغیرہ۔

یہ سب امور جن کا کہ ذکر ہوا، شاہ صاحبؒ نے ان کو مشاہدات" کے رنگ میں پیش کیا ہے مطلب یہ کہ یہ ساری حقیقتیں ان کے دل پر گذری ہوئی اور ان کی آنکھوں کی دیکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہاں آنکھوں سے مراد جسمانی آنکھیں نہیں بلکہ قلب وروح کی آنکھیں ہیں۔ مثال کے طور پر وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں یہ یہ چیزیں یوں یوں دیکھیں یا خود رسول ﷺ کی روح پاک نے مجھ سے یہ القا فرمایا اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ شاہ صاحبؒ روضہ اطہر پر حاضر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کی طرف متوجہ کہ ان کے دل پر بعض حقائق نقش ہوگئے، ان مشاہدات میں کہیں یہ بھی ہے کہ میں نے روح کی آنکھ سے یہ چیزیں دیکھیں۔ خانہ کعبہ سے مجھے نور کی شعاعیں نکلتی نظر آئیں، میں نے غزوۂ بدر کے شہداء کی قبروں سے نور پھوٹتا ہوا پایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کی روح اقدس کو ظاہر اور عیاں دیکھا، آپ حالت انبساط میں میری طرف اس طرح ملتفت ہوئے کہ میں یوں سمجھا کہ گویا آپ نے مجھے اپنی چادر میں لے لیا، اس کے بعد آپ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر خوب بھینچا۔ آپ میرے سامنے رونما ہوئے اور مجھے اسرار و رموز سے آگاہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں، جن میں آپ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو دیکھا اور آپ کو ان بزرگوں نے اپنے نانا رسول مقبول علیہ الصلوۃ والسلام کا قلم ٹھیک کر کے عطا فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کی چادر مبارک اڑھائی۔

علاوہ ازیں شاہ صاحب نے فیوض الحرمین میں جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ:

1. پیغمبر قبروں میں زندہ ہوتے ہیں نمازیں پڑھتے اور حج کرتے ہیں۔ ان سے رابطہ کیا جاسکتا ہے اور مختلف امور میں ان سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ (۲)

2. شاہ صاحب کے مجدد، ولی، قطب، امام، آخری نقطہ علم اور دنیا و آخرت کے مواخذے سے

مامون ہونے کے دعوے۔(۳)

3. وجوب تقلید خصوصاً وجوب حنفیت۔(۴)

4. ضعیف احادیث سے استناد۔(۵)

5. سالک پر یہ الہام ہونا کہ وہ تکلیفات شرعیہ کا مکلف نہیں رہا۔(۶)

کتاب کے مواد اور اسلوب کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ بعض لوگوں کے لیے سبب توحش بھی ہو سکتا ہے اور اختلافی تو وہ ہے ہی۔ خود ہمارے ہاں ماضی قریب تک مختلف دینی مسالک کے درمیان ان امور پر تند و تیز مذہبی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ تاہم ہماری رائے میں شاہ صاحب کے موقف پر معروضی انداز سے غور کرنے کے لیے کئی عوامل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن میں سے تین بہت اہم ہیں۔ ایک ان کا فکری ارتقاء' دوسرے اس زمانے کے مخصوص دینی و سیاسی حالات اور تیسرے کشف والہام کی شرعی حیثیت.

ا۔ فکری ارتقاء

شاہ صاحب کے ان خیالات کا موازنہ اگر حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی آخری زندگی کی دوسری تحریروں سے کیا جائے تو ایک فرق صاف نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض پیغمبر کا کمال ہوتا ہے کہ اس کے ہاں فکری تدریج نہیں ہوتی اور نہ تناقض کا احتمال ہوتا ہے جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے تو بڑے سے بڑے آدمی کو لیجئے اس کے ہاں آپ کو فکری ارتقاء نظر آئے گا اور ہمارے نزدیک یہ ہرگز قابل مذمت نہیں کہ یہ خاصۂ بشریت ہے۔ علم جب اکتسابی امر ہے تو وہ مختلف مراحل سے تو گزرے گا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شاہ صاحب کی فکری زندگی کے دو نمایاں ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک سفر حجاز سے پہلے کا دور' جس میں ان پر تصوف کا غلبہ نظر آتا ہے اور دوسرا سفر حج سے بعد کا دور جس میں ان پر بتدریج حدیث اور علوم حدیث کا غلبہ ہوتا گیا اور تصوف و تقلید کے اثرات معتدل ہوتے گئے اور اس کا اعتراف خود شاہ صاحب نے کیا ہے۔ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت جب وہ

اپنے استاد حدیث علامہ ابو طاہر محمد بن ابراہیم المدنی کے پاس الوداعی ملاقات کے لیے گئے تو یہ شعر پڑھا(۷)۔

نَسِیتُ کل طریق کنت اعرفہ
الا طریق یؤرینی الی ربعکم

اور فارسی شاعر نے اس میں شیرینی کا اضافہ کرتے ہوئے کہا ؂

من آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم(۸)

اور عربی و فارسی کے ذوق سے محروم اشخاص کے لیے اس کا یہ آزاد ترجمہ کیا جا سکتا ہے:

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے
سو وہ ایک دم میں بھلا دیا

۲۔ ماحول اور زمانہ کی رعایت

اس میں شک نہیں کہ بڑے آدمی محض زمانے اور حالات کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ ماحول اور زمانے کو بدل دینے والے اور انہیں ایک نیا رخ عطا کرنے والے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود چونکہ انہیں اسی ماحول میں تجدید و اصلاح کا کام کرنا ہوتا ہے اس لیے ان کے فکر و عمل کو اسی عہد کے پیمانوں سے ماپنا چاہئے نہ کہ کسی دوسرے عہد اور افکار کے حوالے سے چنانچہ خود شاہ صاحب نے "ہمعات" میں کہا ہے کہ:

"ارباب تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان بزرگوں کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ماپتے پھریں۔"(۹)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب 'تجدید و احیائے دین' نے شاہ صاحب کی تجدیدی حکمت عملی پر جو نقد کیا ہے اس کی ایک وجہ اسی پیمانے کو سامنے نہ رکھنا ہے۔(۱۰) آیئے اب

دیکھیں کہ وہ کون سے دینی اور سیاسی حالات تھے جن میں شاہ صاحب کا وہ اسلوب اور وہ فکر پروان چڑھتا جو ہمیں فیوض الحرمین میں جاری وساری نظر آتا ہے۔ (۱۱)

اس زمانے کا دینی ماحول

(الف) شیعہ سنی اختلافات

شاہ صاحب کے عہد میں اسلامی جمعیت کے اندر مستقل گروہ بن چکے تھے اور ہر گروہ اپنی انفرادیت پر مصر تھا اور حالات ایسے تھے کہ ان کو اس طرح ایک کرنا کہ یہ سب کے سب اہل سنت والجماعت کی قیادت کو مان لیں' ناممکن تھا۔ پہلے مرکزی حکومت میں طاقت تھی اور سنی امراء کا زور تھا۔ بیشک اس زمانے میں شیعہ عناصر بھی رہے لیکن ان کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں سنی امراء کے مقابلے میں ایرانی امراء کافی زور پکڑ رہے تھے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں اس کے مواقع بھی حاصل تھے کہ وہ مرہٹوں جٹوں اور راجپوتوں کی مدد سے اپنے مخالفوں کے مقابل آسکیں۔ شیعہ اور سنی کی اس لڑائی میں ظاہر ہے اسلامی جمعیت کو نقصان پہنچتا۔ اس لیے اب ضرورت اس کی نہ تھی کہ "رفض" کے خلاف حضرت مجددؒ کی طرح کھلم کھلا جہاد کا اعلان کیا جاتا' بلکہ مصلحت اور دانشمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں میں جہاں تک اسلامی اصول اجازت دیتے باہمی رواداری اور اتحاد پیدا کیا جاتا' تاکہ اسلامی جمعیت کے اس طرح کے داخلی اتحاد سے خارجی خطرات کا مقابلہ کرنا ممکن ہو سکتا۔

(ب) علماء و صوفیاء کا کردار

شاہ صاحبؒ کے زمانے تک اسلامی جمعیت کی غالب اکثریت اہل سنت پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ان ہی کی اصلاح اور تنظیم سے اسلامی جمعیت کی نئی تشکیل ہو سکتی تھی اہل سنت کی علمی اور روحانی قیادت اس وقت علماء اور صوفیاء کے ہاتھ میں تھی لیکن بدقسمتی سے ان میں افکار و عقائد کی وہ یک جہتی نہ تھی جو وجود ملت کے استحکام کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ صوفیاء عقیدہ وحدت الوجود میں گم باطنی زندگی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے اور علماء کو

صوفیاء سے بدگمانیاں تھیں اور وہ انہیں شریعت کی سیدھی راہ سے ہٹا ہوا پاتے تھے' شریعت اور طریقت کے اس ذہنی اور علمی تضاد کو دور کرنے کا خیال بھی شاہ صاحبؒ کے پیش نظر تھا۔

(ج) فقہ حنفی

اس زمانے میں علماء اہل سنت کا یہ حال تھا کہ وہ فقہی تعصب اور ذہنی جمود میں بری طرح مبتلا تھے' وہ فقہ حنفی ہی کو اسلام کا مترادف سمجھتے' اور اس میں اتنا تشدد برتتے کہ کسی کا حنفی نہ ہونا ان کے نزدیک اسلام سے خروج سمجھا جاتا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال اسلامی ذہن کی موت تھی' اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جماعتی زندگی میں اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کا رجحان اور دنیا میں آگے بڑھنے اور نئے فکری حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ مفقود ہو گیا تھا۔ یہ سب صحیح' لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی عام حالت یہ تھی کہ وہ فقہ حنفی کے سوا کسی' اور فقہی مذہب کا نام تک سننے کو آمادہ نہ ہو سکتے تھے وہ صدیوں سے فقہ حنفی ہی کو اسلام کی واحد تعبیر جانتے اور مانتے چلے آئے تھے۔ اب اگر ان کی علمی اور مذہبی اصلاح کا کوئی امکان ہو سکتا تھا تو اس کی صرف یہی صورت تھی کہ فقہ حنفی کی ایسی تعبیر کی جاتی جس سے حنفی فقہ سے کسی کا تعلق بھی نہ ٹوٹتا اور وہ فقہی جمود سے بھی نکل سکتے۔ چنانچہ فیوض الحرمین میں فقہ حنفی کے متعلق اسی طرح کے مکاشفات ملتے ہیں۔

اس زمانے کا سیاسی ماحول

شاہ صاحبؒ جب پیدا ہوئے تو اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی چار برس کے تھے کہ عالمگیر کا انتقال ہو گیا' اور اس کے بعد گیارہ سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے اور ۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب نے اپنے والد کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو چھٹے بادشاہ محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج شاہی رکھا گیا' اس کی حکومت کے بارہ سال دیکھ کر آپ حج کو گئے۔

دہلی کے یہ انیس سال بڑے سخت سیاسی خلفشار میں گزرے 'عالمگیر کے مرتے ہی اس کے تین بیٹوں میں لڑائی ہوئی' دو تو میدان جنگ میں کام آئے' اور بڑا بیٹا بادشاہ بنا۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا اور ایک سال کے اندر اندر اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھوں مارا گیا' فرخ سیر کو سادات بارہہ نے بادشاہ بنایا تھا۔ لیکن ان میں اور بادشاہ میں زیادہ دیر تک نبھ نہ سکی چنانچہ طرفین ایک دوسرے کو گرانے کی برابر کوشش کرتے رہے جس کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ فرخ سیر کو سادات بارہہ نے سخت عقوبتوں کے بعد مار ڈالا۔ چند ماہ کے اندر دو اور بادشاہ تخت پر بیٹھے اور پھر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا اس پر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ نظام الملک نے سادات بارہہ کو شکست دے کر بادشاہ کو ان کے پنجے سے نجات دلائی۔ یہاں سے محمد شاہ رنگیلا کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔

اس طرح اور اتنی جلدی بادشاہوں کے بدلنے سے ایک طرف مغل سلطنت کا وہ رعب و دبدبہ جو اکبر' جہانگیر اور عالمگیر کی طویل اور مضبوط حکومتوں کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا' کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف شورشیں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان کی باہمی جنگوں نے امرائے سلطنت کو خود سر بنا دیا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف مرہٹوں' راجپوتوں اور جاٹوں سے مدد لینے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قوموں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اکبر و عالمگیر کے جانشینوں کا بس نام ہی نام رہ گیا ہے' محمد شاہ اگر کسی قابل ہوتا تو شاید اس کے عہد حکومت میں جو خلاف توقع کافی لمبا تھا مغل سلطنت کی کچھ حالت سدھر جاتی لیکن وہ تو محض عیش و عشرت کا بندہ تھا۔ چنانچہ معاملات روز بروز خراب ہوتے گئے اور شاہ صاحبؒ کی حج سے واپسی کے چند سال بعد تو نادر شاہ کے حملے سے سلطنت کا سارا بھرم ہی جاتا رہا۔

یہ تھی سلطنت دہلی کی حالت' جو شاہ صاحبؒ اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس میں مرہٹوں کو رعائتیں دی گئیں اور بادشاہ کی طرف سے انہیں دکن سے چوتھ وصول کرنے کا حق عطا ہوا اس سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ شمالی ہند پر قابض ہونے

کی تدبیریں کرنے لگے راجپوتوں کو مطمئن کرنے کے لیے جزیہ کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ ادھر آگرے کے نواح میں جاٹوں نے سر اٹھایا اور پنجاب میں سکھوں نے شورشیں برپا کرنی شروع کر دیں' سب کو وقتی طور پر دبا دیا گیا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کفار کا سیلاب بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کا روکنا اب روز بروز مشکل ہو تا جائے گا۔

مسلمانوں کو اور اسلامی سلطنت کو ان خطرات میں گھرا ہوا پا کر یقیناً شاہ صاحب کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہو گا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت درست ہو جائے' ان کی جمعیت کا شیرازہ پھر سے بندھ جائے' مسلمان امراء میں اتفاق و اتحاد ہو' ان کے اخلاق سدھر جائیں اور اس طرح مسلمانوں کو نئی زندگی ملے اور اسلامی سلطنت تباہی کے اس نرغے سے نکل جائے۔ چنانچہ اس کے لیے ضرورت تھی کہ شیعہ اور سنی نزاع ختم ہو' اہلِ تصوف اور ارباب شریعت میں جو بُعد پیدا ہو گیا تھا' وہ نہ رہے' علماء اپنا کام کریں اور صوفیاء اپنے فرائض انجام دیں' اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں تک پہنچیں اور دین کی تجدید کے ساتھ ملت کی بھی نئی تشکیل ہو۔

۳۔ کشف والہام کی شرعی حیثیت

مسلمانوں کے ہاں علوم کے روایتی منابع دو ہی ہیں: نقل اور عقل لیکن صوفیاء نے ہمارے ہاں ایک تیسرا منبع اور ماخذ بھی متعارف کروایا ہے جسے کشف والہام کہا جاتا ہے۔ اقبال اس ذریعہ علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"قلب ایک طرح کا باطنی وجدان یا بصیرت ہے جو ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جو ہمارے حواس سے پرے ہیں۔ اس کو باطنی پراسرار اور فوق الفطری کہنے سے اس کی قدر و قیمت بحیثیت ایک ذریعہ علم کے کم نہیں ہو جاتی۔ بنی نوع انسان کا سارا الہامی اور صوفی ادب اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ مذہبی واردات کا سلسلہ تاریخ انسانی میں نہ صرف شروع سے موجود رہا بلکہ اس نے تاریخ پر کافی اثر بھی ڈالا ہے۔ اس لیے اسے محض فریب کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ عام سطح کے انسانی تجربات

کو تو حقیقی مان لیا جائے اور جن دوسرے ذرائع سے انسان کو علم حاصل ہو انہیں باطنی اور جذباتی کا نام دے کر مسترد کر دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک انسان کے تجربی علم کا سوال ہے، اس معاملے میں مذہبی واردات کی وہی حیثیت ہے جو دوسرے ذرائع علم کی ہے، جن سے انسان کو عام زندگی میں واسطہ پڑتا ہے"۔ (۱۲)

لیکن سوال یہ ہے کہ اس ذریعہ علم کی نوعیت اور شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے دینی مآخذ معروف و معلوم ہیں یعنی قرآن و سنت۔ اس کے بعد جو ذریعہ علم بھی ہو خواہ وہ اجتہاد ہو یا کشف والہام اُسے قرآن و سنت کی میزان پر ہی تولا جائے گا اور جس امر کو مطابق قرآن و سنت سمجھا جائے گا اسے ہی قبول کیا جائے گا۔ کسی مجتہد کا اجتہاد اور کسی صوفی کا الہام صرف اس کی اپنی ذات ہی کے لیے حجت اور سند ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے سامنے بلا شرط سر جھکانے کے مکلف نہیں ہوتے الا یہ کہ کوئی اسے صحیح اور مطابق قرآن و سنت سمجھے۔

اجتہاد اور الہام میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اجتہاد ایک شرعی فریضہ ہے اور اس کا عامل صحیح احادیث کی رو سے مستحق اجر و ثواب ہے خواہ وہ غلطی ہی کیوں نہ کر جائے اور صحیح فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔ (۱۳) اس کے برعکس کشف والہام کوئی شرعی فریضہ نہیں اور نہ اُس کا عامل کسی اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے بلکہ یہ محض ایک شخص کی باطنی واردات ہے اور وہ دوسروں کے لیے حجت نہیں ہوتی الا یہ کہ کوئی شخص صاحب کشف والہام کو سچا سمجھے اور اس کے بیان کو مطابق قرآن و سنت جانے۔ محض کشف والہام کے الفاظ میں کوئی تقدس پنہاں نہیں کہ اسے بلا شرط و قیود تسلیم کر لیا جائے۔

یہ بھی ایک پیچیدہ اور فنی بحث ہے کہ خود کشف والہام کا منبع کیا ہوتا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ متعدد داخلی اور خارجی عوامل اور محرکات کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسے ہر حالت میں سو فیصد خدائی فیصلہ قرار دینا صحیح نہیں ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صاحب الہام اپنی واردات قلبی کا صحیح تعین نہ کر سکے اور اس کی تعبیر میں غلطی کر جائے۔ شاہ غلام علی مجددی (۱۴) اور

اقبال(۱۵) اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ الہام اللہ کی بجائے شیطان کی طرف سے ہو اور وصول کرنے والا اس فرق کو نہ سمجھ سکے مثلاً اس طرح کا الہام کہ تم پر شریعت کی پابندی ضروری نہیں رہی (۱۶) یا تم پیغمبر ہو (۱۷)۔ خود قرآن اس طرح کی در اندازی کو تسلیم کرتا ہے (۱۸) اور محتاط صوفیاء بھی اس طرح کے امکان کو رد نہیں کرتے۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات میں اس امکان کو تسلیم کیا ہے۔ (۱۹) اور بعض اوقات ملہم اخلاص نیت کے باوجود اپنے نفس کے ہاتھوں دھوکہ کھا جاتا ہے چنانچہ مشہور نو مسلم فرانسیسی مفکر عبدالواحد یحییٰ اس ضمن میں کہتے ہیں کہ مہدی وغیرہ کے بارے میں جو احادیث پائی جاتی ہیں ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہے لیکن بعض صوفیاء نے وفور جوش میں اپنے کشف و الہام سے دھوکہ کھا کر ان کا اطلاق اپنی ذات پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۲۰)

ہمارے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ فیوض الحرمین میں کشف و الہام پر مبنی مشاہدات کا بیان ہو یا دیگر صوفیاء کے کشف و کرامات' قرآن و سنت ان سب پر مہیمن ہیں اور ان میں سے وہی کچھ قبول کیا جائے گا جو کسی کے نزدیک مطابق قرآن و سنت یا ادلہ شرعیہ کی رو سے اقرب الی الصواب ہو لہٰذا نہ ان کشوف و الہامات پر تنقید سوئے ادب ہے اور نہ یہ حق و باطل کا معیار ہیں.

خلاصہ یہ کہ فیوض الحرمین میں شاہ ولی اللہ صاحب نے جن افکار و آراء کا اظہار کیا ہے ان پر معروضی انداز سے غور کرنے کے لیے ہمیں ایک تو ان کے فکری ارتقاء کو سامنے رکھنا چاہئے کہ آخری عمر میں حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں ان کے افکار میں کافی اعتدال اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحبؒ کے افکار و آراء پر غور کرتے ہوئے اس زمانے کے مخصوص دینی و سیاسی حالات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ شاہ صاحب کی قدر و منزلت مسلم اور بڑائی اپنی جگہ لیکن دین بہر حال قرآن و سنت کا نام ہے، اور کسی بڑے سے

بڑے آدمی کے کشف والہام کو بھی صرف اسی وقت صحیح اور قابل عمل تسلیم کیا جانا چاہئے جب وہ اپنے عموم میں قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق ہو اور جزئیات میں اوفق بالقرآن والسنۃ اور اقرب الی الصواب ہو۔

حواشی و مراجع

۱۔ فیوض الحرمین' مترجم پروفیسر سرور جامی' سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۴۷ء ص ۵۱

۲۔ ایضاً ص ۱۱۸۔۱۱۵

۳۔ ایضاً ص ۱۶۰۔ ۲۳۳' ۲۹۷

۴۔ ایضاً ص ۲۲۷' ۳۳

۵۔ جیسے یہ حدیث کہ "تو نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا" صفحہ ۱۸۷۔

۶۔ ایضاً ص ۱۰۶

۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز' پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی ۱۹۶۰' ص ۹۳

۸۔ مناظر احسن گیلانی' تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ' بساط ادب لاہور ۱۹۶۸' ص ۲۹۲

۹۔ شاہ ولی اللہ' ہمعات مترجم سرور جامی' سندھ ساگر اکادمی' لاہور' ۱۹۴۶' صفحہ ۵۲

۱۰۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' تجدید و احیائے دین' اسلامک پبلیکیشنز لیمٹڈ لاہور' ۱۹۶۳ء' ص ۱۱۹

۱۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مشاہدات و معارف کے ابتدا میں پروفیسر سرور جامی کا پیش لفظ۔

(12)Allama Muhammad Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Ed. M. Saeed Shaikh, Iqbal Academy/ Institute of Islamic Culture, Lahore, 1987, p-13

۱۳۔ صحیح بخاری جلد ۷' ص ۱۵۷' طبع استنبول ۱۴۰۱ھ

۱۴۔ ملفوظات شاہ غلام علی مجددی "در المعارف" بحوالہ مضمون پروفیسر منور مرزا بعنوان علامہ اقبال اور خطائے الہام نوائے وقت لاہور' ۹ نومبر ۱۹۹۲ء۔

۱۵۔ **Iqbal, Reconstruction, P-13**

۱۶۔ حیرت ہے کہ شاہ ولی اللہ اس کے امکان کو تسلیم کرتے اور اس کی تاویل کرتے ہیں ملاحظہ ہو فیوض الحرمین ص ۱۰۶۔

۱۷۔ جیسے، مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات نبوت و مہدی موعود اور اوتار وغیرہ

۱۸۔ الناس ۱۱۴ : ۶'۵ النساء ۴ : ۲۰۔ ۱۱۷ الاعراف ۷ : ۷ اوغیرہ

۱۹۔ مکتوبات مجدد الف ثانی 'ملک فضل الدین و چنن دین' لاہور ص ۱۰'۲۱۴

(20)Abdul Wahid Yahya , The Reign of Quantity and the Signs of the Times, Suhail Academy, Lahore, p-306-7

"رحلة الصديق إلى البيت العتيق"

ہندوستان کا ایک عربی سفر نامۂ حج

پروفیسر عبدالباری صدر شعبۂ عربی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)

عہد جدید کے چیلنجز کے تناظر میں سفر نامہ ہائے حج کے موضوع کا انتخاب اور اس کی دینی، ملی اور فکری افادیت کا مطالعہ ایک نیک فال سے کم نہیں.

واقعہ یہ ہے کہ حج کے دینی رموز اور سفر نامۂ حج کی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے ایک ایسی سرزمین کا انتخاب جسے دانائے راز اور حکیم الامت، علامہ اقبالؒ نے اپنا آخری ٹھکانا بنا لیا ہو، بہت ہی معنی خیز ہو جاتا ہے۔ آپ لائق صد مبارک باد ہیں.

اٹھاریں اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ عالمی سطح پر ملت بیضا کے لیے اضمحلال و انتشار کا رہا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا سے ہنوز امت مسلمہ کی دینی اور معاشرتی اصلاح حال کا سلسلہ چلتا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم سب اس احساس کی گراں باری سے انکار نہیں کر سکتے کہ نفس سوختہ شام و سحر کی تازہ کاری کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا ہے.

تازہ کاری کے اس عمل کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانے اور ایک جہان تازہ کی تعمیری تیاری کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں فریضۂ حج اہم ترین کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ فریضۂ حج کے دوران ہر سال سرزمین حجاز میں "کُونُوٓا اَنصَارَ اللّٰہِ" کی دعوت کا تربیتی کیمپ سا لگتا ہے جس میں دنیا کے ہر گوشے سے آواز حق پر "لبيك اللهم لبيك" کی صدا لگاتے دیار محبوب ﷺ کے لاکھوں شیدائی اپنا سب کچھ نہ سہی تو بہت کچھ ضرور تج کر آ پہنچتے ہیں۔ اخوت اسلامی اور نصرت دینی کا عجیب نظارہ ہوتا ہے.

رسول عربی صلی اللہ وعلیہ وسلم نے اس سرزمین حجاز یعنی مکے اور مدینے کے تربیتی کیمپ سے ایک قافلہ حجاز ترتیب دیا تھا اور مؤمنین کے اسی قافلے نے دنیا کو تہذیب حجازی سے روشناس کرایا تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مرد مومن اور تہذیب حجازی میں اصلاذ دوئی نہیں ہوتی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد مومن بہ الفاظ دیگر "لالۂ صحرائی" کی تخم ریزی کے لیے "صحرائے حجاز" کی زمینی فضا ہی راس آتی ہے۔ یہیں وہ صورت حال آسانی سے پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کرنے کی سبیل ہاتھ آتی ہے' بقول علامہ اقبالؔ:

جز حرم منزل ندارد کارواں
غیر حق در دل ندارد کارواں

ایسے میں یقیناً حج کے مرکزی کیمپ کی اہمیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہی وہ مبارک کیمپ ہے جہاں مردانِ گراں خواب کو مردان کار بننے کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ یہ البتہ اپنا اپنا نصیب ہے کہ کسے کتنا حاصل پاتا ہے اور ظاہر ہے اس مرکزی کیمپ کے شب وروز کا کچھ اندازہ اور حرمین شریفین میں حجاج کی عبادات و مشغولیات کا آنکھوں دیکھا حال کسی مشاہدہ کرنے والے حاجی کے ذاتی تاثرات کی شکل میں اگر اس کے سفر نامۂ حج سے حاصل ہو سکتے ہوں تو یقیناً نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں' کیونکہ سفر نامۂ حج سے بھی روح کی تازگی اور بالیدگی کے سر وسامان مہیا ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں سفر ناموں کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً سفر نامۂ حج کی ایک خاص اہمیت ہو جاتی ہے۔ حج کے سفر نامے روداد سفر بھی ہوتے ہیں اور سوز و ساز دل کے ترجمان بھی' آج بھی اور آنے والی صدی میں ہم سفر ناموں سے حاصل شدہ بصیرتوں کی روشنی میں حج کے مرکزی کیمپ کی فعالیت (Workability) کو بہت حد تک بڑھا سکتے ہیں۔

عام سفر ناموں کے مقابلے میں سفر نامۂ حج ملت اسلامیہ کے لیے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اہم دینی فریضے کی ادائیگی کا ریکارڈ بھی ہے اور ملی مسائل کو عالمی سطح پر سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے میں فکری غذا بھی فراہم کرتا ہے۔ حج کے ایام میں

مسلمانانِ عالم کو صرف ایک دوسرے کو دیکھنے' ان سے روشناس ہونے' ان کے علاقوں کے الگ الگ سماجی اور سیاسی احوال جاننے کا ہی موقع نہیں ملتا' بلکہ علمی و ادبی معاملات میں تبادلۂ خیال اور کسب فیض کے مواقع بھی ہاتھ آتے ہیں.

کہتے ہیں اسپین کا کوئی بھی ایسا مسلم عالم نہیں بچا جس نے مشرق کا سفر نہ کیا ہو اور یقیناً اس میں اولیت سفر حج کو رہی ہو گی۔ صاحب "نفح الطیب" نے بہت سارے حج کے سفر ناموں کا ذکر کیا ہے' ان میں ابن جبیر (۵۹۹ھ) کا سفر نامہ اپنی فنی و فکری خوبیوں کے لحاظ سے ایک شان امتیاز رکھتا ہے۔ ابن جبیر نے اپنے سفر نامۂ حج کے ایک حصے میں ذاتی ایک شعر بھی لکھا ہے جو بڑی حد تک سفر نامۂ حج کے ذوق و شوق اور اصل روح کی عکاسی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

بدت لی أعلام بیت الهُدی   بمکة والنور باب علیه
فاحرمْت شوقاله بالهوی   واهدیت قلبی هَدیا الیه.

(مکے میں منزل ہدایت کی نشانیاں میری نگاہوں کے سامنے جھلک رہی ہیں' ہر آن نور ہی نور اس پہ نمایاں ہے۔ میرے شوق نے عشق کا احرام یہیں سے باندھ لیا اور قربانی کا ہدی اپنے دل کو بنالیا).

ظاہر ہے ایسے مخصوص سفر ناموں میں جن کا تعلق سفر حج سے ہو خود مصنف کی شخصیت بہت اہم ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قلبی گداز کے ساتھ ساتھ تفقہ فی الدین کی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو سفر نامۂ حج دو آتشہ بن جاتا ہے.

مولانا صدیق حسن خان قنوجی ثم بھوپالی کی تصنیف "رحلةُ الصدیق الی البیت العتیق" کو کچھ اسی طرح کے سفر ناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے.

مولانا موصوف جید عالم تھے۔ عربی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کے ساتھ ساتھ تفقُّہ فی الدین کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ تقریباً ۲۰۰ کتابوں کے مصنف تھے جن میں ۵۴ عربی کی ۴۲ فارسی اور ۱۰۷ اردو کی کتابیں تھیں.

ہندوستانی علماء میں عربی تذکرہ نگاری کا فن بھی خاصہ فروغ پایا۔ اس فن میں بھی مولانا قنوجی کی "التاج المکلل" اور "ابجد العلوم" جو بیشتر ہندوستانی علما کے تذکروں پر مشتمل ہیں، خاصے کی چیز مانی جاتی ہیں۔

ہندوستان خود اسلامی تہذیب و ثقافت کا اہم مرکز مانا جاتا رہا ہے۔ علوم شرعیہ اور ملی مسائل سے متعلق یہاں کے علما کی تصانیف اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ عربی زبان و ادب کے واسطے سے بھی یہاں کی علمی و دینی کاوشیں اپنی قدر و قیمت کا لوہا ہر زمانے میں منواتی رہی ہیں۔ ہندوستان میں سفر نامہ حج قدیم زمانے سے ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ اردو اور فارسی میں حج کے سفر ناموں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے عربی میں اس طرح کے سفر نامے یقیناً ایک خاص اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

یوں تو ہندوستان میں سفر نامۂ حج کی تصانیف کا سلسلہ شیخ محدث دہلویؒ سے ہی ملتا ہے لیکن عربی سفر ناموں میں سوائے مولانا صدیق حسن کی رحلة الصدیق کے کوئی دوسرا وقیع نام نہیں ملتا اور اس حیثیت سے رحلۃ الصدیق ایک خاص اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔

اس کتاب کی دوسری طباعت ۱۲۹۸ھ میں بمبئی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ صفحات کی کل تعداد ۱۷۳ ہے۔ کتاب پانچ ابواب اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے:

پہلا باب　　　فضیلت مکہ سے متعلق ہے، جس میں ۱۲ فصلیں ہیں۔
دوسرا باب　　　فضائل حج سے متعلق ہے جس میں ۷ فصلیں ہیں۔
تیسرا باب　مبادی حج و عمرہ سے متعلق ہے جس میں ۱۳ فصلیں ہیں۔
چوتھا باب　مقاصد حج سے متعلق ہے جس میں ۲۲ فصلیں ہیں۔
پانچواں باب　　　زیارت رسول سے متعلق ہے جس میں ۳ فصلیں ہیں۔

اور اسی فصل میں تقریباً دس صفحات پر مشتمل ذاتی مشاہدات اور تأثرات سے متعلق مصنف کی قیمتی آراء ہیں۔

جیسا کہ سطور بالا میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سفر حج کا معاملہ ذوق و شوق اور حب خداوندی کا معاملہ ہے۔ سفر حج شوق اور محبت کی اس منزل کی طرف رہنمائی

کرتا ہے جو "اِلیٰ سبیل اللہ" کے صحیح راستے پر مؤمن کو پہنچانے کی صورت پیدا کر دیتی ہے۔

ہندوستان کے بزرگانِ دین کی فہرست میں ایک اہم ترین نام حضرت شیخ شرف الدین یحیی منیریؒ کا ہے۔ ان کی مکتوبات صدیؒ کی شہرت و مقبولیت سے ہم سب واقف ہیں آپ کے مکتوب میں درج ہے کہ لفظ محبت اور محنت میں صرف ایک نقطے کی ترتیب کا فرق ہے اور اگر یہ نقطہ ایک دوسرے کے قریب ہو جاتا ہے تو محبت محنت ہو جاتی ہے اور محنت محبت کا روپ و رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ قرآن پاک میں مؤمن کا شعار دینی اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ بتایا گیا ہے' بالفاظ دیگر ماسوا اللہ کے مقابلے میں اللہ سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والا ہی مؤمن ہوتا ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ محبت کی راہ محنت و مشقت کی راہ ہے' بقول شاعر:

اسے خوشبوؤں کا مکاں مت سمجھ
محبت تو کانٹوں کا گھر ہے میاں

حج کی ادائیگی میں سفر حج کا معاملہ دراصل محبت و محنت کی یکجائی کا عملی پہلو ہے۔ محبت کی راہ اخلاص' ایثار اور قربانی کی راہ ہے۔ سفر حج کا اختیار کرنا محبت و محنت کی اس منزل سے گذر جانا ہے جو صرف "فی سبیل اللہ" ہوتی ہے۔

جہاں تک علامہ صدیق حسن کے "سفر نامے" کا تعلق ہے تو اس میں مناسک حج اور مسائل حج سے متعلق معلومات خاصی وقیع اور عالمانہ ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے تجربات و مشاہدات کا ذکر ہے دوران سفر علمائے دین اور صلحائے امت سے دینی و معاشرتی مسائل پر تبادلۂ خیال کا ذکر بھی بصیرت افروز ہے۔ مصنف نے یہ بھی جگہ جگہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گھر سے دور اور حالت سفر میں بھی زندگی کے قیمتی اور لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان کا مطالعہ کتب اور قیمتی کتابوں کی ہاتھ سے نقل کا سلسلہ برابر جاری رہا اور کئی قابل قدر تصانیف بھی پایۂ تکمیل کو پہنچیں' لیکن ان سب باتوں سے اہم بات ہمیں "زادِ سفر" میں یہ معلوم ہوئی کہ مصنف نے یہ نکتہ واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ کی محبت میں اور اللہ کے راستے پر چلنے والوں کو محنت و مشقت کی عملی راہوں سے گذرنا ہوگا۔ دنیوی صعوبتوں کو دین کی خاطر برداشت کرنا ہوگا اور جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو اس

حال میں بھی "لبیک اللّٰھم لبیک" کی نہ صرف صدا بلند کرنی ہوگی بلکہ میدان عمل میں اتر کر دکھانا ہوگا اور سب کچھ سہنے کے بعد بھی اللہ کے تئیں کلمۂ شکر ہی ادا کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں خود مصنف کے سفرِ حج کی آپ بیتی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ سفرِ حج ایک بادبانی جہاز سے شروع ہوا تھا۔ اس طرح کے سمندری سفر کی صعوبتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

یہ سفرِ حج شعبان ۱۲۸۲ھ میں شروع ہوا اور ۸ مہینوں میں اختتام تک پہنچا۔ سفر کے آغاز میں اور حج سے وطن واپسی پر دو مرتبہ جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ زندگی اور موت کی کشمکش کا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ مصنف نے ان اضطراب کی گھڑیوں کا تذکرہ خاصے دلچسپ انداز سے کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان لمحات میں بھی مصنف کے درونِ دل میں شکرِ الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جدید چیلنجز کے تناظر میں بھی شاید یہی بات سب سے اہم نظر آتی ہے کہ ہم مسلمانانِ عالم کو محبت و محنت کے جذبے کو حصول "سبیل اللہ" کی خاطر یکساں اور یکجا طور پر لے کے چلنا ہوگا۔

کارزارِ حیات کی گرم بازاری میں اور معاملاتِ زندگی کے ہر موڑ پر اگر ہم اس نکتے کو حرزِ جان بنائے رکھیں تو عہدِ جدید کے تقریباً بھی چیلنجز کا مقابلہ ہمارے لیے آسان ہوگا۔ مولانا صدیق حسن قنوجی کی رحلۃُ الصدیق الی البیت العتیق سے بھی ہمیں اس اہم نکتے کا اشارہ ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نواب سید صدیق حسن خان اور ان کا سفر نامۂ حج

(۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء　　۱۳۰۷/۱۸۹۰ء)

"رحلة الصديق إلى البيت العتيق"

پروفیسر محمد اجتباء ندوی
(شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ' جامعہ نگر نئی دہلی)

حرمین شریفین اور مقامات مقدسہ کا سفر ایک مسلمان اور صاحب ایمان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا ہے۔ یہ سفر تڑپ' بے قراری اور ذوق و شوق سے بھرپور بھی ہوتا ہے اور امیدوں و خوابوں کے سایوں میں بھی اس شیریں نغمہ کی گنگناہٹ محسوس ہوتی ہے:

سرود　رفتہ　باز　آید　کہ　ناید
نسیمے　از　حجاز　آید　کہ　ناید

کعبہ مطہرہ کی عظمت اور روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے عشق و جذبہ، مستی عشق' شیفتگی و وارفتگی کے پرکشش' دلآویز اور ایمان افروز مناظر و جلوے حرمین شریفین کے ان تمام سفرناموں میں نمایاں طور پر دل کے لیے سرور اور آنکھوں کے لیے نور ہیں جو مختلف زبانوں میں رقم کیے گئے ہیں۔ سیمینار کے وقت کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کی مثالیں پیش کی جائیں' صرف اپنے موضوع سے متعلق مختصر طور سے ایک ایسے سفر نامۂ حج کا تذکرہ کیا جائے گا جس میں وہ جذبہ بھی ہے روح بھی ہے' شوق و ذوق بھی ہے وارفتگی و شیفتگی اور عشق و مستی کے ساتھ عقل و ہوش' احترام و تکریم اور شریعت و عقیدہ کی پاکیزگی' سیرت و کردار کی استقامت کا قابل تقلید اور لائق تحسین اسوہ و نمونہ بھی ہے۔ یہ سفر نامۂ برصغیر ہندوپاک کے اس عظیم' عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیت نواب سید صدیق

حسن خاں نے رقم کیا ہے جس نے قرآن وحدیث' فقہ واصول' زبان وادب اور اعجاز وبلاغت کے تب خانوں کو تین زبانوں' عربی' فارسی اور اردو میں کتابیں تصنیف کر کے بے بہا ذخیرہ سے مالا مال کیا ہے 'سفر نامۂ عربی زبان میں ہے اور اس کا عنوان "رحلة الصديق إلى البيت العتيق" (صدیق کا سفر بیتِ عتیق تک) ہے

نواب صاحب کی شخصیت جس عہد کی یادگار ہے وہ دور تاریخ کا نہایت پر آشوب و پرفتن دور تھا۔ ہندوستان' سیاسی' سماجی' علمی' فکری' دینی اخلاقی اور سبھی میدانوں میں سخت ترین ابتلاء و آزمائش سے دوچار تھا.

مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ انگریزی سامراجیت نے لے لی تھی' جو دل و جان سے اس بات کی خواہاں تھی کہ اسلامی تمدن' اسلامی افکار واقدار اور وطن دوستی کی طرف رہنمائی کرنے اور روشنی دکھانے والے باقی ماندہ نقوش بھی حرف غلط کی طرح جلد از جلد ناپید ہوں۔ دوسری طرف خود دینی حلقوں کے باہمی اختلافات نے اسلامی تنظیموں' دینی جماعتوں اور خصوصاً فقہی مسالک کے درمیان منافرت اور عداوت کی حد تک کشیدگی پیدا کر دی تھی نتیجۃً علوم وفنون کا ارتقاء بے جان و بے حرکت سا ہو کر رہ گیا تھا' اور علمی و تہذیبی اور تمدنی زندگی کی گاڑی اگر ٹھپ نہیں تو بری طرح پسماندگی کا شکار ہو گئی تھی.

بلاشبہ نواب صدیق حسن خان کا نام (۱۸۳۲۔۱۸۹۰ء) انیسویں صدی عیسوی کے مشہور ہندوستانی محققین اور چوٹی کے علماء میں سر فہرست ہے' جنہوں نے اسلامی علوم اور خصوصاً تفسیر قرآن وحدیث نبوی کی عظیم و جلیل اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں' ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی بھی انہوں نے بے پناہ خدمت کی۔ ان کے تمام کارناموں میں ان کا اپنا رنگ و آہنگ' ذہانت' خداداد صلاحیت' گہرا مطالعہ' اور فکر سلیم اپنی جھلکیاں دکھائے بغیر نہیں رہتا.

نواب سید صدیق حسن خان' خاندان حسینی کے چشم وچراغ تھے' دین و دعوت اور علم ودانش کی خدمت اس خاندان کو ہندوستان لے آئی اور اس کے ایک بزرگ شیخ جلال

سوم نے بہلول شاہ لودھی (۱۴۵۱ء۔۱۴۸۸ء) کے اصرار پر دہلی اور پھر قنوج میں سکونت اختیار کی اور ایکے ایک محلہ (شیخو پورہ) کو انکے جانشینوں نے اپنی علمی' دینی اور عام دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

نواب صاحب کے والد بزرگوار مولانا سید اولاد حسین جلیل القدر عالم' خدا ترس بزرگ اور خانوادہ ولی اللہی سے فیض یافتہ تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت و خلافت کا تعلق تھا ان کے بارے میں علامہ حکیم سید عبدالحی حسنؒ رقم طراز ہیں:

"حضرت مولانا سید اولاد حسن بن علی بن لطف" "حسینی' بخاری' قنوجی شیخ جلال الدین حسینی بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۲۱۰ھ میں قنوج میں پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالباسط قنوجی سے ایک زمانہ تک تعلیم حاصل کرتے رہے پھر لکھنو چلے گئے جہاں مولانا نور الحق بن انوار الحق لکھنوی سے بیشتر کتابیں پڑھیں اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد دہلی منتقل ہوئے' یہاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نامور فرزند حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے کسب فیض کیا۔ سید احمد شہید رائے بریلویؒ کی صحبت میں رہے' ان سے بیعت بھی ہوئے اور راہ حق میں انکے ساتھ جہاد کرتے رہے اور دعوت دین کے کاموں میں ان کے معاون اور خلیفہ مجاز قرار پائے' حصول خلافت کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔

نواب سید صدیق حسن صاحب ابھی پانچ سال کے تھے کہ اس مخلص' مشفق اور اللہ والے عالم والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ محترمہ نے جو ایک ممتاز عالم' مفتی اور پہلی تحریک آزادی کے نامور مجاہد کی صاحب زادی تھیں اور تقوی' صلاح اور تربیتی امور میں طاق اور ضرب المثل تھیں' اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اسی تربیت کے نتیجہ میں نواب صاحب عمر بھر دینی فرائض کی ادائیگی میں چاق و چوبند رہے اور منصب و اقتدار اور عزت و شہرت کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کے بعد کبھی بھی آپ کے عقیدۂ و مسلک اور عمومی دینی روش میں سرمو فرق نہ آیا۔

سید صاحب نے قنوج کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر کانپور و فرخ آباد کے مدرسوں میں پڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خانوادہ اور مفتی صدر الدین آزردہ سے استفادہ کیا۔ حدیث نبوی کی تعلیم شیخ زین العابدین بن محسن یمانی اور امام شعرانیؒ کے شاگرد شیخ عبدالحق بنارسی محدث ہندیؒ (متوفی بمقام منیٰ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) سے حاصل کی۔ دہلی کے دینی، علمی اور شعری و ادبی مجلسوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور ان مجلسوں کو ہمیشہ یاد کرتے تھے اور انہیں یاد کر کے جھوم جھوم اٹھتے اور گنگناتے:

سقیٰ اللہ وقتا کنت اخلو بوجھکم
و ثغری الھوی فی روضۃ الانس ضاحک
فمنا معاً و العیون قریرۃ
و اصبحت یوما و الجنون مواکب

("یادش بخیر وہ زمانہ کہ جب ہمیں تمہاری ہم نشینی میسر تھی اور جب باغ الفت میں عشق کی باچھیں کھل رہی تھیں، ایک زمانہ تک ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہیں اور ہنسی خوشی سے قیام پذیر رہے، لیکن آج یہ حال ہو گیا ہے کہ اپنا سوز دروں ہویدا ہے")

دہلی سے واپسی کے بعد چند ماہ قنوج میں قیام رہا، لیکن گھریلو ذمہ داری اور تلاش معاش کے لیے اپنے ایک پڑوسی محمدی کے مشورہ سے ریاست بھوپال کا رخ کیا، جس کی علم نوازی کا بڑا شہرہ تھا۔ اس وقت ریاست کے مدار المہام منشی جمال الدین تھے۔ انکی سفارش سے بھوپال کی تاریخ نویسی کے محکمہ میں تقرر ہو گیا۔ ایک مختصر مدت کے ابتلاء و آزمائش کے بعد اپنی محنت، لیاقت اور ایمانداری و دینداری کی بنا پر ترقیوں کی منزلیں طے کرتے چلے گئے اور بالآخر والیہ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کی عقد ثانی کے لیے نواب صاحب پر نظر انتخاب پڑی۔ منصب، جاہ اور خطابات سے نوازے گئے نواب شاہ جہاں بیگم علم و علماء کی بڑی قدر دان تھیں، ان کے انتظاموں سے ریاست میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے۔

نواب صاحب کے زمانہ میں حج و زیارت کا ہندوستان میں عام رواج نہیں ہوا تھا' حضرت سید احمد شہیدؒ کے حج کے بعد مسلمانوں میں ہمت و عزم اور اس فریضہ کی ادائگی کا احساس بیدار ہو گیا تھا اور سفر حج ہو رہا تھا۔ نواب صاحب اپنی سرکاری و علمی ذمہ داریوں کی وجہ سے باوجود شوق و بے قراری کے جلد سفر نہ کر سکے' لیکن ان کے دل میں حرمین شریفین کے روحانی و علمی جھونکوں سے کسب فیض کرنے کا شوق بے پایاں تھا۔ وہ وہاں کی دینی و علمی کتابوں کے حصول اور نوادر سے استفادہ کے بھی شیدائی تھے' چنانچہ وہ اپنی کتاب " رحلة الصديق إلى البيت العتيق" کے مقدمہ میں اپنا ایک خواب بیان کرتے ہیں' ترجمہ ملاحظہ ہو:

"میں نے بحر محیط (انڈین اوشن) مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' (اللہ تعالیٰ ان دونوں کے شرف و عظمت میں اضافہ فرمائے) کی خواب میں بارہا زیارت کی' میں نے ایک شب میں دیکھا کہ میں سمندر میں رواں دواں ہوں' سفر مکمل ہوا اور مکہ پہنچ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک خالی جگہ میں پایا جس میں بہت ہی شاندار ستون اور عظیم الشان کھمبے ہیں اور میں انہیں کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں۔ مسجد حرام کی شکل یہی ہے۔ دوسری بار میں نے دیکھا کہ میں مکہ کی وادیوں اور بازاروں میں گھوم پھر رہا ہوں' اور اس کی گلیوں میں آ جا رہا ہوں' اس کی تعمیر عمدہ اور دوکانیں' آباد شہروں کی طرح بارونق ہیں' مکہ شریف کی کیفیت بالکل اسی جیسی ہے۔

میں نے مدینہ منورہ کو بھی دیکھا' جیسے کہ وہ ایک پرانا شہر ہے' اس کی دیواریں خستہ و کہنہ ہیں اور عمارتیں مٹی وگارے سے بنی ہوئی ہیں' اس کی گلیاں تنگ اور غیر آباد ہیں' لوگ بہت کم چل پھر رہے ہیں' جب مجھے ۱۲۸۵ھ میں اس کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو جیسا خواب میں دیکھا تھا ویسا ہی پایا۔

اس خواب نے میرے شوق و ذوق اور شیفتگی و وارفتگی میں اضافہ کر دیا اور اسی سال بلد امین اور مسجد سیدنا محمد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و زیارت کا عزم کر لیا۔ یہی حج و عمرہ کے مناسک کتاب و سنت کے مطابق ترتیب دینے کا سبب بنا اور میری اس کتاب کی تصنیف کا باعث بھی ہوا۔"

نواب صدیق حسن خان صاحب چونکہ کتاب و سنت کا گہرا علم رکھتے تھے اور ان کی زندگی بھی اسی کے مطابق تھی' اور بڑی پابندی سے اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کے پہلو بہ پہلو فرائض و واجبات کو ادا کرتے تھے' اس لیے پانچویں فریضہ کی ادائیگی کے لیے بے چین تھے۔ چنانچہ وہ ۲۷/ شعبان ۱۲۸۵ھ بروز شنبہ ریاست سے چھٹی لے کر بھوپال سے حج کے لیے روانہ ہوئے اور آٹھ ماہ میں بادبانی کشتی کے ذریعہ اس سفر کی تکمیل کی' جس میں انہیں شدید ترین پریشانیوں' دشواریوں' الجھنوں' مخالف ہواؤں' طوفانوں اور موت و زیست کی کشمکش کے ساتھ علمی' فکری' دینی اور دعوتی چیلنجوں کا بھی سامنا کرنا پڑا' جس کا تذکرہ نواب صاحب نے بڑے دکھ اور درد سے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔

نواب صاحب اپنی للہیت' پرہیزگاری' دینداری' علم پروری' ریاست کی ترقی' فلاح و بہبود اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کی مکمل دیانت و امانت سے ادائیگی کے ساتھ ساتھ بڑے پایہ کے مصنف اور مترجم بھی تھے' اور اس فریضۂ شوق کو وہ ہمہ وقت اور ہر حال میں جاری رکھتے تھے ان کا سفر نامہ' حج کی روداد کے ساتھ' حج و عمرہ کے مسائل و مناسک کتاب و سنت کے مطابق تحریروں' تنقیدوں اور تصحیحات پر مشتمل ہے' بلکہ کتاب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہے جس کا مختصر جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

نواب صدیق حسن صاحب کا سفر نامہ' عربی زبان میں ہے' میرے سامنے اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۵ء ہے جسے معروف علم پرور اور کتاب نواز خانوادہ کے لائق فرزند جناب عبدالحکیم شرف الدین صاحب نے حواشی و تصحیح کے بعد عمدہ کاغذ و طباعت و غلاف کے ساتھ شائع کیا ہے کل صفحات ۱۲۶ ہیں' کتاب کے بارے میں عبدالحکیم شرف الدین

صاحب تحریر کرتے ہیں :

وهذه الرسالة تاليف الشيخ ابو الطيب السيد محمد صديق بن حسن بن علي لطف الله الحسيني البخاري القنوجي' وتحتوي على مسائل هامة فيمايتعلق بامر المسلمين و ذلك عام ١٢٨٥ هـ وفي ذلك التاريخ كانت رحلة الشيخ بالسفينة الشراعيه من بومباى إلى جدة' وصادف أن نزل بالحديدة في طريقه ذهابا وايابا' ولقداستغرق سفره ثمانية أشهر من يوم أن غادر بهوپال إلى أن عاد اليها.

والرسالة تحتوي ايضا على مايتعلق بالحج والعمرة و زيارة المسجد النبوي مستدلاً بالكتاب والسنة' ومشيرا إلى تلك البدع الشائعة انذاك في تلك البلاد' وقد رد عليها في رسالته متمنياً إزالتها والقضاء عليها.

وفي آخر هذه الرسالة ذكر المؤلف رحلة وما حدث له فيها" ("ص ١٦٧_١٧٦"(١)

(یہ رسالہ مولانا ابوالطیب سید محمد صدیق بن حسن بن علی لطف اللہ حسینی بخاری قنوجی کی تصنیف ہے.

مسلمانوں سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے' جو ۱۲۸۵ھ میں پیش آئے اور اسی تاریخ کو مولانا کا سفر حج بادبانی کشتی کے ذریعہ بمبئی سے جدہ تک ہوا تھا اتفاق سے آمدورفت کے وقت وہ "حدیدہ" میں اترے' ان کا یہ سفر آٹھ ماہ میں پورا ہوا۔ رسالہ میں حج و عمرہ اور مسجد نبوی کی زیارت سے متعلق مسائل واحکام کتاب وسنت کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں' اس ملک کے عوام میں پھیلی ہوئی بدعتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کی تردید بھی کی ہے اور ان کے ازالہ کی خواہش و آرزو کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں مصنف نے اپنے سفر حج اور اس دوران میں جو واقعات و حوادث پیش آئے تھے ان کا تذکرہ صفحہ ۱۶۷ سے ۱۷۶ میں کیا ہے)

۔۔۔۔نواب صدیق حسن صاحب کی جملہ ۵۶ عربی تصنیفات کی طرح اس رسالہ کی بھی

زبان سادہ، رواں، شگفتہ اور سلیس ہے، تصنع، تکلف، مسجع و مرصع جملوں اور عبارت آرائیوں سے پاک وصاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ عرب انشاء پرداز و مصنف ابھی اس اسلوب وطرز نگارش کے عادی نہیں ہوئے تھے بلکہ قاضی فاضل، بدیع الزماں ہمدانی اور ابوالقاسم حریری کی جادو بیان، پر تکلف اور پر شکوہ تعبیروں اور تحریروں سے قلم و قرطاس مسحور تھے۔

نواب صاحب کی نظر کعبہ شریف پر پڑتی ہے تو انہیں جس شرف وسعادت کا احساس ہوتا ہے اُسے بے تکلف اور سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ومن اول نظرة وقعت إلى جمال الكعبة المكرمة "ذهلنا" عن مصائب السفرو مشاقة كلها كانمالم نشك بشوكة فى الطريق، وهكذاشأن كل بشوقٍ وصديق، كيف والكعبة الزهراء زادهاالله ضياء وسناء يا قوتة كحلية تحلوبصائرأعين الصلحاء، مجلوة للناظرين من حلة من الكرامةسوداء۔'(۲)

(کعبہ مشرفہ کی نور افشاں، ضوء فشاں، پر رونق وجمال آراء "باوقار وعظیم عمارت پر پہلی نظر پڑتے ہی سفر کی تمام مشقتیں پریشانیاں، دشواریاں اور مصیبتیں ذہن سے ایسی نکل گئیں گویا راہ میں کوئی کانٹا بھی نہ چبھا ہو، یہ کیفیت تو ہر دوست اور مشتاق دید کی ہوتی ہے، چہ جائیکہ بارونق ومرکز تجلیات کعبہ مکرمہ اللہ تعالیٰ اس کی نور افشانیوں وضیاء پاشیوں میں اضافہ فرمائے وہ تو زیور تابدار کے اس ہیرے کے مانند ہے جو صالحین کی نگاہوں کو روشنی عطا کرتا ہے اور اس کا قابل صد احترام سیاہ غلاف ناظرین کے لیے سرمہ چشم بنتا ہے)

نواب صاحب کی بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی مسرت وشادمانی، تعظیم وتکریم اور خوش نصیبی و مستی اس وجہ سے اور بھی دوبالا ہوگئی تھی کہ جدہ پہنچے سے قبل ان کی بادبانی کشتی گہرے سمندر کے ایک ایسے پہاڑ سے ٹکرانے سے بال بال بچ گئی، جسے عین وقت پر ملاح

کی دور بین نگاہ نے دیکھ لیا اور بڑی مہارت سے کشتی کو اس جان لیوا خطرے سے بچا لیا تھا۔ نواب صاحب نے اپنے سحر انگیز قلم سے اس کا بڑا پر اثر نقشہ کھینچا ہے اور جدہ بعافیت پہنچ جانے اور منزل مقصود کے قریب ہونے پر جس بے پایاں مسرت کا اظہار کیا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"والذی حصل لنا من مسرة القلب و اشراق الوجه والحبور، اذذلك لايعلم حقائقها إلاالعليم بذات الصدور و كيف؟فقد ظهرت صورة المراد بعد شهرين غب اليأس، و كنانقول: يارب الناس! أقم سفينتنا على جدة كما استوت سفينة نوح عليه السلام على الجودی، فليس ذلك على فضلك المجدی"(۱)

(جدہ پہنچتے ہی ہمارے دل کی کلی کھل اٹھی اور چہرہ مسرت و شادمانی سے چمک اٹھا جس کی حقیقت کا علم صرف دلوں کے اندر کی کیفیات جاننے والی علیم و خبیر ذات ہی کو ہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ دو ماہ کی ہلاکت خیز مایوسی کے بعد منزلِ مقصود آنکھوں کے سامنے تھی، ہم اس دوران میں بارگاہ الٰہی میں عرض کناں رہے کہ اے انسانوں کے پالنہار! ہمارے سفینہ کو ساحل جدہ اسی طرح پہنچا دے "جس طرح تو نے سفینۂ نوح علیہ السلام کو جودی پہاڑ پر" پہنچا دیا تھا" یہ تیرے ابدی فیض اور عظیم فضل کے لیے کچھ دشوار نہیں ہے)"

نواب صاحب نے اپنے اس سفر میں پیش آنے والے واقعات و حوادث اور جدہ سے مکہ مکرمہ اور پھر حج کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے راستہ میں دشواریوں، تکلیفوں اور ساربانوں کی زیادتیوں اور ستم رانیوں کا تذکرہ بڑے مؤثر اور دل لرزا دینے والے مؤثر اور اشک آور اسلوب میں کیا ہے، مگر شکایت اور کبیدگی کا ایک حرف بھی نہیں ہے، ساربانوں کی شر پسندی اور بدنیتی کی وجہ سے وہ خلاف معمول ۱۲ روز کے بجائے بیس دنوں میں مدینہ منورہ پہنچے، جذب و شوق دلوں کو تڑپاتا اور آنکھوں کو رلاتا رہا، مگر اس شہر آرزو اور مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ مدینہ منورہ کے قیام اور وہاں کے معمولات خود انہیں کے الفاظ میں پیش ہیں:

"واتفقت الاقامة بهذه البلدة الى اسبوع' وتيسر لى" حضور المسجد النبوى والسلام على المرقد المنور المصطفوى و اصحابه' وزيارة بقيع وشهداء احد' سيما سيدالشهداء حمزه رضى الله تعالى عنه' وغيره ذلك من المساجد والآبار خصوصا مسجد قباء على الوجه الماثور المسنون' فياما من بلدة طيبة ملئت بأنواع البركات وآثار الرحمة وانوار من التجليات' كيف والأنوار الالهيه والبركات النبوية تترشح من جدرانها والسكينة والوقار تتنزل كل حين على بنيانها"(۱)

(اس مبارک شہر میں ایک ہفتہ قیام کی سعادت حاصل ہوئی مسجد نبوی میں حاضری اور پر نور مصطفوی روضۂ اطہر اور ان کے صحابہؓ کے مزاروں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ جنت بقیع' احد کے شہیدوں' خاص طور سے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ' اور دیگر مسجدوں' کنوؤں' خصوصاً مسجد قباء میں سنت کے مطابق حاضری اور نفل ادا کرنے کا موقع میسر آیا' کیا ہی خوب ہے' یہ پر فضاء شہر جو برکتوں ورحمتوں سے مالامال اور تجلیات کے انوار سے بارونق ہے' یہ کیوں نہ ہو جبکہ انوار الٰہی اور برکات نبوی اس کے درودیوار پر سے عیاں و نمایاں ہیں' ہمہ وقت اور ہر لحظہ اس سرزمین پاک میں رحمت وسکنیت' وقار وطمانیت کا نزول ہوتا ہے).

نواب سید صدیق حسن خاں نے اپنے اس سفر میں کچھ کتاب وسنت کے خلاف اعمال وافعال کا مشاہدہ کیا تو اس پر افسوس کے ساتھ تنقید کی اور اہل حرمین شریفین اور حجاج کرام کو بڑی حکمت' ودانائی' پندو موعظت اور سوزودرد کے ساتھ اس جانب توجہ دلائی ہے۔ ان کی کتاب کا بیشتر حصہ غالباً اسی بنا پر مسائل حج' مناسک واحکام اور حرمین شریفین کے فضائل ومناقب اور آداب پر مشتمل ہے۔ اس جیسے چند ایک سفرنامے اور بھی تحریر کئے گئے ہیں' جن میں شیخ شنقطی' کی کتاب کی بھی اہمیت ہے' لیکن نواب صاحب کی پوری

کتاب اور خصوصاً دو اور سفر دوسرے مصنفین کے برعکس اپنے اسلوب بیان ادبی جمال سفر حج کی کیفیات جذب و شوق ذوق و مستی دلفریبی و دلآویزی اور سحر انگیزی میں ادب عربی کا ایک شہ پارہ اور زبان پر ملکہ و قدرت کا شاہکار ہے۔

نواب صاحب بھوپال واپس آگئے حرمین شریفین کی برکتوں و رحمتوں اور نفحات قدسیہ سے فیض حاصل کرنے کے باوصف اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے بہت سی نادر کتابیں نقل بھی کر کے لائے اور خریدیں بھی۔ جسم و قالب بھوپال واپس ضرور پہنچ گیا مگر دل نظر جوار بیت اللہ اور روضہ اطہر ہی کے قریب ہی رہ گیا سفر نامہ کے آخری الفاظ گوش گذار فرمالیں:

"ونحن الذی مقیمون "بهوبال ء إلى ماشاء الله المتعال' والرجاء من ربنا ذی الجلال يتيسر المقام على الدوام إلى وقت الحمام "بيت الله الحرام أوبمدينة خيرالانام عليه الصلاة والسلام' وباالله التوفيق وهوالهادی وأقوم طريق"(۹)

(ہم اس وقت اور جب تک اللہ برتر و اعلیٰ چاہے بھوپال میں قیام پذیر ہیں اور پروردگار اعلیٰ مقام سے امید رکھتے ہیں کہ وہ دنیا سے کوچ کرنے کے وقت بیت اللہ پاک یا برگزیدہ و خلق خدا کی سب سے بہتر ہستی علیہ السلام کے شہر میں مستقل سکونت کی سہولت فرمادے اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا اور وہی صحیح راہ پر گامزن کرنے والا ہے):

تمنا ہے تیرے روضہ کی دیواروں پر جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا"

شیفتہ کا سفر حرمین

(مومن خان مومن کے نام ایک غیر مطبوعہ نادر خط)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

پروفیسر شعبہ اردو. جامعہ ملیہ دہلی

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) کو دہلی میں پیدا ہوے ان کے والد عظیم الدولہ سر فراز الملک نواب محمد مرتضیٰ خاں بہادر بنگش تھے۔ فرخ آباد کے نوابان بنگش سے ان کی قرابت تھی۔ شیفتہ کی والدہ اکبری بیگم نواب میرزا اسماعیل بیگ ہمدانی کی دختر تھیں اور احتشام الدولہ محمد بیگ خاں' قاطن ہمدان کی نواسی تھیں۔ شیفتہ کے اجداد میں نواب ولی داد خاں فرخ سیر کے عہد میں بدخشات سے چل کر فرخ آباد میں وارد ہوے تھے۔ سلطنت دہلی کی کمزوری کے باعث نواب مرتضیٰ خاں نے جسونت راؤ ہلکر کے لشکر میں ملازمت کرلی اور سپاہیوں کی ایک جماعت کے افسر بن گئے۔ جب مرہٹوں کا لارڈ لیک سے مقابلہ ہوا تو نواب مرتضیٰ نے کوشش کر کے مصالحت کرادی۔ اس سے لارڈ لیک بہت خوش ہوا اور ۱۸۰۳ء میں تین لاکھ روپیہ سالانہ محاصل کی جاگیر پرگنہ ہوڈل وپلول (علاقہ گوڑگاوان) انھیں حین حیات عطا کیے۔ ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد (میرٹھ) کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں نے' اپنے بیٹے نواب مصطفیٰ خاں کے نام سے ایک نیلام میں خریدا۔ نواب مرتضیٰ خاں کی وفات کے بعد انگریزی جاگیر تو ہاتھ سے جاتی رہی لیکن اس کے عوض ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ سرکار سے مقرر ہو گیا۔

شیفتہ نے چالیس سال کی عمر کے بعد شاہ عبدالغنی مجددی نقشبندی (۱۲۳۵ھ۔ ۱۲۹۶ھ) سے بیعت کی۔ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹ء) میں حج بیت اللہ سے شرف اندوز ہوے۔

اس حج کی روداد انھوں نے ترغیب السالک الی احسن المسالک المعروف بہ"رہ آورد" فارسی زبان میں لکھی، جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہو چکی ہے "اس کا ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ کے شیفتہ کلکشن میں بھی محفوظ ہے۔ اس سفر نامہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، مگر میں سر دست اس کی نشان دہی سے قاصر ہوں۔ اسی سفر نامے کی تلخیص حضرت مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے رسالہ الفرقان (لکھنو) میں شائع کرائی تھی.

شیفتہ کا جو خط یہاں پیش کیا جارہا ہے یہ اسی سفر حج کی یادگار ہے۔ یہ خاصا طویل خط ہے اور اس سے ان کے سفر کی روداد معلوم ہوتی ہے 'اس میں بعض ایسے امور پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر "رہ آورد" میں نہیں ہے۔ شیفتہ کے کچھ خطوط "دیوان ورقعات شیفتہ و حسرتی" میں شامل ہیں بلیکن زیر نظر مکتوب غیر مطبوعہ ہے اور پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔ اس کا مآخذ ایک قلمی بیاض ہے جس میں کسی صاحب ذوق نے مختلف حضرات کے خطوط یک جا کیے ہیں' اسی میں غالب کے وہ (۱۲) غیر مطبوعہ خطوط بھی ملتے ہیں جو میں اس سے پہلے 'نقوش' میں طبع کرا چکا ہوں.

مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک فارسی خط جو 'نوائے ادب' بمبئی میں چھپ چکا ہے۔ اسی بیاض سے لیا گیا تھا۔ یہ بیاض اغلاط کتابت و املا سے خالی نہیں' اس لیے کئی جگہ الفاظ پڑھے نہیں جا سکے' یہ راقم الحروف کے ذخیرہ ذاتی سے علاقہ رکھتی ہے.

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ کا جہاز راستے میں چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا تھا اور انھیں ایک ویران جزیرے میں پناہ لینی پڑی۔ شیفتہ نے اس خط میں تو حوالہ نہیں دیا ہے، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اسی سفر حج میں مشہور شاعر کرامت علی شہیدی ان کے ردیف تھے۔ اس جزیرے میں قیام کے دوران چنا' چاول اور باجرہ وغیرہ ابال ابال کر سب نے کھایا' صحت تو سب کی متاثر ہوئی' لیکن شہیدی بیمار ہو گئے۔ انھیں اسہال کبدی شروع ہو چکے تھے۔ جدے سے بمشکل تمام مکہ پہنچے اور وہاں سے اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ مکرمہ کا ارادہ کیا۔ شیفتہ ان کی تیمارداری کر رہے تھے۔ سفر کی تکان اور جھٹکوں کے باعث شہیدی پر غشی

کے دورے پڑ رہے تھے' جب مدینہ منورہ کا سواد نظر آیا اور گنبد خضرا نمودار ہوا تو شیفتہ نے فرطِ شوق سے پکارا: شہیدی دیکھو وہ گنبد خضرا نظر آ رہا ہے!" شہیدی نے غشی کے عالم میں آنکھیں کھول دیں' حسرت سے روضۂ مبارک کی طرف دیکھا اور روح پرواز کر گئی۔ ان کی یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہی:

تمنا ہے ترے روضے کی دیواروں پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

یہ ان کے ایک مشہور نعتیہ قصیدے کا شعر ہے۔ ان کا یہ قصیدہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کے جواب میں متعدد شعرا نے قصائد لکھے لیکن وہ بات کہیں پیدا نہ ہو سکی۔

شیفتہ کے غالب سے بہت گہرے مراسم تھے۔ وہ فارسی میں غالب اور اردو میں مومن خاں سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ نقد شعر کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ علوم رسمیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ حالی نے ان کی صحبت سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ گلشن بے خار بھی لکھا' جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اردو تذکروں میں وقیع سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۲۸۶ھ۔ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اولاد میں پہلی بیوی سے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہوئے جن میں سب سے بڑے نواب محمد علی خاں رشکی (۱۸۹۹ء۔ ۱۸۴۴ء) تھے اور دوسری زوجہ کے بطن سے نواب نقشبند خاں اور محمد اسحاق خاں نیز دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ نقشبند خاں کا انتقال صبح گلشن کی روایت کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں ۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ کو ہوا۔

نواب شیفتہ کے سفر حج کا آغاز ۱۷ ذوالحجہ ۱۸۳۹ء/ ۱۲۵۴ھ کو ہوا۔ ۱۸ ذوالحجہ کو انھوں نے درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ میں قیام کیا۔ وہاں سے ۱۹ کو گوڑگانواں پہنچے۔ اس کے بعد سفر کا راستہ یوں ہے: پاٹودی (۲۰ ذوالحجہ)' ریواڑی (۲۱ ذوالحجہ)' شاہجہاں پور (۲۲ ذوالحجہ)' بڑوڑ نزد الور (۲۳ ذوالحجہ)' کوٹ پتلی (۲۴ ذوالحجہ)' بھابھرہ (۲۵ ذوالحجہ)' منوہر پور (۲۶)' اچرول (۲۷)' جے پور (۲۸)' جے پور میں چار دن قیام کیا' یہاں سے چوتھی محرم ۱۲۵۵ھ کو روانہ ہوئے اور بگرو پہنچے۔ وہاں سے دوں دوں (۵ محرم)' کشن گڑھ

(۶ محرم)' اجمیر (۷)۔ یہاں بھی چار دن قیام کر کے ۱۲ محرم ۱۲۵۵ھ کو چلے اور نصیر آباد آئے' پھر بہناہ (۱۳)' انگوچھہ (۱۴)' بھنیرہ (۱۵)' بھیلواڑہ (۱۶)' سوناتواں (۱۷)' چتوڑ (۱۸)' نیمہ' ہیڑہ علاقہ ٹونک (۱۹)' نیمچ (۲۰)' یہاں سات روز قیام کیا اور ۲۷ محرم کو روانہ ہوئے۔ ملھار گڑھ پہنچے' وہاں سے مندسور (۲۸)' کچنار (۲۹)' جاورہ (۳۰) یہاں تین دن ٹھہرے۔ ۳ صفر کو رتلام پہنچے وہاں سے ۵ صفر کو چلے' علاقہ جھابوہ میں آئے پھر راور (۶)' بھگوڑ (۷)' اناس (۸)' دوحد (۹)' جے کوٹ (۱۰)' پانیا (۱۱)' اڑواڑہ (۱۲)' گودرہ (۱۳)' کلول (۱۵)' جرود (۱۶)' بڑودہ (۱۷)' یہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ ۲۶ صفر کو بڑودہ سے روانہ ہوئے اور اینولہ میں آئے' وہاں سے ٹکاریہ (۲۷)' بروچ (۲۸)' انکلیسر (۲۹)' چوکی (یکم ربیع الاول)' سورت (۲) یہاں سے براہ دریا ۲ ربیع الثانی کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے لاج پور میں منزل کی' وہاں سے قوساری (۳)' بلساڑ (۵)' پاڑی (شب پنجم)' دمن خورد (۶)' عمرگانو (۷)' ڈینو (۸)' مرمہ (۹)' دنتو (۱۰)' بلی (۱۱)' گھوڑ بندر (۱۳)' ماہم (۱۴)' اسی روز بمبئی میں وارد ہوئے۔

یہاں سے جہاز کا سفر شروع ہوا جس کی روداد زیر نظر خط میں لکھی ہے۔ اس خط میں جو تفصیلات ہیں ان میں سے بعض باتیں سفر نامہ میں بھی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے بھی شیفتہ کا یہ مکتوب اہم ہے۔

آخر میں اس فارسی خط کا اردو ترجمہ بھی دیا جا رہا ہے۔ ترجمے میں پوری احتیاط نہیں کی گئی ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اس خط کے مشمولات غیر فارسی حضرات بھی سمجھ سکیں۔ خط کا اس سے بہتر ترجمہ ممکن ہے۔

رقعہ رقم زدہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

(موسومہ حکیم مومن خاں صاحب کہ از راہ کعبہ نوشتہ بود)

برادر والا قدر، مومن خاں صاحب، سلامت

از بمبئی بیوم رکوب جہاز نامہ نوشتہ شد۔ پانزدہم جہاز بحرکت آمد و بتاریخ پنجم ماہ رمضان در عدن رسیدیم و لنگر کردیم بعد دو روز از عدن روانہ شدیم و بتاریخ دہم (ورق ۸۶ ب) در مخا رسیدیم و سہ روز (در) مخا اقامت کردہ بتاریخ پانزدہم در حدیدہ فائز شدیم۔ دہ دران جا توقف رو داد و بست و ششم از حدیدہ روانہ شدیم۔ مخفی نماند کہ جدہ از حدیدہ، اگر باد بحسب مراد باشد، مسیر خمس یوم است۔ بروز روانگی ہا از حدیدہ باد بر وفق فمیا (کذا) بود۔ می دانستم کہ در پنج روز بجدہ می رسم تا سہ روز راہ رقم (۱۵)، و بحسب حساب معلم جہاز، نماند در وصول جدہ الا دو روز کہ ناگاہ یک نیم پاس از شب رفتہ، جہاز بر کمر کوہ کہ اندرون دریا پنہان بود آمد۔ بر سر کوہ آمدن ہماں بود و شکستن ہماں۔ آب از درون آمدن شروع شد، و ہم موج از بیرون افتادن۔ تلاطم امواج جہاز را بر می داشت، و باز بر می افگند۔ حالے بود کہ شرحش نتوان کرد:

شب تاریک، بیم موج، گردابے چنین حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحلہا

و معہذا ہیچ معلوم نے کہ این کدام مقام است و چہ جاست۔ آیا بر سر ساحل رسید و شکست، و یا درمیانہ بحر۔ اگر بر سر ساحل شکستہ است، باشد کہ تدبیرے بر آید کہ موجب حفظ مردم از غرق گردد واگر درمیانہ بحر است، انا للہ وَ اِنا اِلیہِ رَاجعُونَ۔ بالجملہ بانتظار صبح دم شماری بود کہ اگر تا طلوع سحر جہاز از تفرقہ سلامت ماند پاید (آید) کہ در سر نوشت چہ بودہ است، قیاس باید کرد کہ این شب بچہ درازی سحر شدہ باشد۔ الغرض حفظ حافظ حقیقی جہاز را از ہم ریختن آب دور داشت، ہر چند یک قد آدم آب درون آمد ولیکن سطح محفوظ ماند۔ ازان کہ بالائے کوہ

آب بیش ازین نبود و گرنہ غرق می شد و حوالی جہاز از سہ جانب آب بیرون از حد حساب۔ و یک جانب لو بیش از دو سہ قد آدم نبود۔ صبح گاہ روشن شد کہ از ساحل نشانے نیست۔ د اش (کذا) و لیکن بمقدار رسیدن ضرب گلولہ بندوق جزیرہ خشکی کو چکے می نماید' و ہمان جانب آب کمتر است۔ مردم خود را در آب انداختند و باہم بصورتیکہ باشد' بجزیرہ رسیدیم۔ طول و عرض بقدر چہل و پنجاہ بیگہ تخمیناً بنظر آمد' پنجاہ آبے' نہ بزرگ کاہے' نہ درختے کہ از میوہ آن بہرہ توان برداشت و نشجرے کہ از سایہ آن نفع توان گرفت۔ غیر از سنگ و بیخ مرجان مطلقاً چیزے دیگر نبود۔ از سامان و اسباب ہم آنچہ بالاے سطح بود ہر یک در آب انداخت و کذلک از اجناس۔ دو ستار شمار ما' ہر چہ رفتنی باشد' در بحر برود' و ہر چہ ماندنی باشد بساحل آید۔ ہمچنان شد' ہر آنچہ رفتنی بود رفت' و ہر آنچہ آمدنی بود آمد۔ اکنون از اندیشہ غرق خاطر فراہم شد۔ اندیشہ رفت کہ طریق خروج ازین گرداب بظاہر مشکل' بل محال۔ آب و دانہ درین جانہ۔ و اہل جہاز زیادہ بر دو صد۔ و پیپہ ہاے آب کہ از جہاز بساحل رسید ہمگی ہشت' و باقی در دریا رفت' و معذلک آب بسیار در جہاز۔ نخود و باجرہ اگرچہ تجار در جہاز بسیار بار کردہ بودند' لیکن آوردن مشکل۔ و بہ تقدیر آوردن ہمہ بے آب بچہ کار آید کہ آب شرط زندگانی افتادہ است' و لیکن چہ توان کرد کہ چون کار از چارہ در گذشتہ باشد و چون ہمہ دل بر مرگ نہادہ بودند عاقبت غیر ازین تدبیرے ندیدند کہ کشتی خوردے کہ در جہاز است آن را بطرفے باید فرستاد کہ اگر زندگی پس ماندگان باقیست' باشد کہ روندگان نیز بسلامت رسند ورنہ ایشان در دریا میرند و ما در خشکی۔ برین قرار داد کشتی از جہاز فرود آمدہ و دو کس از ان خود کہ یکے از آنہا مولوی فضل علی و دومی سعادت خاں سپاہی بود' و سہ کس دیگر در آن نشانیدہ' در ان بحر بے پایان انداختہ شد و گفتہ اند:

الله یرحمان ویرحمکم و ان غرقتم و ان مساوان صلتم بساحل ارجعتم فالحمد لله علیٰ سلامته (کذا)۔

تا بہ شانزدہ روز از شکستن جہاز کہ چون باز گشت ایشان را امداد تام شدہ کہ غرق سفینہ بگمان بود' ناگاہ دو کشتی خورد نمودار شدند دانستیم کہ رفتگان ما آمدہ ند چون قریب تر رسید معلوم شد کہ کے از آن ما در ان کشتی نیست۔ حیرتے عظیم رو آورد۔ بارے تا اہل کشتی

نزول نمودند، واضح گشت کہ آن سفینہ یک ہفتہ در دریا رفت و عاقبت بساحل قنفذہ مجرد ادراک این حال شش کشتی ہمرہ ہمان کردہ روانہ کردہ کہ این دو ازان جملہ اند، و در سبب نرسیدن باقی سفائن بیان کردند کہ مردمان شما شکستن جہاز در بحر عرب بیان کردہ اند، و اہل سفائن در بحر تلاش شامی کنند و ما راہ غلط کردہ اتفاقاً درین جا رسیدہ ایم۔ آن گاہ وضوح رفت کہ در بحر عجم بودہ ایم سبحان اللہ از کجا بکجا افتادہ ایم۔ بالجملہ از دو کشتی چہ می کشود، اطلاع گم کردہ راہان ضرورت افتاد، چون تا شش روز ازاں نشانے پیدا نشد، دران دو کشتی مردم دیگر را سوار کردہ روانہ کردند۔ باین نظر کہ ہر قدر مردم درین جا کمتر باشد خوب است ہر کہ رفت بارے نجات یابد۔ باقی ماندگان را ہم کارسازے خواہد کرد، و دران کشتی ہا رفتن خود ترمین جہت گوارا نہ شد کہ اگر می روم دیگران را دل شکستگی می شود و کمال خلاف مروت است کہ مساکین درین جا باشند و من بیرون آیم۔ نظر برین می گفتم کہ اگر یک کس ہم درین جا می ماند آن یک کس من خواہم بود نہ دیگرے۔ ہر چند بعض مردم را در رفتن کشتی ہا ہراس می شد و لیکن بحمد اللہ کہ مرا دل ہم چنان بجاے بود و بارے یک ہفتہ از رفتن کشتی دو کشتی دیگر نمودار شدند گمان رفت کہ ہمان گم کردہ راہان اند و لیکن بعد آمدن ہمان ما را معلوم شد کہ آنان نبودہ اند۔ معلوم شد کہ آن ہر چہار کشتی روزے چند در دریا بودہ خرابہ متعلقہ بحر عرب را تلاش کردہ باز بقنفذہ واپس شدند۔ امیر قنفذہ باز در دم بشتاب باز گردانید و یک کشتی دیگر ہمراہ داد و گفت کہ یا از گم شدگان چیزے آرید یا خود در پس آن ہا مفقود الخبر شوید۔ ہم چنان در بحر عرب می جستیم و نشانے نمی یافتیم کہ تلاطم امواج ما را ازان دور افگند بےخبرانہ می رفتیم کہ ناگاہ از دور جزیرہ نمایان شد آمدیم تا دیدیم ہر آنچہ دیدیم۔ ہر چند این دو کشتی از کشتی ہاے سابق ہم خورد تر و لیکن این بار ہم چنین قرار یافت کہ جملہ کسان سوار شوند و اسباب ہر قدر کہ برداشتہ شود و باقی بگذاریم اما تا دہ روز دیگر انتظار آمدن آن سہ کشتی بردیم و ہم تلاطم امواج شدیدہ و ہبوب ریاح غلیظہ مانع آمد۔ عاقبت بعد دہ روز توکلاً علی اللہ سوار شدیم۔ ہر چند ماجراے کہ در میانہ از جہت شورش امواج رفت مقتضی آن نبود کہ بسلامت بساحل رسیم اما عنایت الٰہی بسلامت بساحل لیس رسانید۔ ہمدرانجا فرود شدیم و شش روز دران جا گذرانیدہ براہ خشکی در چہار روز

بحرم شریف زادہ اللہ شرفا فائز گشتم۔ الحمد للہ علیٰ ذلک حمداً کثیراً۔ اکنون پیش ازانکہ سخن دیگر گویم بمقتضائے و امّا بنعمتِ ربّکَ فحدّث۔ ذکر نعمت ہائے چند کہ از منعم حقیقی انعام شد بسمع رسانم۔ ہر چند نعم فتواللہ تعالیٰ شانہ (کذا) مقدور من نیست کہ در ہر دم ہزاران نعمت ہائے بے پایان شامل این کس بودہ است ولیکن از جملہ نعمائے نعمیہ یک دوسہ بر شمارم تا فی الجملہ اسال (کذا) لو کردہ باشم۔ نخست آن کہ از وقت شکست جہاز تا دم بر آمدن از جزیرہ مرا از من گرفتند و دل و زبان مرا جز بشکر و ثنائے خود چیزے دیگر نیالودند و از اضطراب بر اصل بعیدہ دور داشتہ۔ ورنہ انسان ضعیف البنیان خاص چون سامدکی (کذا) و ناتوان را کجا طاقت آن بود، دوم جزیرہ شکست ورنہ بر آمدن ہیچ صورتے نمی داشت، سوم در جزیرہ بے آب و دولنہ بسلامت داشتند، حکایت آب گفتہ ایم و تا کجا گویم کہ سخن درازمی شود۔ مختصر این کہ باران فرستادند و یک دوسہ روز باآن سیراب نمودند۔ بعد ازان حکمے در دل انداختند کہ آب دریائے شور را مانند عرق کشیدہ می نوشیدند شیرین می شد۔ چہارم چنان جزیرہ کہ از طریق آمدو شد جہازہا بر کران افتاد چنان بسلامت آوردند کہ از اہل جہاز یک کس ہم تلف نشد، پنجم در ان کشتی ہائے صغیر جم غفیر را ازان بحر کبیر بساحل رسانیدند۔ ششم بکعبہ مرا لو فائز گردانیدند۔ و این اصل نعمت ہاست۔ برادر من از روزے کہ درین جائے محترم رسیدہ ام، فرحتے و سرورے کہ نصیب من است واتم کہ از سلاطین روے زمین کسے را حاصل نخواہد بود، و چگونہ نباشد کہ درین عالم جنت رسیدہ ام، اکنون حسرتے بر حال نارسیدگان است و بس۔ خصوصاً بر حال شما۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

و ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُو ہم چنین آنست، واین بیت ہم در حق خاصان و ہم در حق عوام۔ اما در حق عوام مخاطب کعبہ و از لفظ "یہاں" مراد این عالم۔ و در حق خواص پس مخاطب در ب کعبہ و مقصود از لفظ "یہاں" کعبہ معظم۔ ہر چند نگارش این گونہ امور محمول بر فخر و ریای تواند بود، معاذ اللہ من ذلک۔ مگر چوں توی این امور را گنجایش نیست۔ زیادہ تا کجا نویسم، وجہ چاہے

نو مؤمن است پیلانی

والسلام۔ حکایت مولوی فضل علی و سعادت خاں ہم دراز است و دو ماغ ترنمی ماند بارے بخیریت بعد روزے چند از رسیدن مادرین جا رسیدند۔

الحمد للہ علی نعمائہ انشاء اللہ و آلا لکالہ (کذا)

محررہ غرہ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ

اردو ترجمہ

برادر والا قدر مومن خاں صاحب' سلامت

بمبئی سے جہاز میں سوار ہونے کے دن خط لکھا تھا۔ ۱۵ کو جہاز چلا اور ہم پانچویں رمضان کو عدن میں پہنچے اور لنگر ڈالا۔ دو دن کے بعد عدن سے روانہ ہوئے اور دسویں تاریخ کو مخا میں آئے' وہاں تین دن ٹھہر کر پندرھویں کو حدیدہ میں نزول کیا' یہاں دس دن قیام رہا' چھبیسویں کو حدیدہ سے چلے۔ واضح رہے کہ اگر ہوا موافق چلتی رہے تو حدیدہ سے جدہ تک پانچ دن کا سفر ہے۔ ہم نے حدیدہ سے روانگی کے دن یہ سمجھا تھا کہ ہوا موافق ہے اور پانچ دن میں جدہ پہنچ جائیں گے۔ تین دن تک چلتے رہے اور معلم جہاز کے اندازے کے مطابق جدہ پہنچنے میں دو دن باقی رہ گئے تھے' اچانک ڈیڑھ پہر رات گئے' جہاز ایک پہاڑ کی چٹان سے ٹکرا گیا جو پانی میں چھپی ہوئی تھی' اس سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گیا۔ جہاز میں پانی بھرنا شروع ہوا اور باہر سے موجیں آنے لگیں' پانی کا تلاطم کبھی جہاز کو اچھالتا تھا کبھی پٹکتا تھا۔ ایسا حال تھا جس کی شرح نہیں کی جا سکتی۔ (شعر: "اندھیری رات' موجوں کا خوف اور ایسے بھنور کا سامنا ـــــــ بھلا ساحل پر آرام کرنے والے' ہماری اس حالت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں"۔ یہ حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے۔)

اچھا لطف یہ کہ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ جگہ کون سی ہے۔ ساحل پر پہنچ کر ٹوٹا ہے یا بیچ راستے میں چکنا چور ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

بہر حال صبح کے انتظار میں ایک ایک دم گن رہے تھے کہ اگر صبح کے برآمد ہونے

تک جہاز بربادی سے بچ رہا تو معلوم ہوگا کہ قسمت کا بدا کیا ہے۔ قیاس کرنا چاہیے کہ یہ رات کس جوکھم سے صبح ہوئی ہوگی۔ غرض یہ کہ محافظ حقیقی نے جہاز کو بالکل تباہ ہونے سے محفوظ رکھا۔ ہر چند اندر ایک قد آدم پانی بھر گیا تھا لیکن سطح بچی رہی کیونکہ پہاڑ کی چوٹی پر اس سے زیادہ پانی نہ تھا ورنہ جہاز ڈوبے بغیر نہ رہتا۔ مگر جہاز کے ارد گرد تین طرف بہت زیادہ پانی تھا اور ایک طرف قد آدم سے زیادہ نہ تھا۔ صبح کو ظاہر ہوا کہ کنارے کا دور دور پتہ نہیں۔ ہاں اتنے فاصلے پر کہ جہاں تک توپ کا گولا جا سکے' ایک چھوٹے سے جزیرے کا سراغ نظر آیا۔ ادھر پانی بھی کم تھا۔ لوگ پانی میں کود پڑے کہ جس طرح بھی بن پڑے جزیرے تک پہنچ جائیں۔ اس کا طول و عرض تقریباً پچاس بیگہ کا نظر آیا' نہ وہاں پانی کا کنواں تھا' نہ برگ و گیاہ۔ نہ کوئی ایسا درخت جس کا میوا کھایا جا سکے' نہ ایسا جھاڑ جس کے سائے میں آرام کیا جا سکے۔ سوائے گھونگھوں اور کنکریوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ سامان و اسباب میں سے جو کچھ تھا وہ ہم نے سطح آب پر پھینک دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ جو کچھ جانا ہے وہ چلا جائے گا اور جو قسمت میں ہے وہ ساحل سے آ لگے گا۔ ایسا ہی ہوا جو جانا تھا گیا' جو بچنا تھا وہ آ گیا۔ بہر حال اب ڈوبنے کا خطرہ دل سے نکل گیا۔ اب یہ خوف رہا کہ اس جزیرے سے نکلنا بظاہر مشکل' بلکہ محال ہے۔ یہاں کھانے پینے کا سامان تو ہے ہی نہیں۔ اور جہاز والے دو سو سے زیادہ ہیں۔ پانی کے پیپے جو جہاز سے ساحل تک پہنچ سکے تھے صرف آٹھ عدد تھے باقی سمندر میں رہ گئے۔ پھر یہ کہ جہاز میں پانی بھر چکا تھا۔ بیوپاریوں نے ہر چند چنا اور باجرا کافی مقدار میں بھر لیا تھا لیکن اس کا یہاں تک لانا مشکل تھا اور لے بھی آئیں تو پانی کے بغیر وہ کس کام آئے گا؟ پانی پر تو زندگی کا انحصار ہے' مگر جب معاملہ تدبیر کی حدوں سے نکل جائے تو کیا کریں۔ چونکہ سب لوگ مرنے کے لیے آمادہ تھے' عافیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ ایک چھوٹی کشتی' جو جہاز میں موجود تھی' کسی طرف بھیجی جائے' اگر ہم لوگوں کی زندگی باقی ہے' تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سلامتی کے ساتھ واپس آ جائیں ورنہ وہ سمندر میں مر جائیں گے اور ہم یہاں خشکی میں۔ یہ طے کر کے کشتی جہاز سے نکالی گئی اور ہم میں سے دو آدمی' جن میں ایک مولوی فضل علی اور دوسرے سعادت خاں سپاہی تھے اور تین دوسرے اشخاص اس میں سوار ہوئے اور اس ناپید

کنار سمندر میں کشتی چلادی۔

جہاز ٹوٹنے کے سولہ دن کے بعد، جب ان کی واپسی نہ ہوئی تو یقین ہو گیا کہ وہ سب ڈوب گئے۔ ناگاہ دو کشتیاں نمودار ہوئیں، ہم نے سمجھا کہ یہ ہمارے ہی لوگ واپس آئے ہیں۔ جب وہ نزدیک آئے تو پتا چلا کہ ہمارے لوگوں میں سے تو ان میں ایک بھی نہیں۔ بہت حیرانی ہوئی۔ بارے جب کشتی والے ساحل پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ کشتی ایک ہفتے دریا میں پھرتی رہی اور آخر ساحل قنفذہ پر سلامت پہنچی۔ قنفذہ کے حاکم نے جیسے ہی یہ حال سنا تو ان کے ساتھ چھ کشتیوں کو روانہ کیا، جن میں سے دو یہ ہیں اور باقی کشتیوں کے نہ آنے کا سبب یہ بتایا کہ تمھارے لوگوں نے وہاں بحر عرب میں جہاز کا ٹوٹ جانا بیان کیا تھا۔ چناں چہ وہ کشتی والے اسی سمندر میں کھوج لگا رہے ہوں گے۔ ہم تو اتفاق سے راستہ بھول کر یہاں آگئے ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ ہم بحر عجم میں ہیں۔ سبحان اللہ کہاں سے کہاں آپڑے! بہر حال ان دو کشتیوں سے کیا ہو سکتا تھا ان ر لو گم کردہ کشتیوں کا انتظار کرنا ضروری ہوا۔ جب چھ دن تک ان کا کوئی نشان نہ ملا تو ان دونوں کشتیوں میں کچھ لوگوں کو سوار کر کے روانہ کیا، اس خیال سے کہ یہاں جتنے بھی کم لوگ رہیں اچھا ہے۔ جو بھی نکل جائے وہ تو نجات پا جائے گا۔ باقی لوگوں کے لیے بھی خدا کوئی سبب پیدا کر دے گا۔ مجھے ان کشتیوں میں جانا اس لیے گوارا نہ ہوا کہ اگر چلا جاؤں تو دوسروں کی دل شکنی ہو گی اور یہ مروت کے خلاف ہے کہ یہ بے چارے یہاں رہ جائیں اور میں نکل بھاگوں، اسی لیے میں نے کہا کہ اگر یہاں ایک آدمی بھی رہے گا تو وہ میں ہوں گا۔ دوسرے ہر چند بعض لوگوں کو کشتی کے جانے سے خوف لگتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا دل اسی طرح مطمئن تھا۔ اس کشتی کے روانہ ہونے سے ایک ہفتے کے بعد دو کشتیاں اور نظر آگئیں، خیال ہوا کہ یہ وہی کشتیاں ہیں جو راستہ بھول گئی تھیں، لیکن ان کے نزدیک آنے پر کھلا کہ یہ وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ کشتیاں چند دن تک سمندر میں کھوج لگانے کے بعد اور بحر عرب کے علاقے میں تلاش کر کے قنفذہ واپس پہنچ گئیں۔ امیر قنفذہ نے اسی وقت انھیں ڈانٹ کر پھر لوٹا دیا اور ایک کشتی ساتھ کر دی اور کہا کہ یا تو گم شدہ مسافروں کا کوئی سراغ لگاؤ ورنہ ان کی طرح تم بھی گم ہو جاؤ۔ ہم اسی طرح پھر بحر عرب میں

ڈھونڈھتے رہے اور کوئی نشان نہ ملا۔ ناگاہ موجوں کے تلاطم نے ہمیں وہاں سے دور پھینک دیا۔ اب ہم بے خبری کے عالم میں چلتے رہے، اچانک دور سے جزیرہ نمودار ہوا۔ ہم یہاں آئے تو ہم نے یہ کچھ دیکھا۔ یہ دونوں کشتیاں اگرچہ پہلی کشتیوں سے بھی چھوٹی تھیں، لیکن اب کی بار یہی طے ہوا کہ سب لوگ سوار ہو جائیں اور جتنا ہو سکے سامان ساتھ لے لیں، باقی چھوڑ دیں، مگر ہم نے مزید دس دن تک ان تین کشتیوں کے آنے کا انتظار کیا، کچھ تیز ہواؤں کا چلنا اور موجوں کا تلاطم بھی مانع سفر ہوا۔ بہر حال دس دن کے بعد اللہ پر بھروسا کر کے روانہ ہوئے۔ اگرچہ راستے میں موجوں کی طغیانی سے جو کچھ پیش آیا اس سے یہ یقین نہ تھا کہ ہم کنارے تک سلامت پہنچ جائیں گے مگر عنایت الٰہی نے ساحل تک پہنچا دیا۔ وہاں چھ دن قیام کیا پھر خشکی کے راستے سے چار دن میں حرم شریف پہنچے (اللہ کا لاکھ شکر ہے).

اب اس سے پہلے کہ اور کچھ بیان کروں، اس آیت کے مطابق کہ (اور اللہ کی نعمتوں کا چرچا کیا کرو) چند نعمتوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس منعم حقیقی کی طرف سے اس ناچیز کو ملیں۔ ہر چند نعمتوں کا بیان میرے بس کی بات نہیں کیونکہ ہر آن ہزاروں نعمتیں اس وجود پر نازل ہوتی ہیں، لیکن ان میں دو تین کا شمار کرتا ہوں: پہلی یہ کہ جہاز ٹوٹنے کے وقت سے اس وقت تک جب ہم جزیرے سے نکلے، مجھے مرتبہ تسلیم و رضا حاصل رہا کہ زبان سے سوائے شکر اور حمد کے دوسری بات نہیں نکلی اور گھبراہٹ سے تو کوسوں دور رہا۔ ورنہ انسان ضعیف البنیان ہے اسے اتنی تاب کہاں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جہاز جزیرے کے قریب ہی ٹوٹا ورنہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ اس جزیرے میں آب و دانہ کے بغیر بھی ہمیں زندہ سلامت رکھا۔ پانی کا قصہ تو میں نے سنایا ہی نہیں، کہاں تک کہوں۔ بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ اسی زمانے میں بارش ہو گئی اور اس کے پانی سے ہم دو تین دن تک سیراب ہوئے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے یہ حکمت ذہن میں آئی کہ سمندر کے پانی کو عرق کی طرح کشید کر کے پیا جائے اس طرح وہ میٹھا ہو جاتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ایک ایسے جزیرے سے، جو جہازوں کی آمد و رفت کے راستے سے ہٹا ہوا تھا، ہمیں سلامتی کے ساتھ

چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں خوب لد پھند کر لوگ بیٹھے اور ساحل تک پہنچ گئے۔ چھٹے یہ کہ کعبہ مراد کی زیارت نصیب ہو گئی اور یہ ساری نعمتوں سے افضل ہے۔

بھائی! جب سے اس مقام مقدس میں وارد ہوا ہوں جو فرحت و سرور مجھے حاصل ہے وہ روئے زمین کے بادشاہوں میں بھی کسی کو نصیب نہ ہوگا اور کیوں نہ ہو میں نے اسی دنیا میں جنت کی زیارت کر لی۔ اب تو صرف ان لوگوں کے حال پر حسرت ہے جو یہاں تک نہ پہنچ سکے خصوصاً تمھارے حال پر:

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔ یہ بیت خواص کے لیے بھی ہے اور عوام کے لیے بھی۔ البتہ عوام کے لیے خطاب کعبہ سے ہوگا اور لفظ 'یہاں' سے مراد یہ دنیا اور خواص کے لیے مخاطب رب کعبہ اور یہاں سے مقصود کعبہ معظم۔ اگرچہ ان باتوں کا لکھنا فخر وریا پر محمول کیا جا سکتا ہے (خدا اس سے محفوظ رکھے) لیکن تمھارے معاملے میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ زیادہ کہاں تک لکھوں اور لکھنے کا موقع بھی کیا ہے، لہٰذا ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔ مولوی فضل علی اور سعادت خاں کا قصہ بھی بہت طویل ہے اب لکھنے کے لیے دماغ وفا نہیں کرتا۔ بہر حال خیریت سے رہے اور ہمارے پہنچنے کے چند روز بعد وہ بھی یہاں آ گئے۔ اللہ کا شکر ہے اس کی نعمتوں پر۔

علامہ اقبالؒ اور سفر حرمین شریفین

ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام

صدر شعبہ اقبالیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

علامہ اقبالؒ دنیا کے ان معدودے چند عظیم شاعروں اور ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے شعر و ادب کو صرف اور صرف اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کیا۔ ان کے نزدیک فلسفہ و ادب اور علم و حکمت کا مقصود نہائی حرم کے مسائل کا حل ہے اور بس۔

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں[۱]

اقبالؒ نے شعر و ادب کو مکمل طور پر تبلیغ دین کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ اگر میرے کلام میں قرآنی مطالب اور آپ کی تعلیمات کے علاوہ کچھ موجود ہو تو آپ امت مسلمہ کو میرے افکار کے شر سے محفوظ رکھیں اور قیامت کے روز مجھے اپنے بوسۂ پا سے محروم فرمائیں:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن این خیابان از خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۲]

اقبالؒ حرمین شریفین حاضر نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں حرمین شریفین کے ایک سے زیادہ سفرنامے ملتے ہیں۔ جن کے لفظ لفظ سے اس زمین مقدس کے ساتھ ان کی غیر معمولی محبت و ارادت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان سفرناموں میں اقبالؒ کا مقصد محض سفر کے واقعات لکھنا نہیں بلکہ اپنے داخلی جذبات و احساسات کو بیان کرنا ہے تاکہ ایک طرف حرمین شریفین کی عزت و احترام اور عظمت و اہمیت واضح ہو اور دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں اس سرزمین پاک کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات پیدا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے علامہ اقبال کے دل میں ابتدائے عمر ہی سے حجاز مقدس کی محبت غالب تھی۔ وہ اس سرزمین پاک کو اپنی حقیقی منزل تصور کرتے تھے اور بقول مولانا رومیؒ:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش

ان کا دل حریم حجاز سے تھا ۳۔ اور وہ ہمیشہ اسی خاک پاک میں جذب ہو جانے کے متمنی رہے چنانچہ انہوں نے کہا:

"آرزو دارم کہ میرم در حجاز"

۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو ان کا جہاز جب عدن کی بندرگاہ پر پہنچنے لگا تو انہوں نے اپنے قلبی عواطف کو ایک خط میں یوں قلمبند کیا:

"چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن پہنچ جائے گا ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں"۔

اللہ رے خاک پاک مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

"اے عرب کی سرزمین تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی......... تیرے ریگستانوں نے مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذان بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔ ۳۴

پھر جب جہاز جزیرۂ سسلی کے سامنے سے گذرا تو بے تاب ہو کر کہا:

رولے اب دل کھول کر　　اے دیدۂ خونابہ بار

وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا جہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلاؤں گا

۱۹۰۸ء کے بعد کی ہوئی ایک نظم ہے جس کے مطابق کسی مہربان نے انہیں یہ خوشخبری سنائی کہ جدہ میں شفاخانہ قائم ہو رہا ہے۔ اس پر اقبال نے کہا:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں [۵]

اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اکبر الہ آبادی کو خط میں لکھا: "خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضہ رسول نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے دیکھئے کب جوان ہوتی ہے۔[۶]

۱۹۲۲ء میں شائع شدہ تصنیف "پیام مشرق" میں "نغمۂ ساربان حجاز" کے عنوان سے ایک فارسی نظم ہے جس میں اقبال اونٹنی پر سوار ہو کر حرمین شریفین جا رہے ہیں۔ یہی ان کا اصل وطن ہے۔ تمام نظم جو نہایت خوش آہنگ ہے اونٹنی کو خطاب ہے۔ اونٹنی یہاں محض ایک استعارہ ہے۔ اقبال دراصل اپنی روح سے مخاطب ہیں کہ وہ جلد حرمین شریفین پہنچ کر سجدہ ریز ہو۔ اقبال

یہی روح پیرامت میں بھی پھونکنا چاہتے ہیں۔ اس نظم کے چند آخری اشعار یوں ہیں:

شام تو اندر یمن صبح تو اندر قرن ریگ درشب وطن
پائے ترا یاسمن اے چو غزال ختن تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست
مہ ز سفر پاکشید در پس تل آرمید صبح ز مشرق دمید
جامۂ شب بردرید باد بیابان وزید تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست
نغمۂ من دلکشائے زیر و بمش جانفزائے قافلہ ھا را درائے
فتنہ ربا فتنہ زائے اے بہ حرم چہرہ سائے تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست ۷ ۔

یعنی تو شام کے وقت یمن میں ہے اور صبح قرن میں ہے۔ تیرے پاؤں میں وطن کی ریت چنبیلی کے پھولوں کی طرح ہے۔ تو غزال ختن ہے۔ ذرا تیز چل ہماری منزل دور نہیں۔

چاند تمام رات سفر کر کے تھک گیا ہے۔ وہ ریت کے ٹیلے کے پیچھے آرام کرنے لگا ہے۔ مشرق سے صبح کی روشنیاں پھوٹ رہی ہیں۔ رات کے پردے چاک ہو گئے ہیں۔ صحرا کی ہوا چلنے لگی ہے۔ تو ذرا تیز چل ہماری منزل دور نہیں ہے۔

میرا نغمہ دل انگیز ہے۔ اس کا آہنگ روح پرور ہے۔ قافلوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ ہنگامہ پرور اور انقلاب انگیز ہے۔ اے کہ تجھے حرم پاک میں پہنچ کو سجدہ کرنا ہے ذرا تیز چل ہماری منزل دور نہیں ہے۔

اس نظم کے ہلکے پھلکے الفاظ اور چھوٹے چھوٹے مصرعے بہت ہی موزوں اور مترنم ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نظم بچوں کے لیے کہی گئی ہو۔ لیکن اس نظم سے متعلق ایران میں واقعہ یہ ہوا کہ جب ہزاروں انقلابی لوگ جتھوں کی شکل میں اڑھائی ہزار سالہ سلطنتی قصر استبداد کو مسمار کرنے کے لیے شاہ کی آگ اگلتی توپوں کی طرف بڑھے تو وہ بلند آواز سے پڑھتے۔ "تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست" "تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست" بلا شبہ تشکیل پاکستان اور پھر مشرق وسطی اور وسطی ایشیا کے انقلابات کافی حد تک اقبال کے انہی اشعار کے مرہون منت ہیں۔

علامہ اقبال نے بتاریخ ۱۳ر جون ۱۹۳۷ء سر اکبر حیدری کے نام خط میں لکھا۔

"تنہا خواہش جو ہنوز میرے دل میں خلش پیدا کرتی ہے۔ یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کے مزار پر حاضری دوں جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمۂ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہو سکا۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ہر بن مو آپؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اور میری روح ایک بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آپؐ کے مزار مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔" ۸

اقبالؒ نے مذکورہ عبارت میں اپنے انفرادی شعور کی ابدیت کو اپنے لیے ناگزیر قرار دیا ہے اور اسے نبی علیہ السلام کی ذات حق صفات کا فیضان کہا ہے جو بلاشبہ شعوری حیات کی ابدیت کی عالی ترین تجلی ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے اقبال ۱۴ر جنوری ۱۹۲۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے۔" ۹

اگست ۱۹۳۷ء کو سید غلام میران شاہ کے نام ایک خط میں لکھا:

"حج بیت اللہ کی آرزو گذشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت عطا فرمائے تو یہ آرزو پوری ہو۔ اگر آپ رفیق راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو۔ عراق کی راہ جائیں تو بہت سے مقدس مقامات کی زیارت ہو جاتی ہے۔ لیکن بغداد سے مدینہ تک چھ سو میل کا طویل سفر ہے جو لاری پر کرنا پڑتا ہے۔ صحرائی سفر بہت دشوار گذار ہے۔ وہاں کی گورنمنٹ کی طرف سے اطلاع اخبار وں میں شائع ہوئی تھی کہ جن لوگوں کی صحت اچھی نہیں وہ یہ راستہ اختیار نہ کریں۔ مولوی محبوب عالم مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کی صاحبزادی فاطمہ بیگم ایڈیٹر خاتون جو حال ہی میں واپس آئی ہیں وہ بھی راستہ کی دشواری کی تصدیق کرتی ہیں۔ آپ ایسے

باہمت جوان کے لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہیں، ہمت تو میری بھی بلند ہے۔ لیکن بدن عاجز و ناتواں ہے۔ کیا عجب کہ خداوند تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور آپ کی معیت اس سفر میں نصیب کرے۔

"چند روز ہوئے سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد کا خط مجھ کو ولایت سے آیا تھا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ حج بیت اللہ اگر تمہاری معیت میں نصیب ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن درویشوں کے قافلہ میں جو لذت و راحت ہے وہ امیروں کی معیت میں کیونکر نصیب ہو سکتی ہے۔ میرے دوست غلام بھیک نیرنگ نے بھی خطوط اپنے احباب کو بغداد میں میرے کہنے پر لکھے ہیں تاکہ مذکورہ بالا راستے کے کوائف سے مفصل آگاہی ہو۔ ان کا جواب آنے پر آپ کو بھی اطلاع دوں گا۔"۱۰

اواخرِ عمر میں حرمین شریفین کے سفر کا شوق ان کے دل میں روز بروز بڑھتا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں مزید تیاری شروع کی۔ چنانچہ اطالوی کونسل جنرل نے انگلو اطالوی کمپنی لائڈ ٹرسیٹوں کے کسی جہاز میں سفر کرنے کی دعوت دی۱۱۔ اقبال سفر حجاز سے اہل وطن کے لیے ایک تحفہ بھی ہمراہ لانا چاہتے تھے۔ لیکن صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ چنانچہ اقبال عملاً سفر پر نہ جا سکے لیکن اب وہ عالم خیال میں جو بجائے خود عمل ہی کی ایک اساسی صورت ہے حرمین شریفین گئے اور وہاں سے وہ تحفہ "ارمغان حجازؒ" کی صورت میں لائے البتہ یہ تحفہ انہوں نے اپنی وفات کے بعد امت مسلمہ کو پیش کیا "ارمغان حجاز" حرمین شریفین کا روح پرور سفر نامہ ہے جو فارسی رباعیات کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اس کے پانچ حصے ہیں۔ پہلا حصہ حضور حق ہے۔ دوسرا حضور رسالت، تیسرا حضور ملت، چوتھا حضور عالم انسانی اور پانچواں بہ یاران طریق کے عنوان سے ہے۔ حضور رسالت سب سے زیادہ لطیف احساسات کے بیان پر مبنی ہے۔ اس میں وہ مکہ شریف سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے کہتے ہیں۔

بدن واماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ بطحا رہ اوست

تو باش ایں جا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

یعنی میرا بدن اگرچہ تھک چکا ہے لیکن میری روح مدینہ طیبہ کے سفر کے لیے فعال ہے۔ تم لوگ بیشک مکہ میں ٹھہرو مجھے تو اپنے محبوب کے در پر جانا ہے۔

باایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بفکرِ آشیانہ

اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرتا ہے۔ میں اپنے بڑھاپے کے عالم میں نوا خوانی کرتا ہوا مدینہ شریف کی طرف چل پڑا ہوں۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم آہستہ زد چنداں کہ گوئی بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

میں نے سحر کے وقت لونٹنی سے کہا کہ ذرا آہستہ چل کہ یہ سوار تھکا ہوا ہے۔ بیمار اور بوڑھا ہے۔ میرے کہنے پر لونٹنی اس طرح آہستہ چلی کہ گویا صحرائی ریت اس کے پاؤں میں ریشم ہو۔

مہار اے سارباں او را نشاید کہ جاں او چو جاں ما بصیر است

یعنی! اے ساربان لونٹنی کو مہار کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی روح بھی ہماری روح کی طرح دانا و بینا ہے۔

قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چو ما ہر ذرۂ او درد مند است

اے راہ مدینہ کے مسافر تو آہستہ قدم رکھ کر اس خاک کے ذرے بھی ہم انسانوں کی طرح حساس دل رکھتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کاروان ہا درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آور سجودے جبیں را سوز تا داغے بماند

یہ کتنا مقدس صحرا ہے جس میں قافلے والے درود پڑھتے ہوئے سفر کر رہے ہیں اس صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر تم بھی سجدے کرو شاید تمہاری پیشانی داغ سجدہ سے مزین ہو جائے۔

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوے یثرب سفر بے کارواں بہ

مجھے تنہائی اور آہ و فغان پسند ہے۔ میں مدینہ منورہ کی طرف اکیلا ہی سفر کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اقبال بتاریخ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء سحر کے وقت اس سفر پر عملاً روانہ ہو گئے۔ جانے سے پیشتر ایک نہایت اہم وصیت کر کے گئے جو یہ ہے کہ۔

ایک ہو مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

ارمغانِ حجاز

ایک منفرد سفر نامۂ حرمین

پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی
(نائب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)

ارمغان حجاز اپنی نوعیت کا ایک ایسا منفرد سفر نامہ حرمین ہے' جو شاعر مشرق نے تصوراتی طور پر اپنے تخیل کی دنیا میں کیا۔ اس سفر میں انہوں نے مکہ مکرمہ کی زیارت کی' وہاں سے طیبہ کا محبوب سفر شروع کیا' اہل قافلہ کو ساتھ لیا اور اپنے جذبات واحساسات کی زمام دل کے ہاتھوں میں دے کر مسافر حرمین روانہ ہو گیا:

زمام خویش دادم در کف دل

پھر شاعر عالم تصور ہی میں قریہ قریہ شہر شہر ہوتا ہوا' دشت ودریا کو عبور کرتا ہوا' کہیں ٹھہرتا کہیں رکتا اور کہیں آنسو بہاتا ہوا "خاک یثرب" کا رخ کر لیتا ہے کہ دو عالم سے خوشتر ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور اب اس کی منزل قریب ہی ہے۔ اب اس کی حالت اس پرندے کی ہے جو دن بھر کا تھکا ماندہ سر شام واپس آشیانہ کی طرف لوٹتا ہے۔

راستہ میں شاعر نعتیہ غزلیں بھی پڑھتا ہے' ذکر محبوب میں کبھی لے بلند کرتا ہے' کبھی پست آواز میں نغمہ خواں ہوتا ہے' کبھی آہنگ حجازی میں قند فارسی کے مصرے گنگناتا ہے اور کبھی اس کا طغیان مشاق اس کو ناقہ ہی سے سرگوشی پر آمادہ کر لیتا ہے:

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیراست
قدم مستانہ زد' چنداں کہ گوئی

بپائیش ریگ ایں صحرا حریراست

ان تصورات و احساسات میں غرق شاعر منزل گاہ عشق تک جا پہنچتا ہے۔ بارگاہ رسالت میں دکھ درد بیان کرتا ہے' دنیاے اسلام کے مسائل و مشکلات اور تحدیات دربار نبوت میں پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ذکر کرتا ہے۔ پھر یہاں کے راز و نیاز سے فارغ ہو کر حضور ملت اپنے تجربات اور مشورے پیش کرتا ہے۔ ان مشوروں کی روح اور عطر اس کا یہ مشورہ ہے:

بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

حضور ملت کے بعد رحمتِ عالمؐ کا پیغام عالم انسانی کو پہنچانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حضور عالم انسانی جو سب سے اہم پیغام ہے وہ ولقد کرمنا بنی آدم کی نوید جانفزا ہے:

آدمیت احترام آدمی

باخبر شو زمقام آدمی

شاعر اس پورے سفر میں یاران طریق کو نہیں بھولتا کہ پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب بالجنب اور ابن السبیل کے حقوق کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ یاران طریق سے وہ دل کی بات کرتا ہے اور ان تحدیات کا ذکر کرتا ہے جو امت مسلمہ کو درپیش ہیں۔ یہاں امت مسلمہ کی فکری لغزشوں اور علمی کوتاہیوں کا ذکر آنا بھی ناگزیر ہے۔ فرد کی ذوق یقین سے بیگانگی پر اظہار افسوس ہے۔ فرنگی بتکدہ میں فرزندان توحید کے سربسجود ہو جانے پر نالہ و فغان ہے۔ آخر میں یاران طریق کو اسوۂ شبیری پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ ان کے ایک نعرہ قد قامت سے کیا کیا قیامتیں جنم لے سکتی ہیں۔

ارمغان حجاز: ترتیب اور تعارف موضوعات

ارمغان حجاز دو الگ الگ حصوں حصہ فارسی اور حصہ اردو پر مشتمل ہے' بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اصل ارمغان حجاز حصہ فارسی ہے اور حصہ اردو کی حیثیت محض ایک ضمیمہ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو ہم تصوراتی اور تخیلاتی سفرنامۂ حرمین قرار دے سکتے ہیں وہ فارسی حصہ ہی ہے۔ اردو حصہ علامہ کی متفرق نظموں پر مشتمل ہے' فارسی حصہ درج ذیل حصوں یا

ابواب پر مشتمل ہے :

۱۔ حضور حق

۲۔ حضور رسالت

۳۔ حضور ملت

۴۔ حضور عالم انسانی

۵۔ بہ یاران طریق

ان میں سے ہر ذیلی حصہ یا باب متعدد فصول پر مشتمل ہے۔ ان فصول کے مضامین سے شاعر کی بلندی پرواز، فکر کی گہرائی، تخیل کی رفعتوں اور نظر کی پہنائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں حکیمِ مشرق اپنے تمام ہم عصروں سے آگے، بہت آگے نظر آتے ہیں۔ عربی، اردو اور فارسی کا کوئی شاعر بلندیِ فکر اور رفعت تخیل میں ارمغان حجاز کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں اقبال شاعروں اور ادیبوں کے بجائے رُومیؒ اور جامیؒ جیسے صاحب دل مفکرین، سعدی اور عطار جیسے مصلحین اور بیدل اور سنائی جیسے حکما کی محفل کے صدر نشین محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں پوری کتاب کے مندرجات کا مفصل جائزہ لینا تو دشوار ہے۔ تاہم ذیلی فصول کا ایک سرسری تعارف حسب ذیل ہے :

حضورِ حق

حضور حق گیارہ اجزا اور اکتالیس رباعیات پر مشتمل ہے. اقبال نے ان گیارہ اجزا کو الگ الگ عنوانات نہیں دیئے، بلکہ ان کو صرف نمبر لگا کر ممیز کیا ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے ہر جزو میں ایک داخلی اور معنوی انفرادیت واضح طور پر پائی جاتی ہے. ذیل میں ان میں سے ہر جزو کی رباعیات کی انتہائی مختصر تلخیص پیش کی جاتی ہے.

۱۔ بارگاہ خداوندی میں عرض ہے کہ اللہ کے خاص اور مقرب بندے مدت ہوئی دنیا سے چلے گئے، شاعر کو اس کا دکھ ہے کہ "خاصاں" چلے گے اور اب "عاماں (عامیان ؟)" ہی رہ گئے، اب تو ایسے لوگ رہ گے جو روحانی طور پہ مردہ ہیں۔ ان کی زندگی کی سطح کا اندازہ ان کے سجدوں کے سوز سے کیا جا سکتا ہے۔ میں اس دنیا سے بیزار ہو چکا ہوں اور اب تنہا ہی رہنا چاہتا ہوں.

۲۔ میرا دل۔ بے قید ایک اضطراب اور پیچ و تاب کا شکار ہے۔ میری اور میرے برادران

ملت کی حالت زار توجہ کے قابل ہے۔ ان کی روحانی زمین بنجر ہو چکی ہے اور اب اس سے زندگی سے بھرپور سجدہ کی توقع عبث ہے۔ اس دنیا میں میرے لیے زندگی بہت دشوار ہوتی جا رہی ہے۔

۳۔ دنیائے اسلام کے حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا سینہ بے سرور، دل بے سوز اور خاک بے نور ہے۔ دین و وطن کی کشمکش نے "بنائے ملی" کو منہدم کر دیا ہے۔ ان حالات میں ایسا پر سوز سجدہ چاہتا ہوں جس کے سرور سے زمین و آسمان وجد میں آ جائیں۔

۴۔ ملت کی اس تباہی کا سبب اس کے علما اور فقہا ہیں۔ تو نے ایک دانائے راز کو توفیق دی تھی کہ وہ حجاز کی نسیم جان فزا سے مشامِ جان کو معطر کرے لیکن اب اس کا بھی وقت اخیر ہے۔ اگر اور دانائے راز کا آنا مقدر ہے تو اے اللہ اس کو نوائے دل گداز عطا فرما۔

۵۔ میرا ہم عصر مسلمان بغیر کسی آرزو اور نصب العین کے جی رہا ہے۔ اس کا مقصد محض کھانا پینا ہی رہ گیا ہے، حالانکہ آرزو اور نصب العین ہی کی وجہ سے انسان ملائکہ سے بڑھ سکتا ہے، مگر افسوس کہ عصر حاضر کا مسلمان کافروں کے تراشیدہ بتوں کی پرستش میں مصروف ہے۔

۶۔ اے اللہ رومی کی شان عشق، خسرو کا سوز و مستی اور سنائی کا صدق و اخلاص عطا فرما اور مجھے بندگی کا خوگر بنا دے۔

۷۔ آج ایک نئی ملت کی ضرورت ہے، ایسی ملت جس کا نعرۂ تکبیر اس شب تاریک کو صبح درخشاں میں بدل دے۔

۸۔ اے اللہ تیری دنیا نااہلوں کے تصرف میں ہے۔ خود غرض لوگ یہاں مسلط ہیں جو دنیاوی اور دینی دونوں جذبات و احساسات کا استحصال کر کے خلق خدا کو تباہ کر رہے ہیں۔

۹۔ اے اللہ، میرا وطن آج دگر گوں ہے۔ غلامی کا دور دورہ ہے۔ میری قوم پر نماز، سجدہ اور شرع و آئین ہر چیز بار معلوم ہوتی ہے۔

۱۰۔ اے اللہ مجھے حیات جاودانی عطا فرما۔

۱۱۔ اے اللہ مجھے روز قیامت حضور (ﷺ) کے روبرو رسوا نہ فرمانا۔

حضور رسالت ﷺ

حضور رسالت ﷺ تیرہ ذیلی حصوں فصول یا اجزا اور ایک سو انیس رباعیات پر مشتمل

ہے۔ باب کا آغاز عزت بخاری کے مشہور شعر سے ہوتا ہے جو گویا سفرنامہ کے اس حصہ کی تمہید ہے:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

ان تیرہ فصول کے مندرجات کا، جن میں عنوانات کے بجائے مصنف نے صرف نمبر لگا دینے پر اکتفا کیا ہے، خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱۔ سرکار دو عالم ﷺ تک پہنچنے کا حقیقی طریقہ یہی ہے کہ عقل اور نفسانیت کو نظر انداز کر کے قلب و ضمیر سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

۲۔ دورانِ سفر شاعر کی قلبی کیفیات کا ذکر ہے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ میں سرشار آہنگِ حجازی میں فارسی کی نعتیہ اور عاشقانہ غزلیں گاتا ہوا سوئے منزل رواں دواں ہے۔

۳۔ شاعر عالم تصور میں ناقہ سے مصروف رازو نیاز ہے۔ ناقہ بھی اس عالم سرخوشی میں مسافر کی پوری طرح شریک و سہیم ہے۔

۴۔ شاعر کو عرب کا ریگستان بھی خوب معلوم ہوتا ہے۔ وہ جگہ جگہ سجدہ کرتا ہوا اپنی جبیں نیاز کو گرمیٔ صحرا سے سینکتا ہوا مصروف سفر ہے۔

۵۔ دوسرے اہل کارواں کی زبان سے شاعر کے جوش و خروش اور جذب و مستی پر اظہار حیرت و رشک ہے۔

۶۔ مسافر کے غم پنہاں کا تذکرہ ہے۔ منزل تک پہنچنے کی مشکلات کا ذکر ہے۔ راہ پر پیچ ہے، راہی خستہ و زار ہے، روشنی ناپید ہے اور رات تاریک ہے۔

۷۔ ان حالات میں شاعر کے ذوق و شوق کو مزید مہمیز لگتی ہے اور وہ عاشقانہ غزلیں گاتا چلا جار ہا ہے، لیکن ساربان سے یہ بھی کہتا ہے کہ راستہ جلدی طے کرنے کے بجائے وہ طویل راستہ سے لیجائے تاکہ آتش شوق اور بھڑکے اور اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

۸۔ اس جزو میں مسافر گویا مدینۃ الرسول ﷺ آپہنچتا ہے اور یہاں آکر وہ اپنے ہم نفسوں کو اپنے اس ذوق و شوق میں شریک کرنا چاہتا ہے اور ان کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ مل کر خواجہ

یثرب کے قدموں سے آنکھیں ملیں۔ اس لیے کہ یہ خوش نصیبی کم ہی لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ یہ مسافر کی خوش بختی ہے کہ یہ دروازہ سعادت اس کے لیے کھولا جارہا ہے۔ جب یہ سعادت ملتی ہے تو مسافر محسوس کرتا ہے کہ جہان چار سو اس کے اندر سماچکا ہے اور وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو چکا ہے اب آگے پرواز کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ یہاں آکر زمانی کو بھی حیات جاودانی نصیب ہو جاتی ہے۔ یہاں نزول معانی کے لیے الفاظ کا سہارا ضروری نہیں۔ اس بارگاہ میں حکیم و کلیم، فرزانہ و مجنون، بینا اور نابینا سبھی کی تسلی کا سامان موجود ہے۔ اس درگاہ سے کوئی محروم نہیں لوٹایا جاتا۔

۹۔ یہ اس باب کا سب سے طویل جزو ہے جو ستاسی رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان رباعیات میں زائرِ مدینہ عالم تصور میں بارگاہِ رسالت میں کھڑا ہے اور اپنے تمام جذبات و احساسات، مصائب و مشکلات، آرزوئیں اور فریادیں دربار نبوت میں پیش کر رہا ہے۔ یہی جزو دراصل وہ ارمغانِ حجاز ہے جو مصنف نے اپنی قوم کو دی ہے۔ اس حصہ میں سوز و گداز کی وہ بے مثال کیفیت پائی جاتی ہے جو کلام اقبال میں بھی خال خال ہی ملتی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان سب رباعیات کے مطالب کی تلخیص یہاں پیش کی جائے جن میں حکیمِ مشرق نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو چشم تصور میں اپنا درد دل بیان کیا ہے اور گویا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے لیکن ان سب رباعیات کی تلخیص بھی اس مختصر تحریر کو بہت طویل بنا دے گی، لہٰذا اس سے احتراز کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ نسل نو (جاوید) کے لیے اظہار آرزو کہ اس کو عشق مصطفیٰ کی دولت ارزانی ہو۔

۱۱۔ نوجوانان قوم کو فرنگی کج کلاہوں سے محفوظ رکھنے کی دعا۔

۱۲۔ جو سوز و ساز مجھے عطا ہوا ہے ویسا ہی سوز و ساز دوسرے مسلمانوں کو عطا ہو۔

۱۳۔ جزیرۂ عرب کے حکمرانوں (عبدالعزیز اور اس کی اولاد) سے خطاب کر کے ان کو چند نصیحتیں کی ہیں اور ان کو ان کی بعض مذہبی غلط فہمیوں پر متنبہ کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اے سعودیو! آؤ عشق رسول ﷺ کے جذبے کو تازہ کریں اور مدینہ کی گلیوں کو آنسوں سے شاداب کر دیں۔ اے حکمران عرب! تو اپنے ملک میں جو چاہے کر مگر دوسروں سے مدینہ

لے 'ملت اسلامیہ کی عالمی اور کائناتی ساخت کو نہ بھول' فرنگی بتوں سے لاتعلق ہو جا' فاروق اعظمؓ کی سی بصیرت پیدا کر اور جرأت سے اپنی دنیا آپ پیدا کر.

حضور ملت

"حضور ملت" کے ذیلی عنوانات یا ذیلی ابواب ملاحظہ ہوں .

۱۔ تجی دل بند و راہ مصطفیٰ رو : اس میں بارہ رباعیات ہیں.

۲۔ خودی : اس میں تین رباعیات ہیں.

۳۔ انا الحق : اس میں سات رباعیات ہیں.

۴۔ صوفی و ملا : اس میں آٹھ رباعیات ہیں.

۵۔ رومی : اس میں دس رباعیات ہیں.

۶۔ پیام فاروق : اس میں نو رباعیات ہیں.

۷۔ شعرائے عرب : اس میں گیارہ رباعیات ہیں.

۸۔ اے فرزندِ صحرا : اس میں تین رباعیات ہیں.

۹۔ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد : اس میں دس رباعیات ہیں.

۱۰۔ خلافت و ملوکیت : اس میں پانچ رباعیات ہیں.

۱۱۔ ترک عثمانی : اس میں تین رباعیات ہیں.

۱۲۔ دختران ملت : اس میں آٹھ رباعیات ہیں.

۱۳۔ عصر حاضر : اس میں پانچ رباعیات ہیں.

۱۴۔ برہمن : اس میں چار رباعیات ہیں.

۱۵۔ تعلیم : اس میں چودہ رباعیات ہیں.

۱۶۔ تلاش رزق : اس میں دو رباعیات ہیں.

۱۷۔ ننگ باچہ خویش : اس میں دو رباعیات ہیں.

۱۸۔ خاتمہ : اس میں تین رباعیات ہیں.

حضور ملت اس کتاب کا تیسرا حصہ ہے جس میں مذکورہ بالا اٹھارہ ذیلی حصے یا فصول

ہیں۔ گویا جب اقبالؒ نے بارگاہ نبوت میں اپنی معروضات پیش کر لیں اور اس عالی مقام دربار کی روحانی نعمتوں سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہو گئے' تو ان کو خیال ہوا کہ اب حضور ﷺ کی قائم کردہ ملت کی خدمت میں وہ ارمغان پیش کروں جو میں نے اس بارگاہ سے حاصل کیا ہے. یوں تو اس کتاب کے ہر حصے میں اور ہر حصے کی ہر فصل میں اقبال نے ملت مسلمہ کو درپیش تحدیات کا ذکر کیا ہے لیکن یہ حصہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس کا موضوع ہی امت مسلمہ اور اس کو درپیش چیلنج ہیں. ان تحدیات اور چیلنجوں کا تفصیلی ذکر تو آگے آئے گا' یہاں زیر نظر باب یا حصہ کے اہم مطالب کی تلخیص پیش خدمت ہے :

۱۔ "بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو" :اس حصہ میں بارہ رباعیات ہیں۔ان میں برادرانِ ملت کو راہ مصطفیٰ ﷺ پر کاربند رہنے' تعمیر حرم میں کوشاں رہنے' اسلام دشمن تحریکات سے خائف نہ ہونے' اپنے امور اور معاملات کا خود فیصلہ کرنے اور اغیار سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ خودداری اور خودنگری کے بغیر نہ دین کی کامیابی مل سکتی ہے نہ دنیا کی.

۲۔ "خودی" : مومن اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اسی وقت بیدار کر سکتے ہیں جب وہ اپنی خودی کو ترقی دیں اور اپنے آپ کو تلاش کریں.

۳۔ "انا الحق" :اگرچہ فرد کا انا الحق کہنا قابل سرزنش ہے لیکن اگر پوری قوم انا الحق کہے تو ناروا نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر امت کو اجتماعی طور پر صفات الٰہی کا مظہر ہونا چاہئے.

۴۔ "صوفی و ملا" : صوفی و ملا یعنی علمائے ظاہر و باطن کی کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے.

۵۔ "رومی" : صوفی و ملا کی کمزوریاں رومی' کے پیغام اور اسلوب پر عمل کرنے سے دور ہو سکتی ہیں۔ رومی کی "نے نوازی" سے اسرارِ فقیری وا ہوتے ہیں اور مقام کبریائی عطا ہوتا ہے.

۶۔ "پیام فاروق" :دور جدید کے حکمرانوں کو فاروق اعظمؓ کا پیغام یاد لانے کی ضرورت ہے.

۷۔ "شعرائے عرب" : عرب دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو پیغام دیا ہے اور ان کو بتایا

ہے کہ میں نے مادی حسن و جمال کا تذکرہ کرنے کے بجائے اپنی روح پرور شاعری میں انوار قرآنی اپنی قوم تک پہنچائے ہیں اور اس طرح ان کے دلوں میں ذوق و شوق اور جذبہ پیدا کیا ہے۔ لہذا اے عرب ادیبو اور شاعرو! تم بھی اپنی شاعرانہ اور ادیبانہ صلاحیتوں سے بت پرستی کے بجائے سوز و ساز پیدا کرنے کا کام لو۔ مسلمانوں کے دلوں میں ذوق انقلاب پیدا کرو۔

۸۔ "اے فرزند صحرا": اس عنوان کے تحت تین رباعیات میں اقبالؒ نے اپنی محبوب قوم یعنی عربوں سے خطاب کیا ہے اور ان کو فقر غیور کا سبق یاد دلایا ہے۔

۹۔ "تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد": اس جزو میں شامل دس رباعیات کا موضوع مردِ مومن اور مردِ حق کا انتظار اور اس کے ظہور کی آرزو ہے۔ مرد مومن کا ظہور تبھی ہو سکتا ہے جب تسلیم و رضا، صدق و اخلاص اور جنون و وفا کو شیوہ بنا لیا جائے۔ وہ دن کتنا خوش نصیب ہو گا جب میرے پیغام کی تاثیر سے وہ شہسوار بر آمد ہو گا جس کے لیے دیدۂ و دل فرش راہ ہیں۔ آئندہ رباعیات میں اس شہسوار کی صفات بیان کی ہیں۔

۱۰۔ "خلافت و ملوکیت": اس عنوان کے تحت پانچ رباعیات میں اقبالؒ نے اسلامی اور غیر اسلامی طرز ہائے حکومت کا موازنہ کیا ہے۔ اسلامی حکومت یعنی خلافت سے ناموس الٰہی کی حفاظت ہوتی ہے جبکہ ملوکیت سراپا مکر و فریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ملوکیت (یعنی انسانوں اور فرمانرواؤں کی مرضی کا بالادست ہونا) حرام ہے۔

۱۱۔ "ترک عثمانی": ان تین رباعیات میں ترکوں کی ذہنی غلامی اور مغرب پرستی پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ گو وہ بظاہر آزاد ہیں، لیکن بباطن اب بھی طلسم فرنگ کے اسیر ہیں۔

۱۲۔ "دخترِ ملت": ان آٹھ رباعیات میں مسلمان خواتین کو شرم و حیا اور حجاب اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مغرب کی کافرانہ دلبری کے مقابلہ میں شرم و حیا کا غازہ بہتر ہے۔ پھر کہا ہے کہ نظام عالم کا دارومدار خواتین کے کردار پر ہے۔ اگر کوئی قوم اس نکتہ سے غافل ہے تو اس کا نظام درست نہیں ہو سکتا لہذا اے قوم کی بیٹیو! تم حضرت

بتولؓ کے نقش قدم پر چلو اگر تم ایسا کرنے لگو تو تمہاری تلاوت سے عمرؓ جیسے انسانوں کی قلب ماہیت ہو سکتی ہے۔

۱۳۔ ''عصرِ حاضر'': اس جزو میں شامل پانچ رباعیات کا موضوع دور حاضر کی مادہ پرستی اور اس کے ہولناک نتائج ہیں۔ یہ دور طرح طرح کی بت پرستیوں اور ملحدانہ نظریات کا دور ہے۔ میں نے اس دور کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔

۱۴۔ ''برہمن'': ان چار رباعیات میں اقبالؒ نے ہندو قوم کی ذہنیت اور رویہ پر تبصرہ کیا ہے' اس کی چالاکی اور عیاری کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی دھوکہ پر مبنی پر سیاست بازی کا پردہ فاش کیا ہے۔

۱۵۔ ''تعلیم'': ان چودہ رباعیات میں اقبالؒ نے اپنے پسندیدہ اور محبوب موضوع تعلیم اور بالخصوص فرنگی نظام' تعلیم کے عواقب و نتائج سے بحث کی ہے اور اسلام کے تصور تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی ہے۔ کہتے ہیں کہ جس علم کا حاصل دل بیدار' جوان خود نگہدار اور ید بیضانہ ہو وہ بیکار ہے۔ اقبالؒ کی رائے میں دین' دانش اور ہنر جب ملتے ہیں تو قوم نہ صرف مہ و انجم کی طرح چمکتی ہے بلکہ اس کو ید بیضا بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۶۔ ''تلاش رزق'': اس عنوان کے تحت دو رباعیات میں اقبال نے عزت اور استغناء کے ساتھ روزی کے حصول کی اہمیت بتائی ہے اور کہا ہے کہ ذلت کی روزی سے موت بہتر ہے۔

۱۷۔ ''نہنگ با بچہ خویش'': ان دو رباعیات میں اقبال نے تگ و دو کرنے اور مسلسل خطرات کو انگیز کرنے کی اہمیت بیان کی ہے۔

۱۸۔ ''خاتمہ'': میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ''پاکان امت'' ہی کے فرمودات ہیں۔ میں نے راستہ بتادیا ہے اب عمل کرنا اے قاری تیری ذمہ داری ہے۔

حضور عالم انسانی

حضور عالم انسانی دراصل پوری انسانیت کے نام ارمغان حجاز یا پیغام طیبہ ہے۔ یہ رحمت اللعالمین کے دربار سے عالم انسانیت کے نام آدمیت اور احترام آدمیت کا پیغام ہے۔ کتاب کا یہ

حصہ سات اجزا پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یہ ہے.

۱۔ تمہید جو سات ذیلی حصوں یا فصول یا مشتمل ہے اور اس میں تمیں رباعیات ہیں۔ تمہید میں عمومی طور پر انسانیت سے خطاب ہے اور انسانوں کو نبی نوع انسان سے ہمدردی اور محبت کی تلقین کی ہے' بتلایا ہے کہ اس دنیا میں کامیاب رہنے کے لیے سخت کوشی اور خود شناسی کے لیے ایمان و یقین لازمی ہے' سخت کوشی کے لیے مستقبل بینی ضروری ہے۔ مصائب و مشکلات کا مقابلہ سخت کوشی ہی کے ذریعہ ممکن ہے' حتیٰ کہ موت کا مقابلہ بھی خندہ پیشانی سے کیا جا سکتا ہے

۲۔ "دل": اس عنوان کے تحت دی گئی گیارہ رباعیات میں انسان کی قلبی صلاحیتوں اور روحانی قوتوں کی وسعت اور ہمہ گیری کا تذکرہ ہے۔ دل سے مراد اقبالؒ کے ہاں وہ روحانی قوت ہے جس کی مدد سے انسان زمان و مکان کی قید سے ماورا ہو سکتا ہے اور مادی کائنات پر اس کا تصرف قائم ہو جاتا ہے.

۳۔ "خودی": اس عنوان کے تحت دی گئی چھ رباعیات میں اقبالؒ نے بتلایا ہے کہ خودی نور کبریائی سے روشن ہوتی ہے اور وہ نور حق سے ہی اپنی نمود حاصل کرتی ہے.

۴۔ "جبر و اختیار": ہر قوم کی تقدیر بڑی حد تک اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے لہذا تدبیر اور تقدیر کے درمیان توازن ضروری ہے.

۵۔ "موت": حیات جاودانی کے حصول کے لیے تگ و دو ضروری ہے' ورنہ موت مرگ دوام ہو جاتی ہے.

۶۔ "بگو ابلیس را": ان چھ رباعیات میں ابلیس کو پیغام دیا گیا ہے کہ یہ دنیا زیادہ دلچسپی لینے کی چیز نہیں ہے' اس لیے کہ یہاں کی ہر خوشی کا انجام غم ہے۔ انسان کمزور اور ناقص ہے' وہ اپنی ہر کمزوری کو ابلیس سے منسوب کر دیتا ہے' حالانکہ ابلیس انسان ہی کی قوت غضبیہ کی خارجی تشکیل ہے.

۷۔ "ابلیس خاکی و ناری": ذوق نگہ سے سارے ابلیس انسان کے خادم بن سکتے ہیں۔ اس دور کے ابلیسوں کی غلامی شرم کی بات ہے' یہ تو خود ہی بہت ذلیل و حقیر ہیں.

بہ یارانِ طریق

"بہ یاران طریق" کتاب کا آخری باب ہے جو چھ ذیلی حصوں اور تیس رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ نے اپنے ہم مشربوں سے خطاب کیا ہے اور تمہیدی رباعی ہی میں ان کو دعوت دی ہے کہ آؤ اس امت کی بگڑی بنائیں:

بیا تا کار ایں امت بسازیم
قمار زندگی مردانہ بازیم

اپنے ہم مشربوں سے اس خطاب میں اقبال نے ان کو درج ذیل نصیحتیں کی ہیں۔

۱۔ اے ہم سفر! مجھ سے میرا سوز و ساز سیکھ لے اور جو "نغمہ اللہ" ہو میرے رگ و پے سے ٹپک رہا ہے کوشش کر کہ وہ چار دانگ عالم میں ٹپکنے لگے۔

۲۔ اے ہم نشین! خالص عقلی اور منطقی علوم پر بھروسہ نہ کر، یہ سب خام اور ناقص ہیں۔ رومی اور جامی جیسے واقفان حال اور صاحبان حضور کے فیض سے مستنیر ہو۔

۳۔ دوسروں کا دست نگر بننا اور دوسروں کی مصلحتوں کے تابع رہنا بڑی ذلت کی بات ہے۔ محکومی کی روزی سے آزادی کی روکھی سوکھی بہتر ہے۔

۴۔ یہ جہاں ایک رہگذر سے زیادہ نہیں ہے، یہاں راہرو تو بہت ہیں، لیکن حقیقی ہم سفر دستیاب نہیں ہے لیکن اسی تنہائی میں گذر کرنا سیکھ۔

۵۔ دارا و جمشید کے آگے گردن جھکا کر حرم کو بے آبرو نہ کر، فرنگیوں سے اپنی حاجت بیان نہ کر اور اس بت کو اپنے طاق دل سے جھٹک دے۔

۶۔ صدق و یقین پیدا کیے بغیر مقام شوق تک رسائی ناممکن ہے۔ یقین کے لیے روح الامین کی صحبت ضروری ہے جس کے نتیجہ میں جرأت رندانہ پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ اے ہم سفر! وہ نماز ادا کرنا سیکھ جس کا قیام جلال کبریائی کا اور سجدۂ جمال بندگی کا مظہر ہو۔ جس کے نعرۂ تکبیر کی تب و تاب کی کوئی تاب نہ لاسکے۔ جس کی ایک قدِ قامت سے باطل کے ایوانوں میں قیامت آجائے۔

۸۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔

کتاب کے مضامین کی اس مختصر تلخیص کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو اہم حصوں "حضور حق" اور "حضور رسالت ﷺ" سے سفر بطحیٰ اور سفر طیبہ کی جھلکیاں پیش کی جائیں اور مصنف نے جن تحدیات کا ذکر کیا ہے ان کو بھی اختصار سے بیان کر دیا جائے۔

سفر بطحاء کی جھلکیاں

مسافر "حضورِ حق" سفر کا ارادہ اس اعلان سے کرتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں بے سروسامانی ہی اصل زادِ راہ ہے۔ یہاں مادی علائق سے قطع تعلق ہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس سفر میں جس زادِ راہ کی قدر ہے وہ آہ سوزناک، نالۂ سحری اور فغان نیم شبی ہے۔ اس راہ میں جب بھی کوئی مشکل مقام آتا ہے تو صاحب دل مسافر کو فوراً آہ و فغان نیم شب کا پیام آجاتا ہے۔ یہ آہ و فغان نیم شب اور یہ آہ سوزناک جب بلند ہوتی ہے تو سینکڑوں سال کی مسافت آنوں اور ثانیوں میں طے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مادی اسباب اور ظاہری سروسامان کے بغیر سامان آہ و فغان سے لیس مسافر بطحاء روانہ ہو جاتا ہے۔ آغاز سفر ہی میں مسافر کو احساس ہوتا ہے کہ اب محض عامیوں ہی کا دور ہے اس لیے کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند۔ اس احساس سے مسافر پر جو ندامت طاری ہوتی ہے وہ اس کی زبان کو گنگ کر دیتی ہے:

من از خجلت لب خود کم کشودیم

دورانِ سفر مسافر نے بارگاہ حق میں بہت سی دعائیں کیں، مناجاتیں کیں، راز و نیاز پر مبنی گفتگوئیں کیں، کہیں کہیں عاشقانہ ناز کے مظاہرے بھی آئے، لیکن ناز کے پردوں میں اپنے اور امت مسلمہ کے دکھوں کا ہی تذکرہ ہے، شکوہ کے اسلوب میں اپنی ہی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف ہے، طرز ادا گو شکایت کی ہے لیکن مقصود حکایت ہی ہے۔

مسافر کی دعا ہے کہ اس کو وہ سجدہ کرنے کی توفیق نصیب ہو جو اس کو نہ صرف دو عالم کی غلامی سے نجات دلائے بلکہ کائنات میں زلزلہ پیدا کر دے:

سجودے دہ کہ از سوز و سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

مسافر کو احساس ہے کہ اب اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہوا چاہتا ہے۔ اس کو اپنے اس دنیا سے

جانے کا دکھ نہیں. اس کو دکھ اس بات کا ہے کہ اب مسلمانان عالم اور فرزندان ملت اس کے اس نغمہ جاں فزا سے محروم ہو جائیں گے جو وہ چالیس سال سے بلند کر رہا ہے۔ مسافر اپنے دکھ کا اظہار اپنی اس مشہور رباعی میں کرتا ہے جو اس نے اپنی حیات ارضی کی آخری ساعات میں بھی پڑھی :

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روز گار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

لیکن یہ مسافر مایوسی اور "قنوط" کا شکار نہیں ہے۔ اس کی دنیا میں آفتاب رجائیت ہمیشہ نصف النہار پر ہی رہا۔ اس نے زندگی بھر رجاء اور امید کا درس دیا۔ اس کا تو پیغام ہی یہ رہا :

درطلب کوش و مدہ دامن امید زدست

لہذا اس باب میں وہ کیسے مایوس رہ سکتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے بعد ایک دوسرا دانائے راز اس نوائے دل گداز کی لے بلند رکھے گا۔ شاعر بارگاہ احدیت میں اس آنے والے دانائے راز کے لیے بھی دعا کرتا ہے :

اگر می آید آن دانائے رازے
بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیر امتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

دعوات و مناجات کے اس سلسلے میں ایک منفرد ایک یکتا رباعی (جس کو ایک الگ نمبر کے تحت رکھا گیا ہے) مسافر کی روحانی آرزوں اور نصب العین کا بہت جامع اور بلیغ اظہار ہے' کہتے ہیں :

عطا کن شور رومی سوز خسرو
عطا کن صدق و اخلاص سنائی
چناں با بندگی درساختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

بارہ گاہ خداوندی میں مسافر نہ ملت مسلمہ کو بھولتا ہے اور نہ اپنے وطن کو۔ وہ بارگاہ احدیت میں مسلمانوں کی کمزوری، ملک کی غلامی اور ابنائے وطن کی محکومی کی داستان خون چکاں پیش کر کے درد دل ہلکا کرتا ہے۔

اس جزو کا سب سے آخری حصہ گیارھواں حصہ ہے جو دو رباعیات پر مشتمل ہے۔ اب گویا مسافر نے بطحا کا سفر مکمل کر لیا ہے اور اب وہ حضور رسالت پیش ہونے کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہے۔ دربار رسالت میں یہ تصوراتی حاضری اس کو روز قیامت کی حاضری یاد دلاتی ہے اور وہ کانپ کر رہ جاتا ہے۔ یہ تصور اس پر لرزہ طاری کر دیتا ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ دربار نبوت میں کیونکر پیش ہو گا لہٰذا مدینہ روانگی کے وقت شاعر کی دعا ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ مارا
حساب من ز چشم او نہاں گیر

دعا یہ کہ جب یہ عالم اپنی انتہا کو پہنچے اور ہر پوشیدہ چیز ظاہر ہو جائے تو اے خدا میرا حساب حضور ﷺ کی نگاہوں کے روبرو لیکر مجھے ان کے سامنے شرمندہ نہ کرنا، میرا حساب ان کی موجودگی میں نہ لینا۔ یہ دعا کر کے شاعر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہتا ہوا طیبہ کی راہ لیتا ہے:

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوے شہرے کہ بطحا در رہ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

سید نذیر نیازی مرحوم نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ ان کی علامہ اقبالؒ سے ان کی حیات ارضی کے آخری ایام میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں علامہ مرحوم ارمغان حجاز کی ترتیب واشاعت کے مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے۔ اس ضمن میں انہوں نے یہی رباعی پڑھی۔ نیازی

صاحب بتاتے تھے کہ دوسرے مصرعہ میں لفظ بطحاء پر ان کی آواز گلو گیر ہوئی۔ تیسرا مصرعہ ذرا ضبط کر کے گلو گیر آواز میں دہرالیا۔ تھوڑا سا وقفہ کر کے ذرا ہمت کی اور چوتھا مصرعہ پڑھا اور "دوست" کا لفظ ادا کرتے ہی ہچکیاں لگ گئیں اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

سفر طیبہ کی جھلکیاں

مسافر نہ صرف ایک عارف و حکیم ہے بلکہ ایک صاحب دل عاشق بھی ہے۔ جہاں اس کا شہپر فکر بو حامدؒ و رازیؒ کا ہم سر ہے وہاں اس کا طغیانِ مشتاقی بھی رومیؒ و جامیؒ کے فیض سے مستنیر ہے۔ مسافر کو طیبہ کا سفر شروع کرنے سے قبل ہی مقام رسالت کی بلندی کا پورا احساس بھی ہے اور حضور رسالت کی نزاکت کا پورا شعور بھی۔ وہ سفر کا آغاز ہی عزت بخاری کے اس بلیغ اور مشہور و معروف شعر سے کرتا ہے:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہ شعر پڑھ کر شاعر دوسرے ہم سفروں کو اطلاع دیتا ہے کہ پیش آہنگ یعنی زادِ سفر اور قافلہ سالار تیار اور آمادۂ سفر ہے۔ اب شاعر نے لگام عقل کے بجائے دل کے حوالہ کر دی ہے اور وہ بطحاء سے سوئے یثرب رواں دواں ہے۔ وہ قریہ و شہر کی ہوا اور ماحول سے بے زار، یادِ دشت کا مشتاق، دردِ دل وا تپیدہ آرمیدہ سوئے منزل جا رہا ہے۔ قریہ و شہر سے مسافر کی بیزاری نئی نہیں ربع صدی قبل جب اس نے اس سفر کی تیاری کا آغاز کیا تھا تو اس وقت بھی مرشد رومیؒ کی زبانی اپنے احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کر دیا تھا:

کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست

لیکن آرزو اتنی منفرد ہے اور سیلابِ شوق اتنا شدید ہے کہ مسافر کو تسکین کا ایک لمحہ نصیب نہیں، تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں:

ندانم دل شہید جلوہ کیست نصیب او قرار یک نفس نیست
بصحرا بردمش، فسردہ ترگشت کنار آبجوے زار بگریست

طائر عمر اب منزل کے قریب ہے۔ راکب بھی خستہ و بیمار و پیر ہے، لیکن اس کا سرورِ عاشقانہ اب

بھی نوجوانوں کی طرح ہے۔ اور اس کو نوا پز پے در پے مجبور کرتا ہے' لیکن مسافر کو دکھ یہ ہے کہ اس کے حقیقی ہم ذوق اور ہم صفیر موجود نہیں ہیں۔ شاعر کو اس تنہائی کا اگرچہ عرصہ سے احساس ہے' لیکن یہاں اس احساس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بیساختہ پکار اٹھتا ہے:

چہ پرسی از مقامات نوایم
ندیماں کم شناسند از کجایم
کشادم رخت خودرا اندریں دشت
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

مسافر تنہائی میں ناقہ ہی سے راز و نیاز شروع کر دیتا ہے۔ ناقہ اس محبوب وجہتہ سفر میں اس کی رفیق و معاون ہے۔ اس سے وہ اپنے درد کا حال کہتا ہے۔ اپنی بیماری اور پیری کا ذکر کرتا ہے۔ ناقہ بھی پوری طرح گوش بر آواز ہے۔ اس کو مسافر کی روحانی عظمت اور جسمانی کمزوری کا احساس ہو چلتا ہے اور وہ اس طرح نرم رو اور تیز گام ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ:

بپالش ریگ ایں صحرا حریر است

جوں ہی مسافر کو ناقہ کی نزاکت احساس کا اندازہ ہوتا ہے وہ ساربان سے کہہ کر اس کی مہار چھڑا دیتا ہے کہ اب:

جان او چو جان ما بصیر است

ناقہ کے ساتھ ساتھ مسافر طیبہ دوسرے اہل کاروان سے بھی دل کی باتیں کرتا چلا جارہا ہے۔ ہم سفر رفیق کو اس کا مشورہ ہے:

بہ ریگ گرم او آور سجودے جبیں را سوز' تا داغے بماند

ریگ کا ذکر کرتے ہی مسافر کو محسوس ہوتا ہے کہ اس صحرا کا ہر ذرہ خوش نصیب ہے کہ راہ یثرب کا ذرہ ہے لہذا راہ چلنے والوں کو ان ذروں کا بھی ادب اور لحاظ ضروری ہے:

چہ خوش صحراء کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ

چو ما ہر ذرہ او درد مند است

مسافر کو اس ریگستان کے ذروں سے بھی محبت ہو جاتی ہے وہ ان پر زیادہ زور سے قدم بھی نہیں رکھنا چاہتا کہ مبادا ان ذروں کو تکلیف پہنچے.

مسافر کا سوز و گداز اور آہ و فغاں دوسرے مسافروں کو بھی متوجہ کر لیتی ہے۔وہ قافلہ سالار اور ساربان قافلہ سے پوچھتے ہیں۔کہ یہ عجمی کون ہے جو غیر عربی لے میں یہ نغمے بلند کر رہا ہے جن کی گرمی اور سیرابی سے اس بیابان میں بھی لوگ خوش خوش جی سکتے ہیں' یہ سوال سن کر جواب دینے والا جواب دیتا ہے:

مقام عشق و مستی اوست
چہ آتش ہا کہ در آب و گل اوست
نوائے او بہ ہر دل ساز گار است
کہ در ہر سینہ قاشے از دل اوست

یعنی یہ وہ عاشق زار ہے جو عشق و مستی کے بلند مقام پر فائز ہے۔اس کے جسد خاکی میں آگ بھڑکی ہوئی ہے۔اس کی یہ نواطرازی ہر درد مند دل کی آواز ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب مسافروں کے دلوں میں اسی کے دل کی قاشیں رکھ دی گئی ہیں.

اب شاعر خود اپنے احساسات کو زبان دیتا ہے۔کہتا ہے کہ اس سفر محبت میں مجھے رہ رہ کر اپنے مصائب و مشکلات یاد آرہے ہیں۔ان کا غم کہنے کو پنہاں ہے' مگر اتنا عیاں کہ ہر کسی پر روشن ہے۔میری کیفیت اس بیمار اور خستہ و زار مسافر کی سی ہے جس کو تاریک رات میں پر پیچ سفر در پیش ہو۔میں انہی احساسات میں غلطاں و پیچاں چلا جا رہا ہوں۔کبھی جذبہ میں آکر عراقی کے عشقیہ اشعار پڑھتا ہوں' کبھی جامی کی نعتیں گنگناتا ہوں۔اگرچہ میں عربی آہنگ سے مانوس نہیں ہوں' لیکن ساربان کے عربی نغموں سے اثر پذیر ہو رہا ہوں.

اسی کیفیت میں شاعر ساربان سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے ساربان! میں درد فراق کے اس سوز و ساز سے اس قدر لذت اندوز ہوتا ہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس تڑپ میں اور اضافہ ہو' لہٰذا تو میری اس کیفیت کو اور بھڑکا دے' میرے جذبہ دروں میں اور شدت پیدا

کردے' تو مجھے کسی طویل راستہ مدینہ لے چل' ایسا نہ ہو کہ لذت و محبت کا یہ سفر جلدی ختم ہو جائے:

بگیر اے ساربان راہ درازے
مرا سوز جدائی تیز ترکن

شاعر کا سفر مکمل ہوتا ہے اور وہ مدینہ کے قرب و جوار میں جا پہنچتا ہے۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دربار رسالت ﷺ 'ادب گاہ نازک تر از عرش' میں حاضری کی تیاری کرتا ہے۔ اس تیاری کے دوران وہ ساتھیوں سے خطاب کر کے چار رباعیوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ آؤ ہم اور تم مل کر آنسو بہائیں اور دل کا غبار نکالیں۔ ہم دونوں ہی حضور رسالت مآب (ﷺ) کی شان جمال کے کشتہ ہیں۔ ہمارے دل کی مراد دو حرفوں میں ادا کی جا سکتی ہے:

بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

آؤ خواجہ یثرب کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں اور ان کو پر نور کریں۔ یہ وہ دربار ہے جہاں تعقل و تفلسف کے بت توڑ کر حاضر ہونا چاہئے۔ یہاں حکیم و فیلسوف کی قیمت کم ہے سادہ اور مخلص انسان کی قیمت زیادہ ہے۔ یہاں سے عاقل نامراد اور عاشق بامراد لوٹتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ میری خوش نصیبی بھی کس درجہ کی ہے کہ شاہنشاہ کونین کے دربار میں مجھ بے مایہ درویش اور گمنام مسکین کو رسائی حاصل ہو رہی ہے:

چہ خوش بختے' چہ خرم روزگارے
در سلطاں بہ درویشے کشادند

اب وہ لمحہ قریب سے آرہا ہے' جب مسافر طیبہ چشم تصور میں حرم نبوی کے قریب پہنچتا ہے۔ جوں جوں حرم قریب آرہا ہے اس کی روحانی کیفیات میں طوفان اٹھ رہے ہیں' جذبات میں تلاطم بپا ہے۔ جوں ہی وہ روضہ اقدس کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات (جہان چار سو) اس کے اندر سما گئی ہے اور عالم لامکان کی فضا اس کے دل و دماغ میں بس گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو چکا ہے۔ جیسے ہی اس نے خود کو اس

بلند و بالا عمارت کے سامنے پایا اس کو ایسے لگا کہ اب اس کی استطاعت پرواز کم ہو چکی ہے۔ گویا جہاں سے سرکار دو عالم ﷺ کی رفعت کا آغاز ہوتا ہے وہاں مسافر کی منزلیں ختم ہو جاتی ہے اور طاقت پرواز جواب دے جاتی ہے۔ اس بستی میں علم زمانی ہستیاں جاودانی ہو جاتی ہیں' مکانی وجود لامکانی ہو جاتے ہیں۔ اس خاک پاک سے الفاظ و عبارات کے واسطے کے بغیر ہی حقائق و معارف کا صدور ہونے لگتا ہے۔ یہاں آنے والا محروم نہیں رہتا' یہاں کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا۔ یہاں سے ہر ایک دولت دیدار سے بہرہ مند ہو کر ہی جاتا ہے۔ آنے والا حکیم ہو یا کلیم اس کو لن ترانی نہیں کہا جاتا :

دریں وادی زمانی جاودانی
زخاکش بے صور روید معانی
حکیماں با کلیماں دوش بردوش
کہ ایں جا کس نگوید لن ترانی

اب وہ لمحہ آیا کہ مسافر مواجہہ شریف میں حاضر ہوتا ہے۔ چشم تصور میں' عالم تخیل میں اقبال (غالباً شروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس) آہستہ آہستہ ادب سے قدم رکھتے ہوئے' دل میں صلاۃ و درود' لب پہ صلاۃ و درود' آگے بڑھ رہے ہیں۔ دل میں جذبات کے سمندر موجزن ہیں' روح میں تلاطم برپا ہے' کون و مکان سے بے پرواہ' زمین و آسمان سے غافل' دیدار رسالت میں محو' وہ جالیوں کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں وہ ستاسی رباعیات میں اپنا حال دل حضور (ﷺ) کے سامنے بیان فرماتے ہیں۔ دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد جس چیز کی آپ کو سب سے زیادہ فکر تھی وہ آپ کی امت تھی۔ آپ امت ہی کے لیے جیے' امت ہی کے لیے دعائیں کیں۔ امت ہی کے لیے آپ کی شبوں کا گداز اور دنوں کا تگ و تاز وقف تھا۔ روز قیامت امتی امتی ہی آپ کے ورد زبان ہو گا۔ اقبالؒ نے امت ہی کی حالت زار بیان کی' امت ہی کے مصائب پیش کیے' امت ہی کی راہنمائی کی دعا کی' امت ہی کے دکھوں پر آنسو بہائے اور امت ہی کی طرف سے مناجاتیں پیش کیں :

گذارشات اور مناجاتوں کے آغاز ہی میں شاعر کو خیال ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ میں

بارگاہ رسالت میں بیان کر رہا ہوں یہ تو حضور ﷺ کو پہلے سے معلوم ہے۔ کہتے ہیں :

چساں احوال او را برلب آرم
تو می بینی نہان و آشکارم

ان گذارشات میں اقبال نے امت مسلمہ کو درپیش مشکلات و تحدیات کا تذکرہ کیا ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں نالش کی ہے۔ کہیں اپنے دکھ کا ذکر ہے، کہیں مسلمانوں کی کوتاہیوں کا شکوہ ہے، کہیں فرنگی شاطروں کی چالوں کا تذکرہ ہے، غرض ان ستاسی رباعیات میں اقبالؒ نے بلاغت کلام، ایجاز، رمز و استعارہ، تراکیب کی بندش، خیالات کی بلندی اور رفعت تخیل کی اعلیٰ ترین مثالوں کے علاوہ سوز و گداز، قلبی کیفیات اور روحانی واردات کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جن کی مثالیں اردو، فارسی اور عربی شاعری میں بہت کم ہیں۔ ان رباعیات کے مطالب کی تلخیص بڑا دشوار کام ہے۔ اس لیے کہ یہاں ہر رباعی

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

کا نمونہ پیش کرتی ہے اور ان میں اخذ و انتخاب نہایت مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے، اپنا درد دل یوں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کے ساز دل پر ضرب لگ کر رہتی ہے۔

تاہم ان رباعیات میں بالخصوص اور اس پوری کتاب میں بالعموم امت کو درپیش جن مشکلات و تحدیات کا شاعر نے ذکر کیا ہے ان کی طرف مختصر اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ارمغان حجاز اور دور جدید کی تحدیات

جیسا کہ گذارش کی گئی ارمغان حجاز ہی وہ واحد "سفر نامہ" حجاز ہے جس میں دور جدید کی تحدیات کا نہ صرف مکمل اور حقیقی ادراک کیا گیا ہے بلکہ ان تحدیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نشان منزل اور نشان راہ کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ارمغان حجاز بیسویں صدی کی دنیائے اسلام کی فکری اور تہذیبی تاریخ کا ایک نہایت اہم سنگ میل ہے۔

ارمغان حجاز میں دور جدید کی جن تحدیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے درج ذیل اسلام اور دنیائے اسلام کے مخلص اہل علم و دانش اور ذمہ دار ارباب سیاست اور اصحاب صحافت کے لیے

اہمیت رکھتی ہیں.

۱۔ قصہ دین و وطن
۲۔ روداد دو صد سال
۳۔ محکومی مسلمان اور شب غلامی
۴۔ ملوکیت
۵۔ اسلام زناردار
۶۔ لادینیت
۷۔ طلسم علم حاضر
۸۔ بند صوفی و ملا
۹۔ فرد بے گانہ ذوق یقین
۱۰۔ بے امامی ملت
۱۱۔ حیات بے آرزو
۱۲۔ بیم مرگ
۱۳۔ فقر خانقاہی
۱۴۔ غربت اندر مشرق و مغرب
۱۵۔ "مرا یاراں غزل خوانے شمردند"

۱۔ قصہ دین و وطن

قصہ دین و وطن سے مسافر حرم کو زندگی بھر اعتناء رہا۔ وطن نے جب ایک نئے سیاسی فلسفہ کی حیثیت سے اسلام کے مقابلے میں کھڑے ہونے کا اعلان کیا تو غالباً دنیائے اسلام میں مسافر حرم کے علاوہ شاید ہی کوئی اور صاحب بصیرت ایسا ہو جس نے اتنی باریک بینی اور دقت نظر سے اس مسئلہ پر غور کر کے اس خطرے کا احساس کیا ہو' دور جدید کے ملحدانہ نظریات نے جو نئے بت گھڑے ہیں ان میں سب سے بڑا' سب سے بدترین اور سب سے خطرناک صاحب ارمغان کے نزدیک وطن ہے۔ اس نے سفر بطحاء ہی میں بارگاہ احدیت کے حضور جو التجائیں پیش کیں ان

میں قصہ دین و وطن کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے خطرات کا احساس بھی شامل تھا۔ کہتے ہیں:

چہ گویم قصہ دین و وطن را
کہ نتواں فاش گفتن این سخن را

شاعر نے زندگی بھر دورِ جدید کے اس فتنہ کبریٰ کے خلاف جنگ کی اور سنت ابراہیمی پر عمل کرتے ہوئے وابستگی حرم کی بنیاد پر اجتماعیت کی تشکیل کی دعوت دی اور حرم سے بغاوت پر مبنی ہر نظریئے کو نمرودیت قرار دیتے ہوئے اس سے جنگ کی۔ نمرودان عصر اس سے ناراض رہے، وہ نمرودان عصر سے نالاں رہا:

ازان نمرود بامن سرگران است
بہ تعمیر حرم کوشیدہ ام من

شاعر کو اس کا پورا احساس تھا کہ ا[illegible] کام اس طرح حرم میں اذان دینے کے مترادف ہے جس طرح اس سے ہزاروں سال قبل حضرت [illegible] اللہ نے حرم میں یوں اذان دی تھی کہ آج تک فرزندان ملت ابراہیمی اس [illegible] لبیک کہہ رہے ہیں لیکن شاعر کو اس کا دکھ ہے کہ آج اولاد ابراہیم میں بہت سے بدنصیب [illegible] رودان وقت کی حاشیہ نشینی اختیار کر چکے ہیں۔ ایسے نمک حرام عناصر کو جھنجھوڑتے ہوئے شا[illegible] کہتا ہے:

دریں بت خانہ اولاد ابراہیم
نمک پروردہ نمرود تا چند

نمرودان وقت کے نمک خواروں سے شاعر کو نبرد آزما ہونا پڑا اس نبرد آزمائی میں شاعر دربار رسالت میں دہائی دیتا ہے:

نگاہ التفاتے بر سربام
کہ من باعصر خویش اندر ستیزم

۲۔ روداد دو صد سال

جس حدی خوان ملت نے زندگی بھر احیائے نو کا نغمہ گایا، جس نے ابنائے ملت کے ہر دکھ کا احساس کیا، جس نے دہلی، قرطبہ، صقلیہ، غرناطہ اور فلسطین میں مسلمانوں کے زوال پر آنسو

بہاے وہ حضور حق میں اپنی مناجاتوں اور حضور رسالت ﷺ میں اپنی فریادوں میں ملت کی دو صد سالہ روداد کو کیسے فراموش کر سکتا تھا؟۔ اس طویل دو صد سالہ مدت میں ملت کو جو مصائب پیش آئے اور جو آفات و مشکلات امت کو برداشت کرنا پڑیں ان پر درد کا اظہار اور ان کے درماں کی فکریں تو اقبالؒ کی ساری شاعری کا ایک اہم مضمون ہے لیکن ارمغان حجاز میں خاص طور پر یہ رنگ بڑا نمایاں ہے:

حضور رسالت ﷺ میں ایک جگہ بڑے بلیغ اور جامع انداز میں کہا ہے:

زرودادِ دو صد سالش ہمیں بس
کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم

گویا ان دو سو سالوں میں اتنے مصائب امت پر پڑے ہیں کہ ان کو سہ سہ کر، ان کو دیکھ دیکھ کر اور ان کو سن سن کر میرا دل قصاب کے تختہ کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ مسلمان کے سینے میں جو روشن دل تھا جو ایک چراغ کی طرح تاباں رہتا تھا ان دو سو سالوں میں مشتمل تاریک رات میں مردہ ہو چکا ہے:

چراغے داشتم در سینۂ خویش
فسرد اندر دو صد سالے کہ بگذشت

اس تاریک رات کی صبح تبھی ہو سکتی ہے، جب از سر نو ملت ابراہیمی کی بنا استوار کی جائے اور ایک نئی ملت کی تعمیر کی جائے۔ اقبال نے اس نئی ملت کے ظہور کے لیے دربار رسالت میں مناجاتیں کیں، فریادیں کیں اور اپنا دردِ دل پیش کر کے رکھ دیا۔ وہ ایسی ملت کے ظہور کے آرزومند ہیں جو پوری دنیاے انسانیت کو دوبارہ اخلاق و ہدایت کا درس دینے کے قابل ہو، اقوام عالم کے درمیان قائدانہ مقام رکھتی ہو اور صفات الہٰی سے متصف ہو:

میانِ امتاں والا مقام است
کہ آن امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش
کہ خواب و خستگی بروے حرام است

یہی وہ ملت ہے جو امت کے کاموں کو بنا سکتی ہے اور اس کی بگڑی سنوار سکتی ہے:

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد
دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

ملت نو کے ظہور کی آرزو شاعر کے دل میں ہر وقت موج زن رہتی ہے۔ حضور رسالت ﷺ میں اور حضور عالم انسانی سے فارغ ہو کر جب وہ یاران طریق کو مشورے دیتا ہے تو پہلی بات اس کی زبان سے یہی نکلتی ہے:

بیا تا کار ایں امت بسازیم

اور اگر اس میں قمار زندگی کی بازی لگانے کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں، بارگاہ الٰہی میں شاعر نے اپنے سفر کے آغاز ہی میں عرض کر دیا تھا کہ:

بیا نقش دگر ملت بہ ریزم
کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است

اور کہا تھا:

در قومے کہ ذکر لا الٰہش
بر آرد از دل شب صبح گاہش

۳۔ محکومی مسلمان

اقبالؒ شاعر استقلال و آزادی ہے، اس نے زندگی بھر حریت اسلام کا نغمہ گایا۔ استقلال کی حدی خوانی کی وہ امام ملت آزادگاں تھا، اس کا سارا کلام آزاد و غلام کے تقابل سے بھرا پڑا ہے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس کے سفر نامہ حرمین میں محکومی مسلمان کے درد کا تذکرہ نہ ہو؟ آج کے مسلمان کی یہ محکومی سیاسی بھی ہے اور عسکری بھی، اس کی یہ غلامی ذہنی بھی ہے اور فکری بھی۔ وہ اقتصادی استعمار کا بھی اسیر ہے اور تہذیبی استعمار کا بھی۔ اس کی عبودیت روحانی بھی ہے اور اخلاقی بھی۔ اقبالؒ نے ارمغان حجاز میں غلامی اور عبودیت کی ان تمام صورتوں کی نوحہ خوانی ہے، سرکار رسالت میں ابنائے امت کی غلامی کی ایک اہم اور افسوس ناک کیفیت کے بارہ میں عرض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج کے مسلمان نے:

دل خود را اسیر رنگ و بو کرد
تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد

رنگ و بو اور مادیات کا اسیر وہی ہوتا ہے جو محض رنگ و آہنگ کا غلام ہو، محض بلبل و طاؤس کا پیرو ہو۔ ساز و آواز اور نقش و رنگ کا نخچیر ہو۔ ایسا فرد قلب و دل اور عقل و خرد کے بجائے چشم و گوش سے ہی کام لینے کا عادی ہوتا ہے۔ آج کے مسلمان کا المیہ یہی ہے کہ وہ خود فروش اور گرفتار طلسم چشم و گوش ہے:

ز محکومی مسلماں خود فروش است
گرفتار طلسم چشم و گوش است

قلب و نظر کی اس محکومی نے اس کو غیروں کے در پر جبہ سائی کا عادی بنا دیا ہے۔ اب اس میں جرأت و ہمت اور عزم و استقلال کی خوبیاں ناپید ہو گئی ہیں اس سے اسلامی کردار کی امید کم ہے۔:

ز سیمائے کہ سودم بر در غیر
بجود بوذر و سلماں نیاید

۴۔ استعمار و ملوکیت

راہ حریت کا مسافر اور منزل استقلال کا جویا ملوکیت کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ جس مسافر کی ساری زندگی ملوکیت کے خلاف فکری، قلمی اور تہذیبی جدوجہد میں گذری تھی وہ اب منزل مقصود پر پہنچ کر ملوکیت کی ہولناکیاں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفر کے ہر مرحلہ میں ملوکیت سے اظہار بیزاری اور خلافت الٰہی کی دعوت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ حضور رسالت میں عرض کرتے ہیں:

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است
ازو ایمن نہ رومی نے حجازی است

ملوکیت وہ سراپا مکر و فریب نظام ہے جس سے نہ دنیائے مغرب محفوظ ہے اور نہ دنیائے مشرق۔ استعماری ملوکیت یا ملوکانہ استعمار کا یہ نظام نئے نئے پردوں اور نقابوں میں دنیا کے سامنے

آثار ہتا ہے۔ روشن چہروں کے پیچھے تاریک چنگیزیت ہی کار فرما رہتی ہے۔ استعمار و ملوکیت کا متبادل صرف خلافت الٰہی پر مبنی نظام ہے:

خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ برما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظ ناموس الٰہی است

خلافت اس فقر کا نام ہے جس کا مظاہرہ تاج و سریر کے ساتھ کیا جائے۔ گویا اخلاق و روحانیت اور حکومت و سیاست کے امتزاج سے جو نظام بنتا ہے وہ خلافت کہلاتا ہے۔ یہ وہ بے پایاں دولت ہے جس کی برکات ختم نہیں ہوتیں:

خلافت فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں نا پذیر است

اسی فقر کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؒ کہتے ہیں:

غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

۵۔ اسلام زنار دار

شاعر کو اس کا بڑے دکھ اور درد سے احساس ہے کہ اس کے دور میں اسلام کی تعلیم خالص اور پاکیزہ نہیں رہی۔ ناداں دوستوں، جاہل عقیدت مندوں اور زیرک دشمنوں نے اس میں اس قدر ملاوٹیں کر دی ہیں کہ اسلام کا چہرہ صافی دھندلا گیا ہے، اس کے روئے تاباں پر ملاوٹوں کی نقابیں اور غازے چڑھا دیے گئے ہیں۔ اقبال کو شکایت ہے کہ ان حالات میں شیخ و ملا نے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا۔ اب بھی شیخ کی ساری متاع اساطیر کہن اور ملا کی تمام تر گفتگو محض ظن و تخمین پر مبنی ہے:

متاع شیخ اساطیر کہن بود
حدیث او ہمہ تخمین و ظن بود

یہی وجہ ہے کہ ہندی مسلمان کا اسلام بھی تک زنار دار (ہندوؤں کے عقائد اور رواجات سے متاثر) ہے :

ہنوز اسلام او زنار دار است

اس نے حرم کو اسیر بنا ڈالا ہے اور خود برہمن بن بیٹھا ہے۔ جس کو حرم کی نگہبانی کرنی تھی وہ دیر کا معمار بنا ہوا ہے۔ اقبال حضور رسالت ﷺ میں فریاد کرتے ہیں :

نگہبان حرم معمار دیر است
یقینش مردہ و چشمش بغیر است

۶۔ لادینیت

دور جدید میں مادیت کے سیلاب اور عقل و خرد کی طغیانی نے جہاں اور بہت سی بستیاں تاراج کی ہیں وہاں اخلاق و کردار' دین و مذہب اور روحانیت کی بلند و بالا عمارتیں بھی زمین بوس کر ڈالیں۔ یورپ کی مادہ پرستی کے سیلاب نے اپنی خواہشات اور شہوات کے راستہ میں جس جس چیز کو حائل پایا اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مذہب و اخلاق اور انسانیت و روحانیت کو عملی اور اجتماعی زندگی سے دربدر کر ڈالا' تجارت و سیاست کو ایک دوسرے کا حلیف قرار دے کر استعمار و ملوکیت کا ایک ایسا دیو استبداد پیدا کیا جس نے فرعون و نمرود اور ہامان و قارون کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا' کہتے ہیں :

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش باقی و فانی
و لیکن الامان از عصر حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی

یہ شیطانی نظام جس کو لادینیت کی بظاہر سادہ سی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے نہ صرف سیاسی نظام اجتماعی زندگی' اخلاق و کردار اور دین و مذہب کو متاثر کرتا ہے' بلکہ لوگوں کے ذہن اور عقل و مزاج کو بدل کر رکھ دیتا ہے' اس نظام میں علم وسیلہ استعماری بن جاتا ہے۔ ایسے استعماری علم و فکر کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ ازو روح قومے می تواں کشت

۷۔ طلسم عصر حاضر

دور جدید کی مادیت پرستی رنگارنگ اور تیز رفتار تہذیب ایک دیو مالا اور طلسم سے کم نہیں۔ ظاہر بیں آنکھیں اس کی تیز روشنیوں سے چکاچوند اور پرکاری سے مبہوت ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ تین سو سال میں مغرب کی تہذیبی اقدار اور تمدنی مظاہر سے متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہونے والوں کی تعداد کروڑوں میں نہیں تو لاکھوں میں ضرور ہے۔ ان حالات میں اقبال ان معدودے چند اہل دانش اور اصحاب بصیرت میں تھے جنہوں نے اس چمک دمک اور ظاہری شان و شوکت کے پیچھے جھانک کر دیکھا اور مغربی تہذیب کی روح تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے اس طلسم کو خلق خدا کے لیے تباہ کن نتائج کا حامل قرار دیا اور اس کا پردہ چاک کرنے کو اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ اس مشن میں ان کو بہت سی آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ ان آزمائشوں اور مشکلات کو وہ نار ابراہیم سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

طلسم علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گستم
خدا داند کہ مانند براہیم بہ نار اوچہ بے پروا نشستم

حضور رسالت مآب علیہ السلام میں کی گئی مناجات کے درمیان بھی وہ اس آزمائش کا ذکر کرتے ہیں اور حضور علیہ السلام کی بارگاہ سے ایک نگہ التفات کی خواہش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نگاہ التفاتے بر سر بام کہ من با عصر خویش اندر ستیزم

۸۔ بند صوفی و ملا

عصر حاضر کے تحدیات اور مشکلات و مسائل میں ایک نہایت افسوسناک مسئلہ اہل دین اور حاملان مذہب کی بے توقیری اور بیشتر صورتوں میں نا اہلی اور کم فہمی کا بھی رہا ہے۔ اقبالؒ کے ہاں حقیقی روحانی جذبہ سے بے بہرہ ظاہر پرستی کا شکار اور رسول و رواجات خانقاہی کا علمبردار

صوفی اور لکیر کا فقیر' فرقہ پرست' دین کی روح سے نا آشنا اور ظواہر پر زور دینے والا ملا دو اہم علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صوفی ایک مردہ' بے اثر اور از کار رفتہ روایت کا محافظ ہے۔ ملا فروعی مسائل کو اہمیت دینے والا' دین کی اساسات کو غیر اہم سمجھنے والا' فرقہ پرست اور جھگڑالو مذہبی لیڈر شپ کا نمائندہ ہے۔ اقبالؒ دونوں سے اظہار براءت کرتے ہیں۔ ان کو ایسے درویش درکار ہیں جو قلندرانہ لوائیں رکھتے ہیں' جن کا جمال جنید و بایزید کا اور جلال طغرل و سنجر کا نمونہ ہو' جن کی ایک نگاہ سے فرعونوں اور نمرودوں کے ہوش اڑ جاتے ہوں' جن کے ذوق یقین سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہوں۔ ان کو ایسے اہل علم کی تلاش ہے جن کا علم نور بصیرت سے مستنیر ہو' جس میں عقل و عشق کی متوازن آمیزش ہو' جو مسلمانوں کے قرن اول کی مجددانہ اور مجتہدانہ علمی روایت کے امین ہوں' جن کا علم و معرفت نور قرآن سے سرشار ہو۔

اقبالؒ نے یہ تمام مضامین ارمغان حجاز میں بھی دہرائے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر مسلمان سے شاکی ہیں:

بہ بند صوفی و ملا اسیری
حیات از حکمت قرآں نہ گیری

ایک جگہ ملا کی خشکی اور بے روحی کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دل ملا گرفتار غمے نیست نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتب او کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

۹۔ فرد بیگانہ ذوق یقین

طلسم علم حاضر کی پیدا کردہ تباہ کاریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قلب و خرد کا رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ اب خرد ذوق یقین سے آشنا نہیں رہی۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سوز و سرور کا نغمہ اس زور شور سے بلند کیا جائے کہ اس سے زمین و آسمان وجد میں آجائیں:

بجودے دہ کہ از سوز و سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

قلب و خرد کے اس ٹوٹے ہوئے تعلق کو دوبارہ جوڑنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان کے دل

۔ دوبارہ ذوق و شوق اور آرزو پیدا کی جائے۔ ذوق و شوق اور آرزو صرف "تعلق مع اللہ" سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ اللہ سے رشتہ جڑ جائے اور دل میں ذوق و شوق اور سوز آرزو پیدا ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مسلمان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ پھر اس کی نماز اس کے لیے وسیلہ حیات ابدی بن جاتی ہے اس کی ایک قد قامت کے نعرہ سے عالم باطل میں قیامت آجاتی ہے:

دو گیتی را صلا از قرات اوست
مسلماں لایموت از رکعت اوست
براگشتہ ایں عصر بے سوز
قیامت ہا کہ در قد قامت اوست

۱۰۔ بے امامی ملت

اقبالؒ کو بڑا دکھ اس بات کا بھی ہے کہ ملت بے امام ہے اور اس کا سارا کاروبار حیات بے نظام ہے:

زکار بے نظام او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است

اقبالؒ کو تلاش ہے اس دیدہ ور کی جو دور بین ہو، جس کی نگہ بلند ہو، سخن دلنواز ہو اور جان پر سوز ہو، وہ پوچھتے ہیں:

دلے با من گو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

۱۱۔ حیات بے آرزو

مسافر کو اس کا بڑا دکھ ہے۔ کہ آج مسلمانوں کا کوئی اجتماعی نصب العین باقی نہیں رہا۔ نہ ان کے دل میں کوئی بڑی روحانی اور اخلاقی آرزو جنم لیتی ہے اور نہ وہ مادیات و شہوات سے ماورا ہو کر کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے کوشاں ہیں۔ مسافر کو حیرت ہے کہ بغیر کسی اونچے نصب العین اور آرزو کے مسلمان کیونکر جی رہا ہے:

گریباں چاک و بے فکر رفو زیست
نمی دانم چساں بے آرزو زیست
نصیب اوست مرگ ناتمامے
مسلمانے کہ بے "اللہ ہو" زیست

ایک دوسرے مقام پر جب شاعر نے یہی مناجات خالق کائنات کے روبرو پیش کی تو

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

۱۲۔ بیم مرگ

مسافر اپنے روحانی اور فکری سفروں اور مشاہدات میں جن مسلمانوں سے آشنا اور متعارف ہوا تھا وہ موت سے خائف نہ تھے بلکہ ہر لحہ موت کو گلے لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں جب مسافر نے عالم تصور سے نکل کر عالم حقیقت میں آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ آج کا مسلمان موت سے خائف اور اس کے نام سے ترساں و لرزاں ہے۔ شاعر نے اس پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

مسلمان زادہ و نا محرم مرگ
ز بیم مرگ لرزاں تا دم مرگ
دلے در سینہ چاکش ندیدم
دم بگسستہ بود و غم رگ

۱۳۔ فقر خانقاہی

اقبال کے ہاں فقر خانقاہی سے مراد وہ فقر و بیچارگی ہے جو حقائق زندگی سے فرار اور شکست خوردگی پر مبنی ہو۔ اقبالؒ کے خیال میں جب مسلمانوں میں سیاسی کمزوری اور عسکری اضمحلال کے اثرات سامنے آنے شروع ہوئے تو ان میں حقائق زندگی سے فرار پر مبنی رویہ پیدا ہونے لگا جس کا ایک اہم مظہر فقر خانقاہی بھی ہے۔ یہ فقر خانقاہی جب پیدا ہوتا ہے تو دین کی

اصلی روح مر جھا جاتی ہے اور دنیا میں مسلمانوں کو شرمسار ہونا پڑتا ہے۔
کہتے ہیں:

مسلماں شرمسار از بے کلاہی است
کہ دینش مرد و فقرش خانقاہی است
تو دانی در جہاں میراث ما چیست
گلیمے از قماش پادشاہی است

اقبالؒ کے نزدیک اسلام کی اصل شان یہ ہے کہ بادشاہ گلیم پوش ہو، فقیر درویش کے ساتھ ہم آغوش ہو اور سیاسی قوت وحی الٰہی کے احکام کے تابع ہو:

۱۴۔ غربت اندر مشرق و مغرب

اقبال کو شدت سے یہ احساس تھا کہ وہ فکری اور جذباتی طور پر تنہائی کا شکار ہیں، اس دنیا میں ان کا کوئی حقیقی ہمراز نہیں ہے اور وہ اس بھری پری محفل میں غریب الدیار ہیں۔ ارمغان حجاز میں انہوں نے جابجا اپنی اس تنہائی اور غربت کا شکوہ کیا ہے۔ ان کو اس کا دکھ ہے کہ ان کا کوئی راز داں نہیں جس سے وہ اپنا دکھ کہہ سکیں:

غریبم درمیان محفل خویش
تو خود گو، با کہ گویم مشکل خویش

وہ اس زندگی کو ایک سفر قرار دیتے ہیں، لیکن ہزارہا مسافروں میں۔۔ کوئی ایک بھی ان کا حقیقی ہم سفر نہیں ہے:

بچشم من جہاں جز رہگذر نیست
ہزاراں رہرو و یک ہم سفر نیست

وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

درون سینۂ من منزلے گیر
مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

ایک دوسری رباعی میں بارگاہ رسالت میں ہی میں یہ یوں کہتے ہیں:

من اندر مشرق و مغرب غریبم که ازیاران محرم بے نصیبم
غم خود را بگویم بادل خویش چه معصومانه غربت را فریبم

۱۵۔ مرا یاراں غزل خوانے شمردند

اقبالؒ نے سرکار رسالت مآب ﷺ میں جو شکایتیں سب سے زیادہ دلدوزی سے کی ہیں ان میں یہ شکایت بھی شامل ہے کہ ان کی قوم نے ان کے پیغام پر توجہ دینے کے بجائے ان کو محض ایک شاعر سمجھا اور ان کے شاعرانہ کمالات ہی سے دلچسپی لی۔ مغربی فکر اور فرنگی تہذیب و تمدن پر ان کی تنقید سے کسی نے استفادہ نہیں کیا اسلامی تعلیمات کو جس انداز اور پیرایہ میں انہوں نے پیش کیا اس سے کم ہی لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ بیشتر لوگوں نے ان کی غزل خوانی اور غنائیت ہی پر سر دھنے۔ اس کی شکایت کرتے ہوئے سرکار دو عالم ﷺ سے کہتے ہیں:

باآں رازے که گفتم پے نه بردند
زشاخ نخل من خرما نخوردند
من اے میرامم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

ایک دوسری جگہ اس مضمون کی شکایت حضور رسالت مآب ﷺ میں ان الفاظ میں کی ہے:

تو گفتی از حیات جاوداں گوئے
بگوش مردہ پیغام جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں
که تاریخ وفات این و آں گوئے

یہ ناحق شناسی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ قوم میں مذاق سلیم کی کمی ہے اور اس نے سنجیدہ امور سے صرف نظر کر کے محض رنگ و آہنگ اور فن و فرہنگ کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا ہے۔ اقبالؒ کی یہ شکایت دراصل اپنے لیے کسی مقام و مرتبہ کے حصول کی غرض سے نہیں' بلکہ دراصل یہ قوم کی بدمذاقی اور غیر سنجیدگی پر اظہار تاسف ہے۔

ارمغان حجاز کے معانی و مطالب ایک اتھاہ سمندر ہیں۔ ان کا مفصل اور مکمل جائزہ کسی مختصر تحریر میں بہت مشکل ہے۔ لیکن ان گذارشات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ارمغان حجاز اپنی نوعیت کا ایک منفرد سفرنامہ حرمین ہے جس میں مسافر حرم نے ملت مسلمہ کو درپیش تحدیات کا بڑی دقت نظر اور باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ افسوس ہے کہ ارمغان حجاز اقبالؒ کی نسبتہً کم مقبول کتابوں میں شامل رہی ہے۔ اقبال کے دوسرے شعری مجموعوں کے مقابلہ میں اس کے ایڈیشن غالباً سب سے کم نکلے۔ یہ بھی قوم کی بدمذاقی کا ایک ثبوت ہے۔

حرمین شریفین کے اردو سفر ناموں کے علمی و ادبی اسالیب

ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی
(پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھارت)

اسلوب کی تعریف میں بھلے ہی تعبیر کا اختلاف ہو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہر مضمون کا اپنا خاص اسلوب ہوتا ہے۔ اسکی تعیین، تشکیل اور تعمیر میں کئی عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ مضمون و موضوع کی اپنی فطرت و نوعیت بنیادی عنصر ہے، جیسا مضمون ویسا اسلوب۔ مضمون نگار کا علم و فضل دوسرا عنصر بن جاتا ہے۔ پھر اس کی ذہنی ساخت، تعلیمی پس منظر، تربیتی ماحول، فکری زاویۂ نگاہ، تہذیبی اٹھان، سماجی اور معاشرتی پرورش، مذہبی نقطہ نظر اور ان جیسی کئی دوسری قدرتی اور اکتسابی چیزیں ذیلی عناصر کا کام کرتی ہیں۔

ذات مضمون اور صفات مضمون نگار کے علاوہ کئی اور خارجی عناصر اور بیرونی عوامل بھی تشکیل اسلوب میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مضمون کی تاریخ اور تہذیبی ترقی، چاہے وہ معکوس ہی کیوں نہ ہو اس پر اثر انداز ہوتی ہو۔ قدیم نمونے اور پیشرو مثالیں متاخر اہلِ قلم کی کافی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کا فقدان اہل نگارش کو اپنی بینش کام میں لانے اور اپنی راہ خود متعین کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ دوسری زبانوں کے نمونے بھی ہدایت نامے بن جاتے ہیں۔ علاقائی اثرات بھی کبھی اپنا رنگ جماتے ہیں۔ ناقدین کی تنقیدات، مبصرین کے تبصرے حتٰی کہ معترفین کی تحسینات اور مستہزئین کی گل افشانیاں بھی کام کر جاتی ہیں۔

سفر نامہ کا فن اب ادب کا ایک لطیف حصہ اور اسکی ایک حسین صنف ہے۔ اصلاً وہ جغرافیہ کی ایک شاخ تھا، فنی ترقی کے بعد اسے تاریخی جغرافیہ کا حصہ قرار دیا گیا۔ مشرقی اور

مغربی ادب میں اس کے نمونے قدیم سے ملے ہیں اگرچہ خال خال ہیں' پہلے ان کی نگارش خالص جغرافیہ داں عالموں کی جاگیر تھی' پھر اس پر سیاحوں کا قبضہ ہوا' عہد جدید میں اہل ادب نے اس پر تصرف کیا' اب ہر ایرے غیرے کا مال بن گیا ہے' آبروئے شیوہ اہل فن جاتی ہے تو بوالہوس اسی طرح حسن پرستی اختیار کر لیتے ہیں۔

سفر نامہ کے فن کی ایک خاص صنف حج نامے ہیں۔ تمام حج نامے اصولی طور سے حرمین شریفین کے سفر نامے ہیں۔ مکہ مکرمہ اور اس کے اطراف مبارکہ کا سفر نامہ ہی حج نامہ ہے' مگر اسلامی روایت نے مدینہ منورہ کے سفر نامے کو بھی اس کا لازمی ضمیمہ بنادیا ہے۔ اب کتاب فن بلا ضمیمہ مبارکہ ناقص سمجھی جاتی ہے۔ اسلامی روایت کی توسیع نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اکثر ضمیمہ یعنی سفر نامہ مدینہ منورہ' اصل کتاب کے بعد' یعنی سفر نامہ مکہ مکرمہ کے بعد آتا ہے' لیکن کبھی کبھی تذکرہ حرم مدینہ تذکار حرم مکہ سے پہلے آجاتا ہے۔ حرمین شریفین کے سفر ناموں کی تقدیم و تاخیر میں اصل عنصر وقت کا جبر ہوتا ہے۔ وہ کبھی زائر و سفر نامہ نگار کی خواہش سے ابھرتا ہے اور کبھی حکومت و انتظامیہ کے حکم و فیصلہ کی میزان سے صادر ہوتا ہے۔

شاید ہی ایسا کوئی بدنصیب حاجی سفر نامہ نگار ہو گا جس نے اپنی نگارش کو دیار حبیب کی جنت نگاہ تحریر سے محروم رکھا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ "ہر حج نامہ سفر نامہ حرمین شریفین" ہے' لیکن ایسے کئی بے بخت و غیر سعید سفر نامے ہیں جو تذکار حرم مدینہ سے مالا مال ہونے کا باوجود تذکرہ حرم الٰہی کی دولت سے محروم و تہی دست ہیں۔ خواجہ نظامی در در کی خاک چھانتے پھرے' قسمت ان کو حرم مدینہ تک لے گئی' لیکن توفیق الٰہی اور خوش بختی کے دروازے ان پر نہیں کھل سکے۔ فکر و عقیدہ اور عمل کی کج کلاہی اور کجروی ان کو دہلیز حرم اوّل سے پہلے ہی واپس لوٹا لے گئی۔ ان کا سفر نامہ مدینہ منورہ کا سفر نامہ تو ہے مگر سفر نامہ حرمین شریفین نہیں۔ پھر ایسا سفر نامہ حرم ثانی کیا جو سفر نامہ حرم اصلی سے خالی ہو۔ اس نے تو بنیاد ہی پر تیشہ چلادیا۔ بے بنیاد عمارت کی تعمیر کا عمل و انجام معلوم۔ طرفہ ستم یہ کہ بعض تجزیہ نگاروں نے اسے حج نامہ بنادیا (انور سدید' ص ۲۸۱۰-۲۸۲)۔

اخلاص نیت اور خلوص فکر ہر سیاح و زائر کا دائرہ عمل و سفر متعین کرتے ہیں۔
عازم حج اول و آخر حرمین شریفین کا قصد و ارادہ کرتا ہے اس کا سفر حرمین شریفین کو محیط ہوتا ہے۔ حج و زیارات کا شائق دوسرے مقامات مقدسہ یا غیر مقدسہ کی نیت باندھ کر چلتا اور حرمین کے علاوہ دوسرے مقامات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ بلاد اسلامیہ اور ممالک مسلمہ یا بلاد عربیہ کے سیاحت کرنے والے اصلاً تو دوسرے مقاصد سے نکلتے ہیں، مگر ان میں ایک ضمنی مقصد سفر حرمین بھی بن جاتا ہے۔ بعض کے ہاں یہ ضمن اصل کا ایک جزو لاینفک اور لازمی ہوتا ہے، مگر اکثر کے نزدیک سر راہے۔ ایک منزل یا فقط نشان منزل۔ بلاد اسلامیہ یا ممالک عربیہ کے سفر نامے حرمین شریفین کے تذکرہ کو ایک ضمنی باب یا حسن خاتمہ ہی سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ بھی حرمین شریفین کے سفر نامے ہیں۔ مرزا قاسم بیگ کا زاد الزائرین احمد حسین خاں کا سفر نامۂ حجاز و مصر، شبیر الحسن کربلائی کا سفر نامۂ عراق و عرب و عجم، الیاس برنی کا صراط الحمید (اول)، محمد حفظ الرحمن و فاؤ بایوی کی راہ وفا، سید محمد جواد کا سفر نامۂ مقامات مقدسہ، مسعود عالم ندوی کا دیار عرب میں چند ماہ، ابوالحسن علی ندوی کا شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ ابوالاعلیٰ مودودی / محمد عاصم کا سفر نامۂ ارض القرآن، عبدالصمد صارم کا سفر نامۂ حج و زیارت، نسیم حجازی کا پاکستان سے دیار حرم تک، محمود عثمان حیدر کا مشاہدات بلاد اسلامیہ، محمد شفیع صابر کا سفر نامۂ حج و زیارت، محمد عارف کا حریم دیدہ و دل اور متعدد دوسرے سفر نامے بلاد اسلامیہ وغیرہ کے اصلاً اور حرمین کا ضمناً سفر نامے ہیں.

عالمی سیاحت پر مبنی سفر ناموں میں بعض حرمین یا حج کے سفر نامہ بھی بطور ایک باب شامل رکھتے ہیں۔ قدیم جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کے سفر نامے اسی نوعیت کے ہیں مقدسی کی کتاب جغرافیہ ہے جو سفر نامہ بھی بن گئی ہے۔ یہی حال ابن حوقل اصطخری، یعقوبی اور بعض دوسرے قدیم سیاحوں کے سیاحت نامہ کا ہے۔ ابن جبر اور ابن بطوطہ کے رحلات، ان کے عالمی سیاحت نامے ہیں جو حرمین شریفین کے تذکار مقدس کے سبب جزوی طور سے حرمین کے سفر ناموں بن جاتے ہیں۔ ان کے اردو تراجم اور دور جدید کے بعض عالمی سیاحت ناموں میں حرمین کے ابواب اسی طرح اپنی نوع کی نمائندگی کرتے ہیں.

اردو میں سفر نامۂ کی روایت چونکہ عربی اور اس سے زیادہ فارسی سفر ناموں کے زیر اثر آئی ہے' اس لیے عالمی فارسی سفر نامے بالخصوص بر صغیر پاک و ہند کے قدیم و متوسط فارسی حج نامے اور دوسرے سفر نامے ایک نئے رجحان و اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں' بالخصوص ان کے اردو تراجم۔ ان میں ناصر خسرو کی زاد المسافرین' شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی جذب القلوب الی دیار المحبوب' رفیع الدین مراد آبادی کے سوانح الحرمین (اردو ترجمہ بعنوان سفر نامۂ حجاز)' نواب مصطفی خاں شیفتہ کی ترغیب المسالک الی احسن المسالک (اردو ترجمہ بعنوان ماہ منیر) شامل ہیں۔ عربی اور فارسی اسالیب بھی ان کے ساتھ آنے ناگزیر تھے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی تابناک و رجحان ساز ہے کہ اردو کے خالص سفر نامۂ ہائے حرمین شریفین اور حج نامے عربی فارسی اسالیب سے قطعی آزاد ہو گئے اور انھوں نے علمی فنی ترقی کا ساتھ اپنے اپنے اسالیب پیدا کیے۔

اردو کے اولین حج ناموں' عالمی سیاحت ناموں' بلاد اسلامیہ یا ممالک عربیہ کے سفر ناموں کے دوش بدوش حرمین شریفین کے زائرانہ تذکار حیات ناموں اور سوانحی ادب میں بھی برابر ملتا ہے۔ بالخصوص ضخیم خود نوشت سوانح حیات میں۔ مذہبی نقطۂ نظر اور دینی اقدار کے حامل خود نوشت سوانح حیات میں وہ ایک طویل باب ہوتا ہے جو اگر علحدہ کتابی صورت میں چھاپا جائے تو کامل آزاد سفر نامۂ حرمین بن جائے۔ بالعموم یہ انداز پیشکش ان صاحبان قلم کے ہاں ملتا ہے جو خالص حج نامۂ نہیں لکھتے' بلکہ اپنے حج کو مجموعی فرائض و مراحل حیات و عمل کا ایک جزو ترکیبی گردان کر اسے تذکرۂ حیات بنا دیتے ہیں۔ عہد جدید میں قدرت اللہ شہاب کا شہاب نامۂ "تو ابھی راہ گذر میں ہے" کے عنوان سے ایسا ہی سفر نامۂ حرمین رکھتا ہے۔

رہ نمائے حج کا اسلوب

اردو کے اولین سفر نامۂ حرمین خواہ محمد منصب علی خاں کا ماہ مغرب المعروف بہ کعبہ نما تسلیم کیا جائے یا نواب صدیق حسن خاں کا سفر نامۂ رحلۃ الصدیق الی بیت العتیق، انیسویں صدی عیسوی کے تقریباً تمام سفر ناموں کا اسلوب زیادہ تر رہ نمائے حج یا گائیڈ بک کا سا ہے۔ صاحب نگارش کا بنیادی خیال و نقطۂ نظر یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے واقعات سفر حج و زیارت کے پس منظر میں اپنے قارئین اور دوسرے عازمین کے لے ایک ہدایت نامہ پیش کرے، ان کو مناسک حج اور آداب زیارت سے آگاہ کرے، مشکلات راہ سے بچائے، مصائب و خطرات کی نشاندہی کرے اور ضروری معلومات فراہم کرے۔

ہدایت نامہ کا اسلوب قدیم سفر ناموں پر زیادہ حاوی ہے، مگر جدید سفر ناموں کے لکھنے والے بھی اس روایت سے اپنے آپ کو کلی طور سے آزاد نہیں کر سکے۔ متعدد معاصر یا جدید سفر نامے تو رہ نمائے حرمین اور ہدایت نامے ہی بن کر رہ گئے ہیں، محمد عمر علی خان کا زاد غریب (۱۸۸۰ء)، وزیر حسین بریلوی کا وکیل الغرباء (۱۸۸۱ء)، مرزا قاسم بیگ کا زاد الزائرین (۱۹۰۱ء)، سبحان اللہ گورکھپوری کا میرا سفر حج (۱۹۰۳ء)، عبدالرحیم نقشبندی کا سفر حرمین شریفین (۱۹۱۱ء)، محمد شریف امرتسری کا سفر نامۂ حج (۱۹۲۷ء)، پیر محمد غوث قریشی کا سفر نامۂ غوثیہ (ت۔ن) مرزا عبدالحلیم بیگ کی سرگذشت حجاز، عبدالمجید صدیقی کا سبیل الرشاد اور ایچ بی خان کا سفر نامۂ کراچی سے گنبد خضرا تک دوسرے عازمین حج اور اپنے سفر ناموں کا قارئین کے لیے مسائل حج، سفر حرمین کے لیے ضروری ہدایات اور لازمی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان تمام سفر ناموں میں واقعات و حالات سفر کا بیان بھی ہدایت و نصیحت کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی زبان و بیان اور اسلوب معمولی اور غیر ادبی ہوتا ہے۔ ہدایت نامہ بنانے کی وجہ سے ادبیت کا عنصر مفقود ہونا لازمی ہے۔

روایتی بیانیہ

بیشتر سفر نامے' خواہ حرمین شریفین کے ہوں یا دوسرے بلاد و امصار کے' مشاہدات کو روایتی بیانیہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان و طرز اولاً معلومات و واقعات بیان کرنے کا ہوتا ہے۔ ایسے تمام سفر ناموں کو معلوماتی کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو تمام سفر ناموں کا ایک مخصوص خاکہ و ہیولیٰ فارمیٹ ہوتا ہے۔ سفر سے قبل تیاری کا مرحلہ' آغاز سفر اور اس کا ابتدائی مراحل' مقامات کے تاریخی جغرافیہ' بلادو امصا کے تاریخی کوائف' اشخاص و شخصیات کا تذکرہ' مسافر و سیاح کی مشکلات و مصائب' معلوماتی اعداد و شمار' مختلف مقامات کے سفر کا حالات' قیام و طعام کی تفصیلات اور سفر سے وطن کی مراجعت۔ سفر نامہ کے فارمیٹ کے یہ بنیادی ارکان ہیں۔ ان میں بعض ذیلی تقسیمات بھی کی جاسکتی ہیں.

ہر سفر نامہ آپ بیتی کا اسلوب بھی رکھتا ہے۔ زائر و مسافر اور سیاح پر جو کچھ گذرتی ہے وہ اسے اپنی سرگذشت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ وقت' شخص اور حالت کے عناصر زمانی و مکانی کے سبب آپ بیتی کی جزئیات و تفصیلات مختلف ہوتی ہیں' لیکن مقامات و اسفار کی نوعیت کی بنا پر ان میں بھی ایک قسم کی نوعی یکسانیت ضرور ہوتی ہے۔ روایتی اور معلوماتی قسم کے سفر ناموں میں آپ بیتی کا عنصر بیانیہ کی شکل میں رواں دواں اور کارفرما نظر آتا ہے۔ ایسے تمام سفر نامے خارجی اشیاء سے تعلق رکھتے اور بحث کرتے ہیں۔ داخلیت کا عنصر ان میں مفقود ہوتا ہے' لہٰذا وہ معلوماتی' تاریخی و جغرافیائی تحریریں تو بن جاتے ہیں' واردات قلب و نظر کا بیان نہیں بن پاتے.

معلوماتی اور روایتی سفر ناموں کی تعداد شاید سب سے زیادہ ہے۔ ہدایت نامہ' مناسک نامہ' مصائب نامہ' سوانح نامہ' معلومات نامہ اور اسی طرح کے دوسرے نامے وہ ہوتے ہیں۔ مرزا عرفان علی بیگ کا سفر نامہ حجاز' محمد لطیف مچھلی شہری کا السفر اللطیف' خطیب قادر بادشاہ کا سفر حجاز' محمد حسین الہ آبادی کا رحلۃ السالکین' مصباح الدین احمد کا غنچہ

حج عبدالرحیم نقشبندی کا سفر حرمین شریفین' مولانا محمود حسن / حسین احمد مدنی کا سفر نامۂ حجاز' الیاس برنی کا صراط الحمید' عزیز الرحمٰن عزیز کا حج صادق' غلام رسول مہر کا سفر نامہ حجاز' فضل الدین حبیب کا دیار حبیب کی باتیں' عبدالکریم ثمر کا سفر حجاز' عبدالصمد صارم کا سفر نامۂ حج و زیارت' محمد منیر قریشی کی داستان حرمین شریفین' کنیز محمد بیگم کا ارض مقدس' مفتاح الدین ظفر کا سفر مقدس' ابو حمید انور کا "نہ آئیں جا کے وہاں سے" وغیرہ' اسی قسم کے ہیں۔

تشکیل اسالیب کے بعض دوسرے عناصر

نگارش کی تکنیک بھی زبان اور اسلوب کی تشکیل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ روزنامچہ یا ڈائری کا اسلوب یا طریق ہر روز سفر کی جزئیات اور مسافر کی معروفیات کو پیش کرتا ہے۔ حرمین شریفین کے سفرناموں روزنامچہ کی تکنیک یا طریق کے دو انداز ملے ہیں: ایک خالص روزنامچہ کا طریقہ جس میں بیانیہ ہر روز نئے سرے سے شروع ہوتا ہے اور اس میں سفر شوق و تجربہ روح کا تسلسل بری طرح مجروح ہوتا ہے یا شہید تکنیک ہو جاتا ہے۔ اس نوع کی ایک نمائندہ مثال مسعود عالم ندوی کا سفر نامۂ ہے جو صبح کی بیداری' جسم کی بیماری' ماکولات و مشروبات' معمولات' ملاقات و زیارت اور ایسی ہی دوسری دنیوی کثافتوں کی یادداشت اور داستان ہے' جو بار بار دہرائی جاتی ہے۔ قاری کو ایسے معمولات مسافر سے ایک گونہ دلچسپی اور مسافر کی تکلیف سے ہمدردی ہو سکتی ہے' مگر اس کا جذب دروں اور ذوق و شوق کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرز پیشکش و نگارش میں روزنامچہ کی غیر ضروری اور غیر دلچسپ جزئیات حذف کر کے بیانیہ کو اصل مقصود کی سمت میں رواں دواں رکھا جاتا ہے اور اس میں عام اور معمول کی معروفیات مسافر بھی حج و زیارت کا بیان ایک جزو بدن بن کر قارئین کی نظر کو اس کے اصل ہدف سے بھٹکنے نہیں دیتیں۔ عبدالماجد دریابادی کے سفر نامے میں یہی تکنیک اختیار کی گئی ہے کہ روزنامچے کا طریق واردات روح میں مدغم ہو جاتا ہے۔ بیشتر اہل قلم تبویب کا طریق تمام اختیار کرتے ہیں اور مقامات و منازل میں اپنے بیان کو تقسیم کر کے تسلسل پیدا اور قائم کرتے ہیں۔

وقت تحریر وزمانہ نگارش بھی ایک اہم تشکیلی عنصر ہے۔ کچھ عازمین حج اور مسافرین زیارت احرام کے ساتھ سفر نامہ لکھنے کی نیت بھی باندھتے ہیں۔ وہ دوران سفر ہر مرحلہ پر یادداشتیں مرتب کرتے جاتے ہیں یا پورا بیان موقعہ ہی لکھ ڈالتے ہیں۔ یادداشتیں مرتب کرنے والے بعد از سفر سفر نامہ لکھ ڈالتے ہیں۔ متعدد ایسے بھی صاحبان ذوق و نظر ہیں جو خالص حج وزیارت کی نیت کا احرام باندھتے ہیں، جسم و جان اور قلب و روح پر جو کچھ دوران سفر گذرتی ہے لوح حافظہ اور قرطاسِ دل پر رقم ہوتا جاتا ہے۔ تکمیل سفر پر کسی خارجی یا اندرونی تقاضے سے اسے قلم کی مدد سے کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔ لمحہ گذراں اور ٹھہرے ہوئے وقت میں لکھی جانے والی تحریروں کی زبان، بیان اور اسلوب جدا ہوتا ہے جذبات کی فروانی اور واردات کی دلکشی کا تعلق وقت کے جبر سے اتنا نہیں جتنا دل کی خستگی اور روح کی بالیدگی سے ہوتا ہے۔ تصویر کشی کے فن کے باذوق مبصرین کا خیال ہے کہ دور سے دیکھنے پر تصویر کا حسن دوبالا نظر آتا ہے۔ شاید وقت اور مکان کا بعد اس میں زیادہ خوبصورت رنگ بھر دیتا ہے۔

ادبی اسالیب

موجودہ صدی کے آغاز سے سفر ناموں میں ادبیت کا اسلوب نمایاں ہونے لگا۔ سادہ، سلیس اور شگفتہ نثر کی کمی ضرور تھی، مگر یکسر فقدان نہ تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں لکھے گئے حرمین شریفین کے سفر نامے زیادہ تر غیر ادبی اسلوب رکھتے ہیں بلکہ بعض سادہ اور سلیس نثر کے نمونے ضرور ہیں، ہماری صدی کے شروع ہی میں بعض اہم ادبی سفر نامے معرض تحریر میں آئے مثلاً محمد الیاس برنی کا صراط الحمید، مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر حجاز، منشی امیر احمد علوی کا سفر سعادت، مولانا غلام رسول مہر کا سفر نامہ حجاز، محمد صدیق خیر آبادی کا سفر نامہ رحلۃ الصدیق الی بیت اللہ العتیق اور متعدد دوسرے سفر نامے ادبی کارنامے ہیں، مگر ان میں سے خالص ادبی شاہکار وہ سفر نامے ہیں جو مسلم صاحب طرز اور قادر البیان ادیبوں نے اپنے خون جگر اور روشنائی دل سے تحریر کیے ہیں۔

ادبی اسلوب اور ادبیت کا انحصار صاحب تحریر کے فکری زاویے اور علمی نقطہ نظر پر ہوتا ہے' مقامات مناسک اور احوال و کیفیات سے کم۔ وہ تقریباً ہی نہیں یقیناً یکساں ہیں مگر ان کو دیکھنے والی آنکھ اور ان کو دستاویز بنانے والا قلم مختلف ہوتا ہے۔ وہ جو ارضی جادہ پیائی کرتے ہیں یا صرف جغرافیہ و تاریخ میں سفر کرتے ہیں یا وہ جو مسائل و مناسک کے اسیر ہوتے ہیں یا اشخاص و زیارات کے حلقہ دام فریب میں مبتلا ہوتے ہیں وہ داخلیت کے عنصر سے عاری ہوتے ہیں اور ان کی تحریریں بھی۔

حرمین شریفین کے اصلی' ادبی' حسین اور جمیل سفر نامے وہ ہیں جن کے لکھنے والوں نے اپنے مشاہدات چشم کو واردات قلب بنایا ہے جو اپنی روح کی گہرائیوں میں سفر کرتے ہیں۔ جو حج و زیارت کے ظواہر سے گذر کر ان کے باطن میں اترتے ہیں جو روح شریعت اور اپنے روحانی تجربہ کو آمیز کر کے اسے مادی چیزوں سے ماوراء' بلند اور حسین تر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جو فصیح الفاظ' بلیغ تراکیب' خوبصورت زبان' حسین بیان اور جمیل پیشکش پر قادر ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تمام ادبی اسالیب سے واقف و آگاہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ادبی تحریروں میں افسانوی انداز بھی کافی جادو جگاتا ہے۔

داخلیت

ادبی اسالیب میں اہم ترین عنصر تشکیل و تعمیر داخلیت' یعنی مشاہدات و معلومات کو محسوسات دل اور واردات روح بنا کر پیش کرنے کا فن ہے۔ اس کے لیے الفاظ و تراکیب پر قدرت' زبان و بیان کی جدت' طرز ادا کی وسعت' شاعرانہ تخیل کی ندرت اور افسانوی بیانیہ کی بنت ناگزیر ہے۔ حرمین شریفین کے قدیم سفر ناموں میں کہیں کہیں خوبصورت فقرے یا حسین جملے مل جاتے ہیں مگر وہ اکثر و بیشتر روایتی انداز کے ہوتے ہیں۔ جدید سفر ناموں میں بالخصوص معاصر حرمین ناموں میں ادبیت کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ تسلسل کہیں کہیں سادہ ہوتا ہے اور کہیں کہیں پرکار۔ واردات قلب اور محسوسات دل کو ان کے شایان شان زبان و بیان عطا کرنے والے صاحبان قلم معلومات و مشاہدات کو بھی ادبی رنگ دے دیتے ہیں۔ یہ ان کے جمال تحریر کا عکس ہوتا ہے کہ ایسے خشک و بے کیف بیانات میں داخلیت کا گذر نہیں

ہوتا

اولین زیارت کعبہ شخصی تناظر میں

عازمین حج اور زائرین مدینہ کے سفر ناموں میں مراحل سفر' مقامات زیارت' مناسک حج اور منازل قیام و طعام کا بیانیہ یکساں ہوتا ہے صرف طرز ادا اور انداز پیشکش کا فرق ہوتا ہے اور یہی فرق ان کی ادبیت و اسلوب کو متعین کرتا ہے۔ مختلف مراحل و منازل میں غالباً سب سے اہم اولین زیارت کعبہ کا منظر ہوتا ہے۔ اس منظر حیات کی تصویر کشی میں موئے قلم نے کیا کیا سادہ و پرکار' سپاٹ اور رنگین' غیر دلچسپ اور جذبات انگیز لہریئے دکھلائے ہیں' عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں:

"اندر داخل ہوتے ہی نگاہ اس سیاہ غلاف والی عمارت پر پڑی جسے خشکی اور تری میں نہ سما سکنے والے نے' زمین و آسمان' عرش و کرسی کی سمائی میں نہ آنے والے نے' وہم و خیال کی وسعت میں نہ گھرنے والے نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ نگاہ پڑی اور پڑتے ہی جہاں پڑی تھی جم کر رہ گئی! اس گھڑی کی کیفیت کیا اور کن لفظوں میں بیان ہو۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ کلیم کے ہوش و حواس کسی کی ایک تجلی کی تاب نہ لا سکے تھے۔ جب "تجلی بیت" کا یہ حال ہے کہ ہوش و حواس قائم رکھنے دشوار' تو "رب البیت" کی تجلی نے خدا معلوم کیا غضب ڈھایا ہوگا؟ جب "گھر" کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے تو گھر والے کے انوار و تجلیات کی تاب کون بشری آنکھ اور انسانی بصارت لا سکتی ہے؟ اللہ اللہ! کیا حسن و جمال' کیا رعنائی و زیبائی' کیا خوبے محبوب و دلکشی و دلبری ہے! جن لوگوں نے قہر و جلال کی تجلی گاہ بتایا ہے خدا معلوم انہوں نے کیا اور کس عالم میں دیکھا' اپنا تو یہ حال تھا کہ سر تاپا مہر و جمال ہی ٹپکتا نظر آتا تھا' ہر چہار طرف سے رفق و الفت' شفقت و رحمت کے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں ٹپکی اور دوڑی چلی آرہی تھیں۔ ابراہیم کی خلت' اسمٰعیل کی فداکاری' ہاجرہ کی مسکینیت' اللہ اکبر جہاں یہ تینوں اکٹھا ہوں' انوار و جمال کی تجلیات' اس ٹھکانے سے بڑھ کر اور کہاں ہوں گی۔ اب نہ قلب کو اضطراب ہے' نہ طبیعت میں انتشار' نہ خوف نہ دہشت' نہ رعب نہ ہیبت' سر تاسر

سکون ہے اور انبساط' سرور ہے اور نشاط! من دخلہ کان امنا کی تفسیریں بہت سی پڑھی تھیں 'لیکن جو تفسیر اس گھڑی بغیر کسی کتاب و عبارت کے توسط کے لوح قلب پر القاء ہو رہی تھی وہ سب سے الگ سب سے نرالی سب سے عجیب تھی۔ اور اگر فاش گوئی کی اجازت دی جائے تو اپنے حق میں سب منقول و مکتوب تفسیروں سے بڑھ کر صحیح بھی تھی" (طبع اعظم گڑھ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء ص ۲۲۱۔۲۲۲) میر کاروان حجاز ماہر القادری کا بیانیہ اولین زیارت کعبہ ذرا مختلف ہے:

"باب السلام سے داخلہ ہوا اور بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی زبان پر تکبیر جاری ہو گئی۔ جلال و ہیبت اور جبروت و ابہیت کا سامنا ہے 'ایک عالم گومگو اور کیفیب بے نام ہے جو طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یا اللہ! میں کہاں آگیا! یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سا پلید اور حرم مقدس میں! مجھ سا خطاکار اور معاصی سرشت اس مقام پر جہاں ہر زمانے کے اتقیاء و صلحاء پاکبازوں اور نیکوں کاروں نے سجدے اور طواف کیے ہیں یہ پیروں سے نہیں سر کے بل چلنے کا مقام ہے" (ص ۳۸).

صاحب حریم دیدہ و دل محمد عارف اپنے اولین تجربہ کی بات کرتے ہیں:

"اچانک ٹیکسی نے موڑ کاٹا اور جونہی نگاہیں اٹھیں جسم میں کپکپی سی آگئی۔ آنکھوں پر یقین نہ آیا اور زبان بے اختیار کہہ اٹھی "لبیك اللهم لبيك" "مسجد الحرام کی باعظمت اور پر شکوہ عمارت سامنے تھی۔ اس کے باوقار اور بلند مینار اسلام کی عظمت کے مظہر نظر آتے تھے۔ اندر سے تسبیح اور درود کی ہلکی دل نواز صدائیں آرہی تھیں۔ اپنی خوش بختی پر فخر بھی تھا اور بے بضاعتی پر ملال' اظہار تشکر کے لیے ہونٹ نہ ہل سکے تو آنکھیں یہ فرض بجالائیں" (انور سدید' ص ۵۱۲).

راقم رودادِ سفر حجاز نصیر احمد ناصر کا بیان ہے کہ " ہم نے دیار دوست میں حج کا مقام اور حرم شریف کی زیارت کی اور خوب کی' پھر ذوق و تسکین کی خاطر آثار حسن و عشق دیکھے لیکن ذوق نظر کی تسکین کے ساتھ شوق دید بڑھتا چلا گیا' جونہی نظر حریم دوست پر پڑی شہید نظارہ ہو گئی۔ اس کا نظارہ اسی طرح حسین و جمیل اور ایمان افروز و مسحور کن تھا جو میں

پہلے دیکھ چکا تھا انوار و تجلیات کی برفباری ہو رہی تھی اور ملائکہ کا ھبوط و عروج کا سلسلہ جاری تھا" (انور سدید ص ۵۱۶۔۵۱۷).

شہاب نامہ کے صاحب نظر زائر کا تجربہ ہے کہ "میرے پاس حرم شریف کے باہر چھوڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں ربڑ کا چپل اور سر پر گناہوں کی گٹھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے دل و جان سے دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک مارا اور باب السلام کے راستے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی دم بھر کے لیے بجلی سی کوندی اور زمین کی کشش ثقل گویا ختم ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی کو مضبوط بریک لگا کر میرے وجود کو پنکچر شدہ ٹائر کی طرح جیک لگا کر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہو۔ جیسے میری پنڈلیوں کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہو۔ میرے جسم کے اعضاء کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ سا گیا ہو۔ ہاتھ بے روح ہو کر لٹک سے گئے اور سر بھنور میں پھنسے ہوے ...
..... خس و خاشاک کی طرح بے بسی سے چکر کاٹنے لگا۔ اس طرح لاپیچ سا ہو کر میں طواف کے لیے آگے بڑھنے کی بجائے بے ساختہ لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا (ص ۵۹۷۔۵۹۸).
سلسلہ شہابیہ کے ایک ٹوٹے ہوئے تارے ممتاز مفتی کا اولین تجربہ سب سے منفرد شخصی اور نرالا ہے:

"اور خانہ خدا میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ بیشتر اس کے کہ میں اللہ اکبر کہہ پاتا کوٹھے کی چھت سے کسی نے سر نکالا۔ چہرے کی جھریوں میں محبت کا ایک طوفان ابھر اور سمٹ رہا تھا۔ آنکھیں ہمدردی کے بے پناہ جذبے سے پرنم تھیں' پیشانی منور تھی۔ ہونٹوں پر لگاؤ بھری مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے پتہ نہیں کیا کیا۔ میرے وجود کے فیتے کو گویا چنگاری دکھادی۔ پھر میرے قلب میں ایک دھماکا ہوا' میرے وجود کی دھجیاں اڑ گئیں اور سارے حرم شریف میں بکھر گئیں۔ لیکن اس وقت میری سدھ بدھ ماری ہوئی تھی اس وقت میرے نزدیک کسی کی کوئی حیثیت نہ تھی' صرف میں تھا اور میرے اللہ تھے۔ اب میرے اور میرے اللہ کے درمیان کچھ حائل نہ تھا۔ نہ پہلا چکر نہ دوسرا' نہ تیسرا' نہ کوئی مقام محمود تھا نہ مقام ابراہیم۔ زندگی میں پہلی بار میرے اللہ میری خاطر اس بھی ڈھب

کوشے میں محدود ہو گئے تھے۔ میرے اللہ میرے روبرو تھے اور میں ان کے گرد والہانہ گھوم رہا تھا' (ص ۷۸۔۷۹). شفیق صدیقی مولف حجاز نامہ کا بیان ہے:

"مولانا نے کہا ہاں وہ سامنے عمارت کعبہ ہی تو ہے۔ یہ سنتے ہی نہ پوچھئے اپنی کیا کیفیت ہوئی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دعائیں مانگنے لگا۔ دعاؤں میں رقت نے وہ کیف پیدا کر دیا تھا کہ جیسے بیت نہیں رب البیت سامنے ہے اور اس کے باب رحمت کی چوکھٹ پر سر جھکانے کو جا رہا ہوں۔ پردہ اٹھنے کو ہے اور اپنا پیارا کردگار شرف عطا فرمائے گا۔ بار بار دل مجھ سے اور میں دل سے سوال کرتا تھا کہ قسمت آج کہاں لائی ہے۔ ایسا گنہگار جس کو ساری خدائی میں کوئی نہ بخشے میرے رؤف ورحیم پروردگار نے اسے اس مرکز رحمت میں باریاب فرمایا ہے" (ص ۴۷۔۴۶).

حج کا سفر مبارک کرنے والے مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محل کا فتوائے زیارت ایسی ہی بے خبری کا تھا:

"اندر پہنچے اور خانہ کعبہ کا دیدار ہوا۔ بس ایسا محسوس ہوا کہ اپنے قابو میں نہیں رہے۔ بے اختیار گریہ طاری ہو گیا۔ کوئی پوچھ بیٹھتا کہ کیوں؟ تو ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ کسی بھی استفسار کا جواب ہمیں یاد نہیں پڑ رہا تھا۔ بے خودی اور بے خبری کا ایسا سخت تجربہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خانہ کعبہ کی پہلی زیارت از خود رفتگی کے عالم میں ہو رہی تھی" (ص ۱۳۳۔۱۳۴)

زائرات کے واردات روحانی

بے خبری، از خود رفتگی، جسم و روح کی سرشاری، گریہ وزاری اور ایسی ہی دوسری کیفیات قلبی میں حجاجِ کرام کے دوش بدوش زائرات صاحباتِ کیف و نظر بھی برابر کی شریک نظر آتی ہیں۔ وہ بھی اولیں زیارت کعبہ مقدسہ کے سرمدی لمحہ میں اسی طرح ہوش و حواس سے بیگانہ، کیف و عرفان و بادہ سرمستی سے سرشار ہو گئی تھیں۔ ان کے واردات روح اور مشاہدات نظر کچھ کم دل آویز نہیں.

رحلۃ المراحل کی مسافرہ صاحبہ نظر کا بیان:

"جس روز کہ میں پہلے وقت حرم شریف میں داخل ہوئی اس دن رعب کا کیا بیان کروں۔ اللہ اکبر۔ گھر سے نکلتے ہی ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے' جب حرم شریف کے قریب پہنچی تو کئی دروازے چھوڑ کر آگے بڑھی کہ پہلے دن باب السلام سے داخلے کا قاعدہ ہے۔ اس کے بعد بہت ہمت کر کے میں نے جو کعبہ شریف کی طرف نگاہ اٹھائی' آنکھیں نیچی کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک دم کعبہ کو تکے جاتی تھی اور سبحان اللہ کر رہی تھی۔ لوگ جوق در جوق اس کے گرد نثار ہو رہے تھے۔ ان کا شوق اور محویت مجھ کو پاگل کیے دیتی تھی۔ خدا جانے میں وہاں کب تک بیٹھی رہی' میں اس وقت اس قدر بدحواس تھی کہ مجھ کو اپنے بیٹھنے کی جگہ مطلق یاد نہیں" (ص ۸۰).

وحیدہ نسیم کی حدیث دل' بشریٰ رحمان کی باؤلی بھکارن' زبیدہ حق کا زہے نصیب اور اسی نوع کے دوسرے نسوانی سفر نامے واردات قلب و نظر اور روحانی تجربات و مشاہدات سے مالامال ہیں۔ ان کے باب میں مردوزن کی تخصیص نہیں' روح و قلب کی دولت بیدار کی تخصیص کی شراکت لازمی ہے۔ یہ تو:

"خبر تحیر عشق سن' نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ میں میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی"

کا مقام فرزانگی ہے۔

اولین زیارت کعبہ مطہرہ ہو یا اولین دید او مسجد و روضہ اقدس یا دوسری زیارات' ان کی قلمی تصویر کشی میں مصور واردات قلب و نظر اکثر و بیشتر اپنی اور صرف اپنی ذات کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوتا ہے۔ وہ خود غرض اور تنگ نظر نہیں ہوتا' مگر اس کے محسوسات و تجربات ایسے ہمہ گیر ہوتے ہیں اور اس کی داخلیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ سے پرے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی ظاہری نگاہ بند اور اندرون کی نظر وا ہو جاتی ہے اور اس سرمدی لمحہ میں اسے صرف اپنے اللہ میاں نظر آتے ہیں "شہود و شاہد و مشہود" کی یک جائی اور اکائی ایسی بسیط ہوتی ہے کہ وہ ہر ماسوا سے بے خبر' اطراف و اکناف سے جدا' ظرف و مکان سے

منقطع اور رُفقا و شرکاء سے دور ہوتا ہے کہ وہ اپنے صرف اپنے رب کے حضور حاضر اور اس کی تجلیات سے سرشار ہوتا ہے۔

مشاہدات حرمین کے راقم سید اسعد گیلانی تعارف و تعریف خانہ کعبہ' تاریخ و کیفیت بیت الٰہی' کیف و سرمستی زائرین اور متعدد دوسری کیفیات سے گذر کر اپنی اولین زیارت و طواف کا ذکر کرتے ہیں اور دوسروں کے حوالہ سے داخلیت کا اظہار کرتے ہیں:

"یوں میں چوکھٹ سے لپٹا ہوا رو رہا تھا جب میرے کان میں آواز پڑی "مینڈھے سائیں "السلام علیکم "اللہ اکبر! میں ابھی باہر کھڑا دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا تھا اور یہ سندھ سے آیا ہوا میرا بھائی سید حاصحن مکان میں پہونچ کر براہ راست صاحب البیت سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ جیسے اس کے اور صاحب البیت کے درمیان اب کوئی پردہ حائل نہ رہا تھا اور وہ اس سے براہ راست خود بات کر رہا تھا۔ بس میری تو چیخ ہی نکل گئی۔ جیسے میرا سارا سفر اکارت ہو گیا تھا اور میرے ساتھ ملتزم سے چمٹا ہوا کھڑا میرا بھائی اپنا سفر مکمل کر کے صحن میں داخل ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلسل سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی سرگوشیوں نے میرے جذبۂ بندگی میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا اور میں بھی قربت حبیب میں بہت دور تک آگے نکل گیا"(ص ۱۵)

جذبہ و سرمستی' کیف و سرشاری' بے خودی و بے خبری اور داخلیت کی بیکراں و بے پناہ کیفیات' قلب و روح کی گہرائی اور احساس و وجدان کی پہنائی سے پھوٹتی ہیں۔ متعدد اہل قلم ایسے بھی ہیں جو اولیں زیارت کعبہ شریف کے نادر لمحہ میں بلا کیف و جذبہ رہ گئے۔ وہ اس سرمدی مقام سے سرسری گذر گئے۔ سفر سعادت سے مالا مال ہونے والے منشی امیر احمد علوی معلم کے چرکوں سے پریشان اپنے ظاہری زخم ہی گنتے گناتے رہ گئے' مودودی کے سفر نامۂ ارض القرآن کے مرتب محمد عاصم نے "کعبہ زادھا اللہ شرفا پر محبت و احترام بھری نگاہ ڈالی اور جماعت میں شامل ہو گئے"۔ (ص ۱۳۱) مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کی "ایک عمر کی تمنا بلکہ حاصل زندگی تمنا فضل ربانی سے بر آئی۔ زیارت بیت اللہ المکرّم و حاضری

مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا' فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ"(ص ۱۲)

اولین زیارت مسجد و روضہ نبوی

جذبات کیف و سرمستی اور تجربات وجدانی و روحانی کا دوسرا مقام محمود دیدار مسجد نبوی اور روضۂ اطہر کا عظیم لمحہ ہوتا ہے۔ یہ مقام راہ وفا بھی جلال و جمال کا مظہر ہے۔ بیت الٰہی کی مانند یہاں بھی مرکز قلب و نگاہ ہے۔ مسجد نبوی کی زیارت اور روضۂ مقدسہ کا دیدار بھی ہر زائر کا عمر بھر کا سرمایہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اسکی زندگی کی دوسری تمنا اور حاصل حیات ہوتا ہے۔ یہاں بھی قلب و نظر اسی طرح خیرہ و سرشار اور دل و جگر شکار ہوتے ہیں۔ بے خودی' بے خبری' از خود رفتگی' بے بسی' بے چارگی' سرمستی' سرشاری' اور "خبر تحیر عشق" سننے کے بعد کی بے خبری یہاں بھی پوری طرح آشکار ہوتی ہے۔ دیدار و زیارت سے مشرف ہونے والے اپنے اپنے جذبات' کیفیات اور نقاط نظر کے سرچشموں سے فیضیاب ہو کر دولت دارین سے مالا مال ہو جاتے ہیں یا مادۂ و جسم کی آلودگی اور جذب دروں کی کمی کے سبب محروم رہتے یا سرسری گذر جاتے ہیں:

عبد الماجد دریابادی ہمہ تن ذوق' ہمہ جاں شوق اور سرتاپا جذب و مستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کی اولین زیارت مسجد و روضہ اسی کی کہانی ہے:

"لیکن پہلی مرتبہ قدم رکھتے وقت ہوش و حواس ہی کب درست تھے جو یہ دعا یا کوئی اور خاص دعا قصد و ارادہ کر کے پڑھی جاتی۔ ایک ربودگی' بے خبری اور نیم بے ہوشی کی حالت میں' معمولی درود شریف کے الفاظ تو محض حفظ کی بنا پر بلا قصد و ارادہ زبان سے ادا ہوتے رہے۔ باقی بس ہوش آیا تو دیکھا کہ نماز کو شروع ہوئے دو چار منٹ ہو چکے ہیں۔ ادھر یہ کچھ ہو رہا ہے' رند و پارسا' فاسق و متقی سب ہی اس دھن میں لگے ہوئے ہیں' ادھر ایک ننگ امت حیران و ششدر' فرط ہیبت و جلال سے گنگ و مضطر' حواس باختہ' چپ چاپ' سب سے الگ کھڑا ہوا ہے' نہ زبان پر کوئی دعا' نہ دل میں کوئی آرزو' سر سے پیر تک ایک عالم

حیرت طاری ' یاالٰہی! یہ خواب ہے یا بیداری! کہاں ایک مشت خاک ' کہاں یہ عالم پاک (ص ۱۰۵ اور ۱۰۶)۔

دریابادی کے بیان میں جذب و سرشاری کافی طویل ہے کہ وہ حدیث دل بھی ہے اور تکمیل آرزو بھی.

راہ وفا کے سالک کی "گنبد خضری پر نگاہ پڑی تھی کہ بے اختیار چیخ نکل گئی تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ جذبہ سلام و نذر حضور میں شعری روپ دھار گیا (ص ۳۰۲).

پاکستان سے دیار حرم تک کے زائر کا حال یہ تھا کہ :

"اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور میری نگاہیں رسول ﷺ کے روضہ اطہر کی جالی پر مرکوز ہو گئیں. اس کے بعد کچھ دیر کے لیے مکمل طور پر خالی الذہن تھا۔ میرے دل میں کوئی آرزو نہ تھی اور میری زبان پر کوئی دعا نہ تھی۔ وہ احساسات جن کے اظہار کرنے کے لیے میں کچھ دیر پہلے چیخوں کی ضرورت محسوس کرتا تھا مکمل طور پر دب چکے تھے ' میری بہترین دعائیں مستجاب ہو چکی تھیں اور عزیز ترین آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں اور میں ایک ایسا اطمینان محسوس کر رہا تھا جس سے میری روح نا آشنا تھی" (ص ۱۲۴۔۱۲۵)

مشاہدات حرمین کے شاہد صادق کا تجربہ بڑا انوکھا تھا :

"جب باب جبریل کی طرف سے میں نے مسجد نبوی میں قدم رکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی مصروف اور مضطرب دنیا سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں آگیا ہوں۔ پھر وہ بزرگ یکایک مجھے مواجہہ شریف کے روبرو لے گئے ' حضور اکرم کی کھڑکی کے روبرو۔ بخدا میں یوں یکایک اس حاضری کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی وہ مفقود تھا۔ یکایک یہ حاضری میرے اوپر اس طرح چھا گئی کہ میں لرز گیا اور اندر ہی اندر کانپنے لگا۔ میں کھڑا تھا ' ایوان نبوت کی کھڑکی میرے سامنے کھلی تھی اور مجھے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت و جرأت نہ تھی۔ میں غیر معمولی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ حسرت ویاس کی تصویر بنا ہوا۔ یہاں تک کہ وہ میری کیفیت خوف گزر گئی اور کیفیت مسرت و انبساط نمودار ہوئی ' میں تو اپنے ہی نبی کے حضور میں تھا جو رحمۃ للعالمین

ہے' جو گنہگاروں کا والی ہے۔ وہ میرا اپنا نانا ہے' یہ میرا اپنا گھر ہے۔ ایک سکینت و اطمینان کی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی" (ص ۸۳)۔

ہمارے نبی و آقا' ہادی و والی' رحمۃ للعٰلمین و رحمت تمام کے لیے جذبات روحانی و جدانی کا اظہار و بیان تقریباً تمام سفر نامہ نگاران مدینہ کے ہاں ملتا ہے۔ زائرین و حاضرین کے وجود جسمانی کی ہم آہنگی' بے خبری اور بے ہوشی کا بھی بیان پایا جاتا ہے ذاتی تعلق اور شخصی یگانگت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ بعض سید زائرین اور سادات کرامؒ کے ہاں خاندانی رشتہ داری اور خونی قرابت کا افتخار بھی بہت زیادہ جھلکتا اور چھلکتا ہے۔ سید اسعد گیلانی اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں اس کا رنگ کافی چوکھا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے سید زائرین کے ہاں صرف یہی رشتہ وجہ افتخار اور مایہ زیارت بن کر رہ گیا ہے۔ جبکہ حرمین شریفین ایسے دو مقامات دانش و آگہی میں جہاں صرف عاجزی و درماندگی' بندگی اور غلامی اور ایمانی و اسلامی تعلقات ہی نگاہ قلب و چشم میں رہیں اور سارے افتخارات اور تمام امتیازات بلا کم و کاست حدود حرمین سے باہر رہ جائیں۔

شہاب نامہ کا زائر ایسے جذبات احترام و عقیدت کے پروں پر اڑتا ہوا مدینہ منورہ روانہ ہوتا ہے۔ وہ عقیدت مندوں کے ایک گروہ کے ساتھ ان کے جذبے سے سرشار ہو کر احتراماً پیدل چلنے لگتا ہے۔ دیار حبیب میں جوتے پہن کر داخل ہونا بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے" تو چپل کھول کر پھینک دیتا ہے۔ برہنہ پا حدود حرم میں داخل ہوتا ہے۔ پھر عقیدت و محبت اور عشق و سرمستی اپنا انوکھا روپ دکھاتی ہے۔ اس طویل عرصہ میں میری آنکھوں نے زندگی کی کثافت اور رذالت اور رکاکت اور خباثت کے علاوہ اور کچھ بہت کم دیکھا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ گنبد خضراء پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گناہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کر لوں۔ اس مقصد کے لیے شاہراہ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیا۔ مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئیں اور راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا۔ قدم قدم پر راہ گیروں سے ٹکر لگتی تھی۔ مجھے اندھا سمجھ کر ایک بھلے آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے

باب جبریل تک پہنچایا"۔ پھر شہاب نے روضہ اقدس اور مسجد نبوی دل کی آنکھ اور جذبہ کی نگاہ سے دیکھی (ص ۶۵۰-۶۰۶)۔

عشق نبوی ہر صاحب ایمان کے خمیر میں گوندھا گیا ہے کہ وہ لازمی جزو ایمان و تسلیم ہے۔ حرمین شریفین کے سفرناموں میں اس عشق نبوی، عقیدت ذات رسالت مآب ﷺ اور محبت والفت مسجد وروضۂ اطہر کا سادہ و پرکار اظہار تقریباً شروع سے ہوتا رہا ہے۔ قدیم اہل قلم بالخصوص غیر ادیب صاحبان اظہار کے ہاں جذبات عقیدت و محبت کی فراوانی کا الفاظ وتراکیب ساتھ نہیں دیتے، تاہم وہ اپنے مافی الضمیر کو کافی مؤثر انداز سے پیش کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ ان میں رفیع الدین مراد آبادی کی سوانح حرمین، نواب مصطفی خان شیفتہ کی "ترغیب المسالک الی احسن المسالک" کا اردو ترجمہ ماہ منیر، الیاس برنی کا صراط الحمید اور دوسرے متعدد سفرنامے شامل ہیں جن میں سلیس وسادہ اور شگفتہ نثر ملتی ہے۔

ادبی شاہ پارے

ادبی لحاظ سے مالا مال اور ادبیت و داخلیت سے بھرپور عہد جدید و معاصر کے سفرناموں میں عشق نبوی اور عقیدت مسجد وروضہ کی فراوانی کا حسین اظہار اور شایان شان بیان ملتا ہے جو سوز وساز رومی اور تب و تاب اقبال کو اپنے اپنے اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ الطاف حسن قریشی کے "قافلے دل کے چلے" شورش کاشمیری کا "شب جائے کہ من بودم" محمد ذاکر علی خاں کے مرحبا الحاج اور حدیث حرم نصیر احمد ناصر کی روداد سفر حجاز، شمس کاشمیری کا جہلم سے عرفات تک، وحیدہ نسیم کی حدیث دل، افضل کیانی کا بلاوا، صادق قریشی کا پھر سوئے حرم، فرید احمد پراچہ کا سفر شوق، بشریٰ رحمان کی باؤلی بھکارن، احمد خان درانی کی نور کی ندیاں، حافظ لدھیانوی کا جمال حرمین، غلام سرور کا مسافر حرم، قمر اختر ظافر کی منزل، عبادت بریلوی کے دیار حبیب میں چند روز، غلام الثقلین نقوی کا سفر ارض تمنا، ابوالخیر کشفی کا وطن سے وطن تک اور متعدد دوسرے سفرنامے عشق رسول ﷺ سے سرمست وسرشار نظر آتے ہیں اور اولین زیارت مسجد وروضہ پر ان کے جذبات چھلک پڑتے ہیں اور اپنے

قارئین کو بھی شرابور کر جاتے ہیں۔ مگر متعدد ایسے بھی ہیں جو اس مقام جذبات کیف و سرمستی میں بھی بلا کیف گذر گئے، جیسے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مسعود عالم ندوی، ابوالحسن علی ندوی، محمد عاصم اور متعدد دوسرے۔

دوسرے مقاماتِ دل

ادبی کارناموں میں سفر نگاروں نے اکثر و بیشتر تمام مقامات، مناسک اور مراحل کے حوالے سے تاریخ و جغرافیہ حالت و کیفیت کے ساتھ ساتھ روحانی تجربات و وجدانی مشاہدات میں بھی سفر کیا ہے۔ اس لیے ادبیت، حسن، سرشاری، کیف و مستی اور داخلیت ان کے قلم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ قدم قدم پر زبان و بیان کا جادو جگاتے ہیں۔ ادبی سحر جلال کے لیے وہ خوبصورت الفاظ، حسین تراکیب، پسندیدہ محاورے، نادر و جدید تشبیہات، شاندار استعارے، بہترین تلمیحات اور نہ جانے کتنے ادبی محاسن و لطائف استعمال میں لاتے ہیں۔

جبل ابوقبیس پر مسجد بلال کے خوبصورت نظارے نے فرید احمد پراچہ سے یہ خوبصورت نثر لکھوائی:

"مسجد بلال کا ایک خوبصورت نظارہ ایک دن میں نے حرم پاک میں حطیم والی سمت میں بیٹھ کر کیا۔ سورج کی کرنیں بڑی آہستگی کے ساتھ پھیل رہی تھیں۔ صبح کی ہوا ہلکورے لے رہی تھی۔ اک اک کر کے سارے ستارے بجھ چکے تھے۔ آسمان نے اپنی بساط لپیٹ لی تھی۔ میری نگاہ اٹھی تو جبل ابوقبیس کی چوٹی پر مسجد بلال کے تنہا مینار کی نوک کے اوپر ایک ستارہ ابھی تک چمک رہا تھا۔ پورے آسمان پر تنہا ستارہ۔ شاید حضرت بلالؓ کی نشانی کو سلامی دے رہا تھا" (انور سدید، ص ۵۲۵)۔

خوبصورت منظر کشی، نادر و حسین تشبیہ اور حسین و جمیل نثر کا ایک اچھوتا نمونہ اسی حوالے سے شورش کاشمیری نے پیش کیا ہے:

بیت اللہ کے شمال مشرقی کونے میں ایک قد آور پہاڑ پر مسجد بلال ہے۔ بیت اللہ

سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ الف پر کھنچی ہوئی ہے یا پہاڑ نے آغوش میں شیر خوار بچہ اٹھا رکھا ہے یا کسی بدو عورت کی پیشانی پر جھومر لٹک رہا ہے۔ یا جبل ابی قبیس پر اذان بلال فراق یار میں منجمد ہو گئی ہے" (انور سدید' ص ۵۰۹).

مقامات حج منیٰ' مزدلفہ اور عرفات سے متعلق کم و بیش تمام ادبی سفر ناموں میں بہت خوبصورت تعبیرات ملتی ہیں بالخصوص عرفات کے میدان میں دعا و عبادت کے مناظر کے حوالے سے۔ اسی طرح حجر اسود' مطاف' مسعیٰ' غار حرا' غار ثور اور حرمین شریفین کے دوسرے مقامات مقدسہ اور طواف' عمرہ' نماز' خطبہ اور دوسری عبادات کے حوالہ سے بھی جذبات کی حسین تصویر کشی کی گئی ہے۔ بالعموم نماز حرمین اور خطبہ عرفات و مسجد حرام کا زیادہ تر ذکر نہیں ملتا اگرچہ اسکی ادائی اور ساعت پر کچھ تاثرات مل جاتے ہیں :

ماہر القادری ان معدودے چند سفر نامہ نگاروں میں ہیں جو نماز حرم شریف کی والہانہ تصویر کشی کرتے ہیں :

"حرم شریف میں صبح کی نماز کے لیے جب اذان ہوتی ہے تو اس کی دلکشی اور اثر انگیزی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ صبح کا سہانا وقت' بوقبیس کی چوٹیوں پر سپیدہ سحر کے آثار کا آغاز' حرم کے در و دیوار تجلیوں میں چھم چھم کرتے ہوئے اور پھر بیت اللہ کی جلالت نشاں دیواروں پر سیاہ غلاف کے سکوت کا باوقار منظر۔ جنت نگاہ اور فردوس گوش کا سچ مچ سماں" (ص ۸۳).

نماز کی دلآویز کیفیت کو الفاظ کا حسین پیکر وحیدہ تبسم کی حدیث دل نے دیا ہے :

"میں نے نماز پڑھی اور مجھے پہلی بار اس کا احساس ہوا کہ رکوع میں جھک کر "سبحان ربی العظیم" کہنے کا لطف صرف اسی وقت ہے جب خانہ کعبہ سامنے ہو اور دل واقعی اسکی عظمت کی گواہی دے۔ سجدے میں جا کر "سبحان ربی الاعلیٰ" کہنے کا مزہ اسی وقت ہے جب جبین نیاز مقام ابراہیم پر جھکے۔ جبہ سائی کا اگر کیف ہے تو صرف حرم کی چوکھٹ پر۔ یہی وہ سجدہ ہے جس سے سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا" (انور سدید' ص ۵۲۰).

ابوالخیر کشفی نے اپنی نماز حرم کو الفاظ و تعبیر کا ایک حسین ترین جامہ پہنایا ہے :

"میرے جسم کو زمزم کے چھینٹوں نے گلزارِ ابراہیم کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بنا دیا تھا۔ زمزم سے وضو' بلکہ نیم غسل کر کے پھر صحن کعبہ میں پہونچا۔ مقام ابراہیم پر اس نقش پا کو سجدہ کرنے کے ارادہ پر غالب آکر خدائے برتر کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ یہ دوگانہ لمحوں میں صدیوں کا سفر تھا۔ اور میرا ہر لمحہ صدی در کنار" (انور سدید' ص ۵۳۵)

بیشتر سفر نامہ نگاروں نے طواف کے روحانی تجربات اور محسوسات کا ذکر کیا ہے' مگر نماز اور خطبہ جمعہ و عرفات کے ذکر سے پہلو تہی کی ہے یا سرسری حوالہ بلا کیف دے کر گذر گئے ہیں۔ ماہر القادری نے اپنی خوبصورت نثر اور والہانہ انداز میں دوسروں کا کفارہ بھی ادا کیا ہے "خطیب پر اللہ کی رحمتیں ہوں کہ اس نے خطبہ میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ آیات اور احادیث کیا برمحل پڑھی ہیں! کیا انداز خطابت تھا! دعا میں کس قدر سوز اور خشیت تھی! کاش وقت کی رفتار اسی مرکز پر ٹھہر جاتی (ص ۵۳).

حرمین شریفین کے ادبی سفر ناموں میں دوسرے مقامات مقدسہ اور کیفیات وجدانیہ کے حوالے سے بہت سے شہ پارے ملے ہیں مگر ان سب کی سمائی ایک مقالہ کی بساط سے باہر ہے اس لیے انھیں پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے.

تنقیدی تجزیہ

اردو میں حرمین شریفین کے سفر ناموں کا جو سلسلۂ زریں گذشتہ صدی کے دوسرے نصف سے شروع ہوا تھا وہ مختلف جہات میں سفر کرتا ہوا ترقی اور عروج کی شاہراہ پر مسلسل گامزن ہے۔ قدیم سفر ناموں میں رہنمائے حج اور ہدایت نامہ کا اسلوب غالب ہے' لہذا قدیم و جدید اور تجربہ میں آنے والی معلومات کو فراہم کرنا سفر نامہ نگار اپنا فرض سمجھتا ہے تاکہ متاخر عازمین و زائرین مصائب و مشکلات سے بچیں اور آسانیوں اور آسائشوں سے ہمکنار ہوں.

حج و زیارت کے آداب اور ادعیہ کا تذکرہ اکثر سفر ناموں کا لازمی حصہ ہے۔ ان کے لکھنے والے سفر نامہ اور ہدایت نامہ حج کا فرق بھول جاتے ہیں۔ اپنے تجربات حج و زیارت میں

آداب و لادعیہ اور دوسری معلومات کا ذکر کرنا حرام و شجر ممنوعہ نہیں' تاہم ان کا تذکرہ سفر نامہ کا جزو بن کر ہونا چاہیے۔ معلومات حج کے ابواب و فصول ان سفر ناموں میں باقاعدہ شعوری طور سے بعد میں مختلف کتب حج و زیارت سے لے کر شامل کی جاتی ہیں اور وہ سفر نامہ کی روانی کو بند لگا کر روک دیتی ہیں اور فنی طور سے اسے سخت نقصان پہنچاتی ہیں.

زائرین اور سفر نامہ نگاروں کے مشاہدہ میں آنے والے تاریخی جغرافیہ مقامات حرمین شریفین کا بیان تو قاری کے نزدیک قابل برداشت نہیں' بلکہ محبوب و پسندیدہ ہے اور فن سفر نامہ کے ہاں مقبول بھی' مگر اس کے ضمن میں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ بے شک سفر نامہ کا جزو ضروری ہی رہے' تاریخی جغرافیہ کی کتاب نہ بنے اور نہ ہی دوسری کتابوں سے اخذ کر کے اسکو سفر ناموں کا حصہ بنایا جائے۔ قدیم' معلوماتی اور رہنمائے حج اور روایتی قسم کے سفر ناموں میں تاریخی جغرافیہ مقامات و مناسک تجربہ و مشاہدہ کی دین نہیں ہوتا' بلکہ فنی کتابوں سے اخذ کردہ ہوتا ہے جو سفر نامہ کے بہاؤ کو روکتا اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ ادبی سفر ناموں میں وہ صاحبان تجربہ و مشاہدہ کا بیان واقعہ بنتا ہے اور سفر نامہ کا ایک خوبصورت حصہ۔

حرمین کے سفر ناموں میں مقامات و مناسک سے متعلق تاریخ اسلامی کا تذکرہ چند جہات رکھتا ہے' ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ مقام متعلق اور منسک مشاہد کے قرب و جوار میں پہنچتے ہی سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتا ہے اور تاریخ کی کتاب کھول کر بیٹھ جاتا ہے اور اس سے سفر نامے کے اس حصہ کو پورا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس سفر نامہ نگار کا اپنا بیان و وجدان نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ سفر نامہ کا جزو ہوتا ہے۔ وہ دراصل سفر نامہ نگار کی خواہش تاریخ نویسی کی تکمیل ہوتی ہے یا مختصر حالات و واقعات سفر کی توسیع۔ جب اس کے پاس نہ معلومات سفر ہوتی ہیں نہ سفر کے حالات کی مزید تفصیل اور نہ ہی محسوسات و مشاہدات کا بیامیہ تو وہ تاریخی واقعات سے اپنے خالی سفر نامہ کا پیٹ بھرنے لگتا ہے۔ قدیم اور روایتی سفر ناموں کے لکھنے والا ایسی مذبوحی حرکات کے شکار ہوں تو چنداں قابل حیرت نہیں' لیکن جب نسیم حجازی جیسا صاحب قلم و مالک بیان مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ کے حوالے

سے حضرات ابراہیم و اسمٰعیل و ہاجرہ کی تفصیل دینے لگے (ص ۱۱۰۔ ۱۱۲) یا صلح حدیبیہ کا معاہدہ مع اسکی شرائط و تفاصیل کے نقل کرنے لگے (ص ۱۱۴۔ ۱۱۷) یا مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے حوالے سے تاریخی واقعات بیان کرنے لگے تو سفر نامۂ نگار کے شعور فن پر حیرت ضرور ہوتی ہے۔ نسیم حجازی کا نام تو محض نمائندگی کرتا ہے اس نوعِ سفر نامہ کی ورنہ اس قسم میں بہت سے قد آور نام شامل ہیں۔

مکہ کے مقامات مقدسہ اور مدینہ کے تبرکات منورہ کے حوالہ سے تاریخی واقعات اور تفصیلات کی پیشکش کا انداز یہ بھی ہے کہ سفر نامۂ نگار اصل تاریخ اسلامی نہیں پیش کرتا' بلکہ اپنے فکری رجحانات اور ذہنی میلانات اور پسند و ناپسند کی ساختہ و پرداختہ تاریخی تعبیرات و تشریحات پیش کرتا ہے۔ وہ اسکی آنکھ اور اسکی عینک کے رنگ و زاویہ سے متعین و متشکل ہوتی ہے۔ غیر معروضی نگارش کی بجائے وہ تاریخ سازی کے مکروہ زمرہ میں آتی ہے۔ اس میں تاریخی واقعات' تفصیلات اور جزئیات کو اپنے جذبات و تعصبات میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ جا بجا اس انداز پیشکش اور طرز بیان میں خالص تاریخی واقعات بھی در آتے ہیں' مگر صرف انہیں مقامات پر جہاں سفر نامۂ نگار کی پسند خاطر سے ان کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ورنہ غیر پسندیدہ اشخاص و واقعات کو غیر تاریخی اور غیر اسلامی رنگ دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے سفرناموں میں سید اسعد گیلانی کے مشاہدات حرمین کو نوعی نمائندگی کا پورا پورا حق حاصل ہے بیت اللہ کے حوالے تاریخ ابراہیمی و اسمٰعیلی' جیاد کی چراگاہ' غار حراء' کوہ صفا و دار ارقم' شعب ابی طالب' صدیق' مسجد عقبہ' غار ثور وغیرہ کے حوالے سے سیرت نبوی اور تاریخ اسلامی اور بعض دوسرے حوالوں سے دوسرے تاریخی واقعات بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں بھی ان کی تاریخ سازی کا فن جا بجا بہار دکھاتا جاتا ہے (ص ا۔ ۶۸)۔ اموی خلافت اور اس کے خلفا کی تاریخ اسعد گیلانی کی فکر اسلامی کے خلاف تھی' لہٰذا ان کا حوالہ آتے ہی سفر نامۂ نگار تاریخ نویسی کے تنگ کوچہ سے نکل کر تاریخ سازی اور ہیجان انگیزی کے وسیع اور مختلف الجہات میدان میں نگارش و تحریر کے پینترے دکھانے لگتا ہے۔ حضرات حسنین کی شہادت اور مکان حضرت حسن کے

حوالے سے صرف ایک نمائندہ مثال

"چلے جاؤ۔ بنوامیہ کو پتہ چل گیا تو وہ قبروں میں سے بھی اٹھ کر تمہارا پیچھا کریں گے' جاؤ چلے جاؤ' میں ابن ہشام کی تاریخ ہوں اور سچ کہتی ہوں" (ص ۸۶)۔

بنوامیہ کی نفرت' ان کی تاریخ سے عداوت اور ہر طرح کی جذباتیت کو برحق بھی مان لیا جائے تو قبروں سے اٹھ کر پیچھے جانے اور تعاقب کرنے کی ہیجان انگیزی کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے؟۔ اس سے بڑا طرفہ ستم یہ کہ ابن ہشام کی تاریخ کا حوالہ لایا گیا ہے' جو خالص سیرت نبوی کی کتاب ہے اور اموی تاریخ یا خلافت کی تاریخ سے اسکا سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ سفرناموں میں ایسی تاریخ نویسی کی مثالیں اور بھی بہت سی ہیں' صرف اسعد گیلانی کو کلی افتخار حاصل نہیں۔

سفرناموں میں تاریخی واقعات نگاری کا ایک انداز تلمیح نویسی کی صورت میں ملتا ہے۔ فنی تقاضوں اور علمی اصولوں سے واقف صاحبان قلم اپنے سفرناموں میں واقعات' اشخاص اور مقامات کے حوالے سے جب سیرۃ نبوی اور اسلامی تاریخ کی جزئیات لاتے ہیں تو ان کو سفرناموں کا ایک جزو بنا دیتے ہیں۔ وہ ان کو اپنے خوبصورت سفری بیانیہ میں سموتے اور اسکی بنت گوندھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ تاریخی واقعات و تفصیلات کو اپنے محسوسات و روحانی واردات کا حصہ اور جذبات کا قصہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات کوئی الگ سے باب یا کتاب نہیں بنتے اور نہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند لگتے ہیں۔ وہ سفرنامہ نگار کے وجدانی اور روحانی محسوسات کے رنگ میں ڈھل کر ماضی کو حال کا ایک تسلسل بنا دیتے عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ اس نوع کا حسین ترین نمائندہ ہے۔ وہ فضائل و آداب' ادعیہ و مسائل' فقہی اختلافات و جزئیات اور تاریخ کے باب میں بھی اپنے فنی تقاضوں سے دستبردار نہیں ہوتے۔ ہمارے دوسرے جدید سفرنامہ نگاروں میں یہ فنی شعور زیادہ ہے اور وہ اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ بھی ہوئے ہیں۔

حالات سفر اور مشاہدات قیام و حضر ہر سفرنامے کے ضروری بلکہ ترکیبی اجزاء ہیں' لہٰذا ان کا ذکر حرمین شریفین کے سفرناموں میں بھی ناگزیر ہے۔ بہت سے لکھنے والوں کا المیہ

یہ ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے' رہنے سہنے' خرید و فروخت' سیر سپاٹے اور بہت سی دوسری عمومی چیزوں کی جزئیات و تفصیلات میں ہی گم رہتے ہیں۔ وہ منزل مقصود' مقصد سفر اور حاصل حیات سے یکسر غافل رہتے ہیں۔ درمیان میں کہیں کہیں ان کا جزوی یا گزرتا ہوا حوالہ لے آتے ہیں۔ وہ خالص سفرنامے ہو سکتے ہیں' طعام و شراب نامے' مصائب و مشکلات نامے' خرید و فروخت نامے اور سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر حرمین شریفین بالخصوص حج و زیارت کے سفرنامے نہیں ہو سکتے' قدیم و جدید' ادبی اور غیر ادبی سفرناموں میں ایسے نمونوں کی تعداد کافی ہے۔

بلاد اسلامیہ و ممالک عربیہ کے سفرنامے ہوں یا عالمی سیاحت نامے' ان میں حرمین شریفین کے سفرنامہ کا حصہ جزوی ہوتا ہے جو کل سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ اس محدودیت کے علاوہ ان کے حرمین شریفین کے بیانیہ میں تاریخی واقعات بھی موجود ہوتے ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ زیارتوں' ملاقاتوں اور سماجی' ثقافتی' علمی اور ذاتی تعلقات کا ذکر مفصل ہوتا ہے۔ دراصل ان کے لکھنے والوں کا واحد مقصود مکہ اور مدینہ سے وابستہ نہیں ہوتا' بلکہ دوسرے وسیع میادین سفر اور جولان گاہوں سے ہوتا ہے۔ چونکہ دوسرے ممالک و بلاد میں ان کے سفر کا زاویہ' جہت اور مقصود متعین ہو چکا ہوتا ہے' لہٰذا وہ حرمین شریفین کے سفر مبارک کے دوران بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا پاتے اور انھیں میں الجھے رہتے ہیں۔ نسیم حجازی کی تحریر مختصر میں تاریخی واقعات کا دخل ہے تو مولانا مسعود عالم ندوی' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحریروں میں ملاقاتوں اور شخصی زیارتوں کی بھرمار ہے جو حرمین شریفین کے سفرناموں سے زیادہ ملاقات نامہ یا تحریک نامہ بناتی ہے۔ احمد حسین خاں' حسن نظامی' بیگم ہمایوں مرزا' الیاس برنی (جزو اول)' عبدالصمد صارم' محمود عثمان حیدر اور متعدد دوسروں کے علاوہ ماہر القادری کے کاروان حجاز کا غالب تر حصہ حرمین شریفین کے حدود کے باہر ہی دوسری مصروفیات مسافر کو پیش کرتا ہے۔ ان میں سے متعدد اہل قلم کے بارے میں یہ معذرت کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے کب اپنے سفرناموں کو حرمین شریفین کی روداد پاک قرار دیا تھا۔ یہ تو تجزیہ نگاروں کی اپنی خام خیالی اور کج فہمی ہے کہ وہ ان

کو حرمین شریفین کے سفرنامے قرار دیتے ہیں.

ادبی اسالیب میں سب سے پہلے فصیح و بلیغ زبان اور حسین و خوبصورت نثر کا عنصر قابل توجہ ہے۔ جدید اور معاصر سفرناموں میں بہت سے عمدہ زبان و بیان اور حسین اسالیب کے نمونے ہیں' لیکن ان میں سے صرف چند میں ادبیت' زبان کی فصاحت' بیان کی بلاغت اور اسلوب کی لطافت کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ عبدالماجد دریابادی غالباً ان کے سرخیل اور ان کا شہ پارہ سرفہرست ہے۔ شورش کاشمیری' ابوالخیر کشفی' ماہرالقادری' غلام الثقلین نقوی' احمد خاں درانی' فرید احمد پراچہ' صادق قریشی' وحیدہ نسیم اور بعض دوسرے بھی ادبی تسلسل کی روایت برقرار رکھتے ہیں' لیکن ان کے ہاں بھی ناہمواریاں در آتی ہیں' بالخصوص ان مقامات پر جہاں جذبہ دل' سرشاری عقیدت اور گرمی محبت ان کے قلم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقامات حج و زیارت اور مراحل روح و وجدان کا دلدوز و دلآویز رنگ و روپ ملاقاتوں' خریداریوں اور دوسری سفری کثافتوں کے بیان میں برقرار نہیں رہ سکتا' مگر صاحب اسلوب کا کمال تو وہیں نظر آتا ہے جہاں جذبہ اور جوش بھلے ہی ساتھ نہ دے' مگر اسکی مخصوص رعنائی تحریر اور زیبائی نگارش روشنائی کی طرح قلم سے جواہر ریزے بکھیرتی رہے۔ عبدالماجد دریابادی ایسے ہی صاحب اسلوب ہیں شورش کی شوریدگی اور ابوالخیر کا کشف اور بعض دوسرے صاحبان طرز کا اسلوب ہر مقام و مرحلہ میں جادو جگاتا ہے۔ اکا دکا ادبی جملے اور کہیں کہیں ادبی شاہکار مل جانا بھی بسا غنیمت ہے' مگر ان کا حال بقول حضرت جگر اس عمدہ شعر کی مانند ہے' جو ہر کس و ناکس بالخصوص نااہلوں پر بطور سزا اتار دیا جاتا ہے.

اردو ادب میں سوڈیڑھ سو سال کی مدت میں تقریباً اتنے ہی حرمین شریفین کے سفرنامے لکھے گئے۔ یہ تعداد کافی تشویشناک تکلیف دہ اور ناکافی ہے۔ وہ ہمارے جذبات محبت و عقیدت حرمین اور دعوائے عشق الٰہی و نبوی پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ خالص سفرناموں کی تعداد تو اور بھی سمٹ جاتی ہے اور وہ باعث افتخار ہرگز نہیں۔ کیفیت کے لحاظ سے ہمارا حرمین شریفین کے سفرناموں پر مبنی ادب زیادہ سے زیادہ گوارا کہا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ اردو سفرنامہ ہائے حرمین کو کئی صاحب دل و خبر اور اہل ذوق و

نظر نے عمدہ علمی اور ادبی اسالیب سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن ابھی مقامات مقدسہ کے شایان شان سفرنامے لکھے جانے ہیں شرط بس یہی ہے کہ جذبہ کی دولت، قلم کی طاقت، زبان کی لطافت، اسلوب کی حلاوت کے ساتھ فنی تقاضوں سے آگاہی اور نظر و مقصود نظر سے ہم آہنگی ہو.

حرمین شریفین کے سفر نامے : ادب کی مخصوص صنف

محمد عبدالجبار شیخ

ڈائریکٹر سیرت سٹڈیز سنٹر سیالکوٹ

سفر ناموں کا ادب ایک ایسی تخلیق ہے جو حقیقی انسانی ادب ہے اور انسانیت کے معیار کے مطابق مطلوبہ فطری اقدار کو امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے پیش کرتا ہے اور اس آیت کی حقیقی تصویر ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (الروم). حرمین کا مسافر دور جدید کے غیر فطری تکلفات اور مشکلات سے ہٹ کر دین متین کی فطری راہ پر رحمتوں اور دشواریوں سے بھرے ہوئے سفر کو حقیقی طمانیت اور سکینت کے حصول کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ اس کے لیے دیار محبوب کا سفر، حرم مکہ اور امور حرم مدینہ کا بیان حقیقت سفر نامہ کے نکھار کی علامت ہے۔ اس لیے مختلف زبانوں میں لکھے گئے حرمین شریفین کے سفر نامے "ادب برائے انسانیت" کا اعلیٰ ترین مظہر ہیں۔ کوئی بھی زبان ہو اور کوئی بھی مصنف معروضی طور پر زیارت حرمین کا بیان دراصل ان حقائق کی تشریح و توضیح پر مبنی ہوتا ہے جو ایک زائر کو اس سفر میں پیش آتے ہیں۔ حرمین شریفین کے سفر ناموں کی یہی ادبی خصوصیت اور یہی علمی اور فکری بنیاد ہے جس کا تعلق براہ راست حضور سرور کائنات ﷺ کے اس ارشاد پاک سے قائم ہوتا ہے : ادبنی ربی فاحسن تادیبی. پھر اسی ادب فطرت کی تکمیل ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ کے الفاظ سے ہو رہی ہے۔ کلام اللہ کی آیات و سور، احادیث نبوی کا لٹریچر، میثاق مدینہ، خطبہ حجۃ الوداع، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سربراہان مملکت کو فرستادہ خطوط کی دستاویزات، ائمہ و علما کے احوال اور حرمین شریفین کے سفر ناموں کی زبان و ادب ایسے ہی با مقصد ادب کا اظہار ہے۔

رچرڈ برٹین کا "گریج ٹو مکہ" (Grimmage to macca) ہو یا محمد اسد کا روڈ ٹو مکہ (Road to mecca) ابن جبیر، ابن بطوطہ البیرونی اور دیگر سیاحوں کی تحریرت

ہوں یا محمد حسین ہیکل کی منزل الوحی ساری محنتیں اور کاوشیں ادب اسلامی کی مثال ہیں۔ اور نہ صرف امت مسلمہ بلکہ پوری انسانیت کے لیے دین فطرت کی طرف بے مثال رہنمائی کی دلیل ہیں اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر کی : قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ حرمین کے سفرنامے تو ہمیں مرکز کے ساتھ اپنے عظیم ترین امور اور مخلصانہ تعلق کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ابدالآباد تک منسلک رہنے کی تربیت دیتے ہیں' کیونکہ حرمین کی حاضری ایک مومن کے لیے ایمان کے معراج کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن ان سب حقیقتوں کے باوصف آج ہمیں اس بات کا گہرائی میں تجزیہ کرنا ہے کہ ہم امت مسلمہ کو درپیش مسائل کا حل سفرناموں کی روشنی میں کیونکر تجویز کر سکتے ہیں اور ان تحدیات کا وافی و شافی جواب ان سفرناموں سے کیونکر ممکن ہے جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ ایک طرف الکفر ملة واحدہ کے تحت آج اسلام کی مخالف قوتیں مسلمانوں کے خلاف یک جان ہو کر عالم اسلام کو اپنا اولین ہدف قرار دے چکی ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان معاشرہ فرقہ وارانہ کشمکش اور داخلی تصادم کا شکار ہے۔ پوری امت مسلمہ مغربی تہذیب کی متشددانہ یلغار کی زد میں ہے' کیونکہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف اور مد مقابل ٹھہرا لیا ہے۔

اس لیے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ انسانی معیاری ادب' یعنی اسلامی ادب اور خصوصاً حرمین کے سفرناموں کے مشتملات کی روشنی میں مغرب اور اس کی یلغار کا جواب کیسے ممکن ہے۔ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعہ نہ صرف جہالت پھیلائی جارہی ہے' بلکہ پوری انسانیت کو جاہلیت جدیدہ کی اتھاہ اور تاریک غاروں میں دھکیلا جارہا ہے' جس کا علاج ازبس ضروری ہوگیا ہے' کیونکہ اس طرح بھیانک طریقے سے انسانی ذہنوں کو مسخ کیا جارہا ہے کہ سوچ کے ذریعے الٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کے لیے یہ عصر نو کا بہت بڑا چیلنج ہے جس کا مقابلہ انہیں آگے بڑھ کر کرنا ہوگا۔ پھر دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی پھبتی کس کر دنیائے علم و دانش کو مسلمانوں کی

اپوزیشن بنایا جارہا ہے اور پھر اس طریقے سے پس پردہ ایمان والوں کو کتاب ہدایت یعنی قرآن پاک سے دور رکھنے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی لازوال محبت کی حوصلہ شکنی اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے شرانگیز پروپیگنڈا دانشوران اسلام کے لیے ایک 'آئی اوپنر' ہے۔

اس سے کہیں زیادہ خطرناک جسارت یہ ہے کہ میڈیا کے ذریعہ نوجوان نسل کو انسانی قدروں اور اسلامی شعائر سے متنفر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جو کہ اسلام دوست مصنفین کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے' اس لیے آنے والی نسلوں کی تربیت کی طرف توجہ دینا از بس ضروری ہو گیا ہے۔

مسلمان ادبا کو چاہئے کہ وہ حرمین شریفین کے سفر ناموں سے خوشہ چینی کریں اور نہایت مؤثر اور سادہ انداز میں اس مسئلہ کا حل تجویز کریں' علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی روشنی میں کہ :

این کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

نہ صرف قرآنی اقدار کو نسل نو کے سامنے اجاگر کیا جائے' بلکہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت بے پایاں کو جو تسخیر عالم کی اولین دلیل ہے پھر سے روشن کرنے کی سعی کی جائے۔ حج کے ادارے کو اس قدر مؤثر اور بامقصد بنادیا جائے کہ وہ یونیورسل دین' یعنی بین الاقوامی امور کائناتی اقتدار اعلیٰ کی طرف بڑھنے کا ذریعہ ہو' کیونکہ عالمی ریاست کا قیام اور ترقی یافتہ دور میں امت انسانیہ کی تشکیل ہی دین کامل کا مقصود و مطلوب ہے۔ ادبائے امت اور دانشوران اسلام کے لیے لازم ہے کہ آگے آئیں اور امت مسلمہ کی علمی اور فکری رہنمائی کرکے ایسا علمی اور ثقافتی رجحان پیدا کریں کہ جس سے نہ صرف انسانی ذہنوں کی آبیاری ہو بلکہ ایسا ثقافتی انقلاب برپا ہوسکے جو قرآن و سنت کی اقدار کی عملی تصویر ہو۔

حرمین کے سفرناموں میں ادبی اسلوب

محمد یوسف خان

(مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور)

افسانہ اور ناول نگاری کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر سے شاید دو رائیں سامنے آئیں، لیکن اس بات کی تردید شاید ممکن نہ ہو کہ اگر مذہبی امور کو ناول یا افسانہ نگاری کی طرز پر لکھنا شروع کیا جائے اور مذہبی اقدار کا تقدس ملحوظ خاطر نہ ہو تو پھر رشدی کی شیطانی آیات جنم لیتی ہیں۔

تاہم حرمین شریفین کی عظمتوں اور امتیازی خصائص نے امت اسلامیہ کے ادبا کو ہمیشہ روحانی غذا مہیا کی ہے۔ چنانچہ ان ادبا نے اپنے اپنے سفرہائے عقیدت ادیبانہ رنگ میں پیش کیے۔ وہ ادب جو زندگی کا ترجمان، عکاس، نقاد اور زندگی کے مجمل کا مفسر ہوتا ہے۔ ادیب ایک عام سی بات یا ایک گہری بات کو ایک علامت، ایک اشارے، ایک کنائے، ایک تمثیل اور ایک رمز میں لکھ جاتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ عقیدت کی خوشبو دل میں بسانے کیلئے جذبے ادبی کانٹوں میں سجے الفاظ کے محتاج نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ بات اس وقت دل پر اثر کرتی ہے جب دل سے نکلے لیکن ارشاد نبوی اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا کی روشنی میں جب ایک ادیب الفاظ کا جادو جگاتا ہے تو اس کا کلام دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے ذہن متاثر ہوتا ہے، سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ادیب جہاں سے ہو کر آیا ہے دوسرے کے اندر وہاں جانے کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔

واقعات و حرکات چاہے زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں، ادیب انہیں

دلچسپ انداز میں پیش کرنا چاہتا ہے. ادیب اپنی تحریر میں جس قدر دلچسپی پیدا کرتا ہے وہ اسی قدر کامیاب تصور کیا جاتا ہے. مثال کے طور پر حج کا سفر نامہ لکھتے ہوئے ایک عام مؤلف حج کی تیاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے کہ :

"میں نے حج کی تیاری کرتے ہوئے سب سے پہلے تصویر اتروائی تاکہ کاغذات کی تیاری کی جاسکے"

لیکن یہی بات ایک ادیبہ یوں لکھتی ہیں.

"میں جب حج کے فارم پر لگانے کے لیے تصاویر اتروانے کیمرے کے سامنے بیٹھی تو مجھے کیمرے کے شیشہ میں کعبہ شریف نظر آیا' میں سراپا التجا بن گئی (دل میں کہنے لگی) میرے خدا تجھ تک پہنچے کے لئے یہ گنہگار حاضر ہے. میں تیری تخلیق ہوں اور تو "مجازی خدا" کی طرح میری صورت نہیں دیکھے گا. اگر میری سیرت میں کوئی ذراسی بھی اچھائی ہے تو مجھے اپنے گھر ضرور بلانا"

(ثریا جبین : "میں موت ڈھونڈتی ہوں زمین حجاز میں" بک کارنر جہلم' اپریل ۱۹۸۰ء)

مکالمہ

ادیب کا ایک اور رخ جس پر وہ توجہ دیتا ہے وہ مکالمہ ہے. دراصل مکالمے واقعات کے بیان میں جاذبیت پیدا کرنے کا وسیلہ ہوتے ہیں جب ادیب اپنے خاص اسلوب سے قلم چلاتا ہے تو اس میں الفاظ کے چناؤ میں بھی جذباتیت اور انسانی جبلتوں کو شامل کر لیتا ہے.

مایہ ناز افسانہ نگار جناب ممتاز مفتی مشہور سفرنامہ حج "لبیک" کا اہل ذوق نے مطالعہ کیا تو خوب داد دی. اس لئے کہ اس کے مکالمے جب دل کی دھڑکنوں کے ترجمان ہوں تو شمع توحید ورسالت کے پروانے اس روشنی کا طواف کرنے کو تڑپ اٹھتے ہیں' لیکن جب ادیب

اپنے قلم سے کعبہ شریف کو "کالا کوٹھا" لکھ جاتا ہے تو پھر اسے اپنوں اور پرایوں کی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کردار نگاری' دائرہ عمل' ماحول

ایک ناول نگار ادیب اپنی تحریر کے کرداروں کو اتنا جاندار بنا کر پیش کرتا ہے کہ تحریر کے اختتام پر وہ کردار قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ناول نگار نسیم حجازی اس میدان کے شہسوار ہیں۔ وہ یہ جب حرمین شریفین کی زیارت سے شرف ہوئے اور اپنا سفر نامہ "پاکستان سے دیار حرم تک" لکھا (جو قومی کتب خانہ لاہور سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا) تو اس میں ایک خاص اثر تھا۔ اس لئے کہ ناول نگار کی گھٹی میں یہ بات پڑ جاتی ہے کہ وہ کردار کے ساتھ ساتھ جغرافیائی اور تاریخی واقفیت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے دنیا کا ہر مقام اور تاریخی اعتبار سے ہر دور اپنی انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔ پھر جبکہ ان تمام مقامات میں افضل ترین مقامات حرمین شریفین ہیں۔ اس لئے ایک ادیب ان مقدس مقامات کا سفر نامہ لکھتا ہے تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ان تمام مقامات کی زیارت کر رہا ہے۔

فلسفۂ حیات' مقصدیت

ایک عام مصنف حرمین شریفین کا سفر نامہ لکھتا ہے تو وہ واقعاتی تذکرہ کرتا ہے۔ اپنے جذبات کو سادہ الفاظ میں بیان کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن محض جب ایک ادیب کا قلم الفاظ کے ہیرے تراشتا ہے تو وہ اسے اس تحریر اور بیان کے مقصد اور حقیقت سے بھی آگاہ کرتا جاتا ہے۔ اور وہ قاری کو اصل منزل اور فلسفہ حیات سے بھی روشناس کراتا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جمرات پر کنکریاں مارنے کو ایک عام مصنف سادہ سے انداز میں لکھ دے گا' لیکن ایک ادیب اسی عمل کو اس طرح لکھتا ہے کہ جس سے جمرات کا فلسفہ دل میں نقش ہو جاتا ہے' جیسے ثریا جبین صاحبہ نے اپنے سفرنامے' میں موت ڈھونڈتی ہوں زمین

حجاز کے صفحہ ۲۹۹ میں لکھا ہے!

"شیطان کو ہم نے کنکریاں سڑک کی دوسری منزل سے ماریں، نچلی سڑک پر بھی بہت سے حاجی اس (شیطان) کا مزاج درست کر رہے تھے۔ شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے میں نے سوچا "کم بخت نہ تو آدم و حوا کو بہکاتا، نہ وہ دنیا میں بطور سزا آتے، نہ دنیا بنتی، نہ تو حضرات ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی سے روکتا اور نہ آج تیری یہ درگت بنتی"

مسجد قبلتین کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک ادیب لکھتا ہے:

"آپ نماز پڑھا رہے تھے کہ آیت مبارکہ نازل ہوئی، آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کر لیجئے نماز ہی کی حالت آپ نے مع صحابہ کرام کعبہ کی طرف منہ کر لیا، اس لئے اس مسجد کا نام مسجد قبلتین ہو گیا۔ یہاں نفل پڑھ کر دیر تک محراب مسجد کو تکتا رہا۔ ایک بار پھر یہ شعر کانوں میں گونجا"

شاید وہ مسجود محبت اسی راہ سے گزرا ہو
دو سجدے یہاں کر لوں، میں دو سجدے وہاں کر لوں

اسلوب، انداز بیان

ایک ادیب کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کا اسلوب انداز بیان انوکھا، دلچسپ اور خوبصورت ہو۔ اس لئے کہ روکھے پھیکے غیر دلکش انداز میں لکھی گئی تحریر کے باقی اجزا چاہے کتنے ہی عمدہ ہوں، لیکن قاری چند صفحات پڑھ کر اکتانے لگتا ہے۔

اس کی ایک عمدہ مثال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ہے۔ مولانا پہلے افسانہ نگاری کا شوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ ان کے اس دور کے افسانے نیاز فتحپوری کے رسالہ "نگار" میں شائع ہوتے رہے، لیکن جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تربیت سے سرشار ہوئے تو پھر افسانے "افسانے" ہو کر رہ گئے۔

لیکن ادب کی وہ چاشنی مولانا عبدالماجد دریابادی کی بعد میں لکھی گئی کتابوں میں

اہل ذوق کو بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے. چنانچہ حرمین شریفین کے سفرنامے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، جو کہ "نامی پریس لکھنؤ" سے "سفرنامہ حجاز" کے نام سے شائع ہوا.

مولانا کا سفرنامہ ایک توازن واعتدال کی عمدہ مثال ہے۔ مولانا چونکہ ایک صاحب قلم ادیب ہونے کے ساتھ ایک عالم باعمل اور صوفی کامل بھی تھے۔ اس لئے ان کی تحریر سہ آتشہ ہے. اس میں ادب کی چاشنی بھی ہے. اب عالم کا علم بھی ہے اور صوفی کامل کا ورع و تقویٰ بھی.

اپنے گھر سے بیت اللہ تک۔ایک منفرد سفر نامہ

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی (انڈیا)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی عربی اور اردو دونوں زبانوں کے صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی شخصیت کی طرح ان کی تصانیف بھی محتاج تعارف نہیں ہیں۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلوب وطرز نگارش کے لحاظ سے جہاں وہ ادیب وانشاپرداز ہیں، وہیں موضوع اور مواد کے لحاظ سے وہ ایک داعی اور مفکر بھی ہیں۔ان کی بے شمار تصانیف میں ادبی لحاظ سے "نقوش اقبال" اور "کاروان مدینہ" ممتاز ہیں۔طبقات وتراجم، سیرت وسوانح، اسرار شریعت، تاریخ دعوت اور دیگر نوع بہ نوع موضوعات پر درجنوں گراں مایہ اور محققانہ تصانیف کے علاوہ متعدد سفر نامے بھی آپ کے رشحات قلم میں شامل ہیں، مثلاً "ترکی میں دو ہفتے" اور "شرق اوسط میں کیا دیکھا" وغیرہ۔

ان عمومی سفر ناموں کے علاوہ "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" کے عنوان سے آپ نے حج کا ایک سفر نامہ بھی تحریر فرمایا ہے۔یہ سفر نامہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے قابل ذکر اور قابل مطالعہ ہے۔آئندہ صفحات میں ہم اس کی کسی قدر تفصیل پیش کرتے ہیں۔

حج ایک عبادت ہے اور جس طرح اس عبادت کی روح اخلاص وللّٰہیت ہے، اسی طرح لازم ہے کہ سفر حج کی روداد بھی نام ونمود اور شہرت وناموری کی خواہش سے پاک اور منزہ ہو۔ورنہ سفر حج کی طرح سفر نامۂ حج بھی غارت اور اکارت چلا جاتا ہے، لیکن انسان

کا نفس ہو کہ شیطان دونوں مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس کے حسنات کو سیئات میں تبدیل کراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بعض شخصیات کے تعلق سے اس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے کہ انہوں نے حج کیا ہی اس لیے تھا تاکہ سفر نامۂ حج لکھ سکیں.

حق تعالیٰ نے دیگر اوصاف و کمالات کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کو تقویٰ اور طہارت قلب کی دولت سے بھی مالا مال اور سرفراز فرمایا ہے' اس لیے مولانا موصوف سفر نامۂ حج لکھنے سے شعوری طور پر گریزاں رہے کہ' بقول علامہ اقبال

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنالیتی ہے تصویریں

لیکن اب سے پچاس سال پیشتر ۱۳۶۸ھ میں جب مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے "الفرقان" کا حج نمبر نکالنے کا قصد کیا تو اصرار کر کے حضرت علی میاں صاحب سے متذکرہ بالا سفر نامۂ بھی تحریر کرالیا۔ حضرت موصوف نے مولانا نعمانی کے اصرار پر یہ سفر نامۂ لکھ تو دیا' لیکن شدت کے ساتھ یہ تاکید بھی کردی کہ اسے ان کے نام کے بغیر شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں خود مولانا نعمانی رقم طراز ہیں:

> "ازراہ اخلاص وانکسار ان کا سخت اصرار تھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کا نام ظاہر نہ کیا جائے' اور ان کو امید تھی کہ میں ایسا ضرور ہی کروں گا' لیکن جب انہوں یہ مضمون تیار کر کے حوالے کر دیا تو میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل اپنے لیے ضروری نہ سمجھی۔ بہر حال اس مضمون کو مولانا کے نام سے شائع کر دینے کی اچھائی برائی کا ذمہ دار یہ عاجز ہے"۔

پس اس سفر نامے کی پہلی خصوصیت اس کے مصنف کا اخلاص وانکسار ہے' جس نے اس کے حرف حرف میں کیفیت اور تاثیر کی شان پیدا کر دی ہے۔ سچ کہا گیا ہے:

"از دل خیزد بر دل ریزد"۔

غالب نے کہا تھا:

نالہ پابند نے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

غالب کی پوری شاعری کی طرح یہ شعر بھی استعاراتی ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ صاحب طرز فن کار کے لیے اظہار کی راہیں مسدود اور محدود نہیں ہیں۔ وہ مختلف اصناف ادب کی حدود اور قیود میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رکھتا ہے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اس کا بنیادی حق بھی ہے۔ حضرت مولانا کی پیش نظر تحریر بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔ انہوں نے بڑی خوب صورتی اور فنی دل آویزی کے ساتھ سفر نامے میں دعوت و موعظت کو یا دعوت و موعظت میں سفر نامے کو آمیز کر دیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مولانا نے طریق کار یہ اپنایا ہے کہ تمہید سفر و مسائل سفر اور منازل سفر کی بہت سی جزئیات، جو روایتی سفر ناموں میں عام طور پر مذکور ہوتی ہیں، قلم انداز کر دی ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ تذکرہ نوعیت کی جزئیات بالکلیہ حذف کر دی گئی ہوں، بلکہ کسی کامل فن مصور یا نقاش کی طرح صرف انہی جزئیات کا سہارا لیا گیا ہے، جو کسی منظر نامے کی تشکیل میں ممد و معاون ہوں۔ اس طرح مولانا کی یہ تحریر روایتی سفر نامہ نہ ہوتے ہوئے بھی سفر نامے کے دائرے سے خارج نہیں ہے، یعنی اس کا سفر نامہ پن برقرار ہے۔

دوسری طرف جزئیات سفر کی کمی کی تلافی دعوت و موعظت کے عناصر سے کر دی گئی ہے، لیکن یہ عمل بھی ایسی فنی چابکدستی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے کہ قاری کو پند و موعظت کی گراں باری یا موضوع کی خشکی کا ایک ذرا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ ذوق و شوق، کیف و مستی اور سوز و سرور کے عالم میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہر قدم پر اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ حج کی روح اس میں اور وہ حج کی روح میں اترتا چلا جا رہا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس سلسلے کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"گاڑی آ گئی۔ مسافروں کو ایذا دیئے بغیر سوار ہوئے۔ سامان قرینے سے رکھا۔ بقدر ضرورت جگہ گھیری، وضو اور نماز کا انتظام کر لیا۔ سفر کے اس ہنگامے اور شور و غل میں بھی اپنے سفر کی عظمت، اللہ تبارک و تعالیٰ کی

طرف توجہ اور اپنی بے بسی کا احساس قائم ہے۔ لوگوں سے محبت کے ساتھ رخصت ہوئے اور سفر کی مقبولیت اور کامیابی کے لیے خود ان سے دعا کی درخواست کی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان سادہ دل بندوں میں کتنے مقبول بارگاہ ہوں گے اور کتنوں کے جسم یہاں اور دل وہاں ہوں گے اور کتنے بہت سے حجاج سے افضل ہوں گے"

"لیجئے روانگی کا دن آپہنچا آج بڑے ہنگامے کا دن ہے۔ میدان حشر کا ایک نمونہ ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ہر ایک کو اس کی فکر ہے کہ اس کو اچھی سے اچھی جگہ مل جائے اور سامان محفوظ رہے۔ قانونی مراحل سب طے ہوئے۔ سامان جہاز پر پہنچا۔ اب سوائے اللہ پر بھروسے کے کوئی چارہ نہیں۔ جہاز پر داخلہ شروع ہو گیا۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے یہ دن دکھلایا۔ خدا وہ دن بھی دکھائے کہ سرزمین مقدس پر اترنا ہو۔ سفر عشق میں راحت کا کیا سوال؟ پھر بھی اللہ کے احسان کے صدقے کہ ہم ضعیفوں کو امتحان میں نہیں ڈالا اور راحت و عافیت کی جگہ عطا فرمائی۔ لیجئے وہ سیٹی ہوئی، وہ لنگر اٹھا، وہ ہاتھ سلام کے لیے اٹھے، وہ رومال وداع کے لیے ان سب کو سب نے دیکھا، مگر بہتے ہوئے آنسوؤں کو کس نے دیکھا؟ اور گلو گیر آواز کو کس نے سنا؟ جانے والو! حج و زیارت تم کو مبارک ہو۔ مومن کی معراج تم کو مبارک ہو، ہم مجبوروں کو نہ بھولنا۔

"ہمیں بھی یاد رکھنا کہ جب دربار میں آئے"

اب اس سلسلے کی تیسری مثال ملاحظہ ہو، جس میں کوائف سفر اور موعظت دونوں کا بہترین امتزاج ہے۔ واضح رہے کہ ذکر عرفات سے روانگی کا ہے:

"اب لاکھوں انسانوں کی یہ بستی یہاں سے تین میل پر منتقل ہو جائے گی۔ شہر کا اجڑنا بسنا کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ ایک شور قیامت برپا ہو، ایک طوفان بے تمیزی۔ لیکن یہاں کچھ نہیں؛ حکم لایا تھا، حکم لیجا رہا ہے، غلاموں کی

طرح آئے تھے' غلاموں کی طرح جاتا ہے۔ لیجئے خیمے اکھڑے' طنابیں ڈھیلی ہوئیں' شامیانے تہہ ہوئے' دیکھتے دیکھتے یہ جیتا جاگتا شہر لق ودق میدان بن گیا۔ جو جواں ہمت اور سواری کے پابند نہ تھے' وہ آزادی سے وقت مسنون پر روانہ ہوگئے۔ جو ضعیف اور عورتوں کی وجہ سے مجبور تھے' ان کو سواری کی وجہ سے وقت پیش آئی اور انتظار کرنا پڑا۔ سواری نہ اب آتی نہ تب۔ اب میدان میں جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ہمارے چھوٹے سے قافلے کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ لاریاں آتی ہیں اور نکل جاتی ہیں۔ رات گذری چلی جارہی ہے۔ مزدلفہ میں بسر ہونے والی رات کا خاصہ حصہ عرفات میں گذرا جارہا ہے۔ یاالٰہی کیا ہوگا؟ کیا ہم یہیں رہ جائیں گے؟ کیا ہم مزدلفہ سے محروم رہیں گے؟ مستورات کا ساتھ' دن بھر کے تھکے ماندے' معلم صاحب بھی عاجزو مجبور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پیمانہ' صبر لب ریز ہونے لگا۔ ڈرائیور پر غصہ' معلم پر خفگی' سب بے سود' آدھی رات ہونے کو آئی۔ خدا خدا کر کے لاری آئی۔ تیوڑی چڑھی' تلخ و تند لہجے میں ڈرائیور سے محاسبہ کیا کہ کہاں اتنی دیر لگائی؟ کیا حجاج کو اذیت دینا تم لوگوں کے نزدیک کار ثواب ہے؟ اس نے آسانی سے کہہ دیا کہ راستہ صاف نہ تھا۔ گھنٹوں میں پہلی کھیپ پہنچی اور بہ مشکل واپسی ہوئی۔ کہہ کر افسوس ہوا کاش زبان سے کچھ نہ کہا ہوتا۔ اللہ کا شکر ادا کیا ہوتا کہ اس نے آخر پہنچادیا۔ اب بھی اگر لاری نہ آتی تو کیا کرتے۔ یہی فرق ہے بڑوں اور چھوٹوں میں"۔　　(ص ۶۴۔۶۶)

سیرت ہو یا سوانح' آپ بیتی ہو یا سفرنامہ' کوئی تحریر اس وقت تک ادب نہیں بنتی' بلکہ یوں کہیے کہ اس میں ادبی رنگ نہیں پیدا ہوتا' جب تک کہ بیان واقعات کی خارجیت کو داخلیت اور جذبات واحساسات کی آنچ نہ پہنچادی جائے۔ حضرت مولانا کی زیر بحث تحریر میں یہ کیفیت از اول تا آخر ہر جگہ موجود ہے۔ اس لیے اس کا ادبی پہلو کہیں دبنے نہیں پاتا۔

البتہ جہاں جہاں یہ لے دو آتشہ ہو گئی ہے، وہاں وہاں اس کا لطف بھی دوبالا ہو گیا ہے۔ اس کی بھی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مدینہ پاک کی حاضری کا موقع ہے۔ اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

"نظر اٹھا کر دیکھئے یہ دونوں پہاڑوں کی قطاریں ہیں۔ کیا عجب کہ ناقۂ نبوی اسی راستے سے گذری ہو۔ یہ فضا کی دلکشی یہ ہوا کی دل آویزی اسی وجہ سے ہے۔ لیجئے مسجد آگئی اب بئر علی کی باری ہے:

منزل دوست چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

درود شریف زبان پر جاری ہے۔ دل و فور شوق سے امنڈ رہا ہے۔
عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟
کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں شعر پڑھتا ہے۔ بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی جس قدر طیبہ قریب ہوتا جا رہا ہے۔
ہوا کی خنکی، پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک، لیکن دل کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ سنیے کوئی کہہ رہا ہے:

بادِ صبا جو آج بہت مشکبار ہے — شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے
وہ ایک بار ادھر سے گئے، مگر اب تک — ہوائے رحمت پروردگار آتی ہے
عجب کیا گر مہ و پروین، مرے نخچیر ہو جائیں — کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سبل ختم رسل مولائے کل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است
داغ غلامیت کرد مرتبہ خسرو بلند — میر ولایت شود، بندہ کہ سلطان خرید
محمد عربی کا بروے ہر دوسراست — کسے کہ خاک درش نیست، خاک بر سر او

(ص ۳۱۔۳۲)

ایک مثال اور:

اب آپ ہیں اور مسجد نبوی، دل کا کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔ درود

شریف پڑھنے کا اس سے بہتر زمانہ اور اس سے بہتر مقام کون سا ہو سکتا ہے؟ اب بھی شہود و حضور نہ ہو تو کب ہو گا؟

دن میں جتنی مرتبہ جی چاہے حاضری دیجئے اور سلام عرض کیجئے۔ آپ کے نصیب کھل گئے۔ اب کیوں کمی کیجئے، مگر ہر بار عظمت و ادب اور اشتیاق و محبت کے ساتھ دل کی ایک حالت نہیں رہتی۔ وہ بھی سوتا اور جاگتا ہے۔ جاگے تو سمجھے کہ نصیب جاگے۔ حاضری دیجئے اور عرض کیجئے۔

ع زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

کبھی اس کا جی چاہے گا کہ غلاموں کے وفود کے ساتھ ملا جلا حاضر ہو۔ عشاق کی آنکھوں سے جنہوں نے مجبوری کے دن کاٹے اور فراق کی راتیں بسر کیں، جب آنسوؤں کا مینہ برسے گا، تو شاید کوئی چھینٹا اس کو بھی تر کر جائے۔ رحمت کی ہوا جب چلے گی تو شاید کوئی جھونکا اس کو بھی لگ جائے۔ کبھی دبے پاؤں لوگوں کی نظریں بچا کر تنہائی میں حاضر ہونے کو جی چاہے گا۔ اس باب میں دل کی فرمائش سب پوری کیجئے۔ کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ کبھی صرف آنسوؤں سے زبان کا کام لیجئے۔ کبھی ذوق و شوق کی زبان میں عرض کیجئے"

(ص ۳۶-۳۷)

حج کے سفرنامے عام سفرناموں سے اس لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں کہ تمام سفرناموں میں قاری کو پہلے سے اس کا علم نہیں ہوتا کہ مسافر کہاں کہاں جائے گا اور دوران سفر اسے کسی قسم کے تجربات و کوائف سے دوچار ہونا پڑے گا؟ اس کے برخلاف سفر حج کے مراحل، منازل، مقامات اور مناسک وغیرہ سے پڑھنے والے کو فی الجملہ واقفیت ہوتی ہے۔ اس لیے عام سفرناموں کے برخلاف حج کے سفرناموں میں انفرادیت کی شان پیدا کرنا اور قاری کے تحیر و تجسس کو برقرار رکھنا زیادہ دشوار گذار ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے کامیاب

گذرنے کی دو ہی صورتیں ہیں؟ ایک تو تجربات و مشاہدات کی انفرادیت اور طرفگی دوسرا انداز بیان کی رعنائی اور شگفتگی پیش نظر سفرنامے میں دونوں ہی خوبیاں موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ محض سفرنامہ نہیں بلکہ دعوت و موعظت بھی ہے اور اسے پڑھ کر صاحب قال بھی صاحب حال بن سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کا مطالعہ جذب و شوق کے ساتھ ساتھ عصری تحدیات سے عہدہ برآ ہونے کا داعیہ بھی پیدا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ماہر القادری بحیثیت سفر نامہ نگار
(کاروان حجاز کی روشنی میں)

ڈاکٹر سید عبدالباری
(صدر شعبہ اردو۔ جی ایس پی جی کالج اودھ یونیورسٹی بھارت سلطانپور یوپی)

دنیا کے علم وادب میں سفر نامہ نگاری کی روایت بہت پرانی ہے ساتھ ہی اس کے تقاضے بھی بے حد نازک اور پر آزمائش ہیں۔ اس صنف میں آدمی دوران سفر اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے۔ اس میں جس قدر بے تکلفی بے ساختگی ہو اور تصنع و آورد سے کنارہ کشی ہو اسی قدر اس صنف کے تقاضے بحسن و خوبی ادا ہوتے ہیں۔ پر تکلف انسان ذاتی کوائف اور واردات کے اظہار کے معاملہ میں سنگ دل ہوتا ہے۔ یوں ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں یہ "ممکن نہیں کہ کوئی شخص وہ سب کچھ لکھ دے جو اس پر اور اس کے دل پر گذر رہی ہے"۔ انہیں کے الفاظ میں "سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ واقعات کی خارجی روداد (اپنے متعلق) اور چشم دید تفصیل (دوسروں کے متعلق) بیان ہو سکتی ہے"۔

(اردو نثر فنی ارتقاء مرتبہ فرمان فتحپوری ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی ص ۳۵۲)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے احساسات کی سرگزشت لکھنے کا بہترین ذریعہ ناول ہے جس پر سر دلبراں کو حدیث دیگراں بنا کر پیش کرنا ممکن ہے۔ سفر نامہ نہ تو فقط روزنامچہ ہے اور نہ محض آپ بیتی۔ یہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اس لیے اس میں فکشن کی آمیزش پسندیدہ نہیں۔ مبالغہ بناوٹ اور اپنی ذات کی نمائش سفر نامہ نگار کے لیے مہلک ہوتی ہے۔ ملمع کاری اس کی کاوش کو فنا کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ اگرچہ سفر نامہ نگار نہایت ذکاری

سے اپنی تحریر میں خود نوشت، خاکہ نگاری، رپورتاژ، انشائیہ اور ناول کی لطافت شامل کر لیتا ہے، لیکن ہر مرحلہ میں وہ ملمع کاری سے پرہیز کرتا ہے اور بیرونی ملامت و تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دینے کی کوشش کرتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ کے الفاظ میں آپ بیتی کو ذاتی جلوہ نمائی، نمود و نمائش اور چھپ کر حملہ کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہئے" (ص ۳۶۱)

موصوف نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ اردو میں روسو کے اعترافات کی طرح کی چیزیں نہیں لکھی جا سکتیں، اس لیے کہ "اردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی یا سچی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بداعمالیوں کی تشہیر کی یہ حرکت خود مغرب کو بھی مہنگی پڑی، بالآخر یہ ہوا کہ لغزش کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے بجائے بشریت کا زیور بنا لیا گیا"۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب میں حقیقت نگاری پستی اور فرومائیگی کی تشہیر کا ذریعہ بن گئی۔ زندگی کی گھناؤنی تصویر پیش کرنا، انسانیت کے کپڑے نکالنا اور ناگفتہ بہ باتوں کو مزلے لے کر بیان کرنا مشرق کی تہذیبی اقدار کے منافی رہا ہے، اسی لیے یہاں خود نوشت ہے یا سفر نامہ یا دیگر اصناف ادب، آدمی کو ننگا کر کے پیش کرنے کی کوششیں ناپسندیدہ رہی ہیں۔

سفر ناموں کا کینوس بے حد وسیع ہے اور بحیثیت ایک صنف ادب کے اس نے لامحدود امکانات کا ثبوت دیا ہے اور زندگی کے جملہ پہلوؤں اور کائنات کی جملہ رنگا رنگی کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدائی ادوار میں سفر نامہ کسی ملک کے جغرافیائی و تاریخی احوال کے بیان تک محدود تھا۔ مناظر فطرت، ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تفصیلات، قیام و طعام اور مشروبات و ماکولات کا تنوع، قدیم محلات، پختہ مقابر، خوبصورت محرابوں اور مناروں کی تفصیل اور سنے سنائے قصوں کو دہرانے تک اس کی کائنات محدود تھی، لیکن دھیرے دھیرے یہ سفر نامہ نگار کے تاثرات واحساسات اور اس کی فکر، نظر کا آئینہ بن گیا جس میں ہر طرح کے جذبہ تفاخر و ذوق نمائش سے بالاتر ہو کر مصنف اپنے قاری کو شریک

سفر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ شبلی نعمانیؒ اس صنف کی وادی میں قدم رکھنے والے کو آگاہ کرتے ہیں:

"ایک بڑی غلطی جو عموماً سفر نامہ لکھنے والوں سے واقع ہوتی ہے جزئیات سے کلیات کا قائم کرنا ہے، یعنی جن لوگوں سے مصنف کو واسطہ پڑتا ہے ان کے اخلاق و عادات و خیالات کے توسط سے تمام قوم کی نسبت رائے قائم کر لیتا ہے اور ہر واقعہ کے ساتھ قیاسات کو داخل کر دیتا ہے اور ان قیاسات کے وقت وہ حسن ظن یا سوء ظن جو پہلے سے اس کے دل میں موجود تھا چپکے چپکے اپنا کام کرتا ہے اور اس کو خبر نہیں ہوتی" (سفر نامۂ مصر و شام)۔ چنانچہ سفر نامہ نگاری اگر دیانت داری اور نکتہ رسی سے کام نہ لے تو اس کی تحریروں سے خاصی گمراہی پیدا ہو سکتی ہے۔

سفر نامہ نگار کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ صاحب قلم اور قادر الکلام بھی ہو۔ اسے بات کہنے کا سلیقہ معلوم ہو۔ اس کے اندر مشاہدہ کی قوت کے ساتھ دلچسپ اور لطیف پیرائے میں اظہار خیال کا ہنر آتا ہو۔ انور سدید کے الفاظ میں "وہ مشاہدہ کو تخلیقی انداز سے بیان کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو" سید عبداللہ کے الفاظ میں جو سفر نامہ نگار کے اندر یہ اہلیت ہونی چاہئے کہ "لمحہ رواں میں آنکھ کان زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شئے نظر میں سما جانے والی ہو۔ تماشہ، نغمہ و نکہت کا ہر صوت و رنگ لفظوں امیجری کی میں جمع ہو کر بیان کو مرقع بنا دے اور قاری ان تمثالوں میں جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنا لے (پیش لفظ حافظ و خیام کی سرزمین، مصنف مقبول درخشاں)

مرزا ادیب کے خیال میں سفر نامہ تخلیقی تجربہ ہے اور اس کا خالق جس مقام سے گذرتا ہے اس کی ساری خوشبوئیں سارے باطنی رنگ اور اس کی وہ ساری کیفیات جو سراپردۂ راز میں چھپی ہوئی ہیں سمیٹ لیتا ہے" (اوراقؔ لاہور ۱۹۷۸ء)

اردو میں سفر نامہ کی عمر ڈیڑھ سو برس ہے، لیکن اس دوران اس صنف ادب نے غیر معمولی ترقی کی اور دنیا جہان کے مسائل و معاملات کی اس میں سمائی ہو گئی اور اپنی بو قلمونی

گیا۔ اس کی تکنیک میں بے حد لچک ہے۔ اس میں انشائیہ کا حسن اور داستان کی دلکشی دونوں جلوہ گر ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود کے الفاظ میں "اس قدیم بیانیہ صنف نے اپنے طویل سفر کے دوران کئی روپ بدلے اور کئی منزلیں طے کی ہیں۔ شروع میں سفر نامہ کا مقصد محض افادیت تھا۔ اس میں ادبیت کی چاشنی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ دور جدید میں سفر نامہ نگار خارج یا ظاہر سے زیادہ داخل یا باطن میں سفر کرتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو زبان دے کر سفر نامہ کو فکشن کا ہمنوا بنا دیتا ہے"۔

(اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ' ڈاکٹر خالد محمو' مکتبہ جامعہ دہلی' ص ۵۹)

مشفق خواجہ بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اچھا "سفر نامہ" مقامات سفر سے زیادہ کیفیات سفر بیان کرتا ہے.

حج کا سفر نامہ عام سفر ناموں سے اس معاملہ میں مختلف ہوتا ہے کہ اس میں مصنف فی الامکان تصنع اور نمائش سے پرہیز کرتا ہے۔ اس سفر میں وہ پاکیزہ جذبات سے سرشار ہوتا ہے اور اس کی روح بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اردو میں حج کے متعلق ایسے سفر نامے بہت لکھے گئے جن میں حج کے ارکان اور فرائض و مستحبات کی تفصیلات سے لوگوں کو آگاہ کرنا مقصود ہے' لیکن ایسے سفر ناموں کی بھی کمی نہیں جنہیں محبت و عقیدت سے سرشار دلوں کی کیفیات کی مرقع نگاری قرار دے سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ابتدا فارسی عربی میں حج سے متعلق بڑے نادر سفر نامے وجود میں آئے اور اپنے زمانہ کی باکمال شخصیتوں کے قلم سے مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ۱۵۸۹ء کا سفر نامہ' شاہ ولی اللہ کا ۱۷۲۸ء کا سفر نامہ' نواب شیفتہ کا ۱۸۳۹ء کا سفر نامہ' نواب صدیق حسن کا ۱۸۶۸ء کا سفر نامہ وغیرہ۔ بیسویں صدی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن' عبدالماجد دریا بادی' غلام رسول مہر' مسعود عالم ندوی' ابوالحسن علی ندوی' ابوالاعلیٰ مودودی' نسیم حجازی' شورش کاشمیری اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے اس صنف کے معیار و اعتبار میں اضافہ کیا۔ اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ماہر القادری کا سفر نامہ حج "کاروانِ حجاز" بھی ہے جو ۱۹۵۴ء میں صفحہ قرطاس پر منتقل ہوا۔ یہ سفر نامہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اردو کے ممتاز

و معروف سفر ناموں میں سے ہے جو آج تک متواتر پڑھا جا رہا ہے اور جس کی دلکشی اور شادابی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اگرچہ اس عنوان سے بے شمار تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں۔

اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی اس کا پرکشش بے تکلف اور ادبی لطافتوں سے لبریز اسلوب بیان ہے' اس کا آغاز کس بے تکلفی سے ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی آبشار اچانک کسی پہاڑ کی بلند چٹان سے پھوٹ پڑا ہو لکھتے ہیں:

"مکہ" مدینہ کی محبت یوں سمجھئے مجھے گھٹی میں پلائی گئی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ان مقدس ناموں سے کان اچھی طرح آشنا بلکہ مانوس تھے۔ والد مرحوم کس ذوق شوق سے امیر مینائی کا یہ شعر جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے:

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

خود ان کی نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کی حاضری کا کتنا شدید اشتیاق ملتا ہے۔:

الٰہی وہ دن کونسا ہے کہ یہ سب مدینہ ظریفؔ ان دنوں جارہے ہیں

انیس کو شبیر کی مداحی میں اپنی سات پشتوں کے تسلسل پر فخر تھا اور غالبؔ کو پیشہ سپہ گری کی سو سالہ خاندانی روایت پر ناز' مگر ماہر خوش بخت ہیں کہ ان کو دنیا کی سب سے زیادہ عظیم سعادت یعنی سرکار دو عالم ﷺ سے والہانہ عشق اور مدینہ کی حاضری کا اشتیاق اپنے والدین سے وراثت میں ملا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری کے ابتدائی دور ہی میں حضور اقدس ﷺ کی شان میں ایسی نظم کہی جو لوگوں کے دل و دماغ پر نقش کالحجر بن گئی۔ "ظہور قدسی" میں ماہر نے رسول ﷺ اللہ کی دنیا میں تشریف آوری اور تاریخ انسانی پر آپ کے عظیم احسانات کا جس والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے وہ اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ "کاروان حجاز" تقریباً ۲ سال بعد ماہر کے قلم سے اسی نظم کا اردو نثر میں نقش ثانی محسوس ہوتی ہے اور اسے بھی وہی عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی جو ان کی نظم "ظہور قدسی" کو حاصل ہوئی تھی۔ شاید ماہر کی اس خود گذشت میں کوئی مبالغہ نہیں:

"خدا شاہد ہے اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہین کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گذری مگر کسی عالم میں بھی دل مکہ مدینہ کی یاد سے خالی نہیں

رہا۔ (کاروان حجاز ص ۴)

ماہر کا یہ سفر نامہ نثر اور نظم کا ایسا آمیزہ ہے جس میں بیک وقت شاعرانہ حسن بیان بھی ہے اور نثر کا قطعیت کے ساتھ بات کہنے کا مزاج بھی۔ یہاں تخیل کی پرواز بھی ہے اور حکمت وبصیرت کی چنگاریاں بھی۔ مولانا آزاد نے غبار خاطر میں فارسی اور اردو کے اشعار بکثرت استعمال کیے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اپنی نثر کو قدیم اساتذہ کے برمحل اشعار سے مزین کرنے میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے لیکن کہیں کہیں مولانا تکلف و تصنع کی بادشمال کی زد میں آگئے ہیں۔ ماہر چونکہ شاعر ہیں اور قادر الکلام شاعر اور جگہ جگہ زیادہ تر خود اپنے اشعار پیش کرتے ہیں' اس لیے ان کی نثر میں یہ پیوند کاری نہیں محسوس ہوتی' کبھی کبھی ان کے اسلوب پر ابوالکلام کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ وہی خطیبانہ انداز گفتگو' وہی وقار و تمکنت' وہی بلند آہنگی اور رکھ رکھاؤ' لیکن وہ انکشاف ذات کے معاملہ میں مولانا سے آگے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں:

"یہ شعر ہزاروں بار سنا اور پڑھا ہے...... خدا خود میر سامان است ارباب توکل را......... مگر نفس کی آرام طلبی اور درازدستیوں کی بدولت اس شعر کی معنویت سے پشیمان ہونا پڑا۔ کھانے پینے کی ایک ایک چیز کا سامنا کیا اور جزئیات کا اس قدر اہتمام کیا کہ اچار کے مرتبانوں سے لے کر بھنے ہوئے چنوں کی تھیلی تک ساتھ لی گئی جو لوگ پہلے حج کر چکے تھے ان کے پاس جاجاکر پوچھا کہ کیا چیز ساتھ لیں کیا نہ لیں"

سفر نامہ نگار اپنے نفس کی دراز دستیوں کا اسی طرح جگہ جگہ ذکر کرتا ہے۔ اعتراف عجز اور اپنی لغزشوں پر احساس ندامت انسان کے قد کو بلند کر دیتا ہے اور اس کی خود نوشت کی اثر انگیزی اور پایۂ اعتبار میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔

ماہر القادری نے حج کا یہ سفر آج سے تقریباً نصف صدی قبل اس وقت کیا جب کہ سمندر اور صحرائی سفر اور مکے و مدینہ میں قیام میں وہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں جو اب مہیا ہیں ایک حاجی کو کافی جسمانی مشقتوں کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس سفر نامے میں اس

عہد کے احوال کا ایک مفصل ذکر ہمارے لیے موجودہ آسائشوں سے تقابل میں معذون ہوتا ہے اور اپنے اسلاف کے لیے احترام کے جذبات سے ہمارے دلوں کو لبریز کر دیتا ہے جو ہزاروں دقتوں کے باوجود دیارِ حرم میں حاضری کو اپنے لیے دنیا کی سب سے بڑی سعادت شمار کرتے تھے۔

ماہر کراچی میں "وکٹوریہ" میں بیٹھ کر پانی کے جہاز پر سوار ہونے کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ کراچی، بمبئی اور دیگر بڑے شہروں میں اس عہد میں چلنے والی چار پہیوں کی اس گاڑی کا ذکر ہم پر رومانی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ اس طرح کے متعدد حوالوں سے ہمارے ماضی کی بازیافت ہوتی ہے۔ یہ سفر نامہ پانی کے جہاز سے بحری سفر کا ایک دلکش مرقع ہے۔ ماہر جزئیات نگاری کے ماہر ہیں۔ ابتدا میں ہم قلیوں کے' جہاز پر سامان لانے جہاز کی سیڑھیوں پر بچشم تر چڑھنے پھر اس کے ڈیک پر جگہ حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کے مناظر سے دوچار ہوتے ہیں' پھر سمندری سفر کی ایک ایک تفصیل سامنے آتی ہے لیکن اس کے درمیان حکمت و موعظت اور احتساب نفس کے جواہر پارے بھی ہاتھ آتے رہتے ہیں۔ مثلاً

> "حرم کے سفر میں بھی خود غرضی کا جذبہ فنا نہیں ہوا۔ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانا اور ایثار کرنا کہاں مسلمان کی خصوصیت تھی مگر اب اس کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔"

> "یہ ٹھاٹ باٹ دکھانے کا نہیں اللہ کی راہ میں فقیر و محتاج اور عاجز و ذلیل بن کر جانے کا موقع ہے' یہاں تزک و احتشام کا تصور بھی معصیت ہے"۔

مصنف کے اس طرح کے انکسار کے جلوے قاری کا دل موہ لیتے ہیں۔

> "مجھ سے بڑھ کر ناشکرا اور کافرِ نعمت کوئی بھی نہ ہوگا۔ اگر یہ وسوسہ بھی دل میں لاؤں کہ یہ جو کچھ آسانیاں میرے لیے پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ادب و صحافت اور شاعری کی وجہ سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ ہو رہا ہے محض اللہ کا کرم ہے"۔

ماہر کی قوت بیان کا سحر' اختصار روانی اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں مافی الضمیر ادا کرنے کا ہنر ملاحظہ ہو :

"نماز مغرب کے بعد کھانا کھایا' پھر عشا کی نماز پڑھی' رات کے دس بجے ہیں اور اب ہم ہیں' جہاز ہے پانی ہے اور آسمان ہے اور آگے خدا کا نام ہے"

خوبصورت منظر نگاری' تشبیہوں اور تمثیلوں کا جلال و جمال' کائنات کے ازلی و ابدی حقائق کی مرقع کشی ماہر کی تحریروں میں اس طرح ابھرتی ہے کہ ہم حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کو بڑا شاعر تسلیم کریں یا بڑا نثر نگار یا غالب کی طرح بیک وقت دونوں مملکتوں کا تاجدار۔ حج کے سفرناموں میں سمندر پر کیا کسی نے ایسی گہری نگاہ ڈالی ہو گی' لیکن وہ قاری کو مناظر میں کھو جانے نہیں دیتے' بلکہ تخلیق اور مالک ارض و سما کی طرف ذہن کو موڑ دیتے ہیں.

"سمندر جس کی نہ تھا ملتی ہے اور نہ اور چھور دکھائی دیتا ہے۔ اس پر جہاز ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سمندر کی ایک پر شور موج اس کو تہہ و بالا کر سکتی ہے۔ یہ صرف اللہ کی قدرت ہے جو جہاز کو تیرا رہی ہے اور موجوں کو اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ بلند تو ہوتی ہیں. مگر جہاز کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ سائنس کی معجز نمائیاں برحق' لیکن سائنس کا کام ایجاد ہے تخلیق نہیں."

اور پھر اس نتیجہ تک رہنمائی کرتے ہیں۔ اس عالم اسباب اور جہان کون و فساد میں سب سے بڑی حماقت بے دانشی اور جہالت خدا کا انکار ہے۔ ماہر القادری اقبال کی طرح صحرائیت پر جان فدا کرنے والا ہے اور عرب کے صحرا نشینوں کی سادگی اور جفاکشی کو بنظر تحسین دیکھتا ہے۔ جہاز کے ڈیک پر جب وہ بے سروسامان بنگالی حاجیوں کو دیکھتا ہے تو اسے اسلام کے درخشاں ماضی کی دل نواز شخصیتیں یاد آجاتی ہیں۔ ماہر لکھتے ہیں :

"ان کی بے سروسامانی قابل صد ہزار رشک ہے۔ خدا کے جن نیک اور برگزیدہ بندوں نے مصر و شام فتح کیا تھا اور مدائن و نینوا کے تخت الٹ دیئے تھے وہ بھی اپنی آسائش و آرام کے لیے بہت کم سامان رکھتے تھے۔ اسلام کی.

تاریخ کا وہ دن سب سے زیادہ منحوس تھا جس دن عرب کی سادگی کو عجمی تکلف نے دبالیا"۔

اس سفرنامے میں قدم قدم پر حکیمانہ جملے برق کی مانند کوندا اٹھتے ہیں اور ہمارے ذہن و دماغ کی تنویر کا ذریعہ بنتے ہیں۔ "خلوص‘ بے نفسی اور مقصد سے عشق ہو تو توتلائی ہوئی زبان سے نکلے ہوئے جملے دلوں میں گھر کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ نہ ہو اور صرف نمود و نمائش مقصود ہو تو فصاحت کے دریا بہادینے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔

اس سفر نامے میں ماہر صاحب کے سیاسی تہذیبی‘ ملی‘ معاشرتی رجحانات اور نظریات پر جگہ جگہ روشنی پڑتی ہے۔ وہ بے تکلفی سے دین کے معاملہ میں عدم توازن دیکھتے ہیں اس کی نشاندہی کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں‘ اس سے اس سفر نامے کی علم و تہذیبی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ تبلیغی جماعت کے روشن پہلوؤں کے ساتھ اس کی ایک خامی کی وہ گرفت کرتے ہیں تبلیغی جماعت کے ایک نوجوان کی جو جہاز میں تقریر کر رہا تھا اس بات پر کہ "ہم دنیا نہیں چاہتے‘ مال و زر نہیں چاہتے‘ حکومت نہیں چاہتے‘ میں نے اس وقت تو کہنا مناسب نہیں سمجھا وعظ کے بعد الگ لے جاکر کہا کہ "آپ کی تبلیغی جماعت کے رکن رکین علامہ ابوالحسن علی میاں نے لکھا ہے کہ اقامت دین کے لیے حکومت حاصل کرنا بھی دین ہی کا کام ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد عرب میں ایک اسلامی حکومت چھوڑی تھی اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بادشاہوں کے دربار میں جاکر ان کے باطل اقتدار کو چیلنج کیا تھا"۔

اس سفرنامے میں ماہر رفقائے سفرِ حج کا بھی جگہ جگہ ذکر کرتے ہیں اور بڑے دلکش پیرائے میں۔ بہاولپور کے ایک جج صاحب مولانا مودودیؒ کے بارے میں سخت غلط فہمی کے شکار تھے۔ ماہر صاحب ان کو عقل و دلیل کی روشنی میں قائل کرتے ہیں کہ بدگمانی اور سوءِ ظن سے کام نہ لیں اس لیے کہ اس پر خدا کے یہاں مواخذہ ہوگا۔

ماہر کی قلندری و درویشی میں شاہانہ تمکنت کا عنصر بھی شامل ہے۔ سفرنامے میں ان کی شخصیت کی گرہیں در حدیث دیگراں کھلتی جاتی ہیں۔ اسد ملتانی کے ذکر کے سلسلہ میں

جو پاکستان میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے لکھتے ہیں :

"ہم جیسے خاک نشینوں کو ان کے سرکاری عہدہ میں ذرا بھی کشش نہیں ان کے اسلامی افکار اور ان کی سادگی کردار ہے"۔

اسی سلسلہ میں وہ شعر و ادب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں :

"اسد ملتانی میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ واضح فکر اور سلجھا ہوا دماغ رکھتے ہیں، بات بچی تلی کہتے ہیں، مطالعہ وسیع ہے۔"

اسی ضمن میں چلتے چلاتے احسن پھپھوندوی کا یہ شعر بھی ماہر کی نوک قلم پر آجاتا ہے :

ہے رقیبوں کے محلہ میں ہمارا بھی مکاں
اس طرف بھی آنکلیے گا ادھر جاتے ہوئے

پھر یہ سجدۂ سہو بھی ملاحظہ ہو :

"سفر حجاز میں اس قسم کے شعر و شاعری کے تذکرے مناسب نہیں اور ہم اس معاملہ میں احتیاط بھی برت رہے ہیں لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "چور چوری سے جائے گا ہیرا پھیری سے تھوڑی ہی جائے گا"۔ تو برسہا برس کی پڑی ہوئی عادت اپنے اظہار کے لیے ڈھونڈھتی ہے"۔

حضرت ماہر اس سفرنامے میں اپنی تازہ تر تخلیقات سے جو سب کی سب رسول اکرم ﷺ اور آپ کے دیار سے محبت و شیفتگی کے جذبات سے مخلوط ہیں ہم کو محظوظ ہونے کا موقع عطا کرتے ہیں، مثلاً ان کی ایک تازہ غزل کے یہ اشعار سفر کی مناسبت سے قاری کے کیف و انبساط میں اضافہ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حسن بیان، روانی، شگفتگی، والہانہ شیفتگی دل موہ لیتی ہے :

شوق طلب ہے راہبر جوش جنوں ہے پاسباں
سوئے مدینہ النبی کون ہے یہ رواں دواں
ان کا خیال، ان کی یاد، ان کا ہی ذکر و داستاں

شکر خدا کہ اب نہیں ایک نفس بھی رائیگاں
زندگی آج تک تو تھی رنج و خوشی کی دھوپ چھاؤں
اب ہے بہ فیض قرب دوست حاصل عیش جاوداں

ماہر سچے عاشق رسول ہیں مگر وہ بارگاہ الٰہی میں سوے ادب کے قائل نہیں اور محبت و عقیدت رسول میں غلو کے خلاف ہیں۔ وہ ایسے نعت گو شعرا پر معترض ہیں جو حضور ﷺ کی تعلیم کے خلاف حضور ﷺ کو درجہ الوہیت دیتے اور استمداد و استعانت کے لیے آپ ﷺ کے سامنے عضو دست طلب دراز کرتے ہیں۔ ماہر کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ خود ماضی میں اس غلو کے شکار رہ چکے ہیں مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابوں کے مطالعہ سے عقیدۂ توحید کو نکھارنے میں ان کو مدد ملی پھر بھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ برسہا برس کی غفلت اور بری عادتوں کا خمار اترتے اترتے ہی اترے گا۔ اسی رو میں یہ جملہ نوک قلم پر آتا ہے:

"شعر و افسانہ سے غیر معمولی شغف رکھنے کے نقصانات کا احساس ہوا[۱] اسلام میں توازن پسند کیا گیا ہے اور انتہا پسندی سے گریز کی تعلیم دی گئی ہے۔ ماہر ایسی شاعری پسند نہیں کرتے جو دیگر فرائض حیات کی ادائیگی میں انسان کو کوتاہ بنا دے۔

ماہر کے اس سفر نامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ان کے تاثرات و قلبی کیفیات کا ہی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ ایک مسافر پر خارجی طور پر جو واردات ہوتے ہیں یہ ان کی بھی داستان موجود ہے۔ جدہ میں حاجیوں کے قیام کی بارکیں، قلیوں کے سامان اتارنے اور سامان کی تلاش و شناخت میں افراتفری کا منظر ہمارے سامنے مصور ہو کر آتا ہے۔ تفصیلات و جزئیات پر ہر ایک کی نگاہ پڑتی ہے اور ضرورت کے مطابق انتخاب کر لیتی ہے کہ کیا بیان کیا جائے اور کس کو نظر انداز کیا جائے۔ بعض لوگوں کے ٹرنک اور کنستر دب کر پچک گئے ہیں اور بعض کے ڈبوں سے گھی ٹپک رہا ہے۔ کھجور کی بنی ہوئی کرسی جو چائے خانوں کے سامنے موجود ہے ماہر کے لیے خاص طور پر وجہ کشش ہے، جس پر ان کی رات گزرتی ہے۔ سامان کے معاملہ میں بے فکری اور شرعی حدود کے نفاذ کی برکتوں کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

ماہر کی یہ سطریں قاری کی چونکا دیتی ہیں کہ وہ جدہ میں اسپرٹ نہ ملنے کی وجہ سے اپنا اسٹو جلا کر کھانا نہیں پکا سکتے۔ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب زیرزمین ذخائر کا علم نہ تھا جس نے اس خطہ کے صبح و شام بدل دیئے یہ باتیں فکشن کا سا لطف دیتی ہیں کہ ماہر لکڑی خرید کر لاتے ہیں تاکہ دوپہر کا سالن تیار ہو سکے، مگر لکڑیاں جلنے سے قاصر ہیں اور ایک دوکاندار ترس کھا کر اپنے اسٹو پر ان کی دال کی دیگچی چڑھادیتا ہے۔

خانہ کعبہ پر حاجی کی پہلی نگاہ پڑنے کا منظر بھی بڑا تاثیر انگیز ہوتا ہے۔ تقریباً حرمین کے تمام سفرناموں میں اس گھڑی کی کیفیت بڑے سوز و گداز کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے۔ ماہر کا انداز بیان اور تاثیر ملاحظہ ہو':

"یا اللہ میں کہاں آگیا ہوں۔ یہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سا پلید اور حرم مقدس میں مجھ سا خطاکار گنہگار اور معاصی سرشت اس مقام پر جہاں ہر زمانہ کے اتقیاء صلحاء اور پاکبازوں و نیکوکاروں نے سجدے اور طواف کئے ہیں۔ یہ پیروں سے نہیں سر کے بل چلنے کا مقام ہے۔ کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید" صفا و مروہ' ملتزم و حطیم' جبل رحمت و چاہ زمزم پھر رباط دل آرام میں قیام کی تفصیلات سے ہم یوں روشناس ہوتے ہیں جیسے آنکھوں کے سامنے مرقعے ہی مرقعے یکے بعد دیگرے آرہے ہوں۔

ہم اس سفرنامہ میں بعض نہایت دلکش شخصیتوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ جو سفرنامہ نگار کی ہم عصر ہیں۔ یہ تصویر میں بھی زندہ و متحرک ہیں۔ ظفر احمد انصاری سے ماہر کی تحریر کے پردے پر ملاقات کیجئے:

"انصاری صاحب سرتابقدم اخلاص ہی اخلاص اور محبت ہی محبت ہیں۔ اس غرض پرست دنیا میں ایسے مخلص دوست کہاں ملتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس دبلے پتلے مولوی صورت شخص نے الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور یونیورسٹی بھر میں اول رہا ہے"۔

پھر ہم اس طرح کے لطیف جملوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں:

"ہم جبل رحمت سے جلد جلد واپس ہوئے۔ راستہ میں ایک جگہ کچھ

حاجیوں میں تکرار ہو رہی تھی۔ غالباً پانی بھرنے پر غلام محمد صاحب نے اشارہ کر کے کہا کہ اس عرفات کے میدان میں وہ شیطان کی حد ہے جہاں سے کہا جاتا ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا اور حاجیوں کے دینی شغف اور اطاعت الٰہی کا منظر دیکھ دیکھ کر اپنے سر پر خاک ڈالتا رہتا ہے مگر کبھی کبھی کچھ حاجیوں کو لڑانے کے لیے ادھر آ بھی جاتا ہے"۔

پھر اس سفرنامے میں اس طرح کی بصیرت مندانہ باتوں اور اس طرح کے انقلاب فریں خیالات سے بھی بیچ بیچ میں ہم بہرہ مند ہوتے ہیں۔

"اسلام قیصر و کلیسا کی حد بندی کا قائل نہیں ہے۔ اس میں پوری کی پوری زندگی اور ظاہر و باطن کا تمام کا تمام نظام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، مگر افسوس کہ دین کے اس تصور کامل اور ان حیات گیر حدود عمل کی طرف توجہ کم جاتی ہے۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے تہجد و اشراق پڑھنے والے ان فیصلوں کو صریحاً اسلام کی ضد مان لیتے ہیں۔ کافرانہ نظام اور غیر اسلامی ماحول میں رہتے رہتے فکر و نظر کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو لوگوں کو دین کامل کی یہ دعوت اجنبی اجنبی سی معلوم ہوتی ہے" (کاروان حجاز، ص ۵۴)

"شیطان اور نفس کے دھوکے بڑے ہی نازک اور پرپیچ ہوتے ہیں" وغیرہ۔

ماہر کی پیکر تراشی میں بھی مہارت ہے مولانا حکیم ایوب حسن صاحب کی چند جملوں میں تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ماہر کو انسانی نفسیات کا تجزیہ کرنے کا بھی شوق ہے۔ منیٰ وغیرہ میں پانی کے لیے کشمکش اور دوسروں سے مانگنے کی عادت کا وہ ذکر کرتے ہیں پھر یہ جملہ ملاحظہ ہو:

"ہر شخص اپنی دنیا بنانے اور سارے جہان کی لذتیں سمیٹنے کی فکر میں ہے۔"

"آدمی نے ضروریات زندگی کے نہ جانے کتنے طوق خود اپنی گردن میں پہن رکھے ہیں اور اس مدنیت پر وہ فخر کرتا ہے اور ضرورتیں ہیں کہ

کسی طرح پوری نہیں ہو پاتیں."

منیٰ میں بدوؤں کی بے سرو سامانی پر ماہر القادری کا تاثر ملاحظہ ہو :

"آدمی زندگی کی ضرورتوں کو مختصر کرنا چاہے تو کر سکتا ہے مگر تمدن حاضر اور تہذیب موجودہ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ زندگی کی ضرورتوں کو بڑھاتے چلے جاؤ۔ یہ بے شمار کارخانے اور فیکٹریاں بس اسی مقصد کے لیے کام کر رہی ہیں."

حرم شریف میں اذان صبح کی کیفیت ماہر اس سفر نامہ میں بیان کرتے ہیں اور قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے :

حرم میں اذان سحر اللہ اللہ کہ ہیں وجد میں بام و در اللہ اللہ
یہ میزاب رحمت وہ رکن یمانی مقامات اہل خبر اللہ اللہ
دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا مناجات با چشم تر اللہ اللہ

تبلیغی جماعت پر یہ جامع تبصرہ ملاحظہ ہو :

"ابھی تو یہ لوگ اہل صفہ تیار کر رہے ہیں۔ نہ جانے اصحاب بدر و احد کی تربیت کا پروگرام کب شروع ہوگا".

ماہر القادری کی ذاتی زندگی ان کی پسند و ناپسند ان کا معیار اخذ و ترک اس سفر نامے کو حقیقت کا رنگ عطا کرتے ہیں۔ ان کی آرا سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں، مگر مصنف کے اخلاص اور خون جگر کی نمود اس کی تحریر کو تھرتھراہٹ عطا کرتی ہے۔ اس سے ہماری بصیرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور یہ ہمارے لیے وجہ انبساط بھی بنتے ہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کے کارکنوں کو عربی لٹریچر تقسیم کرتے ہوئے دیکھ کر رقمطراز ہیں :

اخوان مولانا مودودی کی کتابوں سے خاصے متاثر ہیں۔ جماعت کے طرز فکر کے بھی معترف و مداح ہیں" .... لوگ جب سنتے ہیں کے اسلامی دنیا کا اتنا بڑا مفکر قید و بند میں ہے تو افسوس کرتے ہیں" ماہر کو سفر حج کے دوران اخبارات سے محرومی کا احساس ہے لیکن پھر یہ موعظت .... "زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تو اللہ کی یاد ہے۔ یہ نہیں تو

زندگی زندگی نہیں بلکہ الٹی شرمندگی ہے۔ کوئی شخص دنیا بھر کی خبروں سے مطلع ہوتا ہے مگر یادِ خدا سے غافل ہو تو یہ دنیا کے واقعات سے آگہی اس کی زندگی کے لیے کس کام کی ہے:

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

عرب شخصیات میں وہ سعید رمضان اور علی طنطاوی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مؤتمر اور اخوان دونوں تنظیموں کے جلسوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں جن میں ماہر نے شرکت کی۔ عربوں کی قوت خطابت کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"عربوں کی خطابت کا کیا کہنا چاہیں تو شعلے بھڑکا دیں اور چاہیں تو بادل برسا دیں"۔

حیدر آباد (ہندوستان) کے حاجیوں سے مل کر ماہر اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ حیدر آباد میں گذرے ہوئے ایام بھی ان کی لوحِ ذہن پر ابھر آتے ہیں۔ حیدر آباد کا پولیس ایکشن اور اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی و بربادی کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ تقسیم ملک پر نہایت فاضلانہ تبصرہ کرتے ہیں جس سے ان کے عصری شعور اور سیاسی آگہی کا ثبوت ملتا ہے:

"کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم بہت جلدی اور اضطراب کے عالم میں ہوئی۔"

مسلمان رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ اس کے عواقب سوچتے اور اس سے بڑھ کر یہ بات سوچنے اور غور کرنے کی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی تلخیوں کو جس نقطہ تک پہنچا دیا تھا اس کے اعتبار سے کیا یہ ممکن تھا کہ ہندو ملک کی تقسیم کو خاموشی سے گوارا کر لیتے اور ہندوستان کے کسی مسلمان کے بدن پر ایک خراش تک نہ آتی۔ مگر اس کا اندازہ تھا کہ تقسیم ہند کے بعد شدید حادثے ظہور میں آکر رہیں گے تو پھر مسلمانوں کے بچاؤ کی مناسب تدبیریں اختیار کرنی ضروری تھیں۔

ریڈکلف کا ذکر کرتے ہوئے ماہر تاسف کے ساتھ لکھتے ہیں:

"اس سفاک نے بے ایمانی کی حد کر دی، کیسی خوفناک بے ایمانی جس

نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اختلاف کی مستقل بنیاد ڈال دی"

پھر وہ تقسیم کے وقت مسلمانوں پر جو قیامت گذری اس کا ذکر دلآویز پیرائے میں کرتے ہیں اور یہ تاثرات اس سفر نامہ کی تاریخی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں:

"دنیا کی کوئی سی پتا تھی جو مسلمانوں پر نہیں پڑی۔ عزت' عصمت' مال' جائیداد غرض ہر وہ چیز جو ایک انسان کو عزیز ہوتی ہے اس کو قربان کیا گیا' خوشی سے کم جبراً و کرہاً زیادہ مسجدیں ویران اور مدرسہ و خانقاہیں تباہ ہوئیں۔ کتنے کلمہ گو شدائد حالات کی تاب نہ لا کر دین سے پھر گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمانوں کو توقع تھی کہ اس ملک میں اگر اسلام قائم ہو گیا تو تمام غموں کی تلافی ہو جائے گی' مگر یہاں اب تک جو ہو تا رہا اس نے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں۔" ماہر نے یہ تاثرات ۱۹۵۵ء میں تحریر کئے تھے' لیکن تقریباً اب بھی وہی آلائشیں جو مصنوعی سرحد کے اس پار ہیں وہی اس پار بھی ملتی ہیں۔ دونوں ملکوں کے رہنماؤں کی ناجائز دولت کا انکشاف آئے دن وہاں بھی ہو تا رہتا ہے اور یہاں بھی ماہر کا تاثر بجا ہے.

"انقلابات کی اسی دھوپ چھاؤں میں قرنہا قرن گزر گئے"

مدینہ سے ۴ میل کے فاصلہ پر جنت المعلاۃ کے قبرستان کی ویرانی و خستگی اور توڑ پھوڑ کو دیکھ کر ماہر مغموم ہیں اس لیے کے عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ جو معاملہ نہیں ہونا چاہئے وہ عظیم المرتبت بندوں کی قبروں کے ساتھ کیا گیا۔ ان کا یہ شعر ان کے احساسات کا ترجمان ہے:

فغاں کروں کہ شکایت' ہنسوں کہ اشک بہاؤں
کھڑا ہوا ہوں میں ٹوٹے ہوئے مزاروں پر

لیکن ہندوپاک میں بزرگوں کی قبروں پر میلے لگتے ہیں اور غیر شرعی کام کئے جاتے ہیں ان کا ذکر کرنے کے بعد ماہر لکھتے ہیں:

"ہر بدعت کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی ایک حد پر نہیں ٹھہرتی اس میں جدتیں

پیدا ہوتی رہتی ہیں"۔

ماہر مدینہ جانے والی لاری میں آگے جگہ چاہتے تھے مگر سب سے پیچھے جگہ ملی اور اس پر ان کا ردعمل ملاحظہ ہو:

"آدمی کی ہر آرزو پوری ہو جایا کرے تو اس کے تمرد و انانیت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے۔ یہ اس کی آرزوؤں اور کوششوں کی شکست ہے جو اس کو عبدیت کا احساس دلاتی ہے۔"

مدینہ کے راستے میں غریب عرب قبائل کی عورتوں کا موٹے موٹے نقابوں میں بھیک مانگنے کا منظر اور پھر پانی کی قدر و قیمت کا احساس ماہر کو مغرب کے مسرفانہ معاشرہ کی یاد دلاتا ہے اور وہ اقبال کی طرح اس مصنوعی اور کھوکھلے تمدن پر ضرب لگاتے ہیں:

"یہ تمدن جسے مغرب نے جنم دیا ہے خدا ناشناس تمدن ہے۔ اس کی بنیاد ہی مادی نفع و راحت پر رکھی گئی ہے۔ کیسی آخرت، کہاں کا عذاب و ثواب جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے۔ افادیت نام ہے عیش و تفریح کا جس چیز میں نفس کو لذت اور ہوس کو آسودگی نہ ملے وہ زندگی کے لیے مضر ہے اس لیے قابل اجتناب و گریز و لایق پرہیز۔ ہم نے تو اس ماحول میں پرورش پائی کہ والد مرحوم کھانا کھاتے تو نہ معلوم کتنی بار اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کھانا کھاتا ہوتا تو روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے کہتے جاتے۔ منظور یہ گیہوں کی روٹی یہ سانس یہ ٹھنڈی چھاؤں ہر کسی کو میسر نہیں ان نعمتوں پر اللہ کا شکر واجب ہے":

روضہ اقدس کے سامنے ماہر اپنی کیفیات کو بڑے جذباتی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں بھی عشق اور آداب شریعت کی کشمکش ان کے سامنے ہے اور اس کیفیت کو وہ اپنی غزل کے اس شعر میں منعکس کرتے ہیں:

کس بیم و رجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اک سمت شریعت ہوتی ہے اک سمت محبت ہوتی ہے

ماہر اعلیٰ درجہ کے موحد ہیں اور بلند پایہ ان کو عشق رسول میں بھی حاصل ہے۔
احتیاط کا عالم اس تحریر میں دیکھیے:

"جس معلم توحید نے ہاتھ چومنے کو مجوسیوں کی رسم فرمایا ہو اس کے مزار کی جالیوں کو چومنا مجوسیوں کی نکالی ہوئی بدعت نہیں تو اور کیا ہے۔ جو محبت خود حضور کی لائی ہوئی شریعت کی حدود توڑ دیتی ہو وہ حضورؐ کی خوشی نہیں ناخوشی کا ہی کا سبب بنے گی"۔

روضۂ اقدس کے سامنے ماہر صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تحریک اسلامی کے قائد اور عظیم مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے بھی دعا کرتے ہیں کہ "تیرا یہ فرض شناس حقیر بندہ اور تیرے رسول کا فدائی امتی تیرے دین کی سربلندی کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ اسے صبر و استقامت کی مزید توفیق عطا فرما"

روضۂ اقدس کے ذکر اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے رشحاتِ قلم کے معاً بعد اصطفیٰ منزل کے قریب آباد ہندوستان اور پاکستانی نان بائی' ہوٹل والے اور ان کی تیار کردہ اشیائے خورد و نوش بالخصوص شامی کبابوں کا ذکر مزا لے لے کر کرتے ہیں۔ سچ ہے کہ اسلام رہبانیت کو پسند نہیں کرتا اور اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہونا بھی اطاعت الٰہی کا حصہ ہے۔
اس سفرنامے کی یہ خوبی ہے کہ یہاں بارگاہ قدس کا ذکر ہے تو اصطفیٰ منزل کے صحن میں ہانڈی پکانے والی استانی اور اس سے بچوں کی چھیڑ چھاڑ کا بھی ذکر ہے۔

ماہر احد کی پہاڑیوں اور اس کے روح افزا مناظر میں کھو جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر سے عجب روحانی انبساط عطا کرتے ہیں ماضی کے واقعات ان کے ذہن کے پردے پر یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں اور تاریخ اسلام مصور ہو کر سامنے آتی ہے' مثلاً

"یہ وہ رزم گاہ ہے جہاں ایمان اور اسلام کے رشتے کے سوا ہر رشتہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول کی خوشنودی کے لیے ٹوٹ چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ حضورؐ نے اجازت نہ دی ورنہ حضرت حنظلہ اپنے کافر باپ ابو عامر سے جنگ کرنے کے لیے بارگاہ رسالت میں معروضہ تو کر چکے تھے" .... یہ سعد بن معاذ آرام فرما ہیں جن کی وفات پر رسول اللہ

نے فرمایا تھا کہ سعد کی موت پر اللہ تعالیٰ کا عرش جنبش میں آگیا"........ یہ حضرت علی کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد کا مرقد ہے۔ حضور نے اپنی قمیص مبارک کا کفن ان کو دیا تھا اور یہاں حضور کی دائی حلیمہ سعدیہ بھی چار دیواری کے قریب ایک گوشہ میں سو رہی ہیں۔ حضور کے طفیل انہیں بھی نہ مٹنے والی شہرت حاصل ہو گئی".

ایک ایک مزار پر ماہر کا دل کھنچا جاتا ہے اور موت یاد آتی ہے کہ جب ایسے ایسے برگزیدہ لوگ نہ رہے تو ہم بیچارے کیا ہیں، مگر انسان کی غفلت و خود فراموشی پر ماہر افسوس کرتے ہیں اور جنت البقیع سے بہت سی چوٹیں دل پر لے کر واپس آتے ہیں.

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کا ذکر بڑے دلکش پیرائے میں ہے :

"اس غرض پرست دنیا میں سب سے زیادہ قحط اخلاص و ہمدردی کا ہے۔ اس جوہر کی ذرا سی بھی جھلک جہاں نظر آجائے بہت بڑی نعمت ہے یوں بناوٹ کی ہمدردی اور تصنع آمیز تواضع کی کمی نہیں۔ آج کل اس دنیا کا کاروبار بناوٹ اور ریاکاری کے سہارے چل رہا ہے".

جدہ کے آس پاس کے عالیشان رہائشی مکانات کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ماہر کا تاثر دیکھئے :

"یہ لے اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو دینی و اخلاقی نقطہ نگاہ سے یہ جاہلیت کی ترقی ہو گی۔ جنگی تلواروں نے کسریٰ کے حیرت انگیز قالین "بہار" کے ٹکڑے اڑا دیئے ہوں اگر ان کی اولاد تہذیب و تمدن کی چمک دمک میں الجھ کر رہ جائے تو یہ ترقی کہاں ہوئی یہ تو زوال کی نشانی ہے".

ماہر اس سفر نامہ میں جگہ جگہ ملت کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو کرتے ہیں اور اس کی راہوں کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں.

یہ نہیں ہوا کہ رسول اللہؐ نے کوہ صفا پر اسلام کا اعلان فرمایا اور اس کے سنتے ہی قریش نے کلمہ پڑھ لیا اور نہ یہ ہوا کہ حضورؐ نے ادھر دعا کی ادھر خانہ کعبہ کی چھت سے ہبل گر کر سربسجود ہو گیا۔ مگر اس کی مشیت یہ رہی ہے کہ علمبرداران حق و صداقت کو آزمائش کے آتش کدوں اور ابتلا کے خارزاروں سے گزارا جاتا ہے۔ دعا کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ

یعنی، مگر صرف دعاؤں سے انقلاب نہیں آتا:

دعا کے ساتھ تدبیریں عمل کے ساتھ تکبیریں
خدا کی راہ میں بھی ساز و ساماں کی ضرورت ہے

ماہر نے سفر نامہ کے آخری حصہ میں جو تاثرات ظاہر کئے ہیں اور جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ ہر دور کے لیے معنویت رکھتے ہیں بالخصوص اس عہد میں جب کہ اخلاقی قدروں کا زوال انتہا کو پہنچ چکا ہے اس کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"اگر کسی کو راہبوں اور پروہتوں کی تقلید منظور ہو تو اسے اختیار ہے کہ وہ اطمینان و سکون کے ساتھ تسبیح گھماتا رہے۔ چلے کھینچتا رہے مگر جو کوئی حضور ﷺ کے نقش قدم کو دلیل راہ بنا کر اللہ کے دین کو قائم کرنا چاہتا ہے تو پھر باطل کی ایک ایک قوت کو چیلنج کرنا ہوگا۔ اس راہ میں عتبہ و ابو جہل ہی نہیں عبد اللہ بن ابی اور جمال ناصر بھی ملیں گے۔ یہاں عبد القادر عودہ اور قرعلی کی طرح جھوم جھوم کر اللہ کا کلمہ بلند کرتے ہوئے پھانسی کے تختہ کی طرف جانا ہوگا"۔

"اخوان المسلمون پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ انہوں نے اس ہوا و ہوس اور لذت و نشاط کے دور میں بتایا کہ اقامت دین کی راہ کن منزلوں سے گذرتی ہے"۔

"تاریخ میں جتنے سیاہ ورق نظر آتے ہیں ان کی زیادہ تعداد مغرب نے فراہم کی ہے۔ تاریخ پر سب سے بڑا احسان حجاز مقدس کا ہے"

علم و تحقیق کی روز افزوں ترقی کے باوجود اخلاق و شرافت کے زوال پر ماہر کی آنکھیں نم ہیں، لکھتے ہیں:

"علم اور نیکی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو علم نیکی کو نہ پھیلا سکے وہ علم نہیں کوئی اور چیز ہے"۔

ماہر کے اس سفر نامے میں بعض نثر پارے دل میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایجاز و اختصار کے ساتھ مفہوم کا دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے مثلاً "زمانہ کی تاریخ کے اوراق قلم کے پردوں کی طرح الٹتے رہے۔ کوئی تاج بر سر تو کوئی کفن در بر،

کبھی کسی خاندان کی فرمانروائی تو کبھی کسی خانوادے کی حکومت' ایک کا عروج دوسرے کا زوال کسی کے اقتدار کی شام ہوئی اور کسی کے اقبال کی صبح طلوع ہوئی۔ یہ بنا وہ بگڑا' وہ تخت پر دوسرا بستر مرگ پر"۔

وقت بڑا گریزپا واقع ہوا ہے۔ مخلوقات میں شاید سب سے زیادہ بے چین چیز پارہ ہے اس لیے شعروافسانہ کو زبان میں محبوب کو سیماب وش کہتے ہیں۔ مگر پارہ بھی قائم النار ہو جاتا ہے۔ لیکن وقت کو کوئی طاقت ٹھہرا نہیں سکتا۔ کسریٰ کا خزانہ جب اونٹوں پر لد کر مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ رونے لگے۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اس راہ سے تم میں دنیا آرہی ہے""" بنگلوں کوٹھیوں کی آرائش کی کوئی حد و انتہا نہیں' مگر دل کی دنیا ویران جیسے سدا اس عالم آب و گل میں رہنا ہے اور موت کا فرشتہ ان شبستانوں میں کیوں آنے لگا۔"

چلتے چلاتے ماہر اپنے وطن عزیز کی سیاسی و تہذیبی صورت حال پر ایک آدھ جملہ لکھ جاتے ہیں جو ہزار تحریروں پر بھاری ہے پاکستان کیا ہے ایک خوان یغمٰی کہ جس نے چاہا جھپٹا مارا اور جو ہاتھ آیا لے بھاگا۔

حرمین شریفین سے واپسی میں جہاز سے سمندر کی لہروں کو دیکھ کر ماہر کا شاعرانہ ذوق بیدار ہو جاتا ہے اور نثر میں شاعری شروع کر دیتے ہیں ماہر کو یہ احساس ہے کہ اس سفر نامہ میں سفر کے ساتھ زمانہ اور ابنائے زمانہ پر بھی تبصرے ہیں اور جن تفکرات میں مصنف زندگی بھر غلطاں رہا ہے' ان کی جھلک بھی ہے باتوں باتوں میں اپنی داستان کے بجائے وہ زمانہ کی داستان کہنے لگتے ہیں۔ بلکہ گردوپیش کے احوال سے آگے بڑھ کر وہ اپنے خوابوں تمناؤں اور اسلام اور ملت کے لیے اپنی دیرینہ آرزوؤں کی جھلک پیش کرنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ اس سفر کی جولانیاں ہیں وہ کاغذ پر منتقل نہ کر سکے لکھتے ہیں۔ "حرمین شریفین کی زیارت ایک خواب سا معلوم ہوتی ہے اور اس خواب کا ایک حصہ بھی تو ٹھیک سے کاغذ پر منتقل نہیں ہو سکا"۔ "بعض لوگوں کو شاید شکوہ ہو کہ میں نے بہت سی باتوں کو طول دے دیا ہے۔ یہ شکوہ درست بھی ہو سکتا ہے۔

"من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را"

"کاروانِ حجاز" میں اگر داستان کو اس طرح طول نہ دیا جاتا اور ماہر کے احساسات اور رجحانات کا انعکاس نہ ہوتا تو شاید اس کی عصری معنویت برقرار نہ رہتی۔ وہ ایک حکیم، دانشور، مفکر" اور اسلام و ملت کے ایک مخلص دردمند اور جانباز خادم کی حیثیت سے ان صفحات پر جلوہ گر ہیں اور فکر و خیال اور جذبہ و احساس کی اس تب و تاب نے اس سفر نامۂ حرمین شریفین کو آفاقی و لازوال بنادیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر"

(ایک مختصر مطالعہ)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

استاد شعبہ اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

اردو میں حرمین شریفین کے بیسیوں سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی نوعیت میں ایک خاص مقام اور اہمیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر سطور میں راقم اسی طرح کے ایک سفرنامے کا ذکر کرنا چاہتا ہے۔ جو ایک مختلف اور منفرد نوعیت کا سفرنامہ ہے' ایسا منفرد کہ شاید ہمارے جید نقاد اسے سفرناموں کی ذیل میں شمار کرنے میں تامل کریں۔ نام ہے اس کا "آنحضورؐ کے نقش قدم پر" اور مصنف ہیں پروفیسر عبدالرحمٰن عبد۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے' گذشتہ برس ان کا انتقال ہو گیا۔

کوئی ۱۵'۲۰ برس پہلے سعودی عرب کی حکومت نے پاکستانی کالجوں کے عربی اساتذہ کو تدریس عربی کے دو سالہ وظیفے پر بلانے کا سلسلہ شروع کیا تھا (اب یہ سلسلہ ختم ہے)۔ زیرِ نظر کتاب کے مؤلف کو اسی ضمن میں ۱۹۷۸ء میں نجد و حجاز جانے کا موقع ملا۔ ریاض یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی (۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء) اور پھر اگلے ہی برس خادم الحجاج کے طور پر انھیں عمرہ و حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

عبدالرحمٰن عبد نے اپنے پہلے ہی سفر میں طے کر لیا تھا کہ وہ عربی زبان کی تعلیم و تحصیل تک محدود نہیں رہیں گے' بلکہ اپنے زمانۂ قیام کو مقاماتِ نبویؐ کے تفصیلی مطالعے و مشاہدے کا ذریعہ بنائیں گے۔ چنانچہ "آنحضورؐ کے نقش قدم پر" چلتے ہوئے انھوں نے باقاعدہ ایک پروگرام کے تحت مدینۃ النبیؐ' مسجد نبوی' مسجد قبا' مقام بدر' جبل احد' جبل نور'

غار ثور' طائف' منیٰ' جبل رحمت' عرفات وغیرہ کی تفصیلی زیارت کی۔ ان کے بقول یہ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ محبت کی بارگاہ کے وہ مقدس مقامات دیکھے جائیں "جہاں جہاں سے وہ گزرے" "جہاں جہاں ٹھہرے" .... زیر نظر کتاب جسے چار حصوں میں چار مختلف ناموں (حرم نبوی' حرم مدینہ' حرم مکہ' اور حرم عرفات) سے شائع کیا گیا ہے' مصنف کے اسی مطالعاتی اور جذباتی دورے کا حاصل ہے۔

فاضل مصنف' اپنے مطالعاتی دورے پر ایک طالب علم بن کر گئے' مگر پوری تیاری کے ساتھ نجد و حجاز کے دیار و امصار پر اردو' عربی اور انگریزی میں معروف اور اہم کتابوں کا مطالعہ کیا اور یادداشتیں تیار کیں۔ دوران سفر میں ضروری کتابیں اور معلوماتی لوازم ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے۔ بالعموم انھوں نے ہر مقام کی اجتماعی زیارت کی۔ ان کے ہم سفر رفقا میں حفاظ قرآن' علوم دینی کے فاضل' تاریخ و سیرت نبویؐ پر گہری نظر رکھنے والے اور عربی زبان و ادب کے ماہر شامل تھے۔

چنانچہ یہ سب لوگ ایک ایک مقام کو بڑی محبت و چاہت کے ساتھ دیکھتے ہیں' اپنی اپنی معلومات و مطالعے سے ساتھیوں کو آگاہ کرتے ہیں' قرآن و حدیث اور سیرت نبویؐ کے حوالے سامنے لاتے ہیں اور مستشرقین کی تحقیق پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اس طرح کتاب کا بیانیہ زیادہ تر گفتگوؤں' مکالموں اور تبادلہ خیالات کے حوالے سے آگے بڑھتا ہے۔ جہاں کوئی کمی رہ جاتی ہے مصنف اپنے مطالعہ و تحقیق سے حاصل کردہ معلومات اور مختلف حوالوں اور اقتباسات سے اسے پورا کر دیتے ہیں۔ مصنف کے ہاں جگہ جگہ محمد حمید اللہ' عاتق بن غیث البلادی' محمد حسین ہیکل' مولانا مودودی' میجر جنرل اکبر خان' علامہ اسد' رچرڈ برٹن' میجر ڈاؤٹی اور بہت سے اردو سفر نامہ نگاروں کے حوالے ملتے ہیں۔ یوں ان کی کوشش رہی ہے کہ وہ زیر زیارت مقام کے بارے میں موجود و دستیاب' ممکنہ تفصیل اور معلومات' سامنے لے آئیں تاکہ عہد رسالتؐ کے اوراق گم گشتہ زندہ و متحرک تصاویر میں بدل جائیں (اول' ص ۷۵)

اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی یادداشتوں کی بنیاد پر لکھی گئی کتاب کو حتمی

صورت بننے سے پہلے' مختلف مقامات وروایات کے سلسلے میں خاصی تحقیق و تفتیش کی ہے'
چنانچہ کتاب کا ہر باب اور ہر موضوع وسیع تر مآخذ اور حوالوں سے مُدِ نظر آتا ہے اور مصنف
اس کی تمام جزئیات اور تفاصیل فراہم کرتے ہیں' مثلاً حرم شریف کی عمارت کا ذکر آیا تو بتاتے
ہیں کہ "عثمانی تعمیر کا رقبہ ۲۹ ہزار مربع میٹر تھا' جواب نئی تعمیر سے پانچ گنا سے بھی بڑھ کر
۱۶۰ ہزار مربع میٹر ہو گیا۔ عثمانی حصے میں ۱۵۱ گول ستون سنگ مرمر کے ہیں جن کا قطر
نصف میٹر کے لگ بھگ ہے۔ ۲۰۶ ہشت پہلو ستون' حجر شمیسی سے بنائے گئے ہیں اور ۷۵
ستون کنکریٹ سے۔ حرم کی بالائی منزل پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو اس عثمانی حصے پر قدیم
انداز کی چھت ہے' جسے دو میٹر قطر کے گول گول نصف گنبدوں' قبوں اور قوسوں کی قطاروں
سے مرتب کیا گیا ہے۔ کل ۴۳۳ ستون ہیں اور اتنے ہی ان پر گنبد ہیں۔ ان کی قدیم طرز کی
چھت اور محرابوں کے ماتھے پر تیز رنگ' اس حصے کو سعودی جدید تعمیر سے منفرد کرتے
ہیں۔ اس علاقے کا فرش سفید' سلیٹی اور سیاہ سنگ مرمر سے مختلف ڈیزائنوں میں بنا ہوا ہے"
(سوم ص ۵۱؛ مصنف کی اس تحقیق کے بعد' حرم میں مزید توسیع ہو چکی ہے) میناروں کا ذکر
آیا تو ان کی تعداد' بلندی' محیط' بالکونیوں اور چوٹی کے سنہرے ہلال تک کی تفصیل بیان
کر دی۔ زمزم کا ذکر آیا تو متعلقہ تمام روایات و معلومات کے ساتھ یہ تک بتا دیا کہ چاہ زمزم
کے قرب وجوار میں پینے کے لیے ساڑھے چار سو ٹونٹیاں لگی ہیں۔ غلاف کعبہ کے تذکرے
میں اس کی کئی صدیوں پر محیط پوری تاریخ بیان کر دی۔ بلدیہ مکہ کی مساعی کے ضمن میں لکھتے
ہیں کہ شہر اور حرم کی صفائی کے لیے بلدیہ کے پاس سات ہزار ملازمین پر مشتمل عملہ ہے۔
بلدیہ نے گذشتہ چند سالوں میں طوفانی پانی کو نکالنے' فراز کے رہائشی علاقوں کو ملانے والی
رنگ روڈ اور سب وے بنانے' مکانات کی مرمت اور سڑکوں کی تعمیر پر گیارہ ارب ریال خرچ
کیے ہیں۔ بارہ بڑے منصوبوں میں حرم شریف کے گرد چار میٹر کا ایک مسقف نصف کلومیٹر
لمبا فٹ پاتھ بنایا جا رہا ہے۔ ۳۷۸ پبلک بیت الادب (مصنف کی وضع کردہ ترکیب بھی
خوب ہے) بنائے جا رہے ہیں۔ ۷۶۴ رہائشی یونٹ اور ۶۵۲ کمروں پر مشتمل ہوٹل زیرِ تعمیر
ہے۔ ۶۷ دو منزلہ بنگلے اور ایک ہزار دکانوں اور سٹور پر مشتمل تجارتی کمپلکس بنایا جا رہا ہے۔

(سوم، ص ۴۱)

پہلی جلد کا بیشتر حصہ "حرمِ نبوی" اور اس کے متعلقات: گنبد خضرا' منبر رسولؐ' چبوترہ اصحاب صفہ اور مسجدِ نبوی کے مختلف حصوں کی جزئیات پر مشتمل ہے۔ کتابی اور مشاہداتی معلومات کتاب میں شامل بہت سی تصاویر اور نقشوں کی مدد سے واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ توضیح و تصریح کے لیے کبھی وہ تقابل کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں: "بیت اللہ شریف کے ستون بھاری بھرکم اور عالی ہیں' یعنی عظمت و ہیبت کا تاثر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مسجد نبویؐ کے یہ ستون (کل ۴۷۴ ستون) دیکھ کر نرمی اور تلطف کا احساس ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک فٹ قطر کے اکہرے سفید' پتلے اور چکیلے ستون ہیں۔ ان کی سطح ہموار' چکنی اور ملائم ہے۔ اوپر جاکر ہر ستون کے چاروں جانب تیز دودھیا روشنی کے بلب خوب صورت بلوری طاقچوں میں ہیں۔ ستونوں پر لگے ہوئے ایسے شمع دانوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اور محرابوں پر طلائی نقش و نگار کا اتنا نفیس کام کیا گیا ہے کہ ماہرین کی صناعی دل پر نقش ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ حسن بے نقاب ہو گیا ہے" (اول' ص ۷۶)۔ گنبد خضرا کے تذکرے میں اس کی تعمیر و بناوٹ کی جزئیات اور نزاکتوں کے ساتھ اس کے رنگ کے بارے میں بتایا کہ گنبد کا سبز رنگ ڈیڑھ سو سال سے ہے۔ ترک سلطان عبدالمجید نے' مسجد کی تعمیر بہت وسیع پیمانے پر کرائی تھی۔ اس نے ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں اس مقدس گنبد کا رنگ سبز کرایا اور یہ گنبد خضراء کہلایا۔ اس سے پہلے سفید رنگ تھا۔ کچھ عرصہ نیلا رنگ بھی رہا۔ اور اس رعایت سے یہ گنبد بیضا' اور گنبد زرقا کہلاتا رہا۔ اب گنبد خضرا ہے (اول' ص ۷۸)۔

مقامات نبوی کی تلاش و زیارت میں مصنف اور ان کے رفقا کے بعض سفر' خصوصی "مہمات" کی حیثیت رکھتے ہیں' مثلاً مدائن صالح اور العلا کا سفر' تبوک کا سفر' خیبر کا سفر وغیرہ۔ ان میں "مرقد سیدہ آمنہ" کے باب میں "مہم جوئی" کا عنصر خاصا نمایاں ہے۔ ابواء کی طرف جا رہے تھے تو سامنے سے ایسی تند و تیز آندھی آتی نظر آئی کہ ان کے عرب ڈرائیور غنمی کے منہ سے بے اختیار نکلا "قد ھلکنا" (ہم تو مارے گئے) ہولے بخیر گذشت۔

طوفان کے یہ خطرناک اور تاریک لمحات انھوں نے ویگن کے اندر بیٹھ کر گزارے واپسی پر رات کی تاریکی میں ڈرائیور غنمی صحرا کی وسعتوں میں راستہ بھول گیا اور اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرا' پھر اس اعلان کے ساتھ اس نے ویگن کھڑی کر دی کہ گاڑی میں ۱۰' ۱۲ کلو میٹر سفر کا پٹرول باقی رہ گیا ہے۔ کچھ سوچ بچار اور مشاورت کے بعد' رفقائے سفر نے دب اکبر اور قطبی ستارے کی مدد سے' غنمی کو ایک سمت چلنے کو کہا تو کچھ دور چل کر شاہراہ مل گئی (بعدازاں اندازہ ہوا کہ غنمی صاحب بھٹک کر الٹ سمت میں گاڑی چلاتے رہے تھے)۔

کتاب میں جدید سعودی مملکت' اس کے بڑے شہروں' خصوصاً جدہ اور ریاض کی تعمیر جدید (مع ان کی قدیم تاریخ) اور بعض اداروں جامعہ ام القریٰ' جامعہ ریاض اور مدینہ یونی ورسٹی کے بارے میں بھی مفید اور دلچسپ معلومات ملتی ہیں' مثلاً یہ کہ مولانا مودودی نے شاہ سعود کی دعوت پر مدینہ کی مجوزہ اسلامی یونی ورسٹی کے بارے میں ایک مفصل سکیم پیش کی۔ انھیں یونی ورسٹی سنڈیکیٹ کا رکن بنا لیا گیا۔ سنڈیکیٹ کے اجلاس میں رہنما اصولوں پر غور ہو رہا تھا۔ سعودی عرب میں حنبلی فقہ نافذ ہے چنانچہ مقامی علما کا اصرار تھا کہ یونی ورسٹی میں صرف حنبلی فقہ پڑھائی جائے' لیکن مولانا مودودی کی تجویز تھی کہ مستقبل کے علما میں اجتہادی ذوق اور نظر پیدا کرنے کے لیے چاروں فقہی مذاہب کو دلائل کے ساتھ پڑھایا جائے۔ شیخ بن باز اور مفتی اعظم محمد بن ابراہیم دونوں مولانا مودودی کے موقف سے متفق تھے۔ مگر کچھ علما کا اصرار تھا کہ یونی ورسٹی میں حنبلی فقہ کے علاوہ کسی کا ذکر بھی نہ کیا جائے۔ معاملہ کلیدی نوعیت کا تھا اس لیے رائے شماری کی نوبت آئی اور ۱۲ کے مقابلے میں مولانا مودودی کی تجویز ۱۸ کی کثرت رائے سے منظور ہوئی (دوم ص ۳۱)

مصنف جامعہ ریاض کے زمانۂ طالب علمی کو اپنی زندگی کے روشن ترین ایام شمار کرتے ہیں اور کیوں نہ ہو' اسی زمانے میں انھوں نے "آسمان علم و فضل کے نجوم العلوم" اپنے اساتذہ سے کسب فیض کیا' انھیں ہم ذوق رفقا کی جماعت ملی' اسباب و وسائل بھی فراہم ہوئے اور آنحضورؐ کے نقش قدم پر سیر و مطالعے کے ارادے نے عملی شکل اختیار کی۔ سب

سے اہم تو یہ کہ اس سفر کے ماحصل کے طور پر 'مصنف کو زیر نظر کتاب تالیف کرنے کی توفیق میسر ہوئی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست.

جوش عربیت میں 'مؤلف نے کئی جگہ نامانوس الفاظ استعمال کیے ہیں' موقف (بہ معنی بس اڈا) 'ملذ' حافلہ 'کلیگ' تخت' وغیرہ.

ایک جگہ لکھا ہے: ساری کلاس عش عش کر اٹھی (۲۶/۱) اش اش کرنا صحیح ہے۔ اقبال کو پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ۱۹۳۱ (نہ ۱۹۳۰ء 'اول' ص ۵۰) میں سفر در پیش آیا۔ اقبال کے مصرعے (میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے۔ اول ص ۷۵) کی بنیاد ایک ضعیف حدیث پر ہے۔ ۱۹۸۰ ء میں ہونے والی گفتگو میں ۱۹۸۲ء '۱۹۸۳ء کے واقعات کا ذکر؟ (سوم' ص ۹۴' ص ۹۷) اقبال کا یہ مصرع: لوح بھی تو' قلم بھی تو' تیرا وجود الکتاب' بہت سے علما اور ماہرین اقبال کے نزدیک نعتیہ نہیں' حمدیہ ہے (اول ۱۲۴) سیاہ دل ہند درست ہے (ص دوم ۹۶) اقبال کا پہلا مصرع اصلاح طلب ہے (دوم' ص ۱۱۷) مگر: اتنی طویل اور ضخیم کتاب میں اس طرح کی فرد گزاشتیں بہت کم ہیں اور ان سے کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی.

یہ کتاب مقامات نبویؐ کا سفر نامہ ہے اور ان کی تاریخ اور جغرافیہ بھی۔ اسے سیرت پاک کا ایک دل کش اور مستند مرقع بھی کہہ سکتے ہیں جسے ایک پرجوش زائر نے آپؐ سے عقیدت و والہانہ شیفتگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ مصنف نے بیانیے کو زیادہ مفصل' واضح اور موثر بنانے کے لیے قرآن' حدیث' سیرت' تاریخ' عربی ادب' اور قدیم و جدید مشرقی و مغربی مصنفین کی تحقیقات اور کلام اقبال کا سہارا لیا ہے۔ نبی کریم سے اظہار عقیدت کا یہ ایک انوکھا انداز ہے اردو میں حج کے سینکڑوں سفر نامے لکھے گئے اور سیرت نبی کا ایک وسیع و عظیم ذخیرہ بھی موجود ہے' لیکن ایک والہانہ جذبے سے سرشار ہو کر لکھی ہوئی یہ روداد' اور انتہائی محنت و جانکاہی کے ساتھ مرتب کی ہوئی یہ تاریخ' اردو سفر ناموں اور کتب سیر میں' ایک منفرد کتاب کے طور پر یادگار رہے گی.

سفر حجاز۔۔۔۔ایک بے مثل سفر نامہ

ڈاکٹر تحسین فراقی
شعبہ اردو اورینٹل کالج جامعہ پنجاب لاہور

اردو میں سفر نامے کی باقاعدہ روایت کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوا اور یوسف خاں کمبل پوش اس اعتبار سے اردو کا پہلا سفر نامہ نگار بنتا ہے' بلکہ اس کا سفر نامہ 'سفر نامے کی نسبت سیاحت نامے کے زیادہ قریب ہے' کیونکہ اہل نقد کے نزدیک سیاحت من کی موج اور باطن کی آواز کے نتیجے میں اختیار کی جاتی ہے' جبکہ سفر میں بالعموم ایک طرح کی خارجی مجبوری کو دخل ہوتا ہے۔

اردو کے بیشتر سیاح اس من کی موج پر رہ نورد سفر ہوئے۔ سفر ان میں سے بیشتر کے لیے ایک مذہبی حکم کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ سفر' جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے عبدالماجد دریابادی کے سفر حجاز کے دیباچے میں لکھا ہے "اصل میں ابتداءً حجاز مقدس کی زیارت ہی کے لیے اختیار کیے جاتے تھے" چنانچہ "ابن حوقل بغدادی' اصطخری فارسی' حکیم ناصر خسرو' ابن جبیر اندلسی' ابن بطوطہ مغربی اور بیسیوں سیاح اس قسم کے ہیں جنھوں نے اپنے سفر کا آغاز اسی نیت سے کیا اور پھر جب سیر و سیاحت کی چاٹ لگ گئی تو دنیا کے گوشے گوشے کو چل پھر کر دیکھ لیا اور اپنے مشاہدات کو سفر نامہ کی صورت میں قلمبند کر دیا۔(۱)

اردو کے قدیم سفر نامے اپنے اندر دلچسپی کا کافی سامان رکھتے ہیں' مگر ان میں معلومات کا طومار دلچسپی کی دھار کو کہیں کہیں ضرور کند کر دیتا ہے۔ اس نوعیت کے سفر ناموں میں' جن میں سے بعض دراصل گائیڈ بکس ہیں' مقامات کی تفصیل' مسافروں کے لیے مراعات' مختلف ممالک اور شہروں کی "مکمل" اور "صحیح" مردم شماری کے کوائف' نقشے' شہروں کے آپس کے فاصلے اور ان مقامات کی تاریخ اور جغرافیائی محل وقوع کی اس قدر گراں بار تفصیلات ملتی ہیں کہ ان سے سیاحت کا مقصد ایک حد تک تو بہر حال مجروح ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح قدیم اردو سفر نامے گرانبار تاریخی و جغرافیائی معلومات اور بے رس تفصیلات تلے کراہتے نظر آتے ہیں اسی طرح کی صورت حال اردو کے پرانے سفر نامہ ہائے حج کی بھی ہے' جبکہ حج و زیارت کا یہ سارا سفر تو عبارت ہی ہے وجود کی

نو دریافت ہے!

مشہور فارسی شاعر ناصر خسرو حج سے لوٹنے والے ایک دوست سے ملنے گیا۔ دوران ملاقات اس نے دوست سے پوچھا:

"یہ تو بتاؤ اس مقدس سرزمین پر تم نے مناسک حج کس طرح ادا کیے؟ جب تم نے عام لباس تج کر احرام پہنا تو تمہارے کیا تاثرات تھے؟ کیا تم ان تمام محرمات سے بچے رہے جن سے ممانعت کا حکم آیا ہے؟ کیا تم نے عجز و تسلیم کا وہی انداز اپنایا تھا جو حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے اختیار کیا تھا۔ کیا میدان عرفات میں تم عارف حق اور منکر خویش ہونے کے تجربے سے گزرے؟ کیا حرم میں داخل ہوتے وقت تم نے اپنی انانیت کو اصحاب کہف و رقیم کی طرح تج دیا تھا؟ کیا تم نے جانور کی قربانی کرتے وقت اپنے نفس لئیم کو بھی ذبح کیا؟ اب جبکہ تم کعبے سے لوٹ آئے ہو کیا تم اپنا نفس دنی دفن کر کے آئے ہو اور کیا تم دوبارہ کعبہ جانے کے لئے بے قرار ہو؟ دوست نے جب ان سب سوالوں کا جواب نفی میں دیا تو ناصر خسرو کو کہنا پڑا: افسوس کہ تم نے اپنا پیسہ اور وقت برباد کیا اور حج کی سعادت سے محروم رہے۔(۲)"

حقیقت یہ ہے کہ زیارت حرمین کا مقصد وحید ذات کے نئے عرفان اور باطن کی قلب ماہیت سے عبارت ہے۔ یہیں آ کے فرد نشاۃ ثانیہ اور خلق جدید کے مرحلے سے گزرتا ہے اور یوں نشاۃ ثانیہ کے اس دائرے میں فرد کی ذات سے پھیل کر پوری ملت اسلامیہ اور بالآخر پوری نوع انسانی کا احاطہ کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ حج تو نام ہی ہے کلی انسانی وجود کے کیمیا ہو جانے کا۔ یہ عبارت ہے شناخت سے عدم شناخت اور رنگ سے بے رنگی تک کے اس مرحلے سے جس کے نتیجے میں سب سے بڑی شناخت یعنی صبغۃ اللہ کا حصول ممکن ہوتا ہے اور تحقیق کہ من احسن من اللہ صبغۃ علی شریعتی نے لکھا ہے:

"حج عبارت ہے انسان کے اللہ کی جانب سفر عروجی سے۔ یہ دراصل تخلیق آدم کے فلسفے کا تمثیلی اظہار ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ حج بیک وقت بہت سے حقائق کا مظہر ہے۔ یہ مظہر ہے تخلیق کا، یہ مظہر ہے تاریخ کا، یہ مظہر ہے توحید کا، اور یہ مظہر ہے اسلامی وحدت اور امت محمدیہ ﷺ کی یک دلی اور ہم احساسی کا۔"(۳)

اردو میں حج کے ایسے سفرنامے جن میں: ز چشم آستیں بر دارد گوہر را تماشا کن۔ اور

منم وہمیں تمنا کہ بوقت جاں سپردن
بہ رخ تو دیدہ باشم تو دروں دیدہ باشی

کی کیفیتوں کی تجلیاں بھری ہیں' انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان سفرناموں میں حافظ لدھیانوی کا جمال حرمین' شورش کاشمیری کا "شب جائے کہ من بودم" ماہر القادری کا "کاروان حجاز" حافظ مظہر پوری کا "اس دیار میں" ناصر قریشی کا "سرزمین آرزو" ممتاز مفتی کا "لبیک" نسیم حجازی کا "پاکستان سے دیار حرم تک" اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا "سفر حجاز" بہت اہم ہیں۔ مولانا دریابادی کا سفرنامہ حج کے مندرجہ بالا سفرناموں میں گل سرسبد کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اولیت کا شرف بھی.

میری دانست میں کامیاب سفرنامۂ حج وہی ہے جس میں مسافر حرمین نے اپنی کاوشیں اور کاہشیں' اپنے دیدۂ تر کی بے خوابیاں' اپنے قلب کی پوشیدہ بے تابیاں' اپنے احساس گناہ' شرم عصیاں' خالق سے وصل کی شدید تمنائیں اور حضور اکرم ﷺ کی ذات سے کمال وابستگی اور سپردگی کے احساسات پوری فنکارانہ مہارت سے سموئے ہوں اور جس سے اس کے قارئین کو باور ہو جائے کہ حج وزیارت حرمین کن مقاصد عالیہ کے حصول کا ذریعہ ہے۔ گویا یہ رجعت الی اللہ کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حج کی اس معنویت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جیلانی کامران نے لکھا ہے:

"یافت اور نایافت کی جس کشمکش سے انسانی زندگی عمر بھر گزرتی ہے وہ ارض مقدس ہی کے در وبام' وادی و کوہسار و صحرا سے سکون حاصل کرتی ہے۔ ایسی گہری وارفتگی قلب ارض مقدس کے جغرافیائی رشتوں کو بدل دیتی ہے اور اسے زیادہ بلند' زیادہ گہرے' زیادہ پائیدار رشتوں میں قبول کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام میں پیدا ہوتی ہوئی ہر نسل ارض مقدس میں پیدا ہوتی ہے اور اپنے آبائی وطن سے بہت پہلے اس روحانی وطن میں وارد ہوتی ہے۔ عالم اسلام کی نسلوں کا بچپن ارض مقدس کی اجتماعی یادداشت میں پرورش پاتا ہے اور عمر کے زیادہ پختہ مقام نظر پر بچپن کی حاصل کی ہوئی اجتماعی یادداشت کی مدد سے آبائی اور روحانی وطن کی وحدت ظاہر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی فکری تاریخ اسی وحدت کی تاریخ رہی ہے (۴)۔"

مولانا دریابادیؒ نے ۱۹۲۹ء حرمین کا سفر مقدس اختیار کیا۔ تشکیک و ارتیاب کی وادی سے گزرے ابھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس سفرنامے میں ان کے سابقہ الحادی

میلانات اور اظہارات کی یاد نے ان کے احساس ندامت کی لو کو اور بھڑکا دیا۔ "سفر حجاز" میں مولانا ایک عبد عاجز' ایک فرد آثم اور مسلم ملت کی حیات تازہ کے خواب دیکھنے والے ایک ایسے عالم دین کے طور پر نظر آتے ہیں جو مسلم ملت کے زوال پر بے حد دل گرفتہ ہیں۔ انھیں ایک سچے مسلمان کی طرح کامل یقین ہے کہ وہ جس آستانے پر پہنچے ہیں وہاں سے مرادیں حاصل کیے بغیر کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ وہ روضہ رسول ﷺ کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ مولاناؒ کا یہ سفر نامہ ان کے قلب کے گہرے احساسات و تاثرات کا ایک ایسا روشن اور لطیف آئینہ ہے جس میں عاشقان ذات حق اور محبان رسول رحمت ﷺ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں. مولاناؒ کا کمال یہ ہے کہ ان کی یہ داستان سفر حجاز ایک فرد کی نہیں' ایک پوری نادم اور فرومایہ ملت کی داستان درد بن جاتی ہے۔ حج کا یہ سفر نامہ اصل میں مقامات و افراد کے ذکر سے زیادہ محبت اور والہانہ شیفتگی کا سفر نامہ ہے اور شیفتگی کا یہ سامان تو چودہ صدیوں سے مسلمانوں کا سرمایہ ءافتخار ہے.

اس مقدس سفر کا مقصد کیا تھا' سب جانتے ہیں یہ سفر خیر طلبی اور نفس کی کدورتوں سے زنگ اتارنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ علمی تحقیق و تفتیش یا دنیا طلبی کے لئے نہیں تھا۔ یہ سفر بقول مولانا دریابادی:

"چلچلاتی ہوئی ریگ والی سرزمین کی طرف تھا' گرمی کے موسم میں آسمان کی چھت کے نیچے تھا جس کا آفتاب تمتمایا ہوا ہوتا ہے۔ ہوٹلوں اور پارکوں' آبشاروں اور سبزہ زاروں کی طرف نہ تھا خشک اور چٹیل میدانوں کے بے آب و گیاہ ویرانوں اور خاک برسانے والے ریگستانوں کی جانب تھا۔ ایک گناہگار امتی اپنے شفیع و شفیق آقا کے آستانے پر حاضر ہو رہا تھا۔ بندے کی حاضری اپنے مولا کے دربار میں تھی۔ بھاگا ہوا غلام تھک کر اور ہار کر' پچھتا کر اور شرما کر اپنے مالک کی طرف رخ کر رہا تھا"۔ (۵)

حجاز مقدس کا یہ سفر رنگ' نسل' لباس اور لسان کی رنگارنگی کو کس طرح وحدت میں ڈھال دیتا ہے اور تمدن کی مصنوعی دیواروں کو کس طرح گرا دیتا ہے' اس پر مولاناؒ کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے:

"دیکھتے ہی دیکھتے لباس و پوشش کے سارے امتیازات مٹ گئے' سنتے چلے آئے ہیں کہ الناس باللباس ....اب کس لباس سے خادم کو مخدوم سے پہچانا جائے گا اور کس پوشاک سے غلام کو آقا سے الگ کیا جائے گا۔ ابھی کل تک جہاز کی اس وسیع

آبادی میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی' امیر بھی تھے اور فقیر' بھی رئیس بھی اور مزدور بھی' خوشحال بھی اور مفلس بھی' عالم بھی اور جاہل بھی' نامور بھی اور گمنام بھی' تعلقدار بھی اور رعایا بھی' مجسٹریٹ بھی اور چپراسی بھی' پر آج کسی کو کس سے شناخت کیا جائے۔ سب سے بڑے مہاراجہ اور شہنشاہ اعظم کی راجدھانی کے حدود شروع ہو گئے۔ اب نہ کوئی راجہ ہے نہ ٹھاکر' سب کے سب اسی کی پرجا' کل کے کل اسی کے چاکر' سارے کے سارے اسی کی رعایا ہیں' مالک کے دربار کی سرحدیں شروع ہو گئیں۔ اب نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی وزیر' نہ کوئی عالم ہے نہ کوئی حاکم' نہ کوئی خان بہادر ہے نہ کوئی لیڈر' سارے کے سارے اسی مالک الملک کے غلام ہیں۔۔۔۔ اب نہ ہیٹ ہے نہ پگڑی' نہ عمامہ ہے نہ شملہ' نہ ترکی ٹوپی ہے نہ گاندھی کیپ' نہ قمیض ہے نہ عبا' نہ کوٹ ہے نہ شیروانی' نہ کالر ہے نہ ٹائی' نہ پتلون ہے نہ پاجامہ' سب کی زبان پر لبیک لبیک کے ترانے ہیں اور سب کے جسموں پر بے سلی دو دو چادریں۔۔۔۔۔۔ اس دربار کی وردی سب سے انوکھی' سب سے نرالی سب سے الگ ہے۔ یہاں قدر زریں کلاہوں کی نہیں۔ یہاں عزت رنگیں قباؤں کی نہیں' یہاں طلب صرف کفن پوشوں کی ہے۔ ان کی جو جیتے جی مردوں کا لباس پہن چکے ہیں۔۔۔۔ مبارک ہیں وہ جو زندگی میں اپنے نفسوں کو مردہ کر چکے ہیں۔ ان کا نفس بھی تو مردہ نفس بن چکا ہے۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ لڑنا جھگڑنا' شہوتوں اور خواہشوں میں مبتلا ہونا زندوں کا کام ہے۔ مردوں کو بھی کسی رفث اور فسوق اور جدال میں مبتلا دیکھا ہے؟"(۶)

مولانا دریابادیؒ کے اس اقتباس سے مجھے معاً ڈاکٹر علی شریعتی کے وہ تاثرات یاد آتے ہیں جو ان کی معرکہ آرا کتاب "حج" میں ایک جگہ مرقوم ہیں اور جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم فانی انسانوں نے اپنے اردگرد بہت سی دیواریں چن رکھی ہیں: رنگ و نسل کی دیواریں' لباس و عدات کی دیواریں' آقا و غلام کی دیواریں' ظالم و مظلوم کی دیواریں' استحصال کرنے والوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں کی دیواریں' قوی اور کمزور کی دیواریں' غذا پانے والوں اور بھوکے رہنے والوں کی دیواریں' عزت اور حقارت کی دیواریں' عرب اور عجم کی دیواریں (۷)۔ ہاں رنگا رنگ متنوع لباس بھی مصنوعی دیواریں پیدا کرتا ہے جس سے لوگوں کے مابین مغائرت جنم لیتی ہے اور من و تو کے امتیازات پیدا ہوتے ہیں۔ سچا حج ان دیواروں' ان تمام دیواروں کو گرا دیتا ہے!!

ذرا تصور فرمایئے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سفید رنگ سمندر کا ______
سفید رنگ جو سب رنگوں کے یکجا ہونے سے وجود میں آتا ہے۔ جو اعلیٰ روحانیت کی علامت اور کثرت فی الوحدت کا مظہر ہے۔

مولانا دریابادی کے حج کا یہ سفرنامہ ایک سطح پر ایک تاسف نامہ کا گہرا تاثر پیدا کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلم کلچر کے زوال نے ان کی پوری شخصیت کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ حرم کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر پہنچ کر جو تمام ملت کے افراد کا مرکز اعظم اور مرکز واحد ہے' ہر سوچنے والا دماغ اور درد دل رکھنے والا فرد غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وسیع کرہ ارض پر پھیلی ہوئی مختلف رنگ اور نسل و لباس اور لسان' عادات اور آداب کی حامل اس بے کراں اور رنگا رنگ لہریے پیدا کرتی امت کو ایک کثیر مدت تک ایک مرکز پر یکجا کرنے والے دین کے پیرو آج زوال اور محکومی کی چکی میں کیوں پس رہے ہیں؟ کیا کیا ممالک' کیا کیا تمدنی مراکز مسلم ملت کے ہاتھ سے چھن گئے۔ جدہ کی زیارت مولانا دریابادی کو مسلم ماضی کی طرف مراجعت پر مجبور کرتی ہے۔ شعور کی رو انہیں بغداد و قرطبہ' بیروت و بیت المقدس اور بصرہ و بیجاپور کے اس دور کی طرف لے جاتی ہے جب ان مراکز نے مسلم تہذیب کی عظمت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی لیکن جن کی حالت آج "موز کی آخری سسکی (The Last Sigh of the Moor) سے مماثل ہو کر رہ گئی ہے۔ مولانا کے اس گہرے اور دلدوز تاسف کی تہ میں مسلم عظمت کی باز آفرینی کی خواہش شدت سے کروٹیں لے رہی ہے۔ تاسف اور ملال کا یہ رنگ اور زوال و ادبار کی یہ گھٹا آج بھی اس سفرنامے کی تسوید کے تقریباً ستر برس بعد بھی اس طرح چھائی ہوئی ہے اور حج کے بعض جدید سفرناموں میں بھی وہی آواز گونج رہی ہے جو ایک عرصہ پہلے مولانا دریابادی کے اس سفرنامے میں ابھری تھی۔
ایلی ایلی لما شبقتنی کی کامل مصداق!

اقبال نے فرنگ کی لامرکزیت کا سبب اس کا بے حرم ہونا قرار دیا تھا:

"تہی وحدت سے ہے اندیشہ غرب کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے'

مگر ملت اسلامیہ تو ایک حرم' ایک مرکز رکھتی ہے۔ پھر یہ وحدت سے کیسے تہی ہو گئی؟ یہ ہمارے آپ کے سب کے سوچنے کا کام ہے۔ مولانا دریابادی کا 'سفر حجاز' اور بعض دیگر سفرنامہ ہائے حج کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ یہ ہماری دلوں میں احساس زیاں اور کرب زوال پیدا کر کے ہمیں ایک نئی اور تازہ ترحیات کے آغاز کا حوصلہ دیتے ہیں۔

سفر حجاز کے بعض ابواب اپنی تاثر آفرینی کے ضمن میں بے مثال قرار دیے جا سکتے ہیں مثلاً "الوداع" "مدینہ" "دیار حبیب ﷺ" اور "چل چلاؤ" وغیرہ۔ الوداع کے باب سے دعا کا ایک قرینہ ملاحظہ ہو:

"مردوں کو جلانے والے مالک! مایوسوں کو خوش خبری دینے والے مولا' بےکسوں کی دستگیری کرنے والے آقا! دلوں کے زخموں پر مرہم رکھنے والے پروردگار تجھ سے بھاگا ہوا تیرا نافرمان غلام تیرے اور تیرے حبیب ﷺ کے آستان پاک پر سر رکھنے کو حاضر ہو رہا ہے۔ دعاؤں کا قبول کرنا تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور دعاؤں کی توفیق دینا بھی تیرے ہی ہاتھ میں:

اے خدائے پاک بے انباز و یار   دست گیر و جرم ما را درگذار
یاد دہ ما را سخن ہائے رقیق   کہ ترا رحم آورد آں اے رفیق
ہم دعا از تو' اجابت ہم ز تو   ایمنی از تو' مہابت ہم ز تو
گر خطا گفتیم' اصلاحش تو کن   مصلحی تو از تو اصلاح سخن (۸)

لیکن مولانا دریابادی کے اس سفر نامے میں ذاتی اور ملی تاسف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انہوں نے اپنے مرقع نگار قلم سے سواد مکہ و مدینہ اور جوار عرب کی خوب منظر کشی کی ہے۔ تاریخی واقعات اور جغرافیائی حقائق پر ان کی نظر گہری ہے۔ مقامات مقدسہ کا ذکر آیا ہے تو کوئی قابل ذکر مقام بغیر تفصیلی ذکر اور مناسب معلومات کے چھوڑا نہیں گیا۔ جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کا ذکر آیا ہے تو جہاں قبر پرستی اور قبہ آرائی کی مذمت کی ہے وہیں اس وقت کے حکمران (ابن مسعود) کی قبر شکنی اور مبارک مزارات کو شکستہ کھنڈروں بلکہ گھوروں تک میں تبدیل کر دینے پر ماتم اور احتجاج بھی کیا ہے۔ روضۂ رسول ﷺ کا ذکر کیا ہے تو جہاں اس نے اپنی اٹوٹ چاہت کا ذکر کیا ہے' وہیں ملا علی قاریؒ' عیاض مالکیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے استشہاد کر کے زیارت روضۂ رسول کے آداب بھی واضح کر دیئے ہیں۔ حرمین شریفین سے تمام تر عقیدت اور محبت کے باوجود مولاناؒ نے حزم و احتیاط اور آداب زیارت کو کلیۃً ملحوظ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاثیر اور گداز کے باب میں بہت کم سفر نامے اس کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا دریابادی کے نام حسرت موہانی کے ایک غیر مطبوعہ مکتوب کا اندراج بے محل نہ ہوگا جو کیم مارچ

۱۹۳۲ء کو لکھا گیا تھا:

"السلام علیکم!

سفر حجاز کے متعلق آپ کے مضامین "سچ" میں نظر سے گزرے تھے مگر اس وقت ان کے مطالعے میں تسلسل کا عنصر موجود نہ تھا۔

اب پرسوں مجی ظفر الملک صاحب سے لے کر ان کو ایک بار پھر کتابی شکل میں دیکھا تو آنکھوں کو کچھ اور ہی عالم نظر آیا۔ جزا کم الله فی الدارین کئی بار آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوئیں' فالحمد لله علی ذالك (۹)

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندوی نے سفر حجاز کے تاثیر و گداز میں ڈوبے ہوئے اسلوب کا ذکر یوں کیا تھا۔

"صبح کو امیر شکیب ارسلان کا سفر نامہ حج (الار تسامات اللطاف فی خاطر الحاج الی اقدس مطاف) پڑھتا رہا۔ زبان و بیان کی خوبی کے کیا کہنے مگر سوز و درد کی کمی محسوس ہوئی۔ سفر حج کی روداد یں بہت پڑھی ہیں مگر اب تک دل و دماغ پر جو اثر مولانا عبدالماجد دریابادی کے سفر نامہ حج کا ہے' اسے امیر شکیب کی بلاغت محو نہیں کر سکتی۔ (۱۰)

مختصر یہ کہ سوز و گداز کی یہ لہر بہر سفر حجاز میں جاری و ساری ہے۔ پورے سفر نامے کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ مسلمان ادبار و پستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکل سکیں گے؟ یہ سوال جتنا سنگین کل تھا اتنا ہی آج بھی ہے:

"مکہ کے مہاجر کو اپنے رب کا نام پکارنے' توحید کا کلمہ بلند کرنے کو قبا کا ایک ٹھکانا مل گیا تھا۔ کیا اس محبوب کی امت میں کوئی قبا نہیں اور اسے خدانخواستہ ہمیشہ بھٹکتے ہی رہنے دیا جائے گا (۱۱)"

حواشی

(۱) دیباچہ سفر حجاز' ص ۷۔۸

(۲) شعری متن کیلئے دیکھیے علی شریعتی *Hajj*' ص ۱۰۹' ۱۶۰

(۳) ایضاً ص ix (تعارف)

(۴) حج کے سفر ناموں کی روایت مشمولہ "۱۹۷۸ء کے بہترین مقالات" (مرتبہ سجاد

نقوی) ص ۷۱۔

(۵) سفر حجاز، بار چہارم ص ۲۶

(۶) ایضاً، ص ۸۴۔۸۵

(۷) *Hajj* ص ۸

(۸) سفر حجاز، ص ۱۹۔۲۰

(۹) مولانا حسرت موہانیؒ کے مولانا دریابادی کے نام مخملہ مذکورہ خط کے کئی اور غیر مطبوعہ مکاتیب بھی راقم کے پاس محفوظ ہیں.

(۱۰) دیار عرب میں چند ماہ، ص ۷.

(۱۱) سفر حجاز، ص ۱۹۳.

مولانا غلام رسول مہر کا سفر نامۂ حجاز

زاہد منیر عامر
استاد شعبہ اردو اورئینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

تحرک میں رازِ حیات پوشیدہ ہے اور سفر تحرک کی علامت انجماد پانی میں ہو تو تعفن پیدا کرتا ہے' حیاتِ انسانی میں ہو تو بے ثمری۔ سفر دو سطحوں پر کیا جاسکتا ہے۔ ایک سطح تو خارج کی ہے جس میں ہم ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف حرکت کرتے ہیں اور دوسری سطح باطن کی ہے جہاں ہم آرزووں اور امنگوں کے جلو میں نئی دنیاؤں کی تسخیر کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ خارج کا سفر' در حقیقت اسی داخلی سطح سفر کی تجسیم ہوتا ہے۔ داخل کی دنیا میں جب روحانی رفعت کی تمنا پروان چڑھتی ہے تو مسافر مقدس مقامات کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ آج کی صحبت میں ہم ایک ایسے ہی مسافر کے سفر سے آشنائی حاصل کررہے ہیں جس نے اپنے باطن کی تمنا نے سفر کو ارض پاک حجاز کی مسافرت کا روپ عطا کیا۔

برعظم پاکستان وہند کی قومی علمی اور صحافتی زندگی سے آشنا سماعتوں کے لیے مولانا غلام رسول مہر کا نام نامانوس نہیں۔ تیس کے قریب علمی وادبی تصانیف و تالیفات اور چالیس کے قریب اردو تراجم' روزنامہ زمیندار اور روز نامہ انقلاب جیسے عہد آفرین اخباروں کی ادارت مولانا مہر کی شخصیت کے معروف حوالے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں متعدد ملکی اور غیر ملکی اسفار کیے جن میں یورپ' برطانیہ' مصر' روم اور افغانستان وغیرہ کے اسفار شامل ہیں' لیکن یہاں ہم ارض تمنا سرزمین مقدس حجاز کے سفر کا جائزہ لے رہے ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں حج بیت اللہ کے فریضے کی ادائیگی کی غرض سے اختیار کیا۔ مولانا غلام رسول مہر اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ حجاز تشریف لے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب شریف مکہ کی حکومت کے خاتمے اور سلطان ابن سعود کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے' بعد ہندوستان میں حجاز کے بعض مقدس مقامات کو نقصان پہنچنے کی اطلاعات آرہی تھیں۔ ان اطلاعات کی حقیقت جاننے کے لیے مرکزیہ مجلس

خلافت نے مولانا ظفر علی خان، شعیب قریشی اور مولانا محمد عرفان پر مشتمل ایک تحقیقاتی وفد حجاز روانہ کیا تھا۔ مولانا مہر اس وفد میں مولانا ظفر علی خان کے رفیق سفر کی حیثیت سے ۲۶ راکتوبر ۱۹۲۵ء کو لاہور ہندوستان سے روانہ ہوئے اور تین ماہ حجاز مقدس میں گزارنے کے بعد ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو جدہ سے واپس عازم ہندوستان ہوئے ۲۔ اس سفر میں وہ عدن، رابغ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے۔ "یہ فخر مولانا مہر کو حاصل ہوا کہ (انھوں نے) روضہ اطہر کے اوپر تک پہنچ کر اس امر کا جائزہ لیا کہ اس سلسلہ میں ہندوستان پہنچنے والی خبروں میں کہاں تک صداقت موجود ہے الحمد للہ کہ یہ خبر (یں) غلط ثابت ہوئیں ۳۔

مولانا غلام رسول مہر کا دوسرا اور اس وقت ہمارا اصل موضوع سخن سفر حج بیت اللہ کی سعادت کے حصول کے لیے کیا گیا انھوں نے یہ سفر ۱۹۳۰ء میں اختیار کیا وہ ۲۰ر اپریل ۱۹۳۰ء کو لاہور سے اور ۲۳ر اپریل کو کراچی سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۷ر جون ۱۹۳۰ء کو واپس کراچی اور ۹ر کو لاہور پہنچے۔

مولانا غلام رسول مہر حسب معمول اپنے اس سفر کی روداد بھی دوران سفر ہی میں قلمبند کرتے رہے جو ان کی واپسی سے قبل ہی ان کے اخبار 'روزنامہ انقلاب میں شائع ہونا بھی شروع ہوئی مولانا کے اس سفر حجاز کی روداد کی اولین قسط ۲۹ر اپریل ۱۹۳۰ء کے انقلاب میں شائع ہوئی اور اس کے بعد ۲۹ر مئی، ۳۰ر مئی، ۱۴ر، ۱۵، ۲۲، ۲۴ اور ۲۹ر جون، ۶، ۸، ۱۳، ۲۰ اور ۲۳ر جولائی کی اشاعتوں میں یہ سفر نامہ مکمل ہو گیا۔ اس سفر کے قریباً نصف صدی کے بعد ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب نے مولانا کے سفر نامے کی ان اقساط کو مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۸۴ء میں کتابی صورت میں سفر نامۂ حجاز کے نام سے شائع کر لیا۔

اس سفر نامے میں اگرچہ مسافر کی نظر زیادہ تر خارجی احوال و کوائف پر مرکوز نظر آتی ہے۔ لیکن بین السطور کچھ ایسی علامات بھی موجود ہیں جن کی مدد سے ہم اس مسافر حجاز کی شخصیت اور سیرت اور اس کے محبوب نظر مقامات اور ان مقامات کے نظارے سے وارد ہونے والی کیفیات کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے مہر صاحب کی شخصیت: مہر صاحب ہندوستان کے ایک بہت بڑے

اخبار کے ایڈیٹر تھے جن کی رائے کو سارے ہندوستان میں خاص اہمیت حاصل تھی اس اعتبار سے اگر ان میں ادعا اور تحکم کا جذبہ پیدا ہو جاتا تو یہ کچھ تعجب خیز نہ ہوتا لیکن اس سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ وہ اس سفر میں سیاسی گفتگوؤں سے مجتنب رہنے کے آرزومند ہیں لیکن جب بعض احباب کے پاس خاطر سے انہیں اس دلدل میں اترنا پڑتا ہے تو وہ سخت گیری کا رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں:

اگرچہ "میرے پاس وقت نہیں ہے تاہم اس بات کے لیے تیار ہوں کہ جو کچھ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ آپ مجھ سے اس قلیل فرصت میں سمجھ لیں ؎" اسی طرح جب ان تک ان کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کا یہ تبصرہ پہنچایا جاتا ہے کہ "مہر بری بلا ہے" تو وہ اسے مولانا کا "حسن ظن" قرار دیتے ہیں اور اپنی بابت نااہلی اور ناقابلیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ۵

سفر میں انسان کی طبیعت کے بیشتر ملمعے اتر جاتے ہیں اس سفر نامے میں مہر صاحب بظاہر خود مرکزیت کا شکار نظر نہیں آتے، لیکن وہ دوسروں کی خود مرکزیت کا شکوہ کرتے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایک رفیق سفر کی طرف سے شدائد سفر کی اس شکایت پر کہ "پھرتے پھرتے پریشان ہو گیا ہوں" ۲ وہ یہ تبصرہ کرتے ہیں۔ "گویا ان کے سوا نہ کوئی پھرا اور نہ پریشان ہوا" یہ گویا مولانا مہر کی طرف سے ایک لطیف طنز ہے۔ اپنے رفیق سفر کے اس احساس پر جس کی حدیں اپنی ناک تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

وہ ایک تغیر پسند مزاج رکھتے ہیں اور کیوں نہ ہو یہ عین فطری بات ہے اور پھر سفر تو ہے ہی تغیر کا دوسرا نام مہر صاحب کی تغیر پسندی اور یکسانیت سے بے زاری کا اظہار خاص طور سے اس مقام پر ہوا ہے۔ جہاں انہوں نے سمندر کی بے کرانی کے مقابلے میں اس کے منظر کی یکسانی کو اپنا موضوع بنایا ہے: "چار روز تک طبیعت بہت مضطرب رہی پانچ سمت پانی اور اوپر آسمان تھا اس منظر میں بال برابر بھی تغیر پیدا نہ ہوا۔ میں نے ایک روز گھبرا کر کہا کہ خدا کرے سمندر میں طوفان آجائے تاکہ کچھ تو تبدیلی رونما ہو۔" ا

سفر میں بعض اوقات حقائق انسان کے قیاسات اور اندازوں سے متصادم ہو جاتے ہیں، ایسے مواقع پر پیچیدہ شخصیات کے حامل لوگ اپنے قیاسات کی تاویل کیا کرتے ہیں اور اندازے کی

غلطی کو کسی اتفاق یا حادثے سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں' مہر صاحب ایسا نہیں کرتے عرفات سے واپ پر جب وہ اپنے ایک رفیقِ سفر کی رائے کے برعکس مزدلفہ کے لیے پیدل روانہ ہو گئے تو راستے ہی میں انھیں "قدر عافیت معلوم ہو گئی" ۸۔ انہیں اپنی رائے کی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے اس کی تاویل کرنے کی بجائے اسے تسلیم کرنے کا روّیہ اختیار کیا۔

وہ ایک ہمدرد انسان ہیں جو دوسروں کی تکالیف اور دشواریوں میں ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں ان کا جی چاہتا ہے کہ کسی بھائی کو تکلیف ہو تو اس کی تخفیف کے لیے کوشش کی جائے ۹۔ طواف بیت اللہ کے دوران جب مستورات کے گروہ آتے ہیں تو وہ ان کے تحفظ کی خاطر' مبادا وہ مردوں کے ہجوم میں الجھ جائیں' اپنے ہاتھ پھیلا کر راستہ خالی کرواتے ہیں ۱۰۔ (اگرچہ مصری مستورات اس کے باوجود خود انھی کو دھکا دے جاتی ہیں) یہ ان کے سفرنامے کا ایک دلچسپ مقام ہے۔

وہ ایک کتاب دوست اور باذوق شخصیت ہیں چنانچہ اس سفر میں بھی جو ایک خالص "عبادتی سفر" ہے' قرآن کریم کے علاوہ غالب و نظیری کے کلیات' تاریخ فقہ اسلامی' ارض القرآن' پیام مشرق اور امین ریحانی کی کتاب "ابن سعود آف عریبیا" ان کے ہمراہ ہیں۔ یہی نہیں وہ ہمیں کتابوں کی خریداری کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ باب ہشتم میں وہ بتاتے ہیں کے انہوں نے ایک دن باب السلام سے کتابیں خریدیں۔ خرید کردہ کتابوں میں متنبّی کے دیوان کا ایک نسخہ اور "قصیدہ ابن بدرون مع شرح" شامل ہیں مؤخر الذکر کے بارے میں مہر صاحب لکھتے ہیں :

"یہ غالباً وہی قصیدہ ہے جس کے متعلق حضرت علامہ اقبالؒ نے مرثیہ سسلی میں اشارہ کیا ہے۔"

آسمان نے دولت غرناطہ جب برباد کی ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی ۱۱

"یہاں ہم خوانندگان کرام سے ایک قدرے طویل جملۂ معترضہ کی اجازت چاہتے ہیں"

معلوم نہیں مہر صاحب نے ابن بدروں کا کون سا قصیدہ خریدا؟ کاش وہ کتاب کھول کر ہمیں کچھ بتاتے۔ ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ عربی میں جس شاعر کے دل ناشاد نے "البشامہ" کے عنوان سے بربادی غرناطہ پر فریاد کی ہے وہ ابن بدروں نہیں بلکہ پانچویں صدی ہجری کا عرب

شاعر ابو محمد عبدالمجید ابن عبدون فہری کی ہے۔ جس کے مرثیے کی متعدد مشرقی و مغربی زبانوں میں شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔

عبدالملک بن عبداللہ الحضرمی بھی اس کا ایک شارح ہے جو عربی ادبیات میں ابن بدرون کے نام سے مشہور ہے۔[۱۲] حضرت علامہ اشارۃً شاعر کی طرف کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی جگہ شارح کا نام نظم ہو گیا ہے اور مہر صاحب بھی اس سے دھوکا کھا گئے ہیں۔

حجاز مقدس میں علی الخصوص حرم میں، بقول قاضی سلمان منصور پوریؒ، طبیعت شعر کی طرف مائل نہیں ہوتی تاہم اس سفر نامے میں ایک مقام پر مہر صاحب ذوق کے ایک شعر کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس حوالے سے انہوں نے جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کے طرفدارِ غالب ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔

مسافر اگر حساس ہو تو ناسٹلجیا اس کا مقدر ہوتا ہے لیکن مہر صاحب کا ناسٹلجیا ملال یاد وطن کی منزل سے آگے بڑھ کر تاریخ کے دامن میں بکھر جاتا ہے۔ وہ مقامات سے ماضی کی طرف نکل جاتے ہیں اور بسا اوقات ماضی سے یہ رجوع انہیں افسردہ کر دیتا ہے۔ یہ ان کے ملی احساس اور قومی جذبات کی واضح دلیل ہے:

> "میرے لیے عدن اور باب المندب کا نظارہ بے حد رنج افزا ہوتا ہے اس لیے کہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ ہند کے یہ دو اہم مقامات کبھی اسلام کی متاع تھے آج اغیار کے قبضے میں ہیں آہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کیسی کیسی ارضی نعمتیں نکل گئیں[۱۳]"۔

اسی طرح جزیرہ پیرم سے گزرتے ہوئے وہاں کے روشن اور دل کش مناظر ان کے دل میں احساس مسرت پیدا نہیں کرتے۔ دوسرے مسافر ان روشنیوں کو دو گھنٹے تک چشم تماشا سے دیکھتے رہتے ہیں لیکن مہر صاحب کہتے ہیں :

> "پیرم کی روشنیاں تقریباً دو گھنٹے تک بے انتہا دل کش منظر پیش کرتی رہیں اور اکثر حاجی ڈیک پر کھڑے ان کا تماشا دیکھتے رہے۔ لیکن میرے لیے یہ روشنیاں اسلامی حکمرانی اور فرماں روائی کے زوال پر آتش آنسودی کی حیثیت رکھتی ہیں

اس لیے رات طبیعت بہت مکدر ہوئی"۔ ۱۴

اس ناسٹیلجیا کا دوسرا پہلو مہر صاحب کا تاریخ اسلام کے بعض پہلوؤں کی طرف رجوع کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد کا بربر الاصل ہونا۔ موسیٰ کا اسے تحقیق احوال کے لیے اندلس بھیجنا اور اس کی طرف سے حالات ساز گار پا کر فتوحات کا سلسلہ شروع کر دینا اس پر موسیٰ کا عالم ناراضگی میں ہسپانیہ پہنچنا اور طارق پر تازیانے برسانا۔۔۔۔ اور بالآخر دونوں کا دمشق میں عالم گم نامی میں انتقال وغیرہ اسی طرح چھٹی صدی ہجری کے ایک گمراہ گروہ قرامطہ کا تذکرہ جس نے بزعم خویش حدیثیں گھڑنے کی روش اختیار کی نہ صرف یہ بلکہ اپنے عہد حکومت میں حج کو روکنے کی بھی کوشش کی اور طاہر قرمطی نے صرف ایک حج کے موقع پر تیس ہزار فرزندان توحید کو حرم میں شہید اور زم زم کو لاشوں سے بھر دیا اور حجر اسود کو اکھاڑ دیا۔ ۱۵ وغیرہ واقعات مہر صاحب کی چشم تخیل سے گزرتے ہیں۔ تاریخ کے متضاد اور متفاوت حالات و واقعات زمانے کی اولتی بدلتی قدریں اور روایات لیکن حج بیت اللہ کی عبادت کا اسی طرح قائم رہنا' فرزندان توحید کی طرف سے کبھی طواف بیت اللہ کے تسلسل کو ٹوٹنے نہ دینا اور عالم اسلام کے لیے بیت اللہ کی مرکزیت ایسی حقیقتیں ہیں جو ہر افسردگی پر غلبہ پالیتی ہیں. اور مہر صاحب کہتے ہیں:

حجاز ریویرا نہیں کشمیر نہیں اور ان نہیں کہ لوگ سیر و تفریح کے لیے خود بخود کھنچے آئیں بلکہ ہر اعتبار سے تکالیف و مصائب کا مرقع پیش کرتا ہے۔ گرمی بے پناہ' تمازت آفتاب جسم سوز' پانی کم یاب' سبزی و روئیدگی ناپید' درخت مفقود' جسمانی آسائش و راحت کے سامان بے حد قلیل لیکن اسلام کے حلقہ بہ گوش اپنی راحت و آسائش کی زندگیاں چھوڑ کر جماعتوں اور قافلوں کی صورت ادھر جا رہے ہیں۱۶۔"

اسلام کو دنیا میں آئے ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے لیکن کی مرکزیت اور عالم اسلام کے ہر ہر فرد کی بیت اللہ سے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ مسافر نے اگر کسی ملک کو پہلے بھی دیکھا ہو تو وہ دوسرے سفر میں ہر منظر کا گزشتہ نظارے سے تقابل کرتا رہتا ہے۔ مہر صاحب کا یہ سفر حجاز اولین سفرِ حجاز

نہیں تھا جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں بہت کم پہلے سفر سے تقابل کا جذبہ ابھرا ہے۔ سوائے جہاز کے مسافروں اور سامان میں ۱۷-۲ ار مئی ۱۹۳۰ء کو ساحل جدہ پر قدم رکھتے ۱۸ طواف لوٹیں کے وقت ۱۹ یہاں سے پہلی بار جدا ہونے کی تاریخ کے تذکرے میں جدہ سے روانگی کے سفر میں 'سڑکوں کی حالت کے تقابل ۲۰ میں اور ایک آدھ غیر اہم حوالے کے اور کہیں انہوں نے اپنے پہلے سفر کا موجودہ سفر سے تقابل نہیں کیا۔ اس سے ان کی شخصیت کے مستحکم ہونے اور اپنے خیالات پر قابو رکھنے کا سراغ ملتا ہے۔

خالص ادائے فریضۂ حج کے حالات اور ۸ر جولائی ۱۹۳۰ء کی اقساط میں اور "سفر نامۂ حجاز" کے باب ششم کے چودہ صفحات میں بیان ہوئے ہیں اس میں زیادہ تر تو مقامات اور وہاں پہنچنے اور کوچ کرنے کے اوقات کا تذکرہ ہے لیکن اس روداد کا اہم حصہ وہ ہے۔ جہاں مہر صاحب مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے (جو وقت حجاز میں مقیم ہیں) معارف حج سمجھتے دکھائی دیتے ہیں مولانا سندھی کہتے ہیں:

> "عرفات کے اجتماع کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ ملت کے تمام سپاہی ایک وردی پہن کر آئیں اس کے بعد منزل بہ منزل کوچ ہوتا ہے مثلاً عرفات سے مزدلفہ' مزدلفہ سے منیٰ چونکہ فوج بہت بڑی ہو جاتی ہے اس لیے منزل کم رکھی ہے یعنی عرفات سے مزدلفہ چار میل مزدلفہ سے منیٰ تین ساڑھے تین میل' منیٰ پہنچ کر قربانی کی جاتی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ امت کا ہر سپاہی سمجھ لے کہ اسے کیا کرنا ہے جس طرح وہ قربانی کے جانور کا خون بہاتا ہے اسی طرح اسے اپنا خون خدا کی راہ میں بہانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔" ۲۱

اس سفر نامے میں مولانا سندھیؒ سے متعدد مقامات پر مہر صاحب استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جبل نور اور غار حرا کی زیارت کے دوران مہر صاحب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں حضور ﷺ نے قبل از بعثت اس پہاڑی کو عبادت و ریاضات کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ جس پر چڑھنا بھی اور اترنا بھی دشوار ہے۔ مہر صاحب اس سفر میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ (اور ایک دوست) کے ہمراہ جبل بو قبیس پر جاتے ہیں تو یہ سوال حل ہو جاتا ہے۔ کہ جبل بو قبیس پر

کھڑے ہو کر گرد و پیش پر نظر ڈالی جائے تو جبل نور جس قدر نمایاں اور نظر میں کھبتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ مولانا سندھیؒ کہتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں یہ جبل بو قبیس ہی سے نہیں بلکہ مروہ سے بھی نظر آتی ہو گی اور اس کے ساتھ یقیناً بہت سی خاص چیزیں وابستہ ہیں جو کسی دوسری پہاڑی کے ساتھ وابستہ نہیں ۲۳؎"

یوں تو اس سفر نامے میں متعدد شخصیات کا تذکرہ ہے لیکن دو شخصیات بطور خاص اہم ہیں۔ ایک تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو اس زمانے میں حجاز میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور جن سے مہر صاحب کی تقریباً روزانہ ملاقات رہی۔ دوسرے مصنف رحمۃ اللعالمین مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ جو سفر حج کی سعادت کے لیے حجاز آئے ہوئے تھے۔

قاضی صاحب کا اولین تذکرہ ۱۵ر جون ۱۹۳۰ء کی قسط اور سفر نامۂ حجاز کے باب سوم میں پہلی بار ملتا ہے ۲۳؎ اس مقام پر مہر صاحب کو قاضی صاحب کی حج کے لیے آمد کا پتہ چلتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی طبیعت ناساز ہے چنانچہ سرزمین حجاز میں مہر صاحب کی قاضی صاحب سے پہلی ملاقات عیادت کی تقریب ہی سے ہوتی ہے بعدازاں قاضی صاحب جو دوسری مرتبہ حج کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مہر صاحب کو اپنی مشہور تصنیف رحمۃ اللعالمین کی تیسری جلد کا مسودہ دکھاتے ہیں اور اس کی اشاعت کی بابت گفت و شنید ہوتی ہے۔ پھر قاضی صاحب کا تفصیلی تذکرہ آخری باب (۲۳ر جولائی ۱۹۳۰ء کی قسط) میں ہے جس کا عنوان ہی "مصنف رحمۃ اللعالمین آغوش رحمت میں" ہے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری صاحب نے پہلا سفر حج ۱۹۲۱ء / ۱۳۳۹ھ میں کیا تھا جس کی روداد انہوں نے "سفر نامہ حجاز موسوم بہ الھادالی سبیل الرشاد" کے عنوان سے لکھ کر شائع کر دی تھی۔ اس سفر میں ان کے تین رفقائے سفر دوران سفر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے ۲۴؎۔ زیر تذکرہ سفر، قاضی صاحب کا دوسرا سفر حجاز تھا جس میں وہ خود ۳۰ر مئی ۱۹۳۰ء کو حج بیت اللہ کی سعادت سے دوسری بار بہرہ ور ہونے کے بعد واپسی کے سفر میں، بحری جہاز ہی میں اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ قاضی صاحب کی علالت اور آخری لمحات کی دل دکھا دینے والی روداد مہر صاحب نے تفصیل سے قلمبند کی ہے اس سے بھی زیادہ دلدوز منظر وہ ہے جب نماز جنازہ کے

بعد قاضی صاحب کے جسد خاکی کو' خود قاضی صاحب کے الفاظ میں "ماءِ طہور کی لحد میں چھوڑ دیا گیا۔ ۲۵ ؎

بحری جہاز والوں کے پاس کینوس کا ایک بڑا ٹکڑا ہوتا ہے جس کے دونوں بازوؤں پر رسے بندھے ہوتے ہیں اس کینوس میں رکھ کر میت کو جہاز سے نیچے اتارتے ہیں جب میت سطح آب کے قریب پہنچ جاتی ہے تو بیرونی ڈنڈے کے دونوں رسے ڈھیلے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور میت پانی میں اتر جاتی ہے حضرت قاضی صاحب کے جسدِ خاکی کے ساتھ لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا باندھ کر انھیں مذکورہ بالا طریقے سے سطح آب پر اتارا گیا اور دو منٹ کے بعد باہر کے رسے ڈھیلے کر دیے گئے۔ میت کینوس سے الگ ہو گئی اور طرفۃ العین میں علم و تقویٰ کا پیکر مقدس بحیرۂ قلزم کی موجوں کا دامن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا ۲۶ ؎

انا للہ و انا الیہ راجعون

کوئی سپرد آب ہوتا ہے کوئی سپرد خاک اور کوئی سپرد باد۔ بہر نوع ہر مسافر حیات کی آخری منزل یہی ہے اور حج کا سفر اسی منزل تک بسلامت پہنچنے کا ایک تربیتی عمل' مہر صاحب کا یہ تربیتی عمل' یہاں پہنچ کر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس سفرنامے کے بارے میں ہم مہر صاحب کے دوست عبدالمجید سالک کی طرح نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "محض اس کو پڑھ کر انسان حاجی ہو جاتا ہے گو دنیا اسے حاجی نہ کہے۔ ۲۷ ؎ اور نہ ہی مولانا کے سوانح نگار ڈاکٹر شفیق احمد کی طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں "کوئی خاص بات نظر نہیں آتی" ۲۸ ؎ بلکہ ہمارے خیال میں مہر صاحب کا یہ سفرنامہ قریباً ستر برس قبل کے حجاز کے ماحول و معاشرت کو سمجھنے' غلام ہندوستان کے مسافرانِ حجاز کے شوق و لگن اور دشواریوں کو جانچنے' مسافر حجاز غلام رسول مُہر کے دینی معاشرتی اور نفسی رویوں اور رجحانات سے آشنائی کے لیے ایک مفید دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ روزنامہ زمیندار لاہور ۲۶/اکتوبر ۱۹۲۵ء بحوالہ ڈاکٹر شفیق احمد: مولانا غلام رسول مہر، حیات اور کارنامے لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۸ء ص ۸۷

۲۔ روزنامہ انقلاب لاہور ۱۴/جون ۱۹۳۰ء۔ بحوالہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (مرتب) سفر نامۂ حجاز از مولانا غلام رسول مہر کراچی: مکتبہ اسلوب ۱۹۸۴ء ص ۲۲۔

۳۔ شفیق احمد ڈاکٹر، مولانا غلام رسول مہر حیات اور کارنامے ص ۸۷

۴۔ مہر غلام رسول، مولانا، سفر نامۂ حجاز مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری ص ۲۲، ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۲۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۸۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۱۲۔ اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر: مطالعۂ تلمیحات و اشارات اقبال، لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان ۱۹۸۶ء/ص ۳۲۳، ۳۲۴

۱۳۔ مہر غلام رسول مہر: سفر نامۂ حجاز، محولہ بالا، ص ۳۰۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۱۸۔ ایضاً ، ص ۴۶.

۱۹۔ ایضاً ، ص ۴۲.

۲۰۔ ایضاً ، ص ۴۵.

۲۱۔ ایضاً ، ص ۸۱.

۲۲۔ ایضاً ، ص ۵۵.

۲۳۔ ایضاً ، ص ۴۸.

۲۴۔ سلیمان سلمان منصور پوری، قاضی محمد: سفرنامۂ حجاز موسوم بہ المعاد الیٰ سبیل الرشاد لاہور: کانشی رام پریس، ۱۹۲۴م (صفحات ۲۹۶)

۲۵۔ یہ الفاظ قاضی صاحب مرحوم و مغفور نے اپنے اوّلین سفر حجاز کے سفرنامے میں اپنے رفیق سفر میجر رستم خان کی وفات کے حوالے سے لکھے ہیں جو دوران سفر میں بحری جہاز میں انتقال کر گئے تھے۔ یہی الفاظ حیران کن حد تک، نو برس بعد خود قاضی صاحب پر صادق آئے اس سے بھی زیادہ موجب حیرت قاضی صاحب کے سفر حج سے متعلق ان کا اپنا ایک شعر ہے جس میں گویا ان کے سفر آخرت کی پیش گوئی پائی جاتی ہے ۔

نظر آتا نہیں قسمت میں مجھ کو لوٹ کر آنا
کہ اب عمر رواں آب رواں معلوم ہوتی ہے

(اس الہامی شعر کی طرف توجہ دلانے پر ہم محترم ڈاکٹر امین اللہ وثیر صاحب کے ممنون ہیں)

۲۶۔ مہر، غلام رسول: سفرنامہ حجاز محولہ بالا، ص ۱۱۴.

۲۷۔ سالک، عبدالمجید: سرگزشت، لاہور: قومی کتب خانہ، ص ۲۷۷.

۲۸۔ شفیق احمد ڈاکٹر: مولانا غلام رسول مہر۔ حیات اور کارنامے / محولہ بالا ص ۷۴۳۔

نیویارک سے مکہ مکرمہ تک

(ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کا سفر نامۂ حج)

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت حرمین شریفین کے سفر ناموں پر ہونے والا بین الاقوامی سیمینار اس اعتبار سے بڑا منفرد ہے کہ اس میں حکمرانوں سے لے کر عام شہریوں تک سبھی نے حصہ لیا۔ دس اسلامی ممالک سے مندوبین تشریف لائے........ جن کے خیالات سننے کے لئے اہل لاہور نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔

جنوبی افریقہ سے جن شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کا اسم گرامی بھی شامل ہے...... لیکن ڈاکٹر صاحب اپنی علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔ البتہ انہوں نے اس کی تلافی اپنا ایک سفر نامہ بھیج کر فرمادی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اور اپنے ارسال کردہ سفر نامے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اپنے مکتوب گرامی میں لکھا:

"آپ کی دو روزہ کانفرنس مورخہ ۲۴، ۲۵ اکتوبر مندرجہ بالا عنوان پر انتہائی اہم ہے۔ میں اپنی علالت وغیرہ کی وجہ سے نہیں آسکا' لیکن اسی موضوع پر اپنی قومی زبان اردو میں لکھے ہوئے دو مقالے پیش خدمت ہیں تاکہ میری شرکت By paper ہو جائے۔ اگر آئندہ کوئی مجموعہ مقالات شائع ہو تو میرے دونوں مقالات ایک مقالہ بنا کر شائع کر سکتے ہیں:

میں نے جامعہ ہارورڈ امریکہ سے .M.A اور Phd کیا اور وہیں پڑھاتا بھی رہا۔ اب آب و دانہ جنوبی افریقہ لے آیا ہے۔ ۶ برس تک ہارورڈ اسلامی سوسائٹی کا صدر بھی رہا۔ امریکہ کی تاریخ میں پہلا قافلہ حج روانہ ہوا جس کی روداد آپ کے سامنے ہے۔ یہ خالص تاثراتی مقالہ ہے۔ لیکن علمی بھی ہے۔ اس میں مغربی فلاسفہ مفکرین جدید و قدیم کی تحریکات کا ذکر ہے۔

دوسرا مقالہ یا سفرنامہ جو حج بیت اللہ جولائی ۱۹۸۹ء سے متعلق ہے۔ اس میں جدید امت مسلمہ کی تحدیات کا ذکر ہے۔ دونوں کو ملا کر طبع کرنے میں غرب و شرق دونوں کی تحدیات پر نظر پڑے گی۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ دونوں مقالات کو پسند فرمائیں گے۔

(مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

اس سال اپریل ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر سلمان (ابن سید سلیمان) ندوی لاہور میں تشریف لائے۔ تو ان کی زبانی یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ ڈاکٹر حبیب الحق ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر ندوی صاحب کے لوسال کردہ ان مقالات یا سفرناموں پر ہم ایک نے نظر ڈالی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کا ان دو میں سے ایک سفرنامہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو کسی رسالے میں (ص ۱۵۷ تا ۱۷۲) میں چھپا ہے۔ مرحوم نے اس رسالے کا نام نہیں لکھا۔ جس میں یہ سفرنامہ چھپا ہے۔ البتہ انہوں نے ہمیں اس کی ایک فوٹو کاپی ارسال کی ہے۔ جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اولین امریکی قافلے کا یہ سفر ۱۲ مارچ ۱۹۷۰ء سے شروع ہوا اور مارچ کے آخر میں مکمل ہوا (واپسی کی تاریخ نہیں دی گئی)۔

امریکی مسلمانوں کا یہ قافلہ جدید دنیا کے قلب و مرکز نیویارک سے چلا.... اور لندن سے ہوتا ہوا جدہ اور جدہ سے مکہ معظمہ پہنچا۔ جس کے بعد قافلے نے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور وہاں سے بذریعہ جہاز جدہ کے راستے واپس نیویارک چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس سفرنامے کی ابتدا یوں فرماتے ہیں:

"اس وقت ہم مادی دنیا کے مرکز "نیویارک" سے روحانی دنیا کے مرکز مکہ کا سفر کر رہے ہیں' آج مارچ ۱۹۶۷ء کی بارہ تاریخ ہے۔ موسم نشاط انگیز ہے ابر باراں اور بارش کی جائے خوشگوار دھوپ' زندگی کو متحرک اور فعال بنائے ہوئے ہے۔ ہم شہر کی پرپیچ راہوں سے گذر کر نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ نیویارک کا سب سے بڑا بین الاقوامی ایئرپورٹ ہے' مسافروں کی ہما ہمی اور ریل پیل جاری ہے۔ شام کے ۳۰ : ۔ ج چکے ہیں۔ تیس آدمیوں پر مشتمل حجاج کا یہ قافلہ جس

میں پچیس طالب علم ہیں آپ کے سامنے ہے۔ یہ لوگ ولایات متحدہ کے مختلف شہروں سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان میں کناڈا کے طلبا بھی ہیں جو حرمین شریفین کی زیارت کا شوق سینوں میں چھپائے یہاں پہنچے ہیں۔ اس قافلہ میں کالے بھی ہیں اور گورے بھی' پیدائشی مسلمان بھی ہیں اور نو مسلم بھی فرداً فرداً سب کا تعارف ہوا ہے۔ آیئے آپ کا تعارف وارث محمد سے کراؤں۔ یہ علی جاہ محمد' (زعیم بلیک مسلم تحریک) کے دوسرے صاحبزادے ہیں جو باپ کی جماعت سے بغاوت کر کے صحیح العقیدہ مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں اور امریکہ میں تبلیغ اسلام کے مستقبل کا چراغ ہیں۔ باپ نے عاق کر دیا ہے' مگر دولت ایمان ان کے سکون کے لئے کافی ہے' میانہ قد ہے رنگ صاف ہے' ہندوستانی یا پاکستانی مسلمانوں میں اگر یہ کھڑے ہو جائیں تو امتیاز مشکل ہو گا۔"

امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار حج کا موسم آیا ہے جس میں تیس آدمیوں کا قافلہ لبیك لبیك اللھم لبیك لا شریك لك لبیك کہتا ہوا والہانہ وارفتگی کے ساتھ وادی بطحا کی طرف گامزن ہے۔ یہ صورت حال قرآن کریم کی آیت یَأْتُوكَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ کی عملی تفسیر ہے۔ زائرین حرم آپ کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں۔ سامان افسران کے حوالہ کر کے اپنے ٹکٹ حاصل کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالی نے بڑا تیز ذہن اور فکر رسا عطا کیا تھا' اسی لئے وہ جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا بڑی عمدگی سے استنباط کرتے ہیں چنانچہ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"افسران طیارہ تعجب اور احترام کی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ تعجب تو اس لئے کہ اس مادی دنیا میں تعیش' سیر و سیاحت' تفریح اور تفنن کے لیے اتنی بڑی رقم کا خرچ کرنا تو عقل میں آنے والی بات ہے' لیکن ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی پر صرف کثیر ذرا عقل سے بعید بات ہے۔ احترام شاید اس لیے کہ روحانیت میں اب بھی اتنی قوت موجود ہے کہ مادی سروسامان اور دولت کے نشے میں بدمست انسان بھی کچھ دیر کے لیے چونک جاتا ہے اور اسے عاقبت کی فکر غیر شعوری طور پر کچھ دیر کے لیے ہی سہی' لاحق ہو جاتی ہے۔ اب ہم طیارہ کے اندر ہیں اتفاق دیکھئے کہ ہماری اس جماعت کو ایک ساتھ وسط میں نشستیں ملی ہیں۔ آپ مسافروں کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حصہ آگے ہے ایک حصہ پیچھے اور وسط میں حاملین قرآن کی یہ جماعت ہے' شاید اس لیے کہ اس کا تعلق امت وسط سے ہے جو دو انتہاؤں میں اعتدال

قائم کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے' فرنگی مسافروں کی آنکھیں غیر معمولی طور پر پھٹی ہوئی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھ رہے ہیں انہوں نے ایسی جماعت شاید پہلی بار دیکھی ہے جو ایک ناقابل شکست عزم کی مالک ہے اور یک گونا وقار و اعتماد کے ساتھ لبیک لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک کی صدا بلند کر رہی ہے۔ تلبیہ کی گنگناہٹ سے ان کے کان کھڑے ہوگئے ہیں اور کوشش کے باوجود وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کس منزل کے راہی ہیں"

(ص ۱۵۷)۔

ڈاکٹر صاحب نے پورے سفرِ حج میں اس بات کا بڑا خیال رکھا ہے کہ وہ ایک مقدس سفر اور ایک بابرکت مشن پر ہیں' اس لئے انہیں جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اس سفر کے اغراض و مقاصد اور اس کے فلسفۂ مساواتِ انسانی پر پرزور دارانداز میں ضرور اظہار خیال کرتے ہیں' چنانچہ قافلے کے جدہ اترنے کے بعد اپنی منزل........ یعنی مکہ مکرمہ کی طرف اس کی روانگی کی منظر کشی کرتے ہوئے........وہ لکھتے ہیں:

"آج پانچ ذوالحجہ ہے ذرا نظر اٹھایئے اس امریکی قافلہ کو دیکھئے آپ اب کسی کو نہیں پہچان سکتے' رنگ برنگی لباس اتر چکا ہے' سب یک رنگ ہو چکے ہیں۔ اب آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان میں غریب کون ہے؟ اس سفید کفن آسا لباس نے امارت و غربت' نسل و رنگ اور اونچ نیچ کے تمام امتیازات کو یک لخت مٹا دیا ہے' یہی نہیں۔ یہ قافلہ اب قافلہ امن ہے امن و سلامتی اور صلح و خیر کی مجسم تصویر' اب مچھر' پسو اور چیونٹی تک کی جان لینا حرام ہے۔ سبھوں کی آ ہیں جھکی ہوئی ہیں گفتار و رفتار' نشست و برخاست میں سب پیکر امن و محبت ہیں۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی ہیں چہروں کا رنگ بدلتا جارہا ہے' آوازیں معمول سے بھاری ہوتی جارہی ہیں' کیوں؟ اس لئے کہ یہ قافلہ اب سوئے حرم چل رہا ہے۔ اللہ کے گھر جارہا ہے' کسی کے گھر انسان در و دیوار سے ملنے نہیں جاتا' بلکہ صاحب خانہ سے ملنے جاتا ہے۔ اس احساس نے نفسیاتی کیفیات ہی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ لبیک لبیک اللھم لبیک ان الحمد و النعمۃ لک و الملک کا ورد عام ہے' نمناک آنکھیں سیل اشک کی تمہید ہیں۔ اب آپ ہمارے ساتھ حدود حرم میں داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی جدہ سے مکہ کی طرف چل رہے ہیں۔ اس وقت قافلہ والوں کی عجیب حالت ہے نہ صرف اشکبار آنکھیں ماحول میں فرق پیدا کر رہی ہیں' بلکہ بعضوں کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں' بعض نڈھال ہو رہے ہیں' بعض با آواز

بلند رو رہے ہیں۔ امریکی قافلہ میں سب کی زبانوں پر یہی ورد ہے کہ ہم گھر پہنچ کر خدا کے حضور میں اپنے آلام کا ذکر کریں گے۔"

I am going to tell god, all of my troubles when I get home.!

(ص ۱۵۰۔۱۶۰)

اس مقدس اور بابرکت سفر کی سب سے خاص اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں زائر حرم جذبات واحساسات کا ایک قافلہ ہمراہ لئے ہوئے چلتا ہے..... سید صاحب بے شک جدید دنیا کے مرکز نیویارک سے آئے تھے اور ان کے ہمراہی بھی کولمبس کی دریافت کردہ اس "دنیائے جدید" کے باسی تھے لیکن اس سفر میں وہ اسی طرح جذبہ شوق کے حامل تھے جس طرح کہ مسلمان ملکوں سے آنے والے مسلمان اپنے "جذبہ شوق" کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں......جب یہ قافلہ حدود حرم میں داخل ہوتا ہے تو اس موقع کی منظر کشی کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا ہے:

"آپ بیت اللہ کے قریب ہیں' اب حدود حرم میں داخل ہونے والے ہیں' باب السلام سامنے ہے' ادب واحترام کے ساتھ قدم بڑھایئے۔ ہر فرد کا قدم لڑکھڑا رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی مربع عمارت ہے اَوَّلُ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ' لیکن اس کے رعب و جلال کا عالم دیکھئے' سلاطین و گدا اس کے سامنے سر نیاز خم کیے ہوئے ہیں۔ انسانوں کا ایک سیلاب ہے۔ اس سیلاب میں آپ ہمارے ساتھ طواف میں مصروف ہیں۔ غیر منظم مجمع اس طرح دھکے دے رہا ہے کہ سخت تکدر و تنفر پیدا ہو سکتا ہے' لیکن تنفر کی بات نہیں۔ یہ مجمع اس وقت فرط شوق میں بے خود ہو رہا ہے' اپنے اور اپنے خالق کے درمیان کسی رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں.

دوسروں کے تاثرات کیا ہیں' میں نہیں کہہ سکتا' ہمارے تاثرات تو عجیب ہیں۔ ممکن ہے اوروں کو طواف کعبہ کے وقت الوہیت کا جلال نظر آرہا ہو۔ ہمیں تو اس وقت عبدیت کا جمال نظر آرہا ہے۔ اشک ہائے بندگی کا ایک سیلاب ہے۔ جس میں لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ رہے ہیں۔ دیکھئے کپکپاتے ہوئے سائل ہونٹ عرش الٰہی کو ہلا رہے ہیں۔ آسمان جھک جھک کر زمین کو چوم رہا ہے۔ کہیں شوخی و اقدام ہے' کہیں خود سپردگی و خود فراموشی' کہیں مجاولہ محبت اور کہیں اعتراف بندگی۔ کہیں یہ شوخ مطالبہ

ہے:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

اور کہیں قدر ظرف کی تنگی کا اعتراف ہے:

میرا ظرف دیکھ کر جلیاں گراتا
مجھے تاب ہو جہاں تک وہیں تک نقاب اٹھاتا

خانہ خدا کے اردگرد اقطار عالم کے مدگان الٰہی کالے گورے جوان اور بوڑھے عورت اور مرد مختلف زبانوں میں اور نت نئے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے مصروف دعا ہیں ان سب کی زبان پر ایک ہی التجا ہے۔ "الٰہی ہمیں دین و دنیا کی بھلائی سے بہرہ ور کر" (ص ۱۶۰۔۱۶۱)

سفر نامے کی سب سے اہم بات جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ اس سفر نامہ میں فلسفے کی بھی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں۔ اور مشرقی جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفے کی کمزوریاں بھی سفر نامہ نگار کے سامنے ہیں...... اور وہ "فلسفۂ حج" کے ذریعے ان باطل اور فرسودہ تصورات پر "ضرب کلیمی" لگاتے جاتے ہیں:

"یہ منظر دیکھتے دیکھتے ہم خیالات کی دنیا میں کھو گئے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ حدود حرم میں آج تک کسی کو کھوتے نہیں دیکھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم کھو گئے۔ اس وقت ہم علم الٰہیات (Metaphysics) کی بھول بھلیوں میں گم ہیں جہاں تلاش کی پرپیچ راہوں میں مفکرین و فلاسفہ صدیوں بھٹکتے رہے سر پٹختے رہے اور ہاتھ پیر مارتے رہے لیکن اکثر انہیں کوئی کنارہ نہ مل سکا۔ اس وقت ہم سقراط سے ماقبل دور کے فلاسفہ کے ساتھ ہیں یہ فیثا غورث (Pythagoras) ہیں۔ یہ ہیرا کلی ٹس (Heraclitus) ہیں۔ سامنے پرمانڈس (Parmonides) ہیں۔ ساتھ ہی ایمپیڈوکلیس (Empedocles) اور پروٹاگوراس (Protago)

ras) کھڑے ہیں۔ ان سب کو خدا کی تلاش ہے۔ یہ سب اپنی اپنی دانست کے مطابق خدا کی ذات وصفات کو متعین کر رہے ہیں' چلیے آگے بڑھیں' سامنے سقراط ہیں' افلاطون ہیں' ارسطو ہیں' یہ سب خدا کی جستجو میں سرگرداں ہیں لیکن ان کے فکر کی بنیادیں بھی ظن و تخمین (Speculative Philosophy) پر قائم ہیں ۔اس لئے بے چارے کوشش کے باوجود اسرار کائنات کی نقاب کشائی نہ کر سکے۔ آگے بڑھیے! -Hellenis tic فلسفہ کا عالم جمالیات اور اس کی رعنائیاں دیکھیے ایپی کورین (Epicureans) کی دنیا سے ہوتے ہوئے ہم (Stocirm) کی دنیا میں پہنچ گئے جہاں خدا کی اہمیت پر زیادہ زور ہے۔ پلوٹائینس (Plotinas) سے ہو کر ہم عیسائیت کے فلسفہ تثلیث تک پہنچ گئے۔ سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine) تک پہنچ کر ہم نے چھ صدیوں کا سفر طے کر لیا۔ اب ہم Papacy کے تاریک دور (Dark Ages) سے گزر رہے ہیں' اس اندھیرے میں گیارہ صدیاں گزر گئیں' ۱۲ ویں صدی سے چھلانگ لگا کر ہم تیرھویں صدی میں آ گئے۔ Saint thomas Augainas وغیرہ سے ملتے ہوئے آگے بڑھے' نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی رنگینیاں دیکھیے۔ سامنے ہیوم (Hume) کھڑے ہیں' اب تحریک اصلاحات (Reformations) کی صدائیں گونجنے لگیں' سائنس کا دور شروع ہو گیا۔ بیکن (Bacon) اور ہوبس (Hobbes) اپنا منشور لیے کھڑے ہیں' جدید فلسفہ کا جد امجد ڈیکارٹ (Descartes) خود اپنی ذات کے لئے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اسپنوزا (Spinoza) کے بعد لیبنز (Leibniz) سے ملاقات ہو گئی۔ آگے بڑھے تو لبرلزم (Libral ism) کا دور شروع ہو گیا۔ لوک (Locke) اپنا نظریہ علم و سیاست پیش کرنے لگے۔ اور آگے بڑھے۔ برکلے (Berkely) اور ہیوم (Hume) نے خوش آمدید کہا۔ کچھ آگے رومانی تحریک (Romantic Movem ment) کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس کے بعد روسو (Rousseau) کا سامنا ہو گیا۔ پھر کانت (Kant) نے اپنا فلسفہ پیش کر دیا۔ اس طرح ۱۸ ویں صدی تک کا سفر طے ہو گیا۔ انیسویں صدی میں ہیگل کا سامنا ہوا۔ بائیرن (Byron) اور شوپنہار سے مل کر آگے نہ بڑھے تھے کہ نیٹشے (Nietzche) اپنا نسخہ انسان کامل (Superman) لے کر سامنے آ گئے۔ اس طویل فکری جمنازیم سے نکلتے ہی اشتراکیت کا سامنا کرنا پڑا۔ کارل مارکس اپنا فلسفہ پیش کرنے لگے۔ راستہ میں برگساں (Bergson) مل گئے۔ بیسویں صدی میں وجودی فلسفہ نے ہمارا راستہ گھیر لیا۔ اکتا کر ہم پھر امریکہ پہنچ گئے' جہاں خدائے مرحوم (God is Dead) کا فلسفہ مقبول ہوتا جا رہا ہے اور خدا سے دامن چھڑا کر انسان چین کا سانس لینا چاہتا ہے۔ تین ہزار سالوں کا

سفر صحرائے فکر کی دشت نوردی پھر بھی جس کی تلاش تھی، وہ نہ ملا۔

تھک تھک کے ہر مقام پر دوچار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اس کے بعد چونکے اور آنکھ کھلی تو دیکھا خانہ کعبہ سامنے ہے۔" ہمیں بھی دیجیو مولا۔ ہمیں نہ بھولیو مالک " ہمیں حسنة فی الدنیا اور حسنة فی الآخرہ دونوں سے نوازیو" کا ورد حسب معمول، وہی لینے دینے کی باتیں ہو رہی تھیں، وہی شوخی و اقدام ہے، وہی خود فراموشی و خود سپردگی، وہی رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْآخِرَۃِ حَسَنَۃً کی التجا جاری ہے۔

وہ دیکھیے خدا مردہ نہیں، وہ تو زندہ ہے، ورنہ لین دین کی باتیں کس سے ہو رہی ہیں؟ ہم نے ایک آواز لگائی، اے ماضی و حال کے فلسفۂ فرنگ! کاش تمہاری ارواح تشنہ کو یہ منظر دیکھنا نصیب ہوتا اور اسی خانہ خدا میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی۔ پھر تمہارے علم الٰہیات کی جیادیں مختلف ہوتیں۔ ظن و تخمین کی جائے ایمان و ایقان کی دولت تمہیں نصیب ہوتی۔ خدا فلسفہ کی خشک کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس کے وجود و صفات کی تعیین منطقی تحلیلات کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ وہ تو خانہ کعبہ میں ملتا ہے، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو کر بھی اپنے گھر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ چون و چرا کرنے والوں کو نہیں ملتا۔ وہ تو سادہ لوح قلوب میں جو "یومنون بالغیب" کے قائل ہیں، جاگزیں ہوتا ہے۔ اے فلاسفۂ غرب و شرق! خدا مابعد الطبیعاتی علوم (Metaphysics) یا فلسفہ جزو کل (Ontdogy) کی حدود سے باہر ہے۔ تمہارا محدود علم غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ تمہیں ایمان بالغیب کے بغیر نہیں مل سکتا"

(ص ۱۶۱۔ ۱۶۲).

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ اقتباس میں آمد سے آورد زیادہ ہے۔ اور اس پورے حصے میں کسی قدر تکلف اور تصنع بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے کہ "حاضری" کے اس لمحے جب مدہ رب البیت کے روبرو ہوتا ہے اس وقت "من و تو" کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ اس وقت "زائر" کو مغربی فلسفے کی پیچیدگیوں کا خیال آتا ہے اور نہ مشرقی فلسفے کی بوالہوسیوں کا اس لئے یہ پورا حصہ میز پر بیٹھے ہوئے مکمل ہوا۔ لیکن اس میں سفر نامہ نگار نے جس خوبصورت انداز میں اور جس سلیقے سے مغربی فلسفے کے "تار و پود" ادھیڑے ہیں اور فلسفہ حج و زیارت کے سامنے.... مغربی نظریات و افکار کو

محض بچگانہ سوچ قرار دیا ہے اس سے سفرنامہ نگار کے ذہن و فکر کی بالیدگی اور قلم کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔

مکہ مکرمہ کی سیاحت

سید صاحب اپنے امریکی ہمراہیوں کے ہمراہ ...... "عمرہ" سے فراغت کے بعد .... مکہ مکرمہ میں موجود مقامات مقدسہ کی سیاحت کرتے ہیں۔ جس کے دوران میں انہوں نے مولد النبی، غار حراء اور طائف کا سفر کیا..... اور ان مقامات پر جا کر ان واقعات کو یاد کیا جو ان مقامات پر پیش آئے۔ جس کے دوران میں ان کے اور ان کے رفقائے سفر کے جذبات قابل دید ہیں۔ سید صاحب غار حراء کی سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب ہم دوسرے تاریخی مقام کی طرف جا رہے ہیں۔ ٹیکسی والے سیدھے منہ بات نہیں کرتے، ہم نے ایک گدھا گاڑی کر لی۔ امریکی قافلہ اب آپ کے سامنے گدھا گاڑی پر سوار ہے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی گدھا گاڑی پر بیٹھا ہو...... کہاں ہوائی جہاز اور کاروں کا سفر، کہاں دھوپ میں بے چھت کی گاڑی کی سواری۔ غرض اب آپ ان راہوں سے گزر رہے ہیں، جہاں تیرہ سو سال قبل کفار قریش اور اکابرین مکہ کی رہائش گاہ تھی۔ عصر کا وقت ہو چکا ہے۔ ہم پہاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں اور پر پیچ عمودی و غیر عمودی چڑھائی کے لئے کمربستہ ہیں۔ ہمارے سانس اکھڑ رہے ہیں، لیکن نو مسلم امریکی نوجوانوں کی ہمت قابل دید ہے۔ ان کا ولولہ اور جوش ایمانی خاندانی مسلمانوں سے بے حد مختلف ہے، یہ تاریخی حقیقت بھی ہے، ابتداء میں بھی نو مسلموں کے ہاتھوں یہ دعوت آگے بڑھی تھی، جب تک عربوں میں یہ حوصلہ رہا۔ اللہ نے انہیں آگے بڑھایا۔ ان کا حوصلہ ختم ہوا تو دوسری قوموں کو کھڑا کر دیا۔ پہلے ایرانیوں، سلاجقہ، عثمانی ترکوں اور افغانوں کو اللہ نے کھڑا کیا۔ جب ان کے ایمان پر غنودگی طاری ہو گئی تو اللہ کے لئے مشکل نہیں کہ وہ ایک نئی قوم کو کھڑا کر دے۔ قرینہ غالب ہے کہ نو مسلم امریکی آبادی کے ہاتھوں آج نہیں تو کل یہ دعوت پھیلے گی۔ اس وقت جو لوگ اس دعوت سے متاثر ہو چکے ہیں وہ راسخ العقیدہ ہیں اور تحریک کے شیدائی بھی۔

آپ ہمارے ساتھ اس پہاڑ کی چوٹی پر ہیں جہاں سے انسانیت کو درس توحید ملا تھا۔ دو رکعت

نفل نماز پڑھ لیں۔ پھر ہم اس غار میں داخل ہوں گے جس کا نام غار حرا ہے۔ یہ وہی غار ہے جہاں حضرت محمد ﷺ کفرزار مکہ کے مشرکانہ ماحول سے پناہ لیا کرتے تھے۔ توحید کے مسئلے پر سوچتے تھے۔ آخر اللہ نے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے تحریک توحید کی ابتدا کر دی۔ یہیں سے محمد ﷺ توحید کی دعوت لے کر مکہ کی وادی میں اترے تھے (ص ۱۶۴-۱۶۴)

فلسفۂ حج......... جدید فلسفے کے تناظر میں

اس سفر نامہ کے مؤلف ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کی جدید ترین دانش گاہوں سے استفادہ کیا ہے، مگر ان کے جذبات مشرقی ہیں۔ ان کے سامنے مغرب کی تاریخ اور مغربی فلسفہ ہے۔ اس لئے وہ حج بیت اللہ کے دوران میں جگہ جگہ مشرق و مغرب اور اسلام اور کفر کے مابین تقابل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے سفر نامہ میں صحیح معنوں میں جدید تحدیات (Challenges) کا ذکر اور ان کا مفصل اور عالمانہ رد کیا گیا ہے۔ چنانچہ جس تاریخ کو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ احرام یعنی حج کا یونیفارم پہنا اور وہ "تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے" کی عملی تعبیر بنے تو اس وقت ان کی نظروں کے سامنے مغربی فلسفے اور مغربی ادیان کی تاریخ آجاتی ہے۔ اور وہ فلسفہ حج کی روشنی میں اس پر ضرب کلیمی لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ پوری بستی کفن آسا سفید لباس میں ملبوس ہے۔ امریکی قافلہ بالخصوص نو مسلمین یک رنگی اور اخوت و مساوات کا یہ منظر دیکھ کر بے حد متاثر ہیں، بلکہ اپنے مغربی اجداد کی روایات پر خندہ زن بھی ہیں، انہیں یقین آگیا ہے کہ یہ یک رنگی، مساوات محض توحید کی برکت ہے۔ وحدت فکر اور وحدت نظر کا کرشمہ ہے۔ وہ اس فکر میں غلطاں ہیں کہ ایسی وحدت ان کے اجداد کو کیوں نصیب نہیں ہو سکی؟ یہ سوچتے سوچتے امریکی قافلہ ایک بار پھر کھو گیا۔ اپنے اجداد کے فکری سرمایہ کی تحلیل شروع کر دی اور اپنے اجداد کے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کرنے لگا:

(۱) اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کا عرفان کیسے ممکن ہے؟

(۲) کیا دنیا Mind اور Matter دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہے، اگر ایسا ہے تو دونوں کی تعریف

کس طرح ممکن ہے ؟ آیا وہ ایک دوسرے کے تابع ہیں۔ یا دونوں کا وجود الگ الگ ہے ؟

(۳) نظام عالم میں کوئی وحدت ہے یا نہیں ؟ تخلیق عالم کا کوئی مقصد بھی ہے ؟

(۴) کائنات کسی خاص منزل کی طرف بڑھ رہی ہے یا جامد ہے ؟

ان سوالات پر سوچنے میں ۴ صدی قبل مسیح سے سر کھپایا جا رہا ہے۔ پھر بھی کوئی حل نہ مل سکا۔ اس کا حل جدید سائنس کے پاس بھی نہیں۔ آج سائنس اور مذہب کے درمیان ایک سرحدی نشان ضرور کھینچ دیا گیا ہے اور ان دونوں کے بیچ میں جو زمین (No Man Land) ہے وہ ان سوالات کے حل کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔ جہاں فلسفی آج بھی سر پیٹ رہے ہیں اور علما مابعد الطبیعات ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

ارسطو کے دور تک فلسفہ پر توہمات (Speculation) کا سایہ رہا' انسانوں کی اطاعت کا صحیح مستحق کون ہے۔ اس دور کا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ طے پایا کہ ریاست (State) انسانوں کی اطاعت کی حق دار ہے۔ چنانچہ شہر (City) اور ریاست (State) کی پوجا شروع ہوگئی۔ اس تحریک کے خلاف بغاوت شروع ہوئی۔ (Stoic) فلاسفہ نے اعلان کیا کہ روح کا رشتہ خدا (خالق روح) سے ہونا چاہیے نہ کہ ریاست سے (A man's duty to god is move imperative than his duty to the state.. پانچویں صدی عیسوی سے ۱۱ ویں صدی عیسوی تک مغرب میں تاریکی کا دور رہا۔ اسٹیٹ اور چرچ کی جنگ چلتی رہی۔ پوپ نے اٹلی فرانس' اسپین' برطانیہ' آئرلینڈ' جرمنی' اسکنڈی نیویا اور پولینڈ میں اپنی حکومت و سربراہی کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے بعد پوپ کی طاقت کچھ کم ہونے لگی۔ جب برطانیہ کے بادشاہ نے اس کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ تاہم چرچ شکست نہ کھا سکا۔ شاہ اپنی فوجی قوت کے باوجود اسے دبا نہ سکا۔ فوج اگر شاہ کے ہاتھ میں تھی تو نظام تعلیم چرچ کے ہاتھوں میں تھا جس کی سوتیں عوامی فکر کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تھیں' چرچ کے ساتھ وفاداری اس نظام تعلیم کی بنا پر قائم رہی' ہنوز یہ فیصلہ چرچ کے ہاتھوں میں تھا کہ موت کے بعد بادشاہ جنت کا مستحق ہوگا یا جہنم کا۔

عہد وسطیٰ (Middle Ages) میں فریڈرک ثانی نے چرچ اور پوپ کے خلاف نئے مذہب اور کلچر کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن تھومس اکنس (Thamas Aguinas) چرچ کا علمبردار رہا۔ دونوں انتہا پسندی کی دو حدود پر تھے۔ توازن اور اعتدال قائم کرنے کی آرزو لیکر کوئی پچاس سال بعد دانتے (Dante) کا ظہور ہوا' لیکن ادھر دانتے کی آنکھ بند ہوئی ادھر توازن کی کشتی غرق آب ہوگئی۔ تحریک اصلاحات نے

عیسائی دنیا کی کمر توڑ دی۔ پوپ کے حسین خوابوں کی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب علوم قدیمہ وجدیدہ کے احیاء اور تجدید کا زور ہوا تو اسرار کائنات کی سراغرسانی کا جذبہ بڑھا۔ کوپرنیکس (Copernicus) نے اپنا علم نجوم پیش کیا۔ مسائل کی تفسیر میں اب منطقی استدلال تحلیل اور تنظیم پر زور دیا گیا۔

پندرھویں صدی میں پوپ اور بادشاہ دونوں اپنا اثر کھو بیٹھے۔ پوپ حکمرانوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے۔ اٹلی سیاسی بحران کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانے میں میکیاولی (Machiawelli) کا ظہور ہوا جس نے اپنی معروف کتاب "پرنس" میں حصول اقتدار کا نیا نسخہ پیش کیا۔ اس نے حکمرانوں کو تمام روایتی واخلاقی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا۔ اخلاقیات اب توہمات قرار پائیں۔ حصول اقتدار اور اس کا کسی طرح برقرار رکھنا سب سے بڑی اخلاقی قدر قرار پایا۔ اس فلسفہ نے روحانی واخلاقی اقدار کا تصور ہی مٹا دیا۔ رومتہ الکبریٰ کا زوال ہو گیا اور روم اب دوسری اقوام کا محکوم بن گیا۔ نہ شہنشاہ رہے نہ چرچ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

۱۶ ویں صدی سے مغربی افکار میں تجدید واصلاح کی تحریک چلی جو درحقیقت روم کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ عوام و حکمران دونوں مذہب سے باغی تھے۔ اور ہر تجدید اور تبدیلی کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ پورا شمالی یورپ مارٹن لوتھر کا گرویدہ ہو گیا۔ ساتھ ہی عیسائی مذہب کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ اول الذکر کے عقیدے کے مطابق وحی کا دروازہ بائبل کے بعد بند نہیں ہوا ہے' بلکہ ہر زمانہ میں چرچ کے ذریعہ آسمانی وحی آتی رہے گی' لہذا چرچ انسانوں کی اطاعت کا حقدار ہے۔ اس کے برخلاف پروٹسٹنٹ نے نیا عقیدہ اختیار کیا۔ جس کے مطابق آسمانی وحی سے چرچ کا کوئی تعلق نہیں۔ حق بائبل میں موجود ہے۔ ہر شخص چرچ کی مدد کے بغیر حقائق کی جستجو اور سراغرسانی کر سکتا ہے۔

جدید فلسفہ کا بانی ڈیکارٹ ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا اس کی اپنی شخصیت تمام توجہات کا مرکز بن گئی۔ اپنی شخصیت اور وجود کے یقین کے بعد ہی وہ دیگر ذوات کے وجود پر یقین کا قائل تھا اس طرح اس نے برکلے کانٹ اور (Fichte) کی راہ ہموار کر دی۔ جن کے خیال میں ہر شے کے ظہور کا مصدر اصلی Ego ہے۔

18 ویں صدی میں شخصیت پرستی (Hero Worship) کا زور بڑھا۔ کارلائل اور نیٹشے نے اپنے اپنے نظریات شخصیت پرستی اور انسان کامل کا نسخہ پیش کیا۔ بائرن نے اپنا نظریہ Cult of violentpas-sion پیش کیا۔ اس ذات پرستی کا نتیجہ تھا کہ 19 ویں صدی میں رومانی تحریک یا انسانیت کا زور ہوا' اس سیلاب میں ادب 'آرٹ' کلچر' سیاست سب بہہ گئے۔ اب انسان آرٹسٹ کے تخیل کا حسین خواب بن گیا' انفعالیت کے اس تعفن کے خلاف پھر تحریک چلی اور لبرلزم کا زور ہوا۔ لاک (Locke) اس کا قائدبن گیا۔ وہ انفرادیت پرستی' شخصیت پرستی 'روایات پرستی سب کے خلاف تھا۔ حکومت کی مطلق العنانی کے بھی خلاف تھا۔ اس تحریک نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کرنا چاہا اور ردعمل کے طور پر ریاست پرستی کی تحریک پھر زندہ ہو گئی۔ ہیگل روسو اور ہوبس (Hobbes) اسی نظریہ ریاست پرستی کے مختلف پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ ان کے خیال میں اطاعت وفرمانبرداری کی حقیقی مستحق اسٹیٹ ہے۔

اشتراکیت براہ راست اس فلسفہ کا چہ نہیں' لیکن اس کے قریب ضرور ہے کیونکہ کیمونٹی com-manity اور ریاست نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔

غرض ۲۴ سو سال کا سفر طے ہو گیا' لیکن انسانیت ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی۔ قدیم یونانیوں کے ہاں شہر (City) اور ریاست (State) واجب الاطاعت تھے۔ آج بیسویں صدی میں ہزاروں نشیب و فراز سے گزر کر دنیا وہیں پہنچ گئی ہے۔ وہی ریاست پرستی و قوم پرستی جزو ایمان بن گئی ہے۔" (ص ۱۶۵۔۱۶۸)

سید صاحب نے اسی طرح کے خیالات میں اپنے حج کے سفر کی روداد کو قلمبند کیا ہے۔ وہ ہر قدم پر فکر مغرب کو ٹھوکا دیتے ہیں۔ فلسفہ مغرب کی بیچارگی پر طنز کرتے ہیں اور لبیك اللھم لبیك کی صداؤں کے زیر سایہ اپنے رب کے حضور میں شرف باریابی پاتے چلے جاتے ہیں۔

سفر مدینہ المنورہ

حج سے فراغت کے بعد امریکی مسلمانوں کا یہ قافلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت اور وہاں درود و سلام کے نذرانے پیش کرنے کے لئے مدینہ منورہ

جاتا ہے......اس موقع پر "سفر نامہ نگار" کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف تو اس بابرکت مقام کی رفعتیں ہیں۔ اور دوسری طرف آنحضور ﷺ کے خلاف دنیائے کفر کا وہ پروپیگنڈہ جس میں ملت کفر ہمیشہ مبتلا رہی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ان کی تحریر میں بیک وقت ان دونوں باتوں کا عکس موجود ہے......وہ لکھتے ہیں:

"یہ مدینۃ النبی ﷺ ہے.........یہاں مکہ کا شکوہ نہیں' آقائیت کا جلال نہیں' مدنی کی تواضع نہیں۔ لینے دینے کی باتیں نہیں ...... لین دین کی باتیں تو حدود حرم میں ہو چکیں ......اب تو صرف دینے اور اپنے آپ کو فدا کرنے کا سوال ہے۔ عاشقان رسول ﷺ اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہیں۔ یہ وہی انصار کا شہر ہے جہاں انہوں نے اپنا سب کچھ رسول ﷺ کے لئے لٹایا تھا۔

آپ اس وقت مسجد نبوی کے پاس ہیں۔ سامنے باب السلام ہے۔ لوگ مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہو رہے ہیں۔ عاشقان رسول کی زبانوں پر اس وقت ایک ہی صدا ہے:

السلام علیك یا احمد ﷺ　　السلام علیك یا محمد ﷺ

السلام علیك یا رسول الله　　السلام علیك یا نبی الله

السلام علیك یا حبیب الله

مختلف لہجوں میں یہی ایک صدا گونج رہی ہے۔ اس کیف و محبت کی فضا میں ہم سب کھو گئے ایک بار پھر ہمارا ذہن ان مستشرقین اور سوانح نگاران غرب کی طرف متوجہ ہوا۔ جنہوں نے پیغمبر اسلام کی زندگی کو داغدار ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ العیاذ باللہ مجنوں و شاعر بتایا۔ مرگی کا مریض ثابت کیا' خود غرض سیاستدان اور نفس پرست انسان ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔ انہیں جادوگر بتایا' غرض۔

کیا کیا تہمتیں نہ تراشا کیے عدو

اے مردہ اور زندہ دانش وران فرنگ! اگر محمد ﷺ جادوگر ہوتے تو یہ جادو کتنے دن سر چڑھا رہتا؟ سو سال؟ دو سو سال؟ دنیا کی تاریخ میں کسی سیاسی' اخلاقی اور مذہبی جادو کا زور کچھ عرصہ سے زیادہ رہا ہے؟ اگر کبھی تمہیں اس سرزمین سے گزرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہوتی! اگر تم نے کبھی درود و سلام کی یہ صدا سنی ہوتی تو شائد تمہاری اخلاقی حس تمہیں متنبہ کرتی اور تم اس بہتان تراشی سے باز رہتے اور

توفیق ہو تو اب بھی یہاں آکر دیکھو کہ آج ۱۴ سو سالوں کے بعد بھی اقطار عالم سے عاشقان رسول آ آکر درود و سلام بھیج رہے ہیں اور نبی آخر الزماں کی حمد و ثناء میں رطب اللسان ہیں ؎

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشہ دامان اوست
زانکہ ملت راحیات از عشق اوست
برگ و ساز کائنات از عشق اوست

اے رسالت محمدی کا انکار کرنے والو تمہیں کیا معلوم کہ:

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغ یک محمد بر فروخت
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
لانبی بعدی احسان خدا است — پردہ ناموس دین مصطفیٰ است

اے عقل کے پجاریو اور اے ترقی کے دعویدارو صرف اتنا بتادو ـــــ ہے کوئی دوسرا پیغمبر جسے یہ سلام سرمدی اور حیات ابدی نصیب ہوئی؟ اس قصے کو چھوڑیئے اور آیئے مسجد نبوی ﷺ کے اندر داخل ہوں، درود و سلام پڑھیئے۔ آپ روضہ رسول ﷺ کے سامنے روضۂ اطہر ہے، ہماری زبانوں پر ایک ہی نغمہ ہے:

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاں سے حدی خواں کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد ﷺ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(ص ۱۷۰تا۱۷۲)

آخر یہ قافلہ ......اپنا سفر مقدس مکمل کر کے واپس لوٹ جاتا ہے۔ اس موقع پر سید صاحب لکھتے ہیں:

ہمارا سفر اب مکمل ہو چکا...... امریکی قافلہ آخری درود و سلام کے بعد شہر مدینہ سے جدہ واپس ہو رہا ہے۔ یہ بیروت ہے______ بیروت سے آپ ہمارے ساتھ پھر لندن واپس آئے اور لندن سے نیویارک واپس چل رہے ہیں۔ یہ نیویارک ہے۔ اب آپ روحانی دنیا کے مرکز مکہ سے مادی دنیا کے مرکز نیویارک میں واپس آگئے جہاں مرحوم جمیعت اقوام کی وارث اقوام متحدہ نے جنم لیا ہے اور جس کی نسل جنیوا سے ہجرت کر کے نیویارک پہنچ گئی۔ اس کے لئے مکہ سے ہم وہی پرانا پیغام لائے ہیں۔

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمیعت اقوام کہ جمیعت آدم

(ص ۱۷۲)

حج وعمرہ کے جدید مسائل اور ان کا حل

سید صاحب ۱۹۸۹ء میں دوبارہ حج بیت اللہ اور زیارت حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ اس موقع پر انہوں نے جو سفر نامہ لکھا' یعنی "گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر" اس میں انہوں نے جدید حج وعمرہ کے مسائل اور ان کا حل پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

"ایک شب نماز کے بعد امام کعبہ شریف نے پرزور تقریر کی۔ امام صاحب جامعہ ام القری میں غالباً فقہ اسلامی کے اسکالر کی حیثیت سے مامور ہیں۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کے وقفہ میں خاکسار نے بھی بعض اہم سوالات کئے۔ ان میں سب سے اہم سوال ایام حج میں نقل و حرکت سے متعلق تھا۔ متوازی سمتوں سے ہزاروں افراد کا خروج و دخول یا آمد و رفت تکلیف دہ تصادم کا باعث ہے۔ وقت کا زیاں ہے' مرد و زن کا باہمی ٹکراؤ نیز جارحانہ اقدام غیر مستحسن ہے' ضرورت ہے کہ اس کا حل تلاش کیا جائے۔ خانہ کعبہ کے بعض ابواب کو داخلہ کے لئے اور بعض کو خروج کے لئے مختص کر دیا جائے۔ ایام حج میں یہ انتظام متوازی اور متقابل راستوں سے متصادم آمد و رفت کو روک سکتا ہے۔ حجر اسود کے استلام کا منظر بھی تکلیف دہ ہے اور اسلامی روح کے منافی بھی' عورت و مرد ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما نظر آتے ہیں' ضعفاء کا تو سوال بھی کیا' توانا بھی حجر اسود تک نہیں پہنچ سکتا۔ جواباً امام حرم کعبہ نے فرمایا کہ یہ سوالات عرصہ سے

حکومت کے زیر غور ہیں اور عنقریب اس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ تقریر کے اختتام پر امام صاحب نے خاکسار کے ساتھ پرجوش معانقہ کیا اور نیک تمناؤں کا اظہار بھی کیا۔

بعض حکام اور افسران حج سے خاکسار نے مزید اصلاحات کی تجاویز بھی پیش کیں' ان میں سب سے اہم حجاج کی تعلیمی تربیت کا مسئلہ تھا۔ اقطار عالم سے آنے والے حجاج عام طور پر مناسک حج سے مطلق ناواقف ہوتے ہیں جہالت کے علاوہ تعلیم یافتہ اصحاب بھی روح حج اور مناسک سے واقف نہیں ہوتے۔ انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حکومت سعودیہ بلاد اسلامیہ اور مسلم اقلیات کے رہبران سے یہ درخواست کرے کہ وہ ہر حاجی کی تربیت کا نظم کریں۔ دیہاتوں اور شہروں سے آنے والے حجاج اپنے اپنے جامع مسجد کے امام سے ایک شہادت ساتھ لائیں کہ وہ حج کا تربیتی نصاب (Orientation Course) مکمل کر چکے ہیں۔ یہ نصاب یا کورس ہر امام ایک ہفتہ کے اندر یا اس سے بھی کم مدت میں جماعتی طور پر مکمل کرا سکتا ہے اور ناخواندہ اور خواندہ دونوں معلومات حج سے مزین ہو کر بیت اللہ تشریف لا سکتے ہیں' حجاج کے اندر قربانی اور صبر کا جذبہ مطلق نہیں ہوتا' بلکہ خود غرضی کا جذبہ ہوتا ہے۔ ایک فرد جو حجر اسود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے' وہ ہٹنے کے لئے تیار نہیں بلکہ اس سے اس طرح چپک جاتا ہے جیسے پتھر کو نوچ کر ہضم کر جائے گا۔ اسی طرح مسجد نبوی میں بعض مقامات پر نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتا' تاکہ دوسرے بھی ثواب وسعادت حاصل کر سکیں۔ سارا ثواب وہ اپنے لیے ہی مختص تصور کرتا ہے۔ جو خود غرضی کے مترادف ہے۔ بعض حجاج غلاف کعبہ کو قینچیوں سے کاٹ کر جیب میں رکھتے ہیں۔ عورتوں کے اندر جارحانہ روش بڑھتی نظر آتی ہے۔ وہ مردوں کو دھکے دیکر آگے نکلنے کی کوشش کرتی ہیں اور ہجوم میں گھسنے کا عام رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ تمام اعمال حج کے منافی ہیں۔ یہ خامیاں تربیتی نصاب کے ذریعہ ہی دور ہو سکتی ہیں۔ یہ قابل عمل تجویز ہے ناقابل عمل نہیں۔ یورپ وامریکہ میں اس سے بڑی تعداد اور اس سے بڑے مجمع کا نظم اس طرح ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی ناخوشگوار پریشانیاں نہیں ہوتیں۔ اسلام بدھ مت کی طرح نجات کیلئے ہلاکت نفس (Self Onnihi-lotion) کی دعوت نہیں دیتا یہ تو روحانی بالیدگی کی دعوت ہلاکت نفس کے بغیر دیتا ہے۔

حالیہ حج میں جمرات کا منظر بھی اسی طرح تکلیف دہ نظر آیا۔ انسانوں کا سیلاب ایک دوسرے کے سروں سے گذر رہا تھا۔ اس میں ضعفاء کی موت کا واقع ہونا غیر متوقع نہ تھا' بعض حاجی جمرات کے

فلسفہ سے بھی ناواقف نظر آئے۔ واشنگٹن امریکہ کے ایک حاجی جو خاکسار کی معیت میں تھے جمرات کے پاس پہنچتے ہی شیاطین کو سلام کرنا شروع کیا اور ہر سلام کے ساتھ ایک کنکری بھی مارتے رہے۔ مثلاً السلام علیکم ایک جمرہ۔ السلام علیکم دوسرا جمرہ۔ موصوف نے جب خاکسار کو دیکھا کہ سلام کیے بغیر کنکریاں مار رہے ہیں۔ تو انہوں نے بھی سلام کی گردان بند کر کے جمرات کی گردان شروع کر دی۔ یہ تمام واقعات نادانی اور عدم واقفیت کی دلیل ہیں۔ اس کا حل تربیتی نصاب کے بغیر ممکن نہیں خدا کرے اس میں کامیابی ہو"۔ (ص ۲۹۶۔۲۹۷)

سید صاحب کی نظر میں بڑی گہرائی ہے۔ وہ اپنے سفر نامے میں جس طرح حجاج کرام کو پیش آنے والے مسائل کے حل پر بحث کرتے ہیں' اسی طرح وہ پٹرول یا سیال سونے کی دریافت کے بعد سعودی عرب کے مسلم معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی بڑی گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "فج عمیق" (اکناف عالم) سے آئے ہوئے حجاج کرام کا غیر ملکی مصنوعات کی خریداری میں غیر معمولی انہماک امت مسلمہ کے لیے لمحہ فکریہ ہے وہ لکھتے ہیں:

"سیال سونے (پٹرول) کی فراوانی کے بعد حجاز مقدس کا چہرہ بدل گیا ہے۔ شہروں کے ڈھانچے متغیر ہو چکے ہیں۔ بعض شہر تو یورپ کے شہروں کو شرمانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جدہ بوقت شب (Jedda at Nighte) وغیرہ کی اصطلاح' جو مغربی شہروں میں خاص معنوں کے لئے مختص ہیں مستعمل ہوتی نظر آتی ہے۔ توسیعات ایک محمود عمل ہے' لیکن اگر ان فلک بوس تعمیرات کے نیچے روحانی دنیا دب کر رہ جائے تو اس سے بہتر تو مٹی کا حرم ہے:

میں ناخوش و بے زار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بناؤ

حجاج کے اندر خرید و فروخت' بازار بازی' تجارت و سیاحت کا بڑھتا ہوا رجحان بذات خود خطرناک مستقبل کی نشان دہی ہے' ضیوف الرحمٰن تو گدائے بے نوا' سائل پر خطا' عاشق صادق' اور دیوانہ وار مجنوں کی طرح کوئے جاناں میں کفنی لباس میں ملبوس آتے ہیں وہ ایک حقیر و محتاج کی حیثیت سے مالک کون و مکان' خالق ارض و سما اور رب کائنات کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں انھیں بازار بازی سے کیا تعلق؟ وہ تو منزل جاناں کی طرف جنون وار محو خرام ہوتے ہیں:

در رہ منزل جاناں کہ خطر ہاست بسیار
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

بد قسمتی سے مقامات حج جاپانی، چینی اور امریکی مصنوعات کی منڈیاں بنتے جا رہے ہیں۔ عالم اسلام کی ساری دولت حج کے راستے سے ان مشرک ممالک کو جا رہی ہے۔ حج میں خرید و فروخت ممنوع نہیں ہے، لیکن اس شرعی جواز کے معنی یہ نہیں کہ روح حج کو ہی فنا یا ضائع کر دیا جائے اور ان درآمدی اور برآمدی سامان کی خرید و فروخت کے ذریعہ سفر حج کے اخراجات برآمد کیے جائیں۔ حج کا مقصد تو رب کائنات کے دربار پر جلال میں دامن سوال پھیلانا، اور دامن مراد کو بھرنے کی تمنا ہے۔ شہنشاہ ذوالجلال کے دربار میں حاضری ہے۔ میدان عرفات میں جو میدان حشر کا نمونہ ہوتا ہے اور جہاں کفن پوش افراد (جیسے قبروں سے نکل کر آئے ہوں) التجا، مغفرت اور سنت ابراہیمی کے احیا کا منظر ہوتا ہے۔ وہاں سیاحت و تجارت کی نفسیات رکھنا کو زائل کرنے کے مترادف ہے۔ قربانی کی چھری دنبے کی گردن پر ایک تمثیل ہے اس کا اصل مقصد خواہشات نفسانی، جاہلی عصبیات، نسلی، لونی، اور جغرافیائی علاقات کی گردن پر چھری چلا کر ارواح کو تمام آلائشوں سے پاک کرنا ہے مکہ ہو یا مدینہ یہاں سیاحت و تجارت کا تصور ہی غیر اسلامی ہے:

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

والی بات ہے، زائرین مدینہ کے لیے یہ ہدایت ایک ابدی پیغام ہے:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

(ص ۲۹۷-۲۹۷)

تبصرہ

سید حبیب الحق ندوی مرحوم کا یہ سفر نامہ گو کل ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن یہ اپنے اندر اتنی وسعت اور جامعیت رکھتا ہے کہ اسے کسی بھی طویل سے طویل سفر نامے کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے نہ تو ملاقاتوں کی تفصیل دی ہے، قیام و طعام کے مسائل پر بحث کی ہے اور نہ ہی دوسری مشکلات، راستے کے مصائب و آلام پر توجہ مبذول کی ہے۔ ان کی مثال تو اس غازی کی سی ہے جو نیت کر کے کھڑا ہو جائے اور اپنے گرد و پیش سے یکسر آنکھیں بند کر لے۔ چنانچہ ان کی تمام تر توجہ اپنے "مقصد اصلی" کی طرف مبذول رہی ہے۔ انھیں قدم قدم پر احساس ہے کہ وہ سیر و سیاحت اور سیر گشت کے لئے نہیں آئے۔ بلکہ وہ ایک مقدس سفر پر آئے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے قلم کو ادھر ہی متوجہ رکھتے ہیں اور انہوں نے کسی ایک مقام پر بھی اپنے "قبلے" سے انحراف نہیں کیا۔

سفر نامے کی دوسری خصوصیت اس کے بیان کی شگفتگی اور آسان زبان کا استعمال ہے۔۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انگریزی اصطلاحوں کو بھی استعمال کیا ہے، مگر بقدر ضرورت

اس سفر نامے کی ایک اور خصوصیت اس میں موجود "جدید تحدیات" کا تذکرہ اور ان کا رد ہے....... خصوصاً مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر بھرپور نظر ڈالی گئی ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کو عظیم چیلنج کی صورت میں درپیش ہے۔ سفر نامہ نگار نے فلسفۂ حج سے اس پر ضرب کاری لگائی ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے کے چند سفر نامے

ڈاکٹر امین اللہ وثیر

(سابق ڈائریکٹر جنرل' وزارت امور مذہبیہ اسلام آباد)

سفر پر جانا انسان کا پرانا مشغلہ یا ضرورت رہی ہے۔ ہر زمانے میں انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتے رہے ہیں' قدیم زمانے ہی سے انسان اپنے مشاہدات و تاثرات کے بیان کا عادی رہا ہے۔ اور غالباً یہیں سے سفر نامہ نگاری کی ابتدا ہوئی ہو گی۔

سفر نامہ نگاری دنیا کی بہت سی زبانوں کے ادبیات کا ایک اہم شعبہ بن چکی ہے۔ ہماری زبان اردو بھی اس صنف ادب سے مالا مال ہے' بلکہ وہ اچھی خاصی ترقی یافتہ صورت اختیار کر چکی ہے اور نہ صرف یہ کہ وطن عزیز پاکستان کے مختلف علاقوں اور شہروں کے سفر نامے میسر آئے ہیں' بلکہ دنیا کے دور دراز علاقوں' ملکوں اور شہروں کی سیر و سیاحت کرنے والے ادبا اور مصنفین نے اپنے اپنے خوبصورت انداز میں معلومات افزا سفر نامے تخلیق کیے ہیں۔

حرمین شریفین کا سفر ایک اہم دینی فریضہ ہے' مگر اس میں دنیوی امور سے متعلق گوناں گوں دلچسپی کے بے شمار پہلو بھی پنہاں ہوتے ہیں۔ عربی ادب میں ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے سفر نامے مشہور عالم ادبی شہ پارے ہیں' اور صدیوں سے لوگ انہیں ذوق و شوق سے پڑھتے چلے آتے ہیں۔ ان مسلمان سیاحوں نے بھی حرمین شریفین کی زیارت کی اور ان مقدس و مبارک سرزمین پر جو کچھ دیکھا اسے قلم بند کیا تھا اور اسے اپنے بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے یادگار چھوڑ گئے' یہ تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں۔

اردو زبان میں حرمین شریفین کے بے شمار سفرنامے اب تک زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں قیام پاکستان سے پہلے کے سفرناموں کی جستجو کا آغاز کیا تو مجھے حسب ذیل چار خوبصورت پراز معلومات، تاریخی اور تمدنی و ثقافتی لحاظ سے نہایت مفید اور دینی جذبے میں ڈوب کر لکھے گئے سفرنامے دستیاب ہوئے۔ یہ سفرنامے اس قدر جامع و مانع اسلوب نگارش کے حامل اور حسین و جمیل انداز میں تحریر شدہ ہیں کہ ہر ہر سطر اور ہر ہر صفحے پر نظر جم کر رہ جاتی ہے اور معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ پڑھنے والے کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ ان کے مصنفین نے محبت و عقیدت کے جذبات کو کچھ اس خوبصورتی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

ان چاروں سفرناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مرآۃ العرب، یعنی سفرنامۂ نادر

میرٹھ کے ایک وکیل جناب نادر علی نے ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۳ء میں حج بیت اللہ کیا اور واپس آکر مرآۃ العرب، یعنی سفرنامہ نادر کے نام سے اپنے اس مبارک سفر کے حالات قلمبند کیے۔ اس سفرنامے میں، جو مطبع مفید عام پریس آگرہ، سے شائع ہوا، واقعات سفر، مناسک حج، آداب زیارت مدینہ منورہ کے ساتھ ساتھ تمدن و معاشرت عرب، تجارت، صنعت و حرفت، سیاست منزل، سلطنت عثمانیہ کی شاہانہ مساعی، شریف مکہ، مہاجرین مکہ، مطوفین، حجاز ریلوے جس کی تعمیر کا اس وقت آغاز ہو چکا تھا، حجاز میں ڈاک و تار گھر کے انتظامات، شفاخانے اور ظرف و ذرائع علاج جیسے بے شمار موضوعات پر دلکش اور حسین پیرائے میں اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کیے ہیں گویا قارئین کے سامنے حجاز مقدس اور سفر حج کے حسن و جمال اور صحیح خدوخال کی ہو بہو تصور کھینچ کر رکھ دی ہے۔

جناب نادر علی نے سفر کا آغاز آگرہ سے ۱۰ر جنوری ۱۹۰۲ء/۲۹ رمضان

المبارک ۱۳۱۹ھ) کی رات بذریعہ ریل کیا کلکتہ میں چند دن قیام کے بعد ۱۸؍ جنوری کو وہ بحری جہاز میں براستہ کولمبو عدن سے ہوتے ہوئے ۱۲؍ فروری کو جدہ پہنچے۔ جدہ سے خدیویہ جہاز میں سوار ہوئے اور ینبوع کا سفر اختیار کیا جہاں سے اونٹ پر بیٹھ کر عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ ینبوع میں چار دن تک قیام رہا۔ ۲۱؍ فروری کو روانگی ہوئی اور ۲۶؍ فروری کو مدینہ منورہ میں داخلے کی سعادت حاصل کی لکھتے ہیں:

"قبل از مغرب ہم لوگ داخل حرم ہوئے۔ اس وقت ایک عجیب مسرت افزا خواب حالت بیداری میں دیکھا جارہا تھا۔ سوائے ایسے مسافروں کے جو شوق کی منزلیں طے کر کے وہاں پہنچا ہو اس کا خیال میں آنا خارج از امکان ہے اور کسی دوسرے کے خیال میں بھی وہ لذت نہیں آسکتی۔ اس قلبی فرحت کی تصویر کا لفظوں میں کھینچنا خارج از امکان ہے اور کسی دوسرے کو سمجھانا غیر ممکن ہے۔"

۶؍ مارچ تک ان کا مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ روضہ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور مسجد نبوی کی زیارت کے علاوہ اندرون و بیرون شہر ہر قابل ذکر مقام پر گئے۔ ۷؍ مارچ کو مدینہ منورہ سے روانگی ہوئی اور دس دن بعد ۱۷؍ مارچ مکہ مکرمہ آمد ہوئی۔ ۲۰؍ مارچ پنج شنبہ کو یوم حج تھا۔ میدان عرفات میں شریف مکہ کی آمد ہوئی۔ آگے آگے توپیں چھوٹتی جاتی تھیں۔ ان کے پیچھے چوکڑیوں میں والی مکہ و جرنیل فوج ترکی متعینہ حجاز سوار تھے۔ چوکڑیوں پر خچر جتے ہوئے تھے۔ اعلیٰ حاکم سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک سب احرام باندھے ہوئے تھے"۔

مصنف کلکتہ، کولمبو، جدہ، ینبوع سب جگہوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور ان شہروں کے حالات دلچسپ انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ بحری سفر میں جن تکالیف کا سامنا ہوتا ہے۔ ان سے حفاظت کی تدابیر، سمندر اور اس کی مخلوقات کا ذکر، مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کے سفر کے حالات، حکومت کے حفاظتی انتظامات، حجاج کی شکایات، عربوں کے نکاح و مہر کا طریقہ، طلاق کا رواج اور اس کا اثر تمدن و خانہ داری پر، ذبیحوں کی فروخت، کرایہ شتران کو قافلہ مکہ و مدینہ، طائف۔ حج کے فوائد روحانی کے علاوہ دنیوی برکتوں کا ذکر اس سفر نامے میں تفصیل سے ملتا ہے۔"

مصنف نے بالخصوص مدینہ منورہ، روضۂ مسجد نبوی، مکہ معظمہ، حرم شریف، شہر

مکہ اور اس میں بسنے والے شہروں کے حالات اور متبرک مقامات کا ذکر کئی صفحات پر پھیلا دیا ہے۔ حجاز ریلوے کی تعمیر پر بعض عربوں کے اعتراضات اس کی تعمیر کے فوائد عثمانی سلطنت کے زمانے میں حجاز کے ترقیاتی کاموں اور سلطان عبدالحمید خان' جن کی خوبیوں کا دوست و دشمن دونوں کو اعتراف ہے' کا ذکر بھی کیا ہے۔ کئی اصلاح طلب امور پر اپنی تجاویز پیش کی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گورنمنٹ ترکی ایک کمیٹی مقرر فرمائے جو موقع حج پر ہر سال ایک جلسہ منعقد کیا کرے۔ جس میں ہر ملک کے سربرآوردہ اصحاب ممبر بنائے جائیں۔ وہ سب مل کر بہبودی اسلام' ترقی و تہذیب ملک' فلاح قوم' امن و آسائش اور صنعت و حرفت و تجارت کے متعلق تدابیر و وسائل سوچیں"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: اب ترک عرب کی قسمت کے مالک ہوئے ہیں۔ انہوں نے عربوں میں دوبارہ ترقی شروع کر دی ہے اور ایک جمے ہوئے تالاب میں خفیف سی حرکت پائی جاتی ہے اگر منظور خدا ہے تو کیا تعجب ہے کہ اسلامی دنیا پھر عرب کی کایا پلٹ ہوتے دیکھے۔"

نادر علی صاحب ۷ر اپریل ۱۹۰۲ء کو جدہ سے روانہ ہوئے اور ۲۰ اپریل یک شنبہ کو بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں چند دن قیام کے بعد یکم مئی ۱۹۰۲ء کو اپنے گھر آگرہ بخیریت واپسی ہوئی۔ ان کی کتاب سے مکہ معظمہ کے بیان کی چند دلچسپ باتیں درج ذیل ہیں:

مکہ معظمہ اور اس کے نام

یہ شہر بسبب نہایت عظمت اور بزرگی کے بیان سے مستغنی ہے' فرقان حمید و احادیث نبوی سے خانہ کعبہ کی افضیلت ثابت ہے۔

خط عرضی کے ۲۱ درجہ سے ۲۸ درجہ تک جانب شمال اور خط طول کے ۴۰ درجہ سے ۴۵ درجہ تک جانب مشرق واقع ہے۔ اس مقام پر صرف یقیناً و تبرکاً مختصر حال اس کا بیان کیا جاتا ہے:

مکہ معظمہ کے بہت سے نام ہیں' جن میں سے چند یہ ہیں:

مکہ معظمہ' امّ الرحمٰ' ام القری' معاد' بیت العتیق' حاطمہ حرم' صلاح'

بلدالامین ' بلند' عرش ' قادیس ' مقدسہ ' قریۃ النمل ' باسہ نسناسہ ' عروض ' راس.

قرآن مجید میں اس کے نام مکہ 'ام القری' بلد الامین 'بلد' بیت العتیق' بیت الحرام آئے ہیں۔ صوبہ حجاز کے بلاد الحرام کا دار لسلطنت ہے۔ بحر احمر سے ایک دن کے فاصلہ پر ہے' تنگ درہ میں آباد ہے' تین جانب پہاڑ ہیں۔ چوتھی طرف جس سمت مدینہ طیبہ ہے پہاڑ کم ہیں کوفہ و بغداد ستائیس منزل' بصرہ پچیس منزل دمشق و عدن ایک مہینہ کی راہ ہیں.

دامن کوہ میں دو جانب آبادی ہے۔ بیچ میں حرم محترم ہے۔ مکانات سڑکوں کے اونچ نیچ کے ساتھ دورویہ بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں ہموار' شہر نہایت صاف ستھرا ہے۔ چونکہ مکانات ایام حج میں حجاج و زائرین کو کرایہ پر دیئے جاتے ہیں اس وجہ سے ہر طرح صفائی کا خیال رہتا ہے.

آبادی مکہ کی سوائے ایام حج کے لاکھ نفوس کی بیان کی جاتی ہے۔ اہل اسلام کے تمام فرقے یہاں ساکن ہیں۔ بجز اہل اسلام کے کسی دوسرے مذہب کا آدمی نہ یہاں موجود ہے اور نہ آسکتا ہے۔ بدوی عرب دوسرے مذہب کے شبہ میں انسان کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ ۹ ہجری سے غیر مذہب والوں کے آنے کی ممانعت ہے.

مکہ معظمہ کے محلوں کے نام اور ان کے مختصر حالات

۱۔ محلہ جرول : اس محلہ میں بیشتر ہندوستانی و بنگالی آباد ہیں یہاں شیخ المشائخ محمود بن ابراہیم اوہم مشہور عارف کا مزار ہے۔ ایک وسیع عمارت سلطان المعظم نے سات لاکھ روپیہ کے مصارف سے تعمیر کرائی ہے۔ ہنوز اس کا افتتاح نہیں ہوا۔ غالباً مسافر خانہ۔ یا شفاخانہ ہوگا۔

یہاں ایک چاہ کی نسبت مشہور ہے کہ روز فتح مکہ حضور سرورِ کائناتؐ نے اس چاہ پر غسل فرمایا تھا.

۲۔ محلہ حارۃ الباب : اس محلہ میں ترک و یمنی عرب اکثر رہتے ہیں۔ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم جن کی شہرت و بزرگی محتاج ثبوت نہیں ان کا مکان بھی اس محلہ میں ہے اور اسی محلہ کے ایک حصہ میں مکان مولانا مولوی رحمت اللہ صاحب مرحوم کا ہے' جن کے فضائل خارج از بیان ہیں اور نیز ان کا مدرسہ صولتیہ واقع ہے.

۳۔ محلہ شبیکہ : یہ جگہ واسطے مقابر کے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید فرما کر

وقف فرمائی تھی۔

۴۔ محلہ جبل عمریہ : حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام سے آباد ہے' یہاں چند رباطیں ہیں۔

۵۔ محلہ مصفل : یہاں پر مولد مبارک حضرت امیر حمزہؓ و حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کا ہے' یہاں کثرت سے رباطیں ہیں۔ ایک رباط خاص مستورات کے لیے ہے' جس کو ریاست بہاولپور کی جانب سے تعمیر کرایا گیا ہے۔

۶۔ محلہ جیاد : اس میں کثرت سے بنگالی رہتے ہیں۔ قلعہ کلاں' توپ خانہ' فوجی بارکین' فیل خانہ اسی محلہ میں ہیں۔

۷۔ محلہ جبل ابی قبیس : اسی پہاڑ پر معجزۂ شق القمر کا اظہار ہوا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس کے نشیب میں ایک رباط نواب محمود علی خان مرحوم رئیس چھتاری ضلع بلند شہر کی ہے جس میں حاجی علی خان ساکن دہلی کے خاندان والے غالباً کرایہ پر رہتے ہیں۔

۸۔ محلہ کوشاشیہ : یا سوق اللیل۔ یہ دونوں محلے ملے ہوئے بہت وسیع ہیں۔ اسی میں مولد پاک جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم و مولد مبارک حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ہے۔ اسی محلہ میں حضرت قطب الاقطاب سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا چلہ ہے۔ اسی محلہ میں ایک کوچہ ہے جس کا نام "دار الخزران" ہے۔ جہاں جناب فاروق اعظمؓ ایمان لائے تھے۔ اسی محلہ میں دو مقام متبرک ہیں۔ ایک وہ پتھر جس پر حضور سرور عالم ﷺ نے کہنی ٹیکی تھی۔ نشان اس کا اب تک عیاں ہے۔ دوسرا مقام وہ ہے کہ باعجاز سرور کونین ﷺ کوہ نے کلمہ پڑھا تھا۔ ایک سنگ (پتھر) بصورت زبان نمودار ہے۔ اس وجہ سے اس کوچہ کا نام زقاق الحجر (پتھر کی گلی) ہے۔ اس محلہ میں دوکان حضرت صدیق اکبرؓ کی تھی اور قریب دوکان مولد و مکان خاتون جناب حضرت فاطمہ زہرہؓ کا ہے۔ بحکم سلطان المعظم ایک لنگر خانہ بنام سیدہ خاتون مدام جاری رہتا ہے اور دوسرا لنگر خانہ خدیو مصر کی جانب سے جاری ہے۔

اسی محلہ میں ایک جگہ حراج یعنی نیلام اشیا کا ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔

۱۰۔ محلہ فلک : اس میں ایک چھوٹا سا قلعہ ہے اور تاجر و مہاجرین ترکون کے مکانات ہیں۔

۱۱۔ محلہ شامیان : یہ بھی بڑا محلہ ہے۔ یہاں کثرت سے رباطین ہیں۔ مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب نواسہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ و حاجی فیض احمد خان رئیس و تاولی ضلع علیگڑہ کے رباط ہیں.

۱۲۔ جبل ہندی : اس کے جملہ ساکنین ہندوستانی ہیں یہاں چند رباطیں ہیں جن میں اکثر نواب محمود علی خان رئیس چھتاری کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس محلہ میں ایک ترکی فوجی شفاخانہ ہے.

۱۳۔ معابدہ : آبادی سوق اللیل کے متصل ہے۔ جس میں بیشتر وہ بدوی آباد ہیں' جنہوں نے مکہ کی مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ باقی کچھ عرب رہتے ہیں اور نیز امیر مکہ کے مکانات ہیں جس میں شریف عبدالمطلب کا ایک عالیشان ایوان معہ چمن پر فضا کے سر راہ واقع ہے' جس کے پائیں ہو کر عرفات کو جاتے ہیں.

۱۴۔ ججون : محلہ ججون جسے عوام ججول کہتے ہیں۔ یہاں بھی کثرت سے عرب آباد ہیں اور اس میں جنت المعلی ہے' جنت المعلی کے درمیان سے ہو کر محلہ جرول کو راستہ گیا ہے۔ اس راستہ پر ایک سبز و شادلب باغ شریف صاحب حال کا واقع ہے۔ جنت المعلی کو "گور غریباں" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگوں کے مزارات ہیں۔ حضرت آمنہ والدہ ماجدہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم و حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا زوجہ مطہرہ پیغمبر خدا ﷺ مدفون ہیں اور اس میں ایک محدود دروازہ لگا ہوا مکان ہے۔ جس میں حضرت ابو طالب پدر بزرگوار جناب علی کرم اللہ وجہہ' و حضرت عبدالمطلب جد رسالت مآب ﷺ کے مقابر ہیں اور بھی بہت سے بزرگان دین کے مزارات ہیں جیسے کہ حضرت عبدالرحمن بن حضرت ابوبکر صدیقؓ و زمانہ حال کے بزرگ مولوی رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ و حاجی امداد اللہ صاحب وغیرہم.

باقی اور جو متفرق آبادیاں ہیں' ان کو انہیں محلہ جات کے حصے سمجھنا چاہئیں.

مکہ کے بازاروں کے نام

۱۔ سوق الکبیر : جو باب الصفا سے مروہ تک ہے.

۲۔ بازار سویقہ : مروہ سے باب الزمادہ تک سویقہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں بازاروں میں اکثر بڑے بڑے تاجر بزاز وغیرہ ہیں۔ اسی بازار سویقہ میں حاجی علی خان دہلوی و دیگر تجار ہند کی دوکانیں ہیں.

۴۔ سوق الصغیر باب ابراہیم کے سامنے ہے.

باقی چھوٹے چھوٹے بہت بازار ہیں۔ جن میں مختلف اشیا کے دوکاندار بیٹھتے ہیں۔ حرم شریف کے گرداگرد ایسے مکانات سامان تجارت کے ہیں جن کو تاجروں کی کوٹھیاں کہہ سکتے ہیں۔ ان کے سوالونڈی غلاموں کا جدا بازار ہے جو باب دریہ سے باہر نکل کر ملتا ہے.

تفریح کے مقامات یا کلب جو کچھ کہیے یہاں کے قہوے خانے ہیں' جہاں عمدہ طاہر و طیب کھانے کی چیزیں ملتی ہیں۔ شام کو عام شرفاے مکہ واطراف وجوانب کے یہاں جمع ہوتے ہیں بہت ستر لوصاف مجمع ہوتا ہے.

حرم محترم و خانہ کعبہ معظم

وسط شہر میں ایک وسیع مسجد واقع ہے جس کے ہر چہار جانب دالان در دالان پانچ پانچ درجے کے یکے بعد دیگرے بلند گنبد نما بنے ہوے ہیں۔ یہ گنبد بلند ستونوں پر' جو ایک ڈال سنگ مرمر و دیگر عمدہ پتھر کے طولاً تخمینی پانچ پانچ گز ہوں گے ان پر قائم ہیں.

ہر درجہ تخمیناً پانچ گز عریض ہے۔ اور تقریباً ہر در مسجد کا فاصلہ بھی اس قدر ہے.
اس مسجد کے پچھلے دو درجوں میں قریب قریب مکانات خوش قطع بنے ہوے ہیں' یہ بھی داخل حرم ہیں دولت مند حجاج کرایہ کثیر دے کر ان میں مقیم ہوتے ہیں' کرایہ سالانہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی تھوڑے عرصہ کے لیے بھی معاملہ ہو جاتا ہے۔ اس مسجد کا نام حرم شریف ہے۔ حرم محترم کے ہر چار جانب دروازے ہیں.

جانب غرب :۔ باب الوداع. باب الابراھیم' باب العمرہ.

جانب شرق :۔ باب السلام' باب النبی' باب العباس' باب العلی.

جانب جنوب :۔ باب ام ھانیؓ' باب الحکم' باب الشریف' یعنی باب الجھاد' باب العقد' باب الصفاء' باب النعلہ' باب الرب.

جانب شمال :۔ باب العتیق' باب المدرسہ یا باب زمانیہ' باب القطبی' باب الزمادہ' باب البطی' باب القاضی' یعنی باب الکمہ' باب دریہ و مدرسہ سلیمانی واقع ہیں' کچھ دروازے اور بھی ہیں مگر زیادہ

مشہور بھی ہیں۔

صحن حرم معظم میں ایک مستطیل مکان بعمارت سنگ بنا ہوا ہے' تخمینی جو عرضاً نو گز اور طولاً بارہ گز ہوگا اسی کو کعبہ اور بیت اللہ کہتے ہیں۔ اس کی کرسی قد آدم اور جت نہایت بلند ہے اندر تمام سنگ مرمر کا فرش ہے اور اندرونی دیواروں میں بھی چہار جانب سنگ مرمر ہے۔ اس پر آیات قرآنی بخط جلی خوش قلم کندہ ہیں۔ وسط میں سطیر اور منقش تین ستون صندل استادہ ہیں۔ ان ستونوں میں طلائی عود سوز و بخوردان وغیرہ آویزاں ہیں۔ اندر سو نمازیوں کی بقدر وسعت ہے۔

در کعبہ : جانب شرق محاذی مصلے شافعی کے دروازہ ہے۔ دروازے کے کواڑوں پر سونے کے پتھر جڑے ہوئے ہیں اور زری کا پردہ مغرق لٹکتا ہے۔ سال میں کئی بار باوقات مقررہ کھولا جاتا ہے اور باجازت شریف مکہ و شیبی کلید بردار کے معمول کے علاوہ بھی کھل سکتا ہے۔

گوشہ جنوب و مشرق قریب در بیت اللہ ایک پتھر سیاہ تخمیناً چھ انچ مربع ایک چاندی کے حلقہ کے ساتھ گوشہ دیوار میں نصب ہے۔ یہی حجر اسود ہے وقت طواف اس کو بوسہ دیتے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تکریم کی بابت خاص خاص ارشاد فرمایا ہے۔ معشوق حقیقی کے در کا پتھر ہے جس قدر اس کی تعظیم کی جائے' تھوڑی ہے :

سنگ اسود کی بڑی دھوم سنی تھی ہم نے
جا کے دیکھا تو وہ سنگ در جاناں نکلا

بجز حجر اسود کے دنیا میں کوئی شے اتنے زمانہ دراز سے متبرک نہیں چلی آئی ہے' جیسا کہ یہ پتھر کیونکہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل کئی ہزار سال سے اس کی تعظیم ہو رہی ہے۔

میزاب رحمت : چھت کی جانب شمال مصلے حنفی کے محاذی پرنالہ طلائی لگا ہوا ہے جس کو میزاب رحمت کہتے ہیں اس پر آیات قرآنی منقش ہیں۔

حطیم : میزاب رحمت کے نیچے خانہ کعبہ کے شمالی جانب نصف دائرہ کی صورت کا ایک قطع ہے جس کا فرش سنگ مرمر و سنگ سیاہ کا ہے۔ اس کو حطیم کہتے ہیں۔ پہلے حطیم کا نام "حجر" تھا۔ حجر کے معنی پہلو کے ہیں۔ یہ کعبہ کے پہلو میں ہے اس کی حد رکن عراقی سے رکن شامی تک

ہے اور انہیں حدود میں راستہ بھی ہے۔

حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہؓ کی قبریں اسی میں میزاب رحمت کے نیچے ہیں۔

حفرہ یعنی گڑھا: یہ گڑھا ایک چھوٹا سا حوض خانہ کعبہ کی دیوار شرقی سے ملا ہوا آستانہ کعبہ کے پاس ہے اس کو مقام جبریل کہتے ہیں۔

مطاف:۔ خانہ کعبہ کے گرداگرد دائرہ کی شکل میں سنگ صوان و سنگ مرمر کا فرش ہے جس کو مطاف کہتے ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے شرح متوسط میں لکھا ہے کہ مطاف سے مراد وہ جگہ ہے جو طواف کے لیے مقرر ہے۔ زمانہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں مسجد حرام اس قدر تھی اور مولانا قطب الدین مکی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ مطاف مطلق اس قدر ہے جس میں اس وقت سنگ صوان کے ٹکڑوں کو تراش کے فرش کیا ہے۔ مطاف کا دائرہ سلطان سلیم خان بن سلطان سلیمان خان کے حکم سے ۹۶۱ ہجری میں بنا تھا یہ مدور ہے لیکن سب جانب سے دور برابر نہیں ہے۔

مطاف کے گرداگرد حلقہ کیے ہوئے اڑتیس ستون ہیں جو دھات کے معلوم ہوتے ہیں ہر ایک ستون میں سات بلوری ہانڈیاں آویزاں ہیں۔

مقام ابراہیمؑ: حد مطاف سے ملا ہوا جانب مشرق مقام ابراہیم ہے۔ بعد طواف اسی جگہ نماز دوگانہ ادا کی جاتی ہے۔ مقام ابراہیم میں وہ پتھر موجود ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ فرماتے تھے۔ اس پر قدم کا نشان ہے۔ نشان کے گرد چاندی کے پتھر لگے ہوئے ہیں اس جگہ کے چاروں جانب کو گھیرے ہوئے ایک صندوق زمین میں گڑا ہے۔ اس پر اطلس سیاہ زردوزی کا غلاف پڑا ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا گنبد چار ستونوں پر کھڑا ہے۔ اندر سے نہایت آراستہ و منقش ہے۔ گنبد بند رہتا ہے۔ پیچھے گنبد کے ایک مکان پتھر کے ستونوں پر قائم ہے جس کا نام "ایوان حلف" ہے مقام ابراہیم ایک بار بغرض تعمیر کھولا گیا تھا۔ اس وقت جناب مولانا محمد رحمت اللہ مرحوم و شریف عبداللہ و شیخ عبدالرحمن سراج مفتی مکہ نے بچشم خود زیارت نشان قدم مبارک کی تھی۔ وہ نشان معمولی میانہ قد کے پاؤں کا ہے۔ یہ بیان بروایت مولانا مرحوم مجھ تک پہنچا ہے۔

منبر: مقام ابراہیم کے متصل رکن عراقی کے مقابل سنگ مرمر کا منبر تیرہ زینہ کا نہایت خوشنما بنا ہوا ہے۔ اس پر ایک گاجر کی شکل کا طلائی گنبد ہے۔ جمعہ کا خطبہ اسی پر پڑھا جاتا

ہے۔ یہ سلاطین عثمانیہ میں سے کسی کے عہد کا ہے۔ ۴۴ ہجری میں ایک چھوٹا منبر تین زینہ کا آیا اور خانہ کعبہ کے مقابل رکھا گیا۔ جس پر امیر معاویہؓ نے خطبہ پڑھا۔ اس سے پہلے خلفائے راشدین حطیم میں کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا کرتے تھے اس کے بعد ہارون رشید اعظم کے عامل مصر موسیٰ بن عیسیٰ نے مکہ میں ایک منبر منقش نو زینہ کا بھیجا۔ منبر مسجد میں رکھا گیا ہے۔ پہلے منبر کو عرفات میں بھیج دیا واثق باللہ عباسی نے تین منبر بنوائے۔ ایک مکہ کے لیے دوسرا منیٰ کے لیے اور تیسرا عرفات کے لیے اور اس نے حج کیا اور خطبہ اسی منبر پر پڑھا۔

مصلے: چاروں سمتوں میں مطاف سے باہر چار مصلے ہیں: حنفی شافعی مالکی حنبلی۔ حنفی مصلیٰ: دو منزلہ جانب شمال حطیم کے محاذی دوسرا مصلیٰ شافعی جانب شرق متصل مقام ابراہیمؑ تیسرا مصلیٰ حنبلی حجر اسود کے مقابل جانب جنوب' چوتھا مصلیٰ مالکی جانب غرب ہے۔

صبح کی نماز اول امام شافعی' پھر مالکی پھر حنبلی' سب کے آخر میں امام حنفی پڑھاتا ہے۔ ظہر عصر' مغرب' عشاء اول امام حنفی بعدہ شافعی پھر مالکی اور سب کے آخر میں امام حنبلی پڑھاتا ہے۔

غلاف کعبہ: تمام عمارت کعبہ پر چھت سے تا حد زمین غلاف ابریشم سیاہ جس پر کلمہ طیبہ بافتہ ہوتا ہے' ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ جدا جدا حصہ جن میں پورا کلمہ طیبہ بافتہ ہوتا ہے' علیحدہ معلوم ہوتے ہیں اور سنہری عبارت میں بخط نسخ آیات قرآنی و سلطان وقت کا نام بافتہ ہوتا ہے۔ یہ غلاف ہر سال مصری قافلے کے ساتھ مصر سے آتا ہے۔ جو ۱۰ ذوالحجہ یا کبھی اس سے قبل خانہ خدا پر ڈالا جاتا ہے۔

سب سے پہلے غلاف خانہ کعبہ کو اسعد تبع حمیری بادشاہ یمن نے ہزار برس ہجرت سے پیشتر یمنی چادر کا پہنایا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے چادروں کا غلاف پہنایا۔ حضرت عمر فاروقؓ و حضرت عثمان غنیؓ نے مصری کپڑوں کا پھر معاویہؓ بن ابی سفیان نے دیا اور مصری کپڑوں کا پھر یمنی چادر کا چڑھایا۔

خلیفہ مامون رشید عباسی کی خلافت میں سال میں تین بار غلاف پڑتا تھا۔ ایک آٹھویں ذوالحجہ کو سرخ دیبا کا' دوسرا یکم رجب کو مصری کپڑوں کا' پھر تیسری بار عید الفطر کو سفید دیبا کا۔ کلید برداران خانہ کعبہ نے مہدی عباسی کو اطلاع دی کہ کعبہ پر غلافوں کی تہیں اتنی چڑھ گئی ہیں کہ ان

کے بوجھ سے دیواروں کے گرنے کا خوف ہے۔ مہدی نے حکم دیا کہ سب غلاف علیحدہ کیے جائیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اندر باہر سے مشک و عنبر خوشبو کے مرکب سے لیپی گئیں اور خوشبو کے شیشے دیواروں پر چھڑکے گئے' پھر تین غلاف ایک مصری دوسرا حریر۔ تیسرا دیبا کا کعبہ پر ڈھانکے گئے۔ بعد ضعف خلافت خاندان عباسیہ کعبہ کا لباس کبھی مصر سے اور کبھی یمن سے آتا تھا۔ یہاں تک کہ قریہ بیوس خرید فرما کر سلطان مصر نے غلاف کعبہ کے لیے وقف کر دیا۔

جب ممالک عرب کی حکومت آل عثمان کے قبضہ میں آئی تو غلاف کی تیاری رواج قدیم کے بموجب جاری رہی سلطان سلیمان خان نے حکم دیا کہ کعبہ پر ہمیشہ غلاف سیاہ رہے اور سال میں ایک بار ڈالا جائے۔ چونکہ بیوس کی آمدنی غلاف کے لیے کافی نہ تھی' اس لیے اس نے حکم دیا کہ خزانہ مصر سے اس کو پورا کیا جائے۔ پھر اس نے دوسرا گاؤں غلاف کعبہ کے لیے دائمی وقف کر دیا۔

غلاف سال گذشتہ حق شیبی کلید بردار خانہ کعبہ کا ہوتا ہے۔ شیبی سے اہل مکہ لے لیتے ہیں۔ ان سے تجاج تبرکاً خریدتے ہیں۔ ایک ٹکڑا جس پر پورا کلمہ طیبہ بافتہ ہوتا ہے ایک مجیدی سے تین مجیدی یعنی ڈھائی روپیہ سے ساڑھے سات روپیہ تک آتا ہے۔ مطوف کے ذریعہ خریدنے میں گراں اور بوسیدہ ملتا ہے۔

قبۃ الفراشین : چاہ زمزم کے پیچھے متصل مقام ابراہیمؑ ایک گنبد ہے جس کو قبۃ الفراشین کہتے ہیں۔ اس میں شمع و شمعدان قرآن مجید اور حرم شریف کی ضرورت کی چیزیں فرش وغیرہ کی قسم سے رکھی جاتی ہیں۔

زنانہ عبادت خانہ : صحن حرم میں جانب مشرق کسی قدر مائل بجنوب ایک عبادت خانہ جس میں جنگلا لگا ہے مستورات کے لیے محدود ہے۔

صحن حرم : کل صحن حرم میں سنگریزے بچھے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گز عریض پٹری پتھر کی آمد و رفت کے کئی جانب سے بنی ہوئی ہے۔

قبے : تمام حرم شریف میں ایک سو باون قبے ہیں جن کی شکل کڑاہی کی سی ہے۔

ستون : مسجد حرم کے اندر چاروں جانب چھ سو چوراسی ستون ہیں۔ ہر طرف ستونوں

کی تین قطاریں ہیں' کسی جانب پوری اور کسی جانب کم و بیش' مثلاً کوہ صفا کی طرف تین قطار سے کچھ کم ہیں۔ باب ابراہیم و باب زیادہ کی طرف تین قطار سے پچاس ستون زیادہ ہیں۔ ان میں سنگ مرمر کے ستون دو سو پچانوے' سنگ صوان کے سولہ اور سنگ شمس کے ایک سو چالیس ستون ہیں.

باب المحکمہ کے سامنے ایک ستون سرخ ہے مشہور ہے کہ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

منارے : مسجد کے گرد سات منارے بہت بلند اذان کے لیے چاروں کونوں پر اور تین درمیان میں بنے ہوئے ہیں.

اول : باب العمرہ کا منارہ' اس کی بلندی سٹرسٹھ گز ہے ابو جعفر عباسیؓ نے اس کو تعمیر کرایا اس کے بعد اوروں نے درست کرلیا.

دوسرا : منارہ باب السلام پر ہے' اس کی بلندی ۶۵ گز ہے۔ اس کو از سر نو ۹۲۱ھ میں سلطان سلیم خان نے تعمیر کرایا.

تیسرا : منارہ باب علی پر ہے اس کی بلندی ۵۴ گز ہے اس کو سلطان سلیمان خان نے دوبارہ سنگ شمسی سے بنوایا.

چوتھا : منارہ باب الوداع پر ۵۰ گز بلند ہے ۷۷۱ھ شعبان والی موصل نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا.

پانچواں : منارہ باب الزیادہ پر ۶۷ گز اونچا ہے اس کو شاید معتضد باللہ عباسی نے بنوایا تھا.

چھٹا : منارہ سعی کی جانب ۸۰ گز بلند ہے' جو سلطان قایت بای کا بنایا ہوا ہے.

ساتواں : منارہ سلطان سلیمان خان کا بنوایا ہوا۔ باب السلام و باب الزیادہ کے درمیان ہے جس کی بلندی ۶۵ گز ہے جو سنگ شمسی کی طلاکار جالیوں سے بنا ہے.

ہانڈیاں و سامان روشنی : مسجد کے دروازوں میں بلوری ہانڈیاں آویزاں ہیں' جو تقریباً دو ہزار ہوں گی۔ یہ ہانڈیاں رمضان المبارک سے محرم الحرام تک ہر شب کو روشن ہوتی ہیں۔ روغن زیتون جلتا ہے روشنی اور صفائی کے اہتمام پر بکثرت خدام مامور ہیں جن میں بیشتر

خواجہ سرا ہیں. مطاف اور حجروں کی اندرونی ہانڈیاں دوازدہ ماہ روشن ہوتی ہیں۔

امامِ حرم: قریب ستر یا اسی کے امام مقرر ہیں۔ اوقاف عثمانی سے وظیفہ پاتے ہیں۔ نقد کے علاوہ غلّہ بھی اوقافِ سلطنت سے ملتا ہے.

نمازیوں کی تعداد ایک جماعت میں: موقع حج پر قریب قریب ہر وقت کی ایک ایک جماعت میں پچاس ہزار سے زائد اور کبھی کبھی ایک لاکھ نمازی ہو جاتے ہیں۔ کیا عمدہ طریقہ اسلام میں جماعت کی نماز کا ہے۔ نمازیوں کی کثرت عجیب اثر ڈالنے والی دل پر ہوتی ہے۔ خصوصاً بیت اللہ میں مختلف الممالک مختلف الدیار مختلف الاشکال مختلف الالوان مختلف اللسان ہندی، عجمی، بخاری کابلی، چینی، جاوی، داغستانی، مغربی، بدخشانی، کردی، شامی، روسی، عربی وغیرہ تمام دنیا کے اہل اسلام فرقے ایک ہی حالت اور ایک ہی لباس میں بہ زبان واحد وحدہ لاشریک کو پکارتے ہیں۔ تو دلی مسرت کا جوش ہزار چند ترقی کر جاتا ہے.

معجزات خانہ کعبہ: حرم محترم یوں تو سراسر مظہر معجزات ہے مگر چند امر بدیہی ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے.

اول: یہ کہ حرم محترم میں ہزارہا کبوتر ہیں نماز کے وقت اڑ کر باہر چلے جاتے ہیں.

دوئم: یہ کہ صحن اور کعبہ معظم کی چھت پر کوئی کبوتر بیٹھ نہیں کرتا.

سوئم: یہ کہ کبوتر اور پرند خانہ کعبہ کے اوپر سے نہیں گزرتے اِدھر اُدھر ہو کر چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ بیضاوی وغیرہ میں ہے کہ پرند اڑنے کے وقت خانہ کعبہ کے مقابل سے ہمیشہ یکسو ہو جاتے ہیں.

چہارم: یہ کہ کیسی ہی شدید گرمی پڑے لیکن طواف کی جگہ بہت گرم نہیں ہوتی.

دار الحکومت: باب ام ہانی کے سامنے دار الحکومت ہے، یہاں والی مکہ اور کمانڈر فوجی اجلاس فرماتے ہیں اور نیز تمام محکمہ جات خزانہ و پولیس وغیرہ ہیں.

دار القضاء: باب قاضی پر عدالت قضا ہے، شرعی مقدمات مثل توریث و طلاق و تفریق، مہر و شفع و بیع وغیرہ ہیں. اسٹامپ یعنی کورٹ فیس کچھ نہیں دینا پڑتا.

البتہ تجارتی و سودی مقدمات میں ۴ سیکڑا اسٹامپ، یعنی کورٹ فیس لگانا ہوتا ہے

فوجداری استغاثہ میں صرف ۲ کا کورٹ فیس مقرر ہے' محکمہ قاضی کا اپیل بحضور شیخ الاسلام (قاضی القضاۃ) قسطنطنیہ اور مرافع دیوانی کا اپیل محکمہ تمیز (ہائی کورٹ) قسطنطنیہ میں پیش ہوتا ہے.

جو مقدمہ اپیل سے ناقص ہو کر واپس آتا ہے اس میں پر فریقین از سر نو پیروی کرتے ہیں' معمولی شکایتوں کو بلا تحریری استغاثہ کے محافظان رعایا مثل پولیس وغیرہ کے بطور خود تصفیہ طے کردیتے ہیں۔ وہاں جھوٹی شہادت میسر نہیں آتی لہذا تنازعات بھی طول نہیں پکڑتے.

بیر زمزم: در کعبہ سے مشرق کی جانب متصل مقام ابراہیم و مصلی شافعی کے چاہ زمزم واقع ہے' قبیلہ جرہم کے ایک رئیس عمرو بن حارث نے' جبکہ اس کو اولاد حضرت اسماعیل نے بری حرکات کے باعث کعبہ سے نکالا اس کو بند کردیا تھا۔ حضرت عبدالمطلب جد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں اس کا نشان معلوم ہوا اور انہوں نے اس کو پھر کھودا۔ فضائل آب زمزم کے بیشمار ہیں مسلم میں ہے کہ زمزم کا پانی غذا کی غذا اور بیماریوں کی شفا ہے.

بخاری میں ہے 'ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھ کو تیس شبانہ روز بجز آب زمزم کے کوئی غذا نہ ملی' میں صرف زمزم پیکر بسر کرتا تھا۔ مجھ کو بھوک کی کوئی سستی نہ معلوم ہوئی' بلکہ فربہ ہو گیا.

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ زمزم کا پانی اس غرض کے لیے ہے جس غرض کے لیے پیا جائے' اس سے اشتہاء و تشنگی سب دور ہوتی ہے.

یہ وہ پانی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے بازو مارنے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سیراب کرنے کو نمودار ہوا تھا (روایت کیا اس کو دارقطنی نے)

اس کا قصہ اس طرح ہے کہ جب اللہ جل شانہ' نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی آگ سے بچایا' تو آپ اپنے چچا کی بیٹی حضرت سارہؓ سے نکاح کر کے بغرض ہجرت نکلے اور مصر میں پہنچے۔ حضرت سارہؓ نہایت حسین تھیں۔ مصر کا بادشاہ فرعون باغوائے شیطان حضرت سارہؓ کا حسن و جمال سن کر فریفتہ ہوا اور ان کو طلب کیا۔ ان کو دیکھ کر اس درجہ بے خود ہوا کہ اپنے کو قابو میں نہ کرسکا جس وقت گستاخانہ ان کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ فوراً خشک ہو گیا.

اس واقعہ سے وہ اپنے ارادہ پر پشیمان خائف ہو کر التجا کرنے لگا کہ تو اپنے رب سے دعا کر کہ میرا ہاتھ میرے قابو میں ہو جائے میں تجھے ہرگز ایذا نہ دوں گا" .... الخ".

سفر نامۂ حجاز (تاریخ الحرمین)

یہ سفر نامہ سیرت نبوی کی مشہور عالم کتاب رحمۃ للعالمین کے فاضل مصنف قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کے سفر حرمین شریفین کے دوران ان کے مشاہدات و تجربات پر بیش بہا معلومات کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ قاضی صاحب مرحوم نے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں ۲۶ر شعبان کو اپنے وطن پٹیالہ سے اس مبارک سفر کا آغاز کیا اور ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کو قمری حساب سے چھ ماہ اٹھارہ دن کے بعد واپسی ہوئی.

سفر نامہ حرمین شریفین کے تفصیلی کوائف ان کی عہد بعہد تعمیر اور زیب و زینت' عرب کی طبعی تقسیم' تاریخ اور جغرافیہ' قبائل حجاز' جدہ کا شہر اور بندرگاہ' ینبوع مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ حج پر مذاہب اربعہ کے فقہی مسائل اور حجاز مقدس کے ان تمام بابرکت مقامات کی روح پرور داستان اور ان کے بارے میں تحقیقی مواد پر محیط ہے جن کی زیارت کرنا باعث برکت و ثواب ہے۔ یہ کتاب دراصل خانہ خدا اور مسجد نبوی کی مکمل تاریخ ہے اور اس میں تقابل ادیان کی جھلک بھی نمایاں ہیں.

قاضی صاحب نے اپنا تحقیقی انداز' جو ان کی تحریر کا خلاصہ ہے اس سفر نامے میں بھی برقرار رکھا ہے۔ جو بات لکھی ہے تحقیق صحیح اور سند سے لکھی ہے اور بالتفصیل لکھی ہے۔ اس زمانے میں حجاز پر شریف مکہ حسین بن علی کی حکومت تھی۔ قاضی صاحب نے ان سے کئی بار ملاقات کی۔ ان سے سوال و جواب کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے.

ان کی تحریر کا مہتم بالشان حصہ وہ ہے جہاں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ روضہ نبوی کے سلسلے کی یہ معلومات ایمان افروز ہونے کے علاوہ تاریخ کا ایک شہ پارہ بھی ہے.

مثلاً "ایک دفعہ حضر میجسٹی نے دریافت فرمایا تھا کہ ہند کے مسلمان ان سے کیوں ناخوش ہیں۔ میں نے کہا کہ خاندانوں کا انقلاب یا حکمرانوں کا تبدل اس ناخوشی کی وجہ

نہیں۔ مسلمانانِ ہند تو سمجھے ہوئے ہیں کہ اس سلطنت پر غیر کا سایہ بھی ہے اور یہی امر بہت زیادہ دل شکن ہے"

انہوں نے دوسرا حج ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء میں کیا اس وقت نجد و حجاز میں آل سعود کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب کی ملاقات ملک عبدالعزیز بن سعود سے بھی ہوئی، مگر اس سفر کے حالات وہ تحریر نہ کر پائے۔

حج سے واپسی پر یلملم کے قریب عرشۂ جہاز پر ان کا انتقال ہو گیا۔ وہیں نماز جنازہ سید محمد اسماعیل غزنویؒ کی امامت میں ادا ہوئی اور ان کا جسد خاکی سطح سمندر پر چھوڑ دیا گیا۔ قاضی صاحبؒ ایک پر گو شاعر بھی تھے، اور سلمان تخلص کرتے تھے۔ خود انہوں نے حرمین شریفین کے اس دوسرے سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر یہ شعر کہا تھا۔

نظر آتا نہیں قسمت میں مجھ کو لوٹ کر آنا
مجھے عمر رواں، آب رواں معلوم ہوتی ہے

سفر نامہ حجاز پہلی بار ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت ثانی کا اہتمام نبیرۂ مصنف قاضی عبدالباقی قدس سرہٗ کی مساعی سے ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز ہیں۔ آخر میں قاضی محمد سلیمان منصورپوری کی سوانح بھی منسلک کی گئی ہیں۔ سفر نامہ حجاز کے آغاز میں ایک طویل نظم ہے، جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

اے آنکھ حسن کعبہ کو تو بار بار دیکھ
کیا شان کیا جلال ہے یہ نور بار دیکھ
کیا کیا مطالبے تھے دل و چشم و روح کے
تینوں کو ایک وقت میں تو کامگار دیکھ
ہے کسوت سیاہ بنی سرمۂ نگاہ
رنگینی جمال کو جنت بہار دیکھ
تکبیر کی صدا پہ ملائک بھی مست ہیں
ذوق سماع و لذت گفتار یار دیکھ

سلمان مستعد تری آستان پہ ہے
فضل و کرم سے اے مرے پروردگار دیکھ

حج کے مبارک سفر کے بارے میں کچھ مشورے لکھے ہیں:

"ان برکات عظیمہ و فوائد جسیمہ میں و مصالح کریمہ و نتائج عالیہ کے مقابلے میں جو اس سفر سے حاصل ہوتے ہیں، پیش آنے والی ترددات بالکل ہی ہیچ ہیں۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو، ہر مسلمان کو حج کے لیے ضرور مبادرت و مسابقت کرنی چاہئے البتہ یہ ضروری ہے کہ :

(۱) اچھے رفیق ہوں' (۲) روپیہ کافی ہو' (۳) کوئی عربی دان ساتھ ہو' (۴) تحمل و برداشت کا ملکہ راسخ ہو' (۵) اہل سفر کے ساتھ خلق و رفق کا برتاؤ کیا جائے' (۶) رفقاء کے آرام کے مقابلے میں اپنے آرام کی اور روپے کی وقعت نہ سمجھی جائے' (۷) حرمین شریفین کی ہر شے کا نظارہ نور اسلام اور ضیاء محبت میں کیا جائے۔

اس سفرنامے سے ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"مقصورۃ النبویۃ الشریفہ" علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

* مسجد پاک کا مختصر ضروری بیان لکھا جاچکا ہے۔ اہل ایمان و وجدان کی آنکھیں روضہ پاک کے بیان پر لگی ہوئی ہوں گی۔ اس لیے اب اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ۸ ربیع الاول ۱ھ نبوی ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء بروز دوشنبہ بمقام قبا نزول اجلال فرمایا۔ ۱۴ یوم یہاں ٹھہر کر بروز جمعہ مدینہ منورہ میں نور افروز ہوئے۔ جب مسجد کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے ساتھ دو حجرات بھی بنائے گئے تھے' جن میں سے ایک یہ ام المومنین عائشہ صدیقہ طیبہ کا ہے۔

یہی وہ حجرہ مبارکہ ہے : جسے ارض و سماء کے ہر مقام پر درجہ علیا حاصل ہے۔
یہی وہ حجرہ مبارکہ ہے : جو مہبط جبرئیل اور منزل کلام رب جلیل ہے۔
یہی وہ حجرہ عالیہ ہے : جہاں سے روح انور نے جسم اطہر سے پرواز کی۔
یہی وہ حجرہ مقدسہ ہے : جہاں حضور ﷺ کو غسل و کفن دیا گیا۔

یہی وہ حجرہ کریمہ ہے: جہاں دس دس صحابہ نے اندر داخل ہو کر نماز جنازہ ادا کی۔

یہی وہ حجرہ امینہ ہے: جہاں انتقال سے ۳۲ گھنٹہ بعد جسم اطہر کو لحد انور میں لٹایا گیا۔

یہی وہ حجرہ منورہ ہے: جہاں روز و شب ملائکہ رحمت کا نزول جاری ہے۔

یہی وہ حجرہ عظیمہ ہے۔ جو عِندَ اللّٰهِ خَیرُ البِقَاعِ ہے۔

اس کا نام اپنی بیرونی عمارت کے ساتھ "مقصورۃ النبویہ الشریفہ" ہے۔ عمارت کا یہ حصہ مسجد نبوی ﷺ کے دست راست (مگر قبلہ رخ انسان کے دست چپ) اور جانب شرق واقع ہے۔

اس کے مغرب میں مسجد ہے۔ جنوب میں رواق (اول و دوم) مسجد کے دالان شرق میں پھر مسجد کا حصہ شمال میں باب جبرئیل اور صفہ کا چھتاؤ اس طرح پر مقصورہ کے ہر چہار جانب عمارات موجود ہیں۔

قایت بائی خان کی عمارت سے پیشتر مسجد نبوی ﷺ کے روائق اول و دوم کا طول وہاں ختم ہو جاتا ہے، جہاں مقصورہ کی دیوار آجاتی ہے، مگر قایت بائی خان نے ان دالانوں کو لمبا کر دیا۔ جس سے ان دالانوں کا یہ حصہ مقصورہ شریفہ کے لیے بر آمدہ بھی بن گیا۔ خلفائے راشدین اور ملوک سلف نے ان دالانوں کو اس لیے اس طرف نہیں بڑھایا تھا کہ مقصورہ شریفہ کے گرد پھرنے کی صورت پیدا نہ ہو جائے اور عام لوگوں طواف کی شکل قائم نہ کرلیں۔

مقصورہ شریفہ کے ہر چہار جانب محراب نما عمارت ہے۔ ہر جانب ایک محراب ہر ایک محراب کے نیچے دو دو دروازے، ہر ایک دروازہ دولختہ ہے۔ ہر ایک دروازے میں خوبصورت طلائی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ جو اپنی خوشنمائی سے بصر افروز ہیں۔

طول	جنوباً شمالاً	۱۶ میٹر	۵۲%۳۶ فٹ
عرض	شرقاً غرباً ۱۵ر	میٹر	۴۹%۹ فٹ

ہر ایک محراب حجر صلد (سخت چکنا پتھر) کے گول گول بلند ستونوں پر بنائی گئی ہے۔ ہر چہار جانب کے دروازوں میں کھلنے والے کواڑ (طلائی رنگ مشبک=جالی دار) لگے ہوئے ہیں، جو بند رہتے ہیں، ہر ایک پھاٹک میں گول دائرہ نما خلا رکھی ہوئی ہے۔ جہاں آنکھیں ڈال کر اندر کا نظارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ جو دروازہ جانب مسجد ہے اس کا نام باب الرحمۃ ہے۔

سلام عرض کرنے والے اس دروازہ پر حاضر ہوتے ہیں جو جانب جنوب کھلتا ہے۔ اس دروازہ کو امور مہمات عظیمہ کے موقع پر خاص منظوری سے کھولا جاتا ہے۔ جنوبی دروازوں کے پھاٹک عجیب صنعت سے تیار کئے گئے ہیں۔ ہر ایک داہنے ہاتھ کے کواڑ پر لَآاِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ اور بائیں ہاتھ کے کواڑ پر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ الصَّادِقُ الْاَمِيْنُ نحاس (تانبہ) حروف میں ڈھلے ہوتے ہیں اور اسی طرح کی چار چار سطور ان کواڑوں پر مسطور ہیں۔ ان کواڑوں میں تین تین گول روشن دان (شباکہ) بھی رکھے ہوئے ہیں کہ آنکھیں ڈال کر اندر کا نظارہ کیا جاسکے۔ دن میں اندر کا نظارہ کم نظر آتا ہے، کیونکہ چھت کا سایہ رہتا ہے۔ رات کو جب کہربائی لیمپ اور زیتونی سراج روشن ہو جاتے ہیں، تو دیکھنے والے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ مقصورہ اول اول ۶۶۷ھ میں سلطان الظاہر رکن الدین بیبرس شاہ مصر نے تیار کرایا تھا۔ اس سے پیشتر یہاں چوبی جنگلہ لگا ہوا تھا اور جنگلہ سے پرے حظار مزور صاف (معزز احاطہ) نظر افزا تھا۔

چوبی جنگلہ کے تحت میں خندق کھودی گئی اور اسے رصاص (سیسہ) سے بھر دیا گیا تھا۔ علامہ سمہودی مؤرخ مدینہ نے اپنی کتاب خلاصۃ الوفا میں جمال اسنوی کے رسالہ سے نقل کیا ہے، کہ ملک عادل نور الدین شہیدؒ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شب خواب میں تین بار دیکھا کہ آنحضور ﷺ دو کس گربہ چشم (اشقرین) کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں۔ اور زبان مبارک پر یہ الفاظ ہیں۔ اَنْقِذْنِیْ اَنْقِذْنِیْ مِنْ هٰذَيْنِ ہ (مجھے ان دو سے نجات دلاؤ)۔

بادشاہ اٹھا تیز رو ساڈنیاں منگوائیں۔ صرف بیس آدمی ساتھ لیے مصر سے مدینہ منورہ ۱۶ روز میں پہنچ گیا اور اہلِ مدینہ کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سب آئے مگر وہی دو شخص نہ تھے دریافت سے پتہ چلا کہ دو اہلِ مغرب جو نہایت صالح، فیاض اور عابد ہیں، رہ گئے ہیں۔ ان کو بھی بلا لیا گیا۔ سلطان نے دیکھتے ہی ان کو پہچان لیا۔ ان کو حفاظت میں دیا گیا۔ خود سلطان ان کے مکان پر گیا۔ جستجو سے پتہ لگ گیا۔ ایک نقب اس مکان سے حجرہ مبارکہ کی جانب کھودی جارہی ہے۔ اب تو خوب تفتیش کی گئی۔ دونوں نے اقبال کر لیا کہ وہ دونوں نصرانی ہیں۔ ان کو ان کے بادشاہ نے لاش مبارک نکال لانے کے لیے بھیجا ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ روزانہ مٹی جو نقب سے نکالا کرتے تھے۔

چر می تھیلوں میں بھر کر جنت البقیع کی جانب جہاں وہ زیارت کرنے کے بہانہ سے جایا کرتے تھے پھینک آیا کرتے تھے۔ ان حالات کے معلوم ہونے پر سلطان کی عجیب حالت ہوئی۔ وہ زار زار روتا تھا اور اسے صبر نہ آتا تھا۔ تب اس نے روضہ مبارکہ کے گرداگرد خندق نکلوا کر اسے سیسہ سے بھروادیا۔ اس واقعہ کا ذکر فقیہ الحکم الدین یعقوب بن ابی بکر نے بھی معہ سلسلۂ روات خود کیا ہے۔ مؤرخ مطیریؒ کے بیان سے بھی واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نے واقعہ کو ۵۵۷ھ کا بتایا ہے۔

الغرض نور الدین شہیدؒ نے خندق پر رصاص کے اوپر جنگلا بنوادیا تھا۔ سلطان رکن الدین بیبرس نے ۶۹۴ھ میں دوسرا جنگلہ بدل دیا۔ جو قد آدم تھا۔ اس میں تین دروازے بھی رکھے گئے۔

زین الدین العادل نے ۶۹۳ھ میں جالی دار جنگلے کو مسجد کی چھت تک بلند کر دیا۔ سلطان الظاہر چقمق نے ۸۵۳ھ میں جنگلے کو مسقف کر دیا نیچے ریشمی چادر کی چھت لگادی گئی۔

جب اسے آتش زدگی نے تباہ کر دیا۔ تب ۸۸۶ھ میں موجودہ مقصورہ سنگ رخام کے ستونوں اور محرابوں کا تیار کیا گیا۔ گنبد عالی جسے اب قبۂ خضراء سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی مقصورہ کی دیواروں کے اوپر ہے۔

حظار مزور احاطہ حرمت والا

مقصورہ کی مربع عمارت کی جالیوں میں سے اندر نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایک اور عمارت ہے۔ جو مخمس یا مسدس نما ہے۔ یہ عمارت نہایت قیمتی احجار سے بنائی گئی ہے۔ اس حظار کو ۸۸ھ میں عمر بن عبدالعزیزؒ (مجدد مأتہ اول) (یعنی پہلی صدی ہجری کے مجدد) نے بحکم ولید بن عبدالملک تیار کرایا تھا اور باقی حصہ کو چھوڑ کر اس کی زیب و آرائش کا بڑا اہتمام کیا تھا۔ ولید نے اس کفایت کی وجہ پوچھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ بولے کہ صرف اتنے ہی حصہ میں ۴۵ ہزار دینار سرخ کا مصارف ہو چکا ہے' ولید نے جواب میں کہا : کَاَنَّکَ تُنفِقُهَا مِنْ مَالِکَ کیا تم اپنے مال سے خرچ کر رہے ہو۔

حظار کو نیک دل عمر بن عبدالعزیزؒ نے مخمس و مسدس نما بنوایا۔ مربع اس لیے نہ بنوایا کہ لوگ اسے "مثیل کعبہ" سمجھ کر کہیں اس کا طواف ہی نہ کرنے لگ جائیں۔　　　اب اس تمام

عمارت پر از سر تا پا کسوہ پڑی ہوتی ہے 'یعنی عمارت کا سراپا لباس سے ملبوس ہے.

لباس حظار کی تاریخ

سب سے پہلے ہارون رشیدؒ کی والدہ خیزران خاتون نے ۱۷۰ ھ میں اس پر ریشمی پردے چڑھائے تھے۔ پھر وزیر مصر "صالح" کے داماد امیر حسین بن ابی الہیجاء نے اس پر دبق (دیبا) ابیض کا کسوہ چڑھایا۔ اس کے وسط میں حریر احمر کا پٹکا تھا۔ اس پر سورہ یٰسین کاڑھی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ مستضئ بامر اللہ کے عہد میں ہوا۔ پھر ناصر لدین اللہ نے سیاہ ریشم کا کسوت بھیجا۔ جو سابقہ کسوہ کے اوپر چڑھایا گیا۔ پھر ۷۶۰ ھ میں سلطان صالح اسماعیل بن ناصر محمد نے ایک بڑی جاگیر وقف کر دی۔ جس کی آمدنی سے کسوہ کعبہ ہر سال اور کسوہ حظار مزور ہر پانچ سال بعد تبدیل ہوتی رہی۔ جب سے سلاطین آل عثمان نے خادم الحرمین ہونے کی عزت پائی ہے 'تب سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ حظار مزور کا لباس ہر ایک سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر تبدیل ہوتا ہے۔ موجودہ کسوہ سلطان عبدالحمید خان غازی کی تخت نشینی کے موقع کا ہے۔ جسے چالیس سال ہو چکے ہیں.

عبدالحمید خان غازی کے بعد جلد جلد انقلاب ہوتے رہے اور کسوہ تیار نہیں ہوا۔ اس کسوہ پر قریباً ۱۰ فٹ کی بلندی پر حزام (پٹکا) لگا ہوا ہے۔ جو سرخ مخمل کا ہے۔ اس پر سونے کی تاروں سے ابھرے ہوئے حروف میں سورۂ اِنَّافَتَحۡنَا مکمل تحریر ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ دیوار جنوبی سے شروع ہو کر غربی 'شمالی دیواروں پر ہوتی ہوئی شرقی دیوار کے کونہ پر ختم ہوتی ہے.

حزام سے نیچے دیوار پر (جس طرف کھڑے ہو کر سلام عرض کیا جاتا ہے) 'چار کتبے لگے ہوئے ہیں۔ یا کہنا چاہئے ٹانکے ہوئے ہیں۔ یہ بھی سرخ مخمل کے ہیں۔ سونے کی تاروں کے حروف بنائے گئے ہیں۔ صورت یہ ہے.

هٰذَا قَبۡرُ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ لَآاِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ۔

هٰذَا قَبۡرُ اَبِیۡ بَکۡرِ الصَّدِّیۡقِ رضی اللّٰهُ عَنۡهُ

هٰذَا قَبۡرُ عُمَرَ الۡفَارُوۡقِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُ

قبور پر نور کے رخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بالین مبارک بجانب غرب ہے اور قدم صدق بجانب شرق ہیں۔ وجہ نورانی بجانب جنوب کیونکہ مدینہ منورہ میں جنوب ہی سمت قبلہ ہے:

حضور ﷺ اور حضور ﷺ کے وزرائے صدق کے چہرہ ہائے انور کے مقابل گول گول شباکے (روشن دان) نحاسی کواڑوں میں ڈھلے ہوئے ہیں تاکہ سلام پڑھنے والا وجہ انور کے سامنے حاضر ہو کر سلام عرض کر سکے۔

مقصورہ اور حظار کے درمیان ہر چہار جانب اندازاً ۷ فٹ سے ۱۰ فٹ تک جگہ چھٹی ہوتی ہے۔ جس سے مقصورہ بطور برآمدہ کے بن گیا ہے۔ اس درمیانی جگہ کا فرش نہایت قیمتی احجار بو قلموں سے بنایا گیا ہے۔

"ام المومنین صدیقہ امت نجیبہ رسول ﷺ عائشہ طیبہ کا گھر"

یعنی

سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حجرہ انور و مرقد مطہر

یہ حجرہ حظار مزور کے اندر ہے ہجرت کے سال اول میں تیار اور شوال ۲ھ کو صدیقہؓ کی رونق افروزی سے آباد ہوا تھا۔ اور اس کی دیواریں کچی اینٹ کی ہیں۔

۸۸۸ھ میں بعہد سلطان قایت بای خان حظار مزور کی مرمت کی گئی تھی۔ اس وقت اس کی سنگین دیواروں کے عرض میں ایک اینٹ کچی ملی تھی۔ ڈیڑھ فٹ لمبی ۳/۴ فٹ چوڑی ۱/۴ فٹ موٹی اس وقت قیاس کیا گیا تھا کہ یہ خشت حجرہ پاک کی ہے، جسے یمن و برکت کے لیے حظار کی سنگین دیوار میں رکھ دیا گیا ہے۔ روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حجرہ مبارکہ کا ایک دروازہ جانب شرق تھا۔ عام آمد و رفت اسی دروازہ سے تھی۔ دروازہ میں یک تختی پھاٹک لگا ہوا تھا۔ اسی کے بالمقابل جانب غرب ایک چھوٹا دروازہ یا طاقی تھی۔ جو مسجد کی جانب کھلتی تھی۔ یہ طاق مسقف حجرہ کی دیوار میں تھی۔

حجرہ کے باہر صحن تھا۔ صحن کی جانب چھوٹا کوچہ اور کوچے سے پرے ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ۔ صحن کی شمالی جانب مثلث نما جگہ تھی۔ مثلث کے وسطی کونہ میں ایک طاقی

تھی۔ جو سیدہ بتول زہرا علیہ السلام کے صحن خانہ میں کھلتی تھی۔ طاق کے برابر ہی تھوڑی بلندی کا چبوترہ تھا۔ جس پر عام طور پر نشست کی جاتی اور نوافل ادا کئے جاتے تھے۔ حجرہ مستطیل تھا اس کا طول شرقاً غرباً تھا۔

حجرہ پاک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کی قبور بن جانے تک کوئی تغیر نہیں ہوا تھا لیکن جب عمر فاروقؓ بھی اسی جگہ دفن ہوئے۔ تب عائشہ طیبہؓ نے اپنی رہائش گاہ اور قبور کے درمیان ایک چھوٹی پردہ کی دیوار اٹھوا دی۔ ام المومنینؓ کا بیان ہے' کہ عمرؓ کی قبر بننے سے پیشتر میں یہاں بے تکلفانہ رہا کرتی تھی۔ سر ڈھانپنے یا کھلا رہ جانے کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہاں میرا شوہر ہیں یا میرا باپ ہیں' لیکن تدفین عمرؓ کے بعد یہاں پورے لباس کے بغیر کبھی نہیں آئی۔

ام المومنینؓ کے اس تقویٰ وورع پر غور کرو۔ ان کی غایت ستر و حجاب کا اندازہ لگاؤ کہ غیر محرم کی قبر سے اگرچہ وہ فاروق اعظم ہی تھے' اتنا ہی حجاب کیا جس قدر ان کی زندگی میں مرعی تھا' حالانکہ حجاب کرنے والی وہ ہے جو بحکم قرآنی اس میت کی ام ایمانی ہے۔ اس واقعہ سے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو خاص سبق لینا چاہئے۔

عائشہ صدیقہؓ کی حیات طیبہ تک حجرہ مبارک کھلا رہتا تھا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم حجرہ کے دروازہ شرقی پر حاضر ہوتے اور ان الفاظ میں سلام عرض کرتے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

پھر مسجد میں حاضر ہوتے۔ صدیقؓ و فاروقؓ کے دفن کے بعد پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرتے۔ پھر کہا کرتے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَااَبَابَكْرِ الصِّدِّيْقَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَااَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ۔

جب کسی صحابیؓ نے اندر آنا ہوتا۔ تو صدیقہؓ کی اجازت کے بعد اندر بھی حاضر ہو جاتے۔ ۱۷ رمضان ۵۷ھ کو صدیقہؓ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد حجرہ مبارک کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور ۸۸ھ میں اس تمام حجرہ کو حظار مزور کے اندر محفوظ کر دیا گیا۔

قبور پر نور کی حالت وقوعی

حجرہ مبارک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر حجرہ کی دیوار خام جنوبی کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ تدفین کے بعد جب بلال رضی اللہ عنہ قبر پر پانی چھڑکنے لگے تو دیوار جنوبی اور قبر کے درمیان بلالؓ کے کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اُدرے کھڑے کھڑے پانی جنوبی پہلو پر چھڑکا تھا (روایت ابن عساکر)۔ اس سے صاف طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ جب قبر کا بالائی حصہ سطح زمین پر دیوار سے اتنا قریب تھا۔ تو آئمہ کبار کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ لحد مبارک دیوار جنوبی کے تحت میں تھی۔ (امام شافعیؒ نے اس کو حزماً بیان کیا ہے)۔

گویا عصمت ربانی نے یہ حفاظت کر دی کہ کسی ذی روح کا پاؤں بھولے سے بھی اوپر نہ رکھا جائے۔ خلیفۃ الرسول ابو بکر صدیقؓ کی قبر حضور ﷺ کی قبر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اس سے شمال کو ہے۔ صدیقؓ کا سر حضور ﷺ کے شانہ مبارک کے برابر رکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کی قبر جانب بالیں سے نیچے کو ہٹی ہوئی ہے۔ فاروقؓ کی قبر صدیقؓ امت کی قبر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اس سے جانب شمال کو ہے۔ فاروقؓ کا سر صدیقؓ کے شانہ کے برابر ہے۔ عمرؓ کے قدم حجرہ کی دیوار شرقی تک پہنچ گئے ہیں۔ ۸۸ھ میں جب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ حظار مزور کی بنیاد بموجودگی اولاد صحابہ کھدوا رہے تھے۔ تب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے قدم برہنہ ہو گئے تھے۔ دیکھا کہ کفن بھی میلا نہ ہوا۔

ہمارے اس تمام بیان سے (جو عنوانات مقصورہ شریف' حظار مزور' اور حجرہ مبارکہ کی تحت میں ہوا ہے) ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ سرور عالم فخر آدم وولد آدم کا کچا حجرہ مبارکہ اب تک اصل صورت میں' اصلی حالت میں موجود و قائم ہے۔ دنیا میں کسی اور نبی یا رسول کے گھر اور قبر کی حفاظت قدرت الٰہیہ کی جانب سے ایسی نہیں ہوئی۔ دیگر انبیا علیہم السلام کی قبور کا اول تو پتہ ہی نہیں اور جن چند قبور کے نشانات بنے ہوئے بھی ہیں وہ بھی ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔

اس صلی حجرہ میں ۸۸ھ کے بعد داخل ہونے کا شرف بہت کم بزرگوں کو حاصل ہوا ہے۔ اور جن بزرگوں کو یہ عزت حاصل ہوئی۔ ان کا ذکر تاریخ اسلامیہ میں درج ہے۔

۵۴۸ھ کا واقعہ ہے کہ حجرہ شریفہ کے اندر ایک دھماکہ کی آواز سنی گئی۔ خلیفہ کی منظوری سے شیخ الشیوخ عمر الشاہی الموصلی کو جو مدت سے مقیم آستانہ تھے حظار مزور کی چھت سے اندر پہنچایا گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ دیوار غربی سے کچھ اینٹیں چھٹ کر گر گئی ہیں اور ٹوٹ گئی ہیں۔ ان کی اطلاع دہی پر خاک پاک مسجد نبوی سے خشت بنا کر اندر پہنچائی گئیں۔ انہوں نے دیوار درست کر دی۔ قبور پر جو مٹی گر گئی تھی۔ اسے انہوں نے جاروب ریش سفید سے صاف کر دیا۔

ابوالحسن علی نور الدین بن عبداللہ السمہودیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) مصنف کتاب خلاصۃ الوفا باخبار دارالمصطفیٰ بھی ان بندگان خاص میں سے ہیں۔ جن کو حجرہ منورہ کی ارض مقدسہ دیکھنے کی دولت جاوید حاصل ہوئی تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب عمارت قایت بای (از ۸۸۱ تا ۸۸۸ھ) بن رہی تھی۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ جب مٹی ہٹاتے ہٹاتے حجرہ منورہ کی اصلی زمین بر آمد ہوئی تو ایسی روائح طیبہ سے دماغ شام معطر ہوا۔ آج تک کسی عطر میں ایسی خوشبو نہ پائی گئی تھی۔

بطیب رَسُولِ اللّٰہِ طَابَ نَسِیمُھَا

فَماالمِسْکُ مَا الکافُورُ مَا مُنْدَلُ الرُّطَبِ

۳۔ مرقع حجاز .... از خاموش فتح پوری

مرقع حجاز جناب ابوالقلم خاموش فتح پوری کے سفر حرمین شریفین کی خوبصورت داستان ہے۔ خاموش صاحب اخبار دلچسپ فتحپور کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا تعلق آگرہ سے تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۴ء میں حج کیا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں ٹھیرے رہے۔ مدینہ منورہ کی زیارت کرتے رہے اور طائف کا سفر اختیار کیا۔ اگلے سال ۱۹۳۵ء میں دوسرا حج کرنے کے بعد وطن کو مراجعت کی۔ اس طرح وہ سوا سال تک حجاز مقدس میں مقیم رہے۔

۸ر فروری ۱۹۳۴ء کو آگرہ سے روانگی ہوئی اور پانچ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کا جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم مرقع حجاز کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

یا اللہ! تیرے کعبہ کا حج کروڑوں نے کیا اور تیرے حبیب ﷺ کے دیار مقدس کی زیارت بھی بے شمار پروانوں نے کی' مگر اس طرح کہ پتھر کو چوما' پتھر پر دوڑے' پتھر کے کنکر مارے تو پتھروں کے میدانوں میں دن بھر ٹھہرے اور چلے آئے۔ مگر تیرے بندے حسن الدین خاموش نے تیری ہر ادا کو اسی نظر سے دیکھا جس کی ضرورت تھی اور تیرے بندوں کے اس مفاد کو سامنے رکھا جس کے لیے تو نے حج کا حکم دیا تھا۔"

مرقع حجاز کا تعارف سید غلام بھیک نیرنگ ایڈووکیٹ انبالہ نے کر لیا ہے:

"حضرت خاموش ایک ممتاز اہل قلم ہیں اور ایک عملی کام کرنے والے بزرگ۔ ان کے لکھنے کا انداز ایسا ہے کہ عرب کی معاشرت کی بولتی چالتی تصویریں نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے قیام حجاز کے زمانے میں بعض اصلاحات نافذ کرانے کی سعی بھی کی' مثلاً حرم بیت اللہ میں گداگری کی روک تھام یا عربی مصنوعات کو بطور تبرک خریدنے کی تحریک یا مکہ معظمہ میں حکومت کے زیر اہتمام ایک محتاج خانہ قائم کرنا۔ گویا مرقع حجاز دلچسپ ہونے کے علاوہ مفید بھی ہے کہ اس میں جابجا اہل عرب کی موجودہ حالت کو تعلیمی و اقتصادی نقطۂ نظر سے بہتر بنانے کے عملی طریقے بیان کئے گئے ہیں"

ابوالقلم خاموش صاحب کا یہ سفرنامہ حجاز کے بارے میں معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ اس میں دینی معلومات اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا آنکھوں دیکھا حال ملتا ہے۔ علاوہ ازیں وہاں کے رسم و رواج' تعلیمی حالت' حکومت کے انتظامات' عیدین کے اسلامی تہوار' زبان خوراک اور پوشاک' شادی بیاہ اور خواتین کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہر موقع کے مطابق دعائیں اور اذکار بھی تحریر کر دیئے ہیں۔ گداگری کے انسداد کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں عربی مصنوعات کی ایک باقاعدہ دوکان کھلوادی' جہاں بدو اور دوسرے عرب کاریگروں کی تیار کردہ اشیا فروخت کی جاتی تھیں۔ وہ تعلیمی اداروں اور بالخصوص اہل ہند کی طرف سے قائم کردہ مدارس اور ہندوستان کے بعض والیانِ ریاست' حیدر آباد دکن' بھوپال اور بہاولپور کے تعمیر کردہ رباطات اور مالی معاونت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ حجاز مقدس میں مقیم مہاجرین ہند کا پتہ بھی اس مرقع حجاز میں ملتا ہے۔

وہ اہل عرب کی فلاح و بہبود کے سنجیدگی سے خواہاں نظر آتے ہیں اور کسی گداگر کو حرم شریف کے نواح میں دیکھ کر انہیں دلی رکھ کا احساس ہوتا ہے۔

مرقع حجاز مکہ معظمہ' مدینہ منورہ اور طائف کا ایک خوبصورت روزنامچہ ہے۔ اسے ارض مقدس کی مذہبی' تمدنی اور سیاسی زندگی کی منہ بولتی تصویر کہنا مناسب ہوگا۔

ابوالقلم خاموش جگہ جگہ آل سعود کے حکمرانوں اور ان کے زمانے میں قائم شدہ امن و امان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ انہیں سلطان عبدالعزیز کی ضیافت میں شرکت اور کئی بار ان سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔

سفر نامہ سعادت

(از محمد عبدالوہاب صفدر جنگ)

راجپوتانے کی مشہور مسلم ریاست ٹونک کے نواب محمد علی خان صولت جنگ کے صاجزادے نجم الامراء حافظ' حاجی مولوی قاری محمد عبدالوہاب صفدر جنگ نے ۱۳۳۱ھ بر ۱۹۱۳ء میں مع اپنی اہلیہ و متعلقین حج بیت اللہ شریف کیا۔ سفر نامہ سعادت اسی مبارک سفر کی روداد ہے جو ۱۳۵۳ھ میں محبوب المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔

یہ سفر اس لحاظ سے خاصا منفرد اور دلچسپ ہے کہ ان عازمین حجاز نے بمبئی سے سیدھا جدہ جانے کی بجائے نہر سویز کی بندرگاہ پورٹ سعید کا رخ کیا اور پھر وہاں سے فلسطین اور شام سے ہوتے ہوئے سرزمین حجاز پہنچے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ اگر "بمبئی" سے جدہ جائیں تو راستے میں دس دن کے لیے قرنطینہ میں رہنا پڑتا ہے' مگر پورٹ سعید اور فلسطین و شام کے راستے جایا جائے تو چونکہ یہ سب علاقے سلطان معظم' یعنی عثمانی خلیفہ کے ہیں اس لیے قرنطینہ کی حاجت نہیں ہوتی۔

بمبئی سے پورٹ سعید تک پہنچنے میں سترہ دن صرف ہوے۔ یہاں سے بحری جہاز میں فلسطین کے شہر یافہ گئے اور یافہ سے ریل کے ذریعہ بیت المقدس کا سفر اختیار کیا۔ مسجد اقصیٰ اور مزارات انبیا کرام' قبۃ الصخرہ اور دیگر مشہور مقامات پر حاضری دی۔ پھر یافہ کو لوٹے اور سمندری راستے سے حیفا روانہ ہوئے۔ حیفا سے بذریعہ ریل دمشق کا سفر کیا۔ دمشق میں کئی دن کے قیام کے بعد بذریعہ حجاز ریلوے مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی۔ مدینہ منورہ میں چودہ دن تک حاضر رہنے کے بعد ۲۲ر ذوالقعدہ ۱۳۳۱ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر ۳ر ذوالحجہ کو مکہ معظمہ پہنچے اور حج کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک اونٹ کی سواری لازم تھی۔ راستہ لمبا اور پر خطر عموماً راتوں کو کئی محفوظ مقام پر قیام کرنا پڑتا۔ ساتھ مصری قافلے والے بھی تھے جو بالعموم بندوقیں چلاتے جاتے تھے تاکہ ارد گرد کے رہنے والوں کو پتہ چلتا رہے کہ مسافر خالی ہاتھ نہیں' مسلح ہیں۔

سفر نامہ سعادت ایک نیک نہاد نواب زادے کا جذب و شوق میں ڈوبا ہوا بیان مکہ و مدینہ ہے۔ بمبئی' عدن' پورٹ سعید' یافا' حیفا' بیت المقدس' دمشق' مدینہ منورہ' مکہ معظمہ تمام شہروں کے جہاں جہاں وہ مقیم رہے دل کش انداز میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ مکہ معظمہ' مدینہ منورہ' حرم شریف' روضہ نبوی اور مسجد نبوی ﷺ کا حسین پیرائے میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ مدینہ منورہ کے تمام متبرک مقامات کی زیارت اور ان کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔

ان کے ہاں حالات و کوائف کا گہرا مشاہدہ ملتا ہے۔ بالخصوص دمشق' بیت المقدس' ارض فلسطین اور مدینہ منورہ کے حالات نہایت تفصیل سے قلمبند کیے گئے ہیں جو معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہیں۔ نہر سویز کے بارے میں بھی اس میں بہت سی تفصیلات لکھتی ہیں۔ دمشق میں انہوں نے مصر سے غلاف کعبہ کی آمد اور وہاں سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو اس کی روانگی کا منظر نہایت خوبی سے نذر قارئین کیا ہے کہ اس کا حسین منظر نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ حجاز ریلوے میں سفر کی جزئیات کا بیان نہایت عمدہ ہے۔ پہاڑوں میں چکر کھاتی ہوئی ریلوے لائن اور سرنگوں تک کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حیفا سے دمشق تک ۲۵ ریلوے اسٹیشن آتے ہیں' جبکہ دمشق سے مدینہ منورہ تک ریلوے اسٹیشنوں کی کل تعداد اناسی (۷۹) ہے' جن میں مشہور ترین زرقا' عمان' معان' تبوک اور مدائن صالح ہیں۔ ریل کے ڈبوں کا حال بھی بیان کرتے ہیں۔ حیفا سے براستہ دمشق مدینہ منورہ تک کا کرایہ فی کس ستاون روپیہ تین پائی ہے۔ راستے میں جہاں جہاں سلطانی فوج موجود ہے اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب جو ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کو ٹونک سے روانہ ہوئے تھے ۵ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ ۴ دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنے وطن محمد آباد عرف ٹونک میں سفر فائز المرام ہوئے اور حسب سابق اپنے عہدے کے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اب حضرت موصوف کو عبادت الٰہی میں بہت ہی زیادہ شغف و انہماک ہو گیا تھا" انہوں نے خود ہی اس سفر حرمین شریفین کا قطعۂ تاریخ لکھا:

حالات لکھ چکا سفر حج کے جب تمام
فضل خدا سے طبع رسانے جو کی کمک
آیا خیال دل میں میرے نام و سال کا
تاریخی نام اس کا ہوا اختر فلک
(۱۳۳۱ھ)

ارض فلسطین کے بارے میں لکھتے ہیں:

(ریل کے سفر میں) راستے میں زراعت ربیع بھی دیکھی گئی اور پہاڑوں پر درخت بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس طرف کے اہلِ دیہات کے مکان پختہ ہیں۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں عجب طرح کا موڑ دے کر ریل کو لے گئے ہیں۔ یہ مواقع بھی ایسے لائق دید ہیں کہ ان کا حظہ ہرگز بیان سے محسوس نہیں ہو سکتا' تاوقت کہ اپنی آنکھ سے دیکھے نہ جائیں.

پہاڑوں پر انگور وانجیر و زیتون وغیرہ کی جھاڑیاں لگی ہوئی ہیں...... ان پہاڑوں میں زراعت پیاز' لہسن گاجر' بینگن وغیرہ کے دیکھنے میں آئے اور انگور تو بالکل ایسے ہی کثرت کے ساتھ ہیں جیسے ہمارے ملک میں پہاڑوں پر جھاڑیاں ہوتی ہیں' اس کوہستانی ملک میں زیتون اور انگور کے باغ پہاڑوں میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ البتہ ان کو دیکھ کر عجیب لطف آتا ہے' یعنی پہاڑ کو بھی درجہ بدرجہ ایک زینہ وسیع کی مانند بنا رکھا ہے اور ہر درجہ پر انگور و زیتون وانجیر کے درخت لگے ہوئے ہیں اور ماسوا اس کے دیگر زراعت بھی ہوتی ہے۔ یہ منظر بھی لائق دید ہے۔ تمام پہاڑوں پر دیہات آباد ہیں اور مساجد بھی بنی ہوئی ہیں تخمیناً پندرہ سولہ میل تک ان پہاڑوں کے بیچ میں ہو کر ریل جاتی ہے اور تمام جنگل نہایت سرسبز و بے انتہا رونق دار اور بغایت پر بہار ہے:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یہ سب حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ السلام کی دعا کی برکت ہے۔ پھر قریب مغرب کے اسٹیشن بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ یہ اسٹیشن کوئی ایسا بڑا مکان نہیں ہے' صرف معمولی سا بنا ہوا ہے۔ یہاں سے بگھیوں میں سوار ہو کر ایک مکان میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان تکیہ کے نام سے مشہور

ہے اور شہر کے اندر دروازہ شہر کے قریب ہی واقع ہے۔ اس دروازہ کا نام باب الرحمان ہے۔ اسٹیشن سے لیکر یہاں تک خوب آبادی ہے اور اسٹیشن سے اس جگہ کا جہاں ہم ٹھیرے ہیں تخمیناً دو میل کا فاصلہ ہوگا۔ خدائے تعالیٰ جل شانہٗ کے فضل و کرم سے میں اور میرے اہل محل و برخوردار عبدالحی خاں اور جملہ ہمراہیان بخیریت تمام یہاں پہنچے۔ شب کو اسی مکان میں آرام کیا۔ اسٹیشن سے یہاں تک نصاریٰ و یہود و مسلمانان بڑے بڑے سوداگروں کی دکانیں ہیں اور کس قدر غربا کی بھی آبادی ہے۔ یہ آبادی جدید ہے اور بہ نسبت قدیم آبادی کے کسی قدر کشادہ بھی ہے۔ سب سلطنتوں کے سفرا کے مکانات و خیرات خانہ اسی جدید آبادی میں واقع ہیں۔ ان مکانات کے اندر باغات بھی لگے ہوے ہیں۔ ہم نے شب کو مسجد اقصیٰ کہ بیت المقدس کا نام ہے دیکھی صبح صادق کے وقت ہم مسجد میں گئے اور حنفی مصلی پر نماز جماعت سے ادا کی۔ جس جگہ صخرہ ہے وہی مصلی حنفی ہے۔ یہ صخرہ ایک بڑا پتھر ہے جو گنبد کے اندر ہے۔ عوام کہتے ہیں کہ یہ پہلے گنبد کے اندر معلق تھا، مگر اب تو وہ گنبد کی دیواروں پر لٹکا ہوا ہے۔ یہ گنبد بہت عمدہ بنا ہوا ہے۔ اس کے ستون معمولی پتھروں کے تراشے ہوے ہیں اور موقع موقع پر سنگ مرمر کے ستون بھی ہیں اور دیگر کئی قسم کے پتھروں کے ستون ہیں۔ ان سب پر سونے کا کام ہو رہا ہے انہیں ستوں پر گنبد یا قبہ ہے اور اس قبہ کے اندر صخرہ ہے اور صخرہ کے بیچ میں ایک سوراخ ہے۔ یہاں کے آدمی ایسا بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی سوراخ کے جگہ سے معراج ہوئی ہے، مگر یہ سندی روایت نہیں ہے۔

شب معراج عروج توز افلاک گذشت مقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

حضر علی نبینا و علیہ السلام کا مصلی صخرہ سے بجانب شمال ہے اور اسی جانب جبرئیل علیہ السلام کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ کرسی کی بیٹھک کے برابر وسیع اور اس قدر بلند ایک چبوترہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹھنے اور عبادت کرنے کی جگہ قبہ صخرہ جانب غرب ہے۔ یہ بھی اسی وضع کی بنی ہوئی ہے اور اس کے مغرب کی جانب حضرت داؤد و حضرت سلیمان علی نبینا و علیہما السلام کی جگہ اسی شکل کی بنی ہوئی ہے اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سر آمد عمامہ مبارک کا نشان میں ایک گڑھے کی شکل میں نمایاں ہے، جیسا کہ یہاں کے لوگ بیان کرتے ہیں اور ایک ۔کا۔ ارواح ہے۔ یہ ایک کنواں ہے یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ سب انبیا علیہم

السلام کی ارواح جمعرات کو جمع ہوتی ہیں' واللہ علم۔

قبہ صخرہ کی جانب شرق مسجد کی دیوار احاطہ کے گوشہ میں حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام و حضرت مریم علی نبینا و علیہا السلام کی عبادت و رہنے کی جگہ بنی ہوئی ہے اور اسی جانب کچھ فرق سے حضرت سلیمان علی نبینا و علیہ السلام کی قبر مختلف فیہ ہے' یعنی بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی کرسی ہے اور اسی جانب باب الرحمۃ' باب توبہ ہے اور پل صراط کی بھی نشانی بنی ہوئی ہے اور مسجد اقصیٰ کے نیچے ہے' یعنی مسجد اس کی چھت پر ہے اور یہ چھت اب روئے زمین کے ساتھ ایسی مسطح ہو گئی ہے کہ زائرین ایک نیچے جانے والے زینہ سے اتر کر اس کے اندر جاتے ہیں۔ اس کے ستون بھی پتھر کے ہیں اور اس قدر موٹے اور لانبے ہیں کہ انسان کا کام ایسے پتھروں کے ستونوں کے اٹھانے کا ہرگز ہرگز نہیں معلوم ہوتا - یہ کام جنات کا ہے یا جر ثقل سے ممکن ہے۔ پس انہیں ستونوں سے دالان بناتے چلے گئے ہیں اور ان پر لداؤ کی چھت ڈال دی گئی ہے۔ یہ چھت تخمیناً ہزار گز طویل اور اس قدر عریض ہے اور اسی پر جدید مسجد اقصیٰ وغیرہ مکانات تعمیر ہیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ اب یہ قدیم عمارت ان جدید عمارات کی کرسی ہے' چنانچہ اس کے اوپر عبدالملک بن مروان نے بھی مسجد نہایت عمدہ تعمیر کی ہے فی الحال انہیں دونوں کو یعنی اس جدید مسجد اقصیٰ اور مسجد عبدالملک کو مسجد اقصیٰ کہتے ہیں اور اسی جدید مسجد اقصیٰ میں شافعی مذہب کے امام نماز پڑھاتے ہیں اور باعتبار مکانیت کے یہ ایک اچھی بڑی مسجد ہے۔ اس میں صرف شمال کی جانب تین دروازے ہیں جو نماز کے وقت کھول دیئے جاتے ہیں اور باقی تینوں سمت میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ تین طرف سے بند ہے اور اس میں بجائے جانماز کے قالین کا فرش ہے اور ستون وغیرہ پر سنہری کام ہو رہا ہے۔ جھاڑ وغیرہ بھی بائین شائستہ آویزاں ہیں۔ البتہ بہت بڑی مسجد ہے جو حسب بیان بالا وسعت میں تقریباً ہزار گز کی مساحت میں پھیلی ہوئی ہے اور اس جدید مسجد اقصیٰ کی اور پرانی مسجد جو کہ نیچے ہے۔ اس کے قریب ہی دالان کی شکل میں بقول وہاں کے اشخاص کے طویلہ حضرت سلیمان علی نبینا و علیہ السلام کا ہے۔ اس کی چنائی کے کام میں بھی بڑے بڑے پتھر لگے ہیں۔ مجھ سے اس دالان کی نسبت طویلہ ہونا ہی بیان کیا گیا ہے' یہ نہیں معلوم کہ دالان بھی تھا یا کہ فی الواقع طویلہ تھا اور اب جو مسجد اقصیٰ موجود ہے اس کا صحن بقدر حاجت نمازیاں سنگ مرمر کا بنا ہوا

ہے۔ سلطان عبدالعزیز خان مرحوم کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس خیر کے عمل کا اجر جزیل دے اور باقی بہت سا صحن خام بھی گیا ہے اور جس جگہ صخرہ ہے وہ موقع بلند ہے اور اسی کے سلسلہ میں بہت دور تک جانب جنوب ایک بڑا اور بلند میدان چلا گیا ہے اور اس کے اوپر سے نیچے اتر آنے کے لیے ایک زینہ بنا ہوا ہے اس زینہ کے ذریعہ سے نیچے اتر کر پھر ایک میدان میں داخل ہوتے ہیں اور اس میدان کے پاس ایک حوض ہے اس حوض میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور لوگ اسی کو حوض کوثر کہتے ہیں۔ اس کے چوطرف پانی نکالنے کے پیچ بنے ہوئے ہیں۔ ان کو کھول کر مصلی وضو کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر ایک میدان ہے اور اس میدان کو طے کرنے کے بعد اس مقام میں داخل ہوتے ہیں' جہاں اب تہ خانہ کی حیثیت میں قدیم مسجد اقصیٰ ہے اور جو حسب بیان بالا تعمیر کردہ حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام ہے۔ غرض یہ کل قدیم مسجد اقصیٰ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بہت بڑی مسجد ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ موقعِ صخرہ اور اس کا چوطرف کا صحن حسب بیان بالا اس قدر اونچا ہے کہ اس کے سنگین زینہ پر چڑھ کر صحن میں داخل ہوتے ہیں یہ زینہ اس صحن کے چاروں طرف بنا ہوا ہے اور باعتبار بلندی ہر زینہ میں شاید پندرہ یا بیس سیڑھیاں تعمیر کی ہوئی ہیں اور ان چوطرفہ زینوں میں سے ہر یک طرف زینہ کے شروع پر تین تین دروازہ ہیں اور صحرا کی مشرق کی جانب ایک عمارت بشکل بارہ دری بنی ہوئی ہے اس کے باہر درجہ کے نو دروازہ ہیں اور اندر کی منزل کے چھ دروازہ ہیں ایسا بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی عدالت یعنی داودہی اور انصاف کرنے والا ایوان ہے۔ اب اس مسجد اقصیٰ کے بیان کو مختصر کر کے ہم شہر بیت المقدس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ یہ کہ چاروں گوشوں پر چار منارہ ہیں شہر پناہ اس شہر کی پختہ ہے سلطان سلیم خان غفر اللہ کے عہد میں تیار ہوئی ہے اور پھر جانب جنوب شہر کے ہم حضرت داؤد علیہ السلام کی مقدس قبر کی زیارت کرنے گئے اور پھر وہاں سے جانب شرق ایک بڑی جھیل پانی کی نظر آتی ہے۔ جب اس کی نسبت دریافت کیا گیا تو وہاں کے لوگوں نے بیان کیا کہ اس جگہ حضرت لوط علیٰ نبینا وعلیہ السلام قوم تباہ کی گئی ہے واللہ اعلم۔ پھر وہاں سے ہم حضرت سلیمان فارسی اور حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہما کے مزار مبارک پر گئے اور جس جگہ سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام آسمان پر تشریف لے گئے ہیں وہ جگہ بھی دیکھی۔ اور حضرت موسیٰ نبینا وعلیہ السلام

کے عصا کی جگہ دیکھی یہ سب زیارتیں کوہ سینا پر ہیں۔ حضرت عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار بلدیہ ہسپتال کے پاس ہے اور اسی جانب شرق ایک نشیب میں حضرت مریم علیہا السلام کی قبر ہے۔ نشیب میں اترنے کے لیے ایک زینہ اور بنا ہوا ہے۔ اس پر سے اتر کر ہم قبر شریف پر پہنچے۔ یہ ایک گنبد دار مقبرہ میں ہے اس وقت اس گنبد میں بہت ہی اندھیرا تھا' چنانچہ خادم نے بتیاں روشن کر دیں اور بآئین شائستہ زیارت کرائی۔ ان دنوں اس قبر شریف کی خدمت و غور و پرداخت کا تعلق نصاریٰ سے ہے ورنہ پہلے اس قدر تعلق نہیں تھا' پھر ہم قبہ خلیل الرحمٰن گئے .... راستے میں برلب سڑک ایک قصبہ ہے جس کو بیت اللحم کہتے ہیں .... الخ۔

○ ———————— ○

حرمین الشریفین کے سفر نامے اور بلوچستان

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر
صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی (کوئٹہ بلوچستان شاخ)

بلوچستان کے اہل قلم اور اہل دل کے یہ مختصر اور کہیں طویل سفر نامے (یا حج نامے) اردو، عربی، فارسی، بلوچی اور براہوئی (مع سندھی، انگریزی) میں تحریر کیے گئے ہیں۔ عہد حاضر کی تحدیات کے تناظر میں پروفیسر انور رومان کی تحریر "محسن انسانیت اور ہم" (ص ۴ تا ۶) نہایت جامع ہے اور مسلمانان عالم کے لیے ایک لائحہ عمل ہے۔

مسائل سفر اور حج (اردو)

اس کے مؤلف حاجی دولت علی کوئٹہ تھے۔ آپ چشمہ (نزد کوئٹہ) میں مقیم حضرت چشموی نقشبندی کے مرید تھے اور ان کی جملہ تصانیف کی اشاعت کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ ویسے نام و نمود کی خواہش نہیں تھی۔ خود بھی تصنیف و تالیف سے شغف تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویٹ تھے۔

موجودہ کتابچہ چھتیس صفحات پر مبنی ہے۔ اس پر سن اشاعت اور مطبع کا نام درج نہیں۔ حاجی دولت علی کئی بار حرمین شریفین اور دیار حبیب ﷺ کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے آخر کار اسی دیار پاک کے ہو رہے۔

یہ حاجی دولت علی کی مسافرت کا نچوڑ ہے۔ حجاج کرام کے لیے اس کا مطالعہ اہمیت و وقعت کا حامل ہے۔ طرز بیان اتنا متاثر کن ہے کہ قاری اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

روزنامچے (قلمی، اردو)

حضرت الحاج غلام دستگیر القادری ناشاد (فخر کشمیر) (۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء۔ ۱۴۰۶ھ ۱۹۸۶ء) رہنما تحریک پاکستان، امیر المجاہدین جہاد آزادی کشمیر، عالم با عمل، صوفی باصفا، دانشور، شاعر اور ادیب نو بار حج بیت اللہ شریف اور دیار حبیب ﷺ کی زیارت سے بہرہ یاب ہوئے۔ آپ نے اپنے روزنامچوں میں جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات کے تاریخی و روحانی احوال و حالات دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر قلمبند کیے ہیں۔ آپ کی تحریریں عقیدت و محبت کی رداء اوڑھے ہوئے ہیں۔ ان کی دعائیں انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہیں.

انداز بیان پر سوز، شگفتہ اور متاثر کن ہے۔ روحانی کیفیات سے دل و دماغ اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتے.

حرمین شریفین اور دیار حبیب ﷺ کی زیارتوں کے موقعہ پر آپ نے، اپنے خیالات جوش و جذبہ کے ساتھ فارسی اور اردو میں بھی پیش کیے ہیں۔ جن کا ذکر ان کے کلام کے مجموعوں (مثلاً پیر مغاں، کوئٹہ ۱۹۸۰ء) اور "سرور کونین ﷺ کی مہک بلوچستان میں" (ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ، ۱۹۹۷) میں ملتا ہے.

یہ روزنامچے قلمی صورت میں آپ کے لخت جگر سہ ماہی دستگیر، کوئٹہ کے مدیر اعلیٰ اور حضرت غلام دستگیر اکادمی پاکستان کے روح رواں اور ناشاد پبلشرز کوئٹہ کے کرتا دھرتا سلطان ارشد القادری کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہیں.

سفر حجاز مقدس (قلمی، اردو) رپورتاژ

سلطان العارفین حضرت محمد سلطان باہو اور الحاج غلام دستگیر القادری ناشاد کے خاندان کے ایک نامور محقق اور دانشور پروفیسر ڈاکٹر سلطان الطاف علی جو کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں دو بار (۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۷) حج بیت اللہ اور دیار حبیب ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے.

آپ نے جوش و جذبہ سے تاریخ وار رپورتاژ تیار کیا ہے جو غیر مطبوع ہے۔ مناسک حج کی ادائی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی وجدانی کیفیات بھی بیان کرتے ہیں۔ تاریخی پس منظر ہمیں بہت کچھ دے جاتا ہے۔ یہ رپورتاژ سرشاری کی کیفیت سے لبریز ہے۔ اور غیر مطبوعہ صورت میں ڈاکٹر سلطان الطاف علی کی ذاتی لائبریری کوئٹہ میں موجود ہے۔

بازیافت (رپورتاژ سفر حجاز اردو)

پروفیسر سید احمد سعید ہمدانی کئی سال تک محکمہ تعلیم بلوچستان سے وابستہ رہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں.

آپ کا یہ رپورتاژ سہ ماہی دستگیر' کوئٹہ (خصوصی شمارہ جلد نمبر ۶ شمارہ ۱ تا ۴) میں شائع ہوا ہے. (ص ۲۱ تا ۴۸)

آپ کا یہ رپورتاژ بہت دلچسپ' معلومات افزا اور روح پرور ہے اس میں قرآن و حدیث اور بزرگوں کے اقوال و اشعار سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے.

محسنِ انسانیت اور ہم

پروفیسر محمد انور رومان نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان کے ایک نامور محقق' دانشور' تاریخ دان' اور ماہر تعلیم ہیں۔ آپ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف' مؤلف اور مترجم ہیں.

آپ ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء میں حج بیت اللہ شریف اور دیار حبیب ﷺ کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس عظیم سفر سے واپسی پر آپ نے سب سے پہلے ۷ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ جون ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب سیرت پاک ﷺ کی خوشبو (لاہور' ۱۹۹۳ء ۱۹۹۶' ص ۱۳ تا ۱۵) کے لیے "محسنِ انسانیت اور ہم" تحریر کیا۔ جو بہت اثر پذیر ہے۔ اور دل و دماغ کو ایسے متاثر کرتا ہے کہ قاری عمل کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :

"مسجد نبوی ﷺ قدیم و جدید فن تعمیر کا ایک نادر اور جاذب دل و نگاہ نمونہ ہے اور اس کا مجموعی تاثر اسلامیت سے مالامال ہے۔ اس کی محرابیں' منبر' ماذنہ' ستون' مینار' فرش' دروازے' صفائی ستھرائی' آبِ زمزم کی باافراط فراہمی' صناعی' میناکاری سب قابل دید اور کشش انگیز ہیں۔ اس کے غسل خانوں اور وضو خانوں کا نظام اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کا زیر زمین ایرکنڈیشنر دنیا کا سب سے بڑا ایرکنڈیشنر ہے۔ اس میں ہوا اور روشنی کا انتظام لاجواب ہے۔ اس میں سال بھر عقیدت مندوں کے ہجوم لگے رہتے ہیں جو ایام الحج میں اپنی انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے سے آنے والے مسلمان وفورِ شوق سے جوق در جوق اشکبار آنکھوں اور رقت قلب سے سلام پیش کرتے ہوئے روضہ رسول ﷺ کے سامنے سے دیوانہ وار گزرتے ہیں لیکن مصداق :

مارا گلے از روئے تو چیدن نہ گزارند
چیدن چہ خیال است کہ دیدن نہ گزارند

اصحاب صفہ رضی اللہ عنھم' ماذنہ بلالؓ' منبر رسول ﷺ اور ریاض الجنہ پر شمع رسالت ﷺ کے پروانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں.

لیکن جب یہ مسجد سن ایک ہجری میں تعمیر کی گئی تھی تو یہ بالکل سیدھی سادی عمارت تھی۔ محراب' منبر' چھت اور فرش سے بے نیاز۔ اس میں چراغ کی روشنی تک نہ تھی نہ گرمی سردی سے بچاؤ تھا' نہ بارش سے.

لیکن اس میں جو ہستی متمکن تھی وہ بلاشک و شبہ دنیا کی عظیم ترین ہستی تھی۔ اتنی واسع الاخلاق کہ بد سے بدتر آدمی بھی ان کے پاس بیٹھ کر موم کی طرح پگھل جاتا تھا اور اٹھتا تھا تو ایک سراسر مختلف اور نئے آدمی میں ڈھل کر.

اتنی انسان دوست کہ ایک میلے کچیلے مزدور کے ہاتھوں کو مس کرتی تھی تو اس کی لکیریں شب چہاردہم کی شعاعوں کی طرح جگمگا اٹھتی تھیں.

ایسی گیتی نواز کہ پوری روئے زمین کو اپنی مسجد قرار دیتی تھی۔

اتنی مقلل الکثیر کہ دشمنوں کے غول کے غول ان کے سامنے کھجور کی سوکھی ٹہنی کی طرح سکڑ جاتے تھے۔

اتنی مکثر القلیل کہ ان کے معدودے چند ساتھی ان کی قیادت میں گھنگھور گھٹاؤں کی طرح فضاؤں میں چھا جاتے تھے۔

ایسی مثبت الاقدام کہ لوگوں کے اکھڑے ہوئے قدموں کو پہاڑ کی طرح جما دیتی تھی۔

آج کے عرب کی سب ریل پیل اسی ہستی بے پایاں کا فیض ہے۔

وہ فردِ واحد، وہ مردِ یکتا، وہ گوہر یک دانہ، وہ درِ یتیم، وہ محسنِ انسانیت ﷺ آج کرہ ارض کے سوا ارب انسانوں کی صورت میں رواں دواں ہے۔

محسنِ انسانیت ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنانا ہی "سیرت پاک ﷺ کی خوشبو" کا ماحصل ہے۔

معطر ہے دو عالم یا محمد ﷺ کیسی خوشبو ہے
کھلا ہے کیا کوئی حلقہ تری زلف معنبر کا

ترغیب الحجاج (بلوچی)

مولانا حضور بخش جتوئی مترجم قرآن مجید بلوچی کی حیثیت سے بہت شہرت کے مالک ہیں۔ آپ شیخ البلوچستان مولانا محمد فاضل درخانی (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء ـــ ۱۳۱۴ھ تا ۱۸۹۶ء) کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔

قرآن مجید کا یہ پہلا بلوچی ترجمہ ہے جو جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ میں مکمل ہوا اور ۱۳۲۹ھ میں ۱۲۲۴ صفحات پر مبنی ہندوستان سٹیم پریس لاہور میں چھپ کر ڈھاڈر بلوچستان سے شائع ہوا۔

آپ چالیس کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ آپ نے کئی دینی کتب جیسے 'قدوری (امام ابوالحسن احمد بن محمد بن احمد بن جعفر ۳۶۲ھ / ۹۷۲ء ـ ۴۲۸ھ

۱۰۳۷ء)' شمائل شریف (ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک ترمذی ۲۰۹ھ ۸۲۴ء۔ ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء) اور خلاصہ کیدانی (لطف اللہ نفلی' سن پیدائش و وفات دستیاب نہیں) وغیرہ کا بلوچی میں ترجمہ کیا۔

ترغیب الحجاج اسم با مسمّٰی ہے۔ اس کا نام فہرست کتب مکتبہ درخانی ڈھاڈر بلوچستان ۱۹۴۸ء میں درج ہے اور قیمت پانچ روپے تحریر ہے۔

فی الفراق (منظوم براہوئی)

بلوچستان کے عظیم بزرگوں میں ایک اہم شخصیت شیخ بلوچستان علامہ فاضل درخانیؒ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء ــ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) کے عہد کے ایک جید عالم اور شاعر ملک داد بن آدین غرشین کی روایت کو قائم و دائم رکھتے ہوئے نہ صرف براہویوں کے دلوں کو ایک بار پھر نور اسلام سے پابندہ کیا' بلکہ عالموں' فاضلوں' مفسروں اور مبلغوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس نے بلوچستان پر عیسائیت کی یلغار کو ہر طرح سے ناکام بنا دیا۔ اس گروہ میں علامہ محمد عمر دین پوری (م ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۷ء) کا نام نامی سر فہرست تھا۔

علامہ محمد عمر دین پوری بیک وقت مصنف' مبلغ' مترجم' مفسر' مؤلف اور فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی سیاسی کارکن بھی تھے۔ آپ نے اڑتالیس کتب براہوی زبان میں تصنیف و تالیف کیں اور اس اعتبار سے وہ براہوی کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا براہوی زبان کا ترجمہ (۱۴۲۸ صفحات' ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں طبع ہوا) ہے۔ جس کی شستگی کی تعریف کی گئی ہے۔

'فی الفراق' پہلی مرتبہ بتیس صفحات پر مشتمل ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں اسٹیم پریس لاہور میں چھپی اور علامہ محمد عمر دین پوری (مصنف) نے اسے خود شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چالیس صفحات پر مشتمل ۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو فقیر غلام حیدر بروہی نے اسٹینڈرڈ پریس سکھر میں چھپوا کر دین پور تعلقہ شکار پور سے شائع کیا۔

"فی الفراق" میں علامہ محمد عمر دین پوری نے حج بیت اللہ کے واقعات و تاثرات

بیان کیے ہیں۔ باری تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا ہے۔ حجر اسود کا بیان کچھ اس انداز سے ہے کہ اس گنہگار کی خوش بختی ہے کہ آج وہ اس عظیم و متبرک پتھر کو بوسہ دے رہا ہے جس کو حضور پاک سرورِ کائنات ﷺ کے مبارک و متبرک لبوں نے بوسہ دیا تھا"۔

علاوہ ازیں حج بیت اللہ' صفا و مروہ' احرام' مزدلفہ' منیٰ' غار ثور' غار حرا' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت گاہوں کا ذکر موجود ہے۔

"فی الفراق" میں حمد و نعت بھی شامل ہیں۔ سرور کونین ﷺ کی یاد اقدس میں فراقیہ اشعار موجود ہیں' عنوانات کچھ یوں ہیں :

۱۔ شافی روز محشر رسول ﷺ کو میں ہر گھڑی یاد کرتا ہوں۔

۲۔ باری تعالےٰ نے اپنے نبی ﷺ پر اپنی رحمت اور اپنا فضل نازل کیا۔

۳۔ سب سے افضل شان حضرت مصطفیٰ ﷺ کی ہے۔

۴۔ آؤ ہم نبی کریم ﷺ پر درود شریف پڑھیں (فضیلت درود شریف)۔

۵۔ مدینہ منورہ کے صدقے جاؤں (دوسرے شہروں کے مقابلہ میں مدینہ منورہ کی فضیلت)۔

۶۔ میرا دین و ایمان آپ ﷺ کے حوالے۔

۷۔ درود شریف پڑھنے والے کو ہر غم سے نجات ملی۔

۸۔ بے شک فضل رب کا اور شفقت مصطفیٰ ﷺ کی۔

۹۔ اگر دنیا میں نبی کریم ﷺ کا ظہور اقدس نہ ہوتا۔ دنیا میں دن کے وقت روشنی نہ ہوتی۔

ان عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف سچے عاشقان رسول ﷺ میں سے تھے۔ اسی لیے ان کے نعتیہ اشعار دل کی گہرائی اور گیرائی سے صفحہ قرطاس پر رقم ہوئے ہیں۔

معلم الحج (عربی' فارسی' اردو' براہوئی' سندھی' انگریزی)

حاجی گل محمد توشکوی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ معلم الحج' دو سو چالیس صفحات

پر مبنی ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ / ۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو مکمل ہوئی۔ یہ کتاب سعید آرٹ پریس حیدر آباد میں چھپی اور موئف نے اسے خود نوشکی بلوچستان سے شائع کیا۔ اس پر سن طباعت درج نہیں ہے، مگر آپ نے اپنی دوسری تالیف پاسکنادور (براہوئی، مطبوعہ ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء) میں اس کی اشاعت کا سن ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء تحریر کیا ہے۔

کتاب اسم با مسمی ہے۔ اس میں مناسک حج چھ زبانوں عربی، فارسی، اردو، براہوئی، سندھی، انگریزی میں درج ہیں۔

اس کتاب میں مناسک حج کے علاوہ مقامات مقدسہ کی دعائیں تحریر ہیں جو اس قسم کی اکثر کتابوں میں ملتی ہیں۔

ایک عنوان 'بول چال' ہے۔ جس کا پھیلاؤ ۲۰۵ سے ۲۴۳ صفحات تک ہے۔ اس میں عربی الفاظ کے بالمقابل براہوئی، سندھی اور اردو مطالب درج ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوی نے اپنی کتاب "بلوچستان میں دینی ادب" (قلمی، ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء ص ۳۲۸) میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ترتیب و تدوین اور موضوع کے لحاظ سے بے حد معلوماتی ہے اور انداز بیان دلکش ہے"۔

رفیق راہ مدینہ (براہوئی)

حاجی گل محمد نوشکوی نے اس منظوم کتاب میں ایک دوست کی تعریف کی گئی ہے۔ جو حج کے لیے ہمراہ گیا تھا۔ کتاب میں دوست کے خطوط بھی درج ہیں۔ کل صفحات ۶۴ ہیں۔

گلدستہ حکیم موسوم بہ سفر حجاز (فارسی)

اس کتاب کے مصنف کا نام محمد عبداللہ اور تخلص حکیم تھا۔ عشق و عرفان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کلام سے بھی۔ یہی مترشح ہوتا ہے۔ کانڈل تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ

(حدود چھاؤنی ایبٹ آباد) میں سکونت پزیر تھے۔ اپنی تعلیم وہیں مکمل کی۔ عرب، حبش سوڈان، یمن اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد بلوچستان آکر پہلے لورالائی اور پھر مستونگ میں مقیم ہوے۔

آپ زجِ بیت اللہ سے مشرف ہونے اور تین سال تک عرب میں رہنے کے بعد ایک رسالہ گلدستہ حکیم' عرف 'سفیر حجاز' لکھا۔ جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار نے مطبع عزیزی لاہور سے طبع کروایا۔

جن دنوں محمد عبداللہ حکیم مستونگ (کوئٹہ سے کراچی تفتان۔ سرحد ایران کی جانب ۳۲ میل ۵۱ کلومیٹر) میں مقیم تھے۔ تو وہاں میر سرفراز خان ساکن قصبہ محمد شہی جو سیستان کے علاقہ رسالہ میں دفعدار تھے دوماہ کی رخصت پر آئے اور ہر وقت آپ سے ملک عرب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ ان حالات وواقعات میں ان کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ انہوں نے محمد عبداللہ حکیم سے انہیں قلمبند کرا کر ہی چھوڑا۔ میر سرفراز خان کی رخصت میں صرف چھ یوم باقی تھے کہ بفضل ایزدی مسودہ مکمل ہو گیا۔

کتاب کی ابتدا میں آغاز سفر اور راہ کے واقعات سلیس زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔

"میقاتہائے احرام" کے بعد حکیم احرام باندھنے کی ترکیب بتاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کرتے ہیں کہ جدہ میں جیب کتروں سے ہوشیار رہیں۔ پھر جدہ کی زیارتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ قلعہ سلطانی کے عقب میں اماں حوا کا مرقد ہے اور مرقد کی لمبائی ستر گز کے قریب ہے۔ مرقد کے درمیان ایک گنبد ہے جس کو حدِ ناف تصور کرتے ہیں۔ دوسری قبر مجنوں عاشق لیلیٰ کی ہے۔ اس کا اصل نام قیس ہے۔ بڑا عالم وفاضل تھا۔ لیلیٰ کے سوز عشق سے دیوانہ ہوا۔ تیسری قبر لیلیٰ کی ہے۔ یہ قبر قلعہ سلطانی کے اندر اور لب دریا واقع ہے۔

بعد ازاں آپ جدہ سے مکہ معظمہ روانگی کا ذکر کرتے ہیں اور وہاں کے آداب بھی بیان کرتے ہیں اور تاریخی واقعات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور ان تین برجیوں کا پتہ بتاتے ہیں جہاں شیطان ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قربانی سے منع کیا۔ اسی طرح

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے قربانی پر نہ جانے کے لیے کہا۔ ایسے ہی حکیم نے تحریر کیا ہے کہ مسجد ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک پہاڑ میں ایک غار واقع ہے' جہاں آنحضرت ﷺ قیام منیٰ میں عبادت تنہائی فرمایا کرتے تھے اور ایک مرتبہ آپ ﷺ کا سر مبارک اوپر کی طرف ایک پتھر سے لگا۔ چنانچہ ہر حاجی اس غار میں جاکر دو رکعت نفل ادا کر کے اپنے سر کو اس پتھر سے ملتا ہے۔ منیٰ کے قریب چھوٹی مسجد کے متعلق "گلدستہ حکیم" میں مندرج ہے کہ ایک مرتبہ ایام حج میں آنحضرت ﷺ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ ایک سورۃ نازل ہوئی۔ جس سے سب کو خوشی ہوئی اور انہوں نے دو رکعت نفل ادا کی۔ اکثر حجاج کرام اس مسجد میں دو رکعت نفل ادا کرتے ہیں۔

مکہ معظمہ کی زیارت گاہوں کے بارے میں محمد عبداللہ حکیم نے اس طرح لکھا ہے:

اول جائے تولد آنحضرت ﷺ

دوم جائے تولد حضرت علی کرم اللہ وجہ'

سوم کان حضرت ابوبکرؓ

چہارم جائے کہ یک صبح آنحضرت ﷺ برائے نماز بہ حرم میر فتند ابلیس گفت کہ جماعت شدہ است

پنجم غار جبل ثور

ششم جبل نور

پھر ان مقامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اہل عرب کے اخلاق اور عادات کا بھی ذکر "گلدستہ حکیم" میں موجود ہے۔ ان کی لڑائی کے متعلق لکھا ہے کہ جب عرب آپس میں لڑتے ہیں تو بیچ میں ایک آکر کہتا ہے کہ صلِّ علی النبی یا شیخ۔ اس طرح کہنے سے فریقین لڑائی بند کر دیتے ہیں۔

سفر مدینہ کا ذکر اس انداز میں ہے کہ آنکھیں پڑھتے پڑھتے اشکبار ہو جاتی ہیں۔ مدینہ منورہ کی زیارت گاہوں اور مشہور مقامات کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ بیان

حرم مدینہ منورہ جداگانہ حیثیت لیے ہوئے ہے۔ روضہ اطہر پر ایک عاشق کے متعلق تحریر کیا گیا ہے کہ وہ عشق رسول ﷺ میں بہت ہی زیادہ ڈوبا رہتا تھا اور ایک مرتبہ نظر اٹھا کر روضہ مبارک کی جانب دیکھتا پھر بے ہوش ہو جاتا۔ تین چار گھنٹہ کی بے ہوشی کے بعد ہوش آتا۔ پھر اسی طرح دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا۔ محمد عبداللہ حکیم جب تک مدینہ منورہ میں رہے' اس عاشق کو اسی حالت میں دیکھتے رہے۔ آپ نے اسے کبھی کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ روضہ مبارک پر نظر ڈالنا ہی اس کی غذا تھی۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا برصغیر کا باشندہ ہے۔ پٹواری تھے عشق رسول کریم ﷺ غالب آیا۔ ملازمت ترک کر کے مدینہ منورہ چلا آیا۔۔ یوں گلدستہ حکیم' دلپذیر واقعات سے پر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ ہر گھڑی زیر مطالعہ رہے۔

محمد عبداللہ حکیم حضرت مولانا محمد صدیق نقشبندی مستونگی (المتوفی ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء آپ جامع مسجد مستونگ کے ایک گوشے میں دفن ہیں) کی محبت سے خوب فیض یاب ہوئے۔ آپ نے مستونگ اور مستونگ کے علاقے کے مکینوں کی بڑی خدمت کی۔ لوگ آپ سے دینی اور دنیوی امور میں مستفیض ہوئے۔ عام لوگوں کی بھلائی کے لیے آپ نے کنواں بھی کھدوایا جو آج تک آپ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کو اپنے مرشد کامل سے جو قلبی اور روحانی تعلق تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ کی ہر تصنیف میں حضرت محمد صدیق کا ذکر خیر ہے حضرت محمد صدیق کا مسلک، نقشبندیہ سلسلہ میں میاں فقیر اللہ علوی شکارپوری سے ہوتا ہوا سید آدم بنوریؒ سے جا ملتا ہے۔

حج بیت اللہ کے دوران اخوند ملا فیض اللہ کا' جو آپ کا ہم سفر تھا' بیان ہے کہ حج بیت اللہ شریف سے فراغت کے بعد جب ہم مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے تو مولانا محمد صدیق برہنہ پا سفر کرتے تھے۔ آپ نے پہلے مدینہ منورہ میں مستقل قیام کی ٹھانی۔ بعد میں یکایک رخت سفر باندھا اور واپس چلے آئے' غالباً آنحضرت ﷺ کی طرف سے مستونگ میں قیام کرنے کا اشارہ ہوا تھا۔

محمد عبداللہ حکیم نے رفیق راہ سالک میں آپ کے مناقب کے متعلق لکھا ہے۔

سفر حجاز درخانی (فارسی)

حضرت مولانا محمد عبداللہ درخانی نقشبندی مجددی (۱۱ محرم ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۸ء ـــ ۱۱ صفر المظفر ۱۳۶۳ھ / ۶ فروری ۱۹۴۴ء) شیخ البلوچستان حضرت علامہ محمد فاضل درخانی (۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء ـــ ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء) کے نواسہ تھے۔ مولانا محمد فاضل کی وفات پر مولانا محمد عبداللہ ہی آپ کے جانشین ہوے اور ادارہ مطبوعات 'مسجد اور لنگر وغیرہ کا انتظام سنبھالا۔

آپ نے عربی' فارسی اور براہوئی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے ڈھاڈر میں دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ گرمیوں میں آپ سریاب (کوئٹہ) تشریف لاتے 'کیونکہ ڈھاڈر کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

سریاب میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا تھا۔ آپ فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ اپنے تبحر علمی کے باعث ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء سے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء تک سابقہ ریاست قلات کے قاضی القضاۃ رہے۔ آپ نے قطب عصر حضرت خواجہ محمد عمر چشموی (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء ـــ ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہوے۔ آپ ایک خوشگو شاعر بھی تھے۔

مولانا محمد عبداللہ درخانی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں مکہ معظمہ 'دیار رسول ﷺ اور دیگر متبرک مقامات کی زیارت سے مشرف ہوے۔ پھر نو سال بعد ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں اپنے سفر کے واقعات کو کتابی صورت میں شائع کیا اور مقامات مقدسہ کے سلسلے میں ضروری معلومات فراہم کیں۔ اس میں حج کے جامع مسائل و آداب بھی شامل ہیں۔ گویا قاری ایک طرف مسائل حج سے واقف ہوتا ہے اور دوسری جانب وہاں کی خاص خاص جگہوں کے متعلق واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔

آپ نے بڑے دلچسپ' رواں اور دلنشین انداز میں سفر حجاز کے واقعات کو صفحہ

قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

سفر حجاز درخانی اڑتالیس صفحات پر مبنی ہے۔ اسے مصنف کے فرزند میاں عبدالباقی درخانی (المتوفی ۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء) اسٹیشن سریاب کوئٹہ نے شائع کیا تھا۔

المناسک (قلمی' عربی)

اس کے مؤلف مولانا محمد عبداللہ درخانی ہیں۔ یہ چالیس اوراق پر مبنی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ آپ کے فرزند مولانا عبدالباقی درخانی کے پاس تھا۔ ان کی وفات (۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء) کے بعد اب یہ قلمی نسخہ ان کے لخت جگر اور آپ کے نبیرہ جمیل کے پاس ڈھاڈر میں ہے۔

مولانا محمد عبداللہ درخانیؒ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں حج بیت اللہ شریف کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جب آپ مدینہ منورہ میں تھے تو لوگ آپ سے مسائل حج دریافت کرتے تھے۔ یہی سوالات اس کتاب کے محرک بنے۔

فاضل مؤلف نے اس کتاب میں احکام حج اور مختلف مقامات' حجرِ اسود' رکن شامی' منیٰ' عرفات وغیرہ پر جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بیان نہایت عمدہ طریقہ سے کیا ہے۔

مقام افسوس ہے کہ ایسی عمدہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی اگر اس کا اردو ترجمہ اور دیگر پاکستانی زبانوں میں ترجمہ ہو کر چھپ سکے تو قابل توصیف ہوگا۔